رومان

قلمِ تحریر

اختر شیرانی   عاشق بٹالوی

۱۸-فلیمنگ روڈ-لاہور

مفتاح العلوم شرح مثنوی مولانا روم رح

فارسی کے ادیب اول حضرت مولانا روم کی معرکۃ الآرا کتاب مثنوی مولانا روم ہی وہ کتاب ہے۔ کہ جسے فارسی زبان کا قرآن کہا جاتا ہے۔ فارسی ادب کے لحاظ سے تمام فارسی کی کتابوں سے ممتاز شریعت و طریقت کے بیان کرنے میں دوسری تمام کتابوں پر فائق۔ فارسی علم و ادب کے شائق اسے پڑھ کر زبان فارسی پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ صوفی اس کے معرفیاز کلام کو جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں۔ عالم و واعظ اس کے اشعار کو پڑھ پڑھ کر مجالس وعظ کو گرم کرتے ہیں۔ لیکچرار اپنی تقریر کی دلچسپی کو اسی سے بڑھاتے ہیں۔ مضمون نگار اپنے مضامین کی رنگینی کے لئے اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہر قسم کے لوگ اپنے اپنے مذاق کے موافق اس کا مطالعہ نہایت شوق سے کرتے ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں چونکہ فارسی زبان کی طرف سے بے توجہی پائی جاتی ہے۔ ایسی جلیل القدر کتاب کے اشعار کا سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ لہذا مثنوی کے عام مطالعہ کرنے والے اس کے معانی اور مطالب پر بخوبی عبور حاصل کرنے کے لئے کسی آسان اور مفصل شرح کی جو کہ اردو میں ہو متلاشی تھے۔ پس ہم نے مثنوی مولانا روم کے ایسے شائقین کے لئے بصرف زر کثیر ایک ایسی جامع و مفصل آسان اردو زبان میں مثنوی کی شرح شائع کی ہے۔ کہ جس کے متعلق ہندوستان کے تمام مشہور اخبارات کے علاوہ بڑے بڑے عالموں، صوفیوں اور لیڈروں کی یہ رائے ہے۔ کہ یہ شرح مثنوی کی تمام قدیم و جدید شرحات سے نہایت اعلیٰ اور عمدہ ہے۔ اس میں اول مثنوی کا شعر جلی قلم سے بعض بعض اعراب دیکر لکھا گیا ہے اس کے بعد مشکل الفاظ کی شرح اور شعر کی صرفی نحوی ترکیب بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد شعر کا ترجمہ دو طرح پر کیا گیا ہے۔ کہ جو بہت لفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی ترجمہ کے بعد شعر کا مفصل اور مشرح مطلب قرآن مجید و احادیث اور مستند روایات کے حوالے سے لکھ کر مولانا کے اصل مفہوم کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مثنوی کے اشعار سے ملتے جلتے شعرائے قدیم و جدید کے پھڑکتے ہوئے اشعار درج کر کے مثنوی خوانی کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔ شروع میں ایک مبسوط فہرست دی گئی ہے جس سے بغیر ورق گردانی کے ہر قسم کے مضامین دیکھے جا سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ نہایت اعلیٰ۔ حجم فی حصہ سوا تین سو صفحات۔ قیمت حصہ اول ۱۲؎ حصہ دوم عہ؎ حصہ سوم ۴؎ حصہ چہارم عہ؎ حصہ پنجم ۴؎ حصہ ششم عہ؎ حصہ ہفتم عہ؎ حصہ ہشتم عہ؎ حصہ اول و دوم یکجا مجلد پانچ روپے۔ حصہ سوم و چہارم یکجا مجلد چھ روپے۔ حصہ پنجم و ششم یکجا مجلد چھ روپے۔ حصہ ہفتم و ہشتم یکجا مجلد چھ روپے علیحدہ علیحدہ مجلد فی حصہ سوا تین روپے۔ آٹھوں حصوں کے خریدار کو ۲ فی روپیہ کمیشن کے علاوہ جنتری ۱۹۳۵ء و سوانح مولانا روم از شبلی مفت

(وعدہ) کتاب اگر اشتہار کے مطابق نہ ہو تو بلا عذر قیمت واپس کر دی جائے گی۔ رسالہ کا حوالہ دینے سے ہر شخص کو جنتری ۱۹۳۵ء مفت

پنجاب کونسل کے پریزیڈنٹ آنریبل خان بہادر سر
چودھری شہاب الدین صاحب
نے اس کتاب کو دفتر قریشی بک ایجنسی میں خود
تشریف لاکر خرید فرمایا اور اسے نہایت ہی پسند کیا

منگانے کا پتہ

محمد حفیظ اللہ قریشی تاجر کتب و مالک قریشی بک ایجنسی

چوک سنہری مسجد روم لاہور

گزارہ
روزگار میں کامیابی
حاصل کرنے کیلئے آپ اپنی تعلیم حاصل کرنے میں اور
اپنی کوشش کرتے ہیں مگر سولہ آنہ پورا خاوند بننے
کیلئے آپ کچھ بھی کوشش نہیں کرتے۔ چلو گزارہ ہو جاتا ہے
گھر میں بیوی ہے خاوند تو کہلاتے ہی ہیں۔ یہ ہے آپ کا خیال
سچ مانئے
ہدایت نامہ خاوند
باتصویر
کی کارآمد نصیحتوں، راز کی باتوں اور عملی ہدایتوں کی آپ کو
اشد ضرورت ہے اپنے شہر کے کتب فروش یا مندرجہ ذیل پتہ
سے ہدایت نامہ خاوند مجلد باتصویر پانچواں ایڈیشن طلب
کریں یقیناً آپ اسے پڑھ کر بہت ہی مفید پائیں گے
قیمت ایک روپیہ ڈاک خرچ ۴؍
پتہ: کویراج ہرنام داس بی-اے- لاہور

پروفیسر
کی غلط فہمی
جب اشتہار پڑھا ایک گھڑی سی ہوتی
کہ منگالوں۔ پھر کہتا شاید کوئی بازاری کتاب
ہوگا کبھی کہتا مجھے اس کتاب کی ضرورت ہی
کیا ہے مگر اس دن ایک دوست سے تعریف سن کر
منگا ہی لی کویراج صاحب! بصدق دل تحریر کرتا ہوں کہ
ہدایت نامہ خاوند
بلا مبالغہ بہترین کتاب ہے جو میرے مطالعہ میں
آئی ہر نوجوان اس سے بے حد فائدہ حاصل کرے گا
از راہ کرم ایک جلد ہدایت نامہ بیوی اور تعلیم نسواں ارسال فرمائیں
احسان مند محمد اقبال ایم-اے- تاج محل ہوٹل بمبئی
مصنفہ
کویراج ہرنام داس بی اے
لاہور

جامع اللغات اُردو

واسنہ متعلقہ

مولفہ و مرتبہ خواجہ عبد المجید بی-اے

۴۲ حصوں میں چھپکر مکمل ہوگیا

قیمت فی حصہ ایک روپیہ چار آنہ (عہ) علاوہ محصولڈاک و پیکنگ

مکمل کتاب چار جلدوں میں!

قیمت سُرخ مجلد مراکو لیدر کلانھ مطلا و مذہب جلد اوّل تا سوم فی جلد ۱۲ جلد چہارم ۱۵ مکمل لغت سُرخ مجلد

علاوہ محصول پیکنگ

قیمت سبز مجلد پشت و کونہ چمڑا مطلا و مذہب جلد اول تا سوم فی جلد ۱۲ جلد چہارم للعہ مکمل لغت سبز علاوہ محصول

کل قیمت پیشگی بھیجنے والے کو محصول و پیکنگ معاف۔ نمونہ کا رسالہ مفت طلب کیجیے

مینجر جامع اللغات کمپنی۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور

اقبال کاتب تصویہ منشی نور محمد خوشنویس لاہور

یورپ
کی
بہترین کتابوں کا نچوڑ
خاوند بیوی کا رہنما
پریم شاستر
کام شاستر
قیمت بارہ آنے
قیمت ایک روپیہ
مرد عورت کے تعلقات پر اردو میں بہترین کتابیں!
اپنے شہر کے ایجنٹ سے خرید لیجئے یا براہ راست ہم سے منگوائیے:
مینیجر پریم شاستر بک ڈپو بیرون شاہ عالمی دروازہ لاہور

اقبال کاتب

(شیخ محمد نواب پرنٹر پبلشر نے گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع کرا کے ۱۸۔ فلیمنگ روڈ لاہور سے شائع کیا)

آئندہ نمبر کے قابلِ دید مضامین
حضرت آغا حشر کاشمیری کی
تازہ غزل
امیر تیمور
مبلغ اسلام کی حیثیت سے
از
حضرت مولانا ظفر علی خاں
سید امتیاز علی تاج
بی۔ اے کے
دلکش مضامین
رخصت کی شام
حضرت جوش ملیح آبادی کی
حکایتِ خونچکاں
عاشق بٹالوی
کا ایک ہنگامہ خیز افسانہ
حافظ کے مزار پر
ایرانی دیویوں کی موجودگی میں
گذری ہوئی راتیں
"لارڈ بائرن آف ہندوستان"
کی ولولہ انگیز
نظم
بیوہ کا راز
انگریزی کا ایک دلچسپ افسانہ
مترجمہ
اختر شیرانی
اختر شیرانی
ترکوں کا شیخ چلی
از
علامہ ابن بطوطہ
روگ کا راگ
ایک نظم
ان کے علاوہ مشاہیر اردو
کے متعدد دلچسپ مضامین نظم و نثر
باصرہ نواز ہونگے
مینجر رسالہ "رومان" ۱۸۰۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

فہرس

جلد ۱ | بابت ماہ مئی ۱۹۳۵ء | نمبر ۱

رومان

رُومان کا پیش لفظ

از:۔ حضرۃ جوش ملیح آبادی

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا!
اے گدا خواب سے بیدار کہ سُلطاں آیا

دُور اے زہد کہ وہ زہد شکن آپہنچا
رُخصت ایماں کہ وہ غارتگرِ ایماں آیا

خاطرِ جمع سے ہشیار کہ برہم ہوئی زلف
کشتئ دل سے خبردار کہ طوفاں آیا

بوستاں وجد میں آ، عشق، غزلخواں ہو جا
کہ گلِ سرسبد و سروِ خراماں آیا!

اے کلی ناز سے کھل! بادۂ سرجوش ابل!
کہ نگارِ چمن و شاہدِ مستاں آیا

اے چمن! عید منا، ابر ہوا گرمِ خرام

اے صبا نازسے چل موسمِ باراں آیا!

چرخ اُلٹنے ہی پہ تھا حرف و حکایت کی بساط
کہ بتِ نادرہ گفتار و خوش الحاں آیا

رامش و رنگ کی اُٹھنے ہی پہ تھی رسمِ کہن
شکر ہے نطق میں وہ لعل سخنداں آیا

صاف ہوتا ہی نہ تھا مسئلہ کام و دہن
للہ الحمد کہ یارِ شکر افشاں آیا

مژدہ، اے کارگرہ بستہ کہ ہمراہ صبا
پیک مشکیں نفسِ کاکل پیچاں آیا

شاد باش اے سحرِ عید کہ بالیں پہ مری
یار باسلسلۂ زُلفِ پریشاں آیا!

کج کلاہی کا سرِ و برگ مبارک اے جوشؔ
لے پیامِ شکن طرۂ جاناں آیا

صفحہ لطائف

لطائف

از "عکاس" زمیندار

اخباری لہجے کی نیرنگیاں

نپولین بوناپارٹ کے عہد میں پیرس سے ایک روزانہ جریدہ مانیٹر شائع ہوتا تھا۔ جب نپولین جزیرہ البا بھیج دیا گیا۔ اور بوربن خاندان از سرِ نو برسرِ اقتدار آگیا۔ تو اس اخبار نے بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا شروع کیا۔ اور نپولین کی ہجو اور بوربنوں کی مدح سرائی شروع کر دی۔ اتفاق سے نپولین جزیرہ البا سے نکل آیا اور فوجی ذخیرہ امداد سے پیرس کی طرف بڑھا۔ نتیجے کے طور پر لوئی ہیجدہم بھاگ کھڑا ہوا۔ اور تخت و تاج از سرِ نو نپولین کے قبضے میں آگیا۔ اس زمانے میں مانیٹر نے جس جس طرح رنگ بدلا وہ صحافتی دنیا کا یادگار واقعہ ہے۔ حالت یہ تھی کہ محض اس کے لہجے کی نیرنگیوں سے، ناظرین نپولین کی قوت اور نقل و حرکت کا اندازہ کر لیتے تھے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

البا سے نپولین کی روانگی کی خبر سن کر اس اخبار نے سب سے پہلے یہ اطلاع شائع کی "مردم خوار درندہ اپنے کچھار سے نکل آیا"۔ ایک دو اشاعتوں کے بعد یہ خبر درج کی "کارسیکا کا غول صحرائی خلیج گوآن تک آ پہنچا"۔ ایک اور اشاعت کے بعد لکھا "چیتا کاپ تک آگیا ہے"۔ تیسرے دن بعد درج کیا "وحشی نے گرنوبل میں رات گذاری"۔ ایک اور اشاعت کے بعد یہ اطلاع شائع کی "غاصب تاج و تخت دارالسلطنت سے ۔ میل دُور رہ گیا ہے"۔ ایک دو روز بعد لکھا "بوناپارٹ تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن پیرس ابھی دُور ہے"۔ دوسرے نمبر میں لکھا "نپولین کل تک پیرس کے دروازے پر ہوگا" دو دن بعد یہ اطلاع درج کی "شہنشاہ فونٹین بلو آ پہنچا" آخری خبر کے الفاظ تھے "اعلیٰ حضرت ہمایونی نے قصر ٹولرے میں نزولِ اجلال فرمایا"۔

"ننگِ خدمت"

جارج واشنگٹن پہلے صدر جمہوریہ امریکہ کے اخلاق و عادات کے متعلق بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے واقعات مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن وہ ایک زیرِ مرمت سرکاری عمارت کے پاس سے گذر رہا تھا۔ کہ اس نے دیکھا چند سپاہی ایک بڑے شہتیر کو عمارت کے بالائی حصے تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ شہتیر وزنی اور سپاہیوں کی تعداد کم تھی۔ اس لئے وہ اس کوشش میں ناکام نظر آتے تھے۔ اور انتہائی محنت سے پسینہ پسینہ

ہو رہے تھے۔

سپاہیوں کا افسر دُور کھڑا سپاہیوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ مگر خود امداد کے لئے پاس نہ آتا تھا۔ واشنگٹن شہری لباس میں تھا۔ اس لئے کوئی شخص اسے پہچان نہ سکا۔ اس نے آگے بڑھ کر افسر سے کہا کہ تم سپاہیوں کو طعن تشنیع کرنے کی بجائے ان کی امداد کرتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ افسر نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "تم نہیں جانتے میں افسر ہوں، اور اپنے ماتحت سپاہیوں کا سا کام نہیں کر سکتا"۔ واشنگٹن نے کہا "معاف کیجئے جناب، مجھے معلوم نہ تھا" یہ کہہ کر گھوڑے سے اُتر پڑا اور سپاہیوں کے ساتھ شریک ہو کر شہتیر اُٹھانے لگا۔ اس کی امداد سے شہتیر اوپر پہنچ گیا۔ پسینے میں نہایا ہوا جب وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو اُس نے افسر سے کہا۔

"افسر صاحب! اگر پھر کبھی ایسا موقع پیش آئے اور تم دیکھو کہ تمہارے ماتحت سپاہی تنہا کام نہیں کر سکتے۔ تو فوراً اپنے سپہ سالار کو اطلاع دینا۔ وہ خدمت کے لئے حاضر ہو گا" افسر نے اب پہچانا کہ متکلم کون ہے۔ شرم و خوف کے مارے وہ بے حس و حرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ سپاہیوں نے انتہائی محبت و احترام سے سلامی دی۔ اور واشنگٹن مسکراتا ہوا چل دیا۔

"ترکی نمیدانم"

یورپ جانے والے اصحاب نے اکثر دیکھا ہو گا۔ کہ یکشنبہ یا کسی تہوار کے دن، لوگ اپنے مکانات کے نیچے کھڑے ہو کر پیانو یا دوسرے ساز بجاتے ہیں۔

ایک انگریز نے پولیس سے شکایت کی کہ ایک اطالوی شخص میرے مکان کی نچلی منزل میں پیانو بجاتا ہے۔ جس کی آواز سے ہمارا خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ ہر چند اس کو منع کرتا ہوں۔ وہ ساز بجانے سے باز نہیں آتا"۔

پولیس اطالوی شخص کو قریب کے تھانے میں لے گئی۔ رپٹ لکھوائی اور مشہور مجسٹریٹ مسٹر کورس لانگسٹر کے پاس پہنچا دی۔

مجسٹریٹ نے رپورٹ پڑھ کر مدعا علیہ سے پوچھا۔ "جب مدعی نے تمہیں منع کیا۔ کہ تم اس کے مکان کے نیچے ساز نہ بجاؤ تو تم نے کیوں ایسا نہیں کیا"

اطالوی نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا۔ "کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا اور اس لئے مطلقاً نہ سمجھا کہ مدعی کیا کہہ رہا ہے"

مجسٹریٹ نے کہا "تم انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مگر آنکھوں سے تو دیکھ سکتے تھے کہ مدعی زمین پر پاؤں مار رہا ہے۔ اور اپنے ہاتھوں کو حرکت دے رہا ہے تاکہ تم اس حرکت سے باز آ جاؤ"!

اطالوی نے جواب دیا "معاف کیجئے۔ میں نے مدعی کی یہ حرکتیں دیکھیں۔ مگر خیال کیا۔ کہ میرے ساز کی مست آواز پر تھرک رہا ہے"!

علامہ جمال الدین افغانی

باقیات الصالحات

جنگ کی ہولناک حالت

یہ کہہ گئی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی
زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی

اور

امن کے آثار

اثر:- داعی اتحاد اسلام

علامہ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ

"تاریکی و ظلمت کی گھنگور گھٹاؤں کے ہجوم نے کائنات کو گھیر رکھا ہے۔ دھواں دھار گرد، غلیظ غبار اور تند و شدید آندھیوں نے جو ہوا کو بھر دیا ہے۔ دلوں پر لرزہ طاری ہے رنگ اُڑے ہوئے ہیں۔ یہ کیسی ہولناک آوازیں ہیں۔ یہ کیسے جانکاہ نعرے ہیں۔ یہ کیسے پُرشور نوحے ہیں جو کان بہرے کئے دیتے ہیں۔ یہ کیسی ہیبتناک گرج ہے۔ شمال زلزلے میں ہے اور جنوب لرزش و اضطراب میں مبتلا ہے۔

کوہ و دشت اور وادی و ہاموں، آہن و فولاد سے پُر نظر آتے ہیں۔ توپوں کی گرجدار آوازیں فضا میں گونج رہی ہیں۔ تاریک و غبار آلود ہوا میں ہتیاروں کی شعاعیں، بجلی کی طرح لہرا رہی ہیں۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ خون کے دریا موجزن ہیں، متلاطم ہیں۔ سینے گھوڑوں کے سموں سے کچلے جا رہے ہیں۔ مختلف قومیں اور ملتیں برباد و تباہ ہو گئی ہیں۔

گوناگوں شکلیں اور صورتیں آپس میں مل رہی ہیں۔ دل غصّے سے لبریز ہیں اور ہونٹ غیظ و غضب سے کاٹے جا رہے ہیں۔ عفریت شیطانوں سے ستیزہ کار ہیں۔ گھر برباد ہو گئے اور مال و متاع غارت و یغما کی بھینٹ چڑھا۔ دولہنیں گریہ و زاری میں مبتلا ہیں اور مائیں اپنے بچّوں کا نوحہ کر رہی ہیں۔ مظلومین امن و امان کے منتظر اور اللہ اللہ کر رہے ہیں۔

پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں کو طے کرنا کس قدر دشوار ہے۔ ندیاں اور نہریں خون سے لبریز ہیں۔ پیٹ کے بندے اپنی جانیں برباد کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ مزدور اپنے بھائی کا گھر چھین کر اس میں اجنبیوں کو بسا رہا ہے۔

عقاب اپنے پنجے سے شیر کی آنکھ نکالتا ہے۔
جمشید کوہ دماوند پر بھاگ گیا ہے۔ برہما کوہسارِ ہمالہ پر رقص و وجد میں مصروف ہے۔ بکرماجیت شوق کے عالم میں اپنی قبر سے سر نکال کر نئی زندگی کا تمنائی ہے۔ دریائے ہیرمند اور اٹک کو پل کی ضرورت نہیں رہی مقتولین کی لاشوں نے دریاؤں کو پاٹ دیا ہے۔

آگ نے تمام روئے زمین کو چھپا لیا ہے۔ تر و خشک کو باہم جلا رہی ہے۔ کمزور، طاقتوروں کے چہروں کو اپنے ناخنوں سے زخمی کر رہے ہیں۔ بیماروں کو صحت کی امید ہو چلی ہے۔ اور موتیں، اپنی قبروں میں زندگی کی امید پر، قبروں کی لوحوں کو حرکت دے رہی ہیں۔ جہازوں کے تختے، سمندروں کی ظلمتوں میں پارہ پارہ ہو گئے ہیں۔ اب سے تم ان کے مدافع کی آواز نہیں سنو گے۔

فقیرِ درویش، بادشاہ کے تخت پر بیٹھ گئے۔ سنو! سنو! اب بادشاہ کوہ قاف کی چوٹی پر کھڑا ہے۔ خدا کا ہات تلوار لئے، آسمان کے وسط سے ظاہر ہوا۔ دنیا میں روشنی پھیل گئی۔ آفتاب طلوع ہوا۔ مظالم کے بادل پارہ پارہ ہو گئے۔ غبار بیٹھ گیا۔ صور پھنک گیا۔ غصے جلتے رہے۔ جو جس راستے سے آیا تھا اسی راستے واپس چلا گیا۔ مالک نے اپنے ملک پر تصرف کر لیا۔ کانٹے سوکھ گئے۔ گل و یاسمین اگنے اور پھلنے پھولنے لگے۔

تمام دنیا کو انوار و ازہار نے گھیر لیا ہے بہجت و مسرت کا عالم ہے۔ دیو رخصت ہوا۔ شیطان ہلاک ہو گیا۔ دنیا میں امن و امان کا عالم ہے۔ انصاف پادشاہ ہو گیا ہے۔ ضحاک کوہ دماوند پر اسیر ہو گیا۔ عالم یک بیک بہشت بن گیا۔ آج حکم، خدا کا حکم ہے۔ اور بندہ اس کا بندہ۔

پادشاہ چلا رہا ہے۔ سنو! سنو! اس کے بعد موت نہ ہو گی۔ موت نہ آئیگی۔ ابدی زندگی بسر کرو! اب تم بیماری کی تلخی نہ چکھو گے! ہر ایک قوم اپنے حدود میں امن و امان سے زندگی گزارے۔ ہر ایک جماعت اپنے احاطے میں بود و باش رکھے دست تعدی کوتاہ اور بازوئے ظلم شکستہ ہو گیا۔ والسلام

اخذ و ترجمہ از :- اختر شیرانی

زومان لاہور

صفوة أولي الهمم وقدوة أرباب الشيم السيد

الحاج أحمد خان لا زال مصوناً بعناية الرحمن

أني قد حللت الآن ببلدة أنت ساكنها ومنك بهجتها وبك سناها

فكتبت إليك هذه الوريقة زعماً مني أنك بتقلبك بين أطوار الزمان

واختبارك أجناس الإنسان ترغب أن تلاقي كل من دعكه

الدهر وحنكه العصر وإن كان في كن حقير متربعاً على حصير

فإن كان الأمر كما رأيت فيا لحظي الأوفر وإلا فلست أول

من غرّه الفكر وأني جهلاً بمحلات الإقامة في هذه البلدة

نزلت في خان غريب عفن لا يسكنه إلا الصعاليك والأوباش

بسمى (بجاريان سراى كربلاى عوض) والسلام

جمال الدين الحسيني الأفغاني

علامہ جمال الدین کی تحریر

منظومات

خطابۂ ارادت

ارمغان بہ پیشگاہ جان پاک و روح اقدس تابناک
اُستاد یگانہ و سخن گوے فرزانہ حکیم ابوالقاسم
فردوسی طوسی اعلی اللہ مقامہ

این قصیدہ در موقع جشن "یادگار ہزار سالہ فردوسی" (کلکتہ)
بتاریخ ۲۵ نوامبر ۱۹۳۴ مسیحی سرودہ شد

اثر:- اختر شیرانی

ایا شاعرِ پاک ایراں زمین ! زما بر تو بادا ہزار آفریں !
سخن آفریں تا سخن آفرید سخنگوے چوں تو نیامد پدید
بود تو افسانۂ باستاں ز پاکان ایران و از راستاں
چہا نقش انگیختہ خامہ ات کہ ارژنگ معنی است شہنامہ ات
ز عظمت باندیشہ ہمت رسید ز فکر تو نیرو بہ فکرت رسید
ازاں تخم دانش کہ بر کاشتی سخن را علم برتر افراشتی
تو خود گفتۂ من "دریں سال سی عجم گرم کردم بدیں پارسی"
"بناہاے آباد گردد خراب ز باران و از تابش آفتاب"
بنا کردی "از نظم کاخے بلند کہ از باد و باران نیابد گزند"
ز خورشید و از آب وز باد و خاک نگردد تبہ نام و گفتار پاک"

یکے خیز و بنگر کہ ملک عجم شد آراستہ باز چوں عصر جم
زمانہ پذیرفت رسم نوی بدور شہ فرخ پہلوی

رضا شاہ آں شاہ پاکیزہ دیں — کہ نازد برو تخت و تاج و نگین
ز گفتار خوبت باوائے رود — بر آور ازاں خسروانی سرود
"جہاندار محمود شاہ بزرگ — بآبشخور آرد ہمی میش و گرگ"
"چو کودک لب از شیر مادر بشست — بگہوارہ محمود گوید نخست"
ہماں شیر ایراں کہ در خواب بود — پس از سالہا چشم غفلت کشود
دگر زندہ شد روح ایرانیاں — فرہ مندی عہد ساسانیاں
پس از دورۂ سالہائے دراز — عروسِ عجم شد بہاریں طراز
طرب گاہ خسرو کراں تا کراں — شد آباد چوں باغ نوشیرواں
بہارِ نویں را سرودے بگو — خزانِ کہن را درودے بگو

سخن پرورا مدح خوانِ توایم — توئی شاہ و ما بندگانِ توایم
نہ ایراں فقط والۂ نامِ تو — صنم خانۂ ہند ہم رامِ تو
حقوقِ ارادت ادا کردہ ایم — بکلکتہ جشنے بپا کردہ ایم
تو اے میہمانِ حریمِ ارم — ز ما سجدۂ شوق بپذیر ہم

بیادِ تو دل می چکاند سجود
بخاکِ تو از ما ہزاراں درود

اختر شیرانی

فنون لطیفہ

فنونِ لطیفہ

از:-
آقای ادیب میرزا حسین کاظم زادہ ایرانشہر
سابق مدیر "ایرانشہر" (برلن)

صنائع مستظرفہ یا فنونِ لطیفہ، کسی قوم و ملت کی تکمیل معنوی اور تکامل روحی کا اندازہ کرنے کے لئے ایک مقیاس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس دُنیا میں ہزارہا محسوسات کے ہجوم میں، جن کی ہستی اور کیفیت سے، ہم اپنے پانچوں حواس کے اثر میں، باخبر ہوتے ہیں، بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم بے اختیار پیار کرتے ہیں اور باوجود اس کے کہ ان سے کوئی عملی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، ہمارے دل اور روحیں ان کی شیفتہ ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جس وقت ہم کسی نقاشی کے پردے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، جو کسی صنعت کار کی دماغی و روحی قوتوں کا ثمرہ ہوتا ہے تو دیر تک اس کے نظارے میں محو اور تعجب و حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں۔

تار کی حزن انگیز آواز یا کسی باذوق مغنی کی طرب انگیز صدا ہمارے لطیف احساسات میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح کسی چاندنی رات میں وقت گزارنا، بادلوں اور چاند ستاروں کا نظارہ، ہوا کی اٹھکھیلیاں اور درختوں کے پتّوں کی حرکت، پانی کے گرنے کی خواب آلود اور دلنواز صدا دروں اور کوہساروں کی وحشت انگیز عظمت، چمن زاروں کی سرسبزی اور طراوت، لطیف پھولوں کا رنگ و بو، کسی دلنواز محبوبہ کی صحبت شیریں اور اسی قسم کی دوسری رنگین چیزیں ہمارے لئے ایک قلبی مسرت اور روحی انجذاب پیدا کرتی ہیں۔ اور گھنٹوں تک ہمیں گہرے تفکرات میں مستغرق رکھتی ہیں۔

استغراق کے اس عالم میں، زندگی کے نہ بھولنے والے شیریں لمحات، ہماری آنکھوں میں پھر جاتے ہیں، ہماری دیرینہ اور تسلی بخش آرزوئیں، آنے والی اور رُوح نواز امیدیں، نئے سرے سے زندہ اور بیدار ہو جاتی ہیں۔ یہ استغراق ایک مستی بخش جام کی طرح ہم میں اثر کرتا ہے۔ یہ موقع ہوتا ہے جب ہم خود بخود کہہ اُٹھتے ہیں: "اے کاش، وجد و استغراق کی یہ ساعت ابدی ہو جائے۔" اور ہماری آرزو ہوتی ہے کہ کاش فطرت کا ہاتف ہمیں اس شیریں خیالی کے خواب سے

کبھی بیدار نہ کرے۔ کیونکہ اس وقت ہمارا دل اپنے دیرینہ
آمال کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف اور ہماری روح
اپنے مجذوب محبوب سے ہمکنار ہوئی ہے۔ اگر فطرت
کے ان محاسن اور اس پر جاذبیت استغراق کی تعریف
کسی شاعر شیریں بیان کے قلم سے بھی ہو تو خواہ ہم
کسی بیت الحزن کے تاریک گوشے ہی میں کیوں
نہ بیٹھے ہوں، ہمارے قلب و روح کی گہرائیوں میں
اسی روحی لذت کو بیدار کرتی ہے۔ ایک حساس
دل اور ایک زندہ روح کے لئے فطرت کا ہر منظر
نظارہ ایک جذبہ اور ایک جلوہ متشکل کر دیتا ہے۔

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ اس روحانی فیض
کا منبع کہاں ہے؟ اور کسی چیز کا مشاہدہ اور احساس
ہم میں اس قسم کے جذب و وجد کی کیفیت کیونکر
پیدا کر دیتا ہے؟ ہمیں اس جاذبیت و مجذوبیت کے
مرکز کو پیدا کرنا ہے اور دیکھنا ہے کہ اس معجز نما
قوت کا کیا نام ہے؟ اور یہ "کس چشمے کا پانی پیتی
ہے؟"

اگر ہم کسی قدر تفکر و تعمق سے کام لیں تو معلوم
ہوگا کہ یہ جذبہ وہی جذبۂ صنعت ہے۔ اور صنعت
حسن کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔ اور چونکہ
ہماری روح عوام حسن سے ایک ازلی ربط رکھتی
ہے۔ اور یہ دونوں ایک ابدی محبت کے واسطے
سے باہم پیوستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں حسن
ہے وہاں روح ہے اور جہاں روح ہے صنعت
سے ہمدوش ہے۔

یہ صنعت یعنی حسن جو ہماری روح کی محبوبہ ہے
دو قسموں پر منقسم ہے۔ ایک "حسن خدا داد" جو صنعت کا
حقیقی کا اثر ہے۔ جیسے محاسن فطرت وغیرہ۔ دوسرے
"صنعت بشری" ہے، جو روح بشر کی تخلیق ہے۔

چونکہ انسانی روح، فطری محاسن پر اکتفا نہیں کرتی
یعنی ان کو اپنی معنوی غذا کے لئے کافی نہیں سمجھتی اس
لئے اس قدرت کے ساتھ جو صانع حقیقی نے اس
میں ودیعت کی ہے اس نے فطری محاسن پر بعض
دوسرے محاسن کا اضافہ کر لیا ہے۔ چنانچہ ابتدا میں
فطری حسن کاریوں کی تقلید میں کوشش کی اور بعد ازاں
مزید پیرائے اور آب و رنگ اضافہ کر کے جاذب ترین
شکلیں اور دلربا تر نقوش اسے بخش دئے اور اپنی
روحی غذا یعنی حسن مطلق کی جستجو میں روح انسانی کی اس
دائمی کوشش سے فنون لطیفہ مثلاً نقاشی، موسیقی، مجسمہ سازی
معماری اور شاعری وجود میں آئے۔

پس صنعت اور فنون لطیفہ بشریت کی تخلیق میں اور اسی
کے ساتھ معدوم ہونگے اور جس طرح ہم کہہ چکے ہیں صنعت عین
حسن اور حسن عین صنعت ہے۔ اسی مناسبت سے ہم یہ بھی
کہہ سکتے ہیں کہ فنون لطیفہ، حسن مجسم سے عبارت ہیں۔

کلامِ سرسیّد

فلاطوں طفلکے باشد ز یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می دارد ز درمانے کہ من دارم

زکفرِ من چہ میخواہی، ز ایمانم چہ می پرسی؟
ہماں یک جلوۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم، دلے بریاں زعشقِ مصطفٰے دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

زجبریلِ امیں قراں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرانے کہ من دارم

فلک یک مطلعِ خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

ز برہاں تا بہ ایماں سنگہا دارد رہِ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ہمچو برہانے کہ من دارم

سرسیّد علیہ الرحمتہ کی ایک
فارسی غزل

فلاطون طفلکی باشد ز یونانی کہ من دارم
مسیحا رشک می دارد ز درمانی کہ من دارم

زکفرِ من چہ میخواہی ز ایمانم چہ می پرسی
ہمان یک جلوۂ عشق است ایمانی کہ من دارم

خدا دارم دلی بریان ز عشق مصطفے دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانی کہ من دارم

ز جبریل امین قران بہ پیغامی نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرانی کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاران مطلعہا دارد گریبانی کہ من دارم

ز برہان تا بہ ایمان سنگہا دارد رہ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ہمچو برہانی کہ من دارم

غالبیات

غالب کا ایک شعر
اور
مولانا طباطبائی کا اعتراض

از:-
حضرت علامہ حافظ محمد محمود خاں صاحب
شیرانی لکچرر پنجاب یونیورسٹی

میرزا اسداللہ خاں غالب کے اُردو کلام کی شرحیں قلمبند کرنا آج کل زمانہ کا ایک فیشن ہوگیا ہے۔ ہر سال ایک نہ ایک نئی شرح اضافہ ہوتی جارہی ہے۔ اور اگر یہی حالت رہی تو "غالبیات" ہمارے ادب کی ایک اہم اور گرانقدر شاخ بن جائیگی۔

میرزا غالب کے اپنے زمانے میں جب کہ مستمعین ان کے کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے ع

مگر ان کا لکھا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

کہنے کے عادی تھے، کون خیال کر سکتا تھا کہ اسی کلام کی تاریخ میں ایک دن دورِ عروج بھی آنا ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود میرزا غالب کی نظر میں بھی اُن کا کلام کسی خاص وقعت کا مستحق نہیں تھا اور وہ خود کہتے تھے ع

بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

جب ایک چیز کو خود اس کا مصنف اور اس کے معاصرین تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو پھر وہ کیا اسباب ہیں جنہوں نے ان کے کلام کو آج ہماری نظروں میں اسقدر اہمیت دے دی ہے؟ کیا ہمارے مذاق خدانخواستہ متبذل ہوگئے ہیں؟

بظاہر اس کے دو زبردست وجوہ ہیں۔ اول مولنا حالی کی "یادگار غالب" جس نے سب سے پہلی مرتبہ ہمیں میرزا کے چیدہ چیدہ اشعار کی شرح کرکے بتایا کہ ان کے طلسم الفاظ میں کیا کیا جواہر معانی پنہاں ہیں۔ دوسرے میرزا کے شاگردوں میں بعض ایسے بزرگ تھے جنہوں نے ان کی دقت آشنا طرز کو وقتاً فوقتاً اشاعت دی۔

میرزا کی شاعری کا سب سے دلفریب پہلو بیان ہونا ابھی باقی ہے۔ ہم میں قدرتاً ایک ایسا مادہ ہے جسے تلاش شوق کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ یہ شوقِ تلاش یا شوقِ تحقیق ہے جس نے ہم کو

آئینے سے پشت آئینہ دیکھنے کی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔
غالب کا کمال صرف اسی ایک صنعت پر منحصر ہے۔
کہ وہ ہمارے جذبۂ تجسس کو حرکت میں لے آتے
ہیں اور خواہ مخواہ ہم کو اپنی طرف توجہ دلاتے ہیں۔
ادبیات میں یہ درجہ حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔
غالبؔ کی متعدد شرحیں نکل چکی ہیں لیکن ان
میں دو کو زیادہ نمود حاصل ہے۔ اول مولانا علی حیدر
طبا طبائی کی ہے جو دوسری شرحوں کے مقابلے
میں بہت مفصل ہے۔ دوسرے مولانا حسرت موہانی
کی جو مقبول عام ہے۔

میرا مقصد یہاں غالبؔ کے کلام یا شرحوں
پر مضمون لکھنا نہیں ہے بلکہ صرف اُن کے ایک
شعر کی شرح کرنا ہے جو دیوان کا پہلا شعر ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر کے معنی خود میرزا مرحوم نے "عودِ ہندی"
میں بیان فرمائے ہیں کہ "ایران میں رسم ہے کہ
مستغیث کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے
جاتا ہے۔ جس سے حاکم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ
داد خواہ ہے۔" اس پر مولانا طبا طبائی فرماتے ہیں
"مگر میرزا کا یہ کہنا کہ ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ
کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے،
مَیں نے یہ ذکر نہ کہیں دیکھا نہ سُنا۔"

مجھے اس کے متعلق اس قدر عرض کرنا ہے
کہ اشعار اساتذہ کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ رسم ایران میں یقیناً رائج رہی ہے۔
شیخ فرید الدین عطار شیخ صنعان کی حکایت میں
فرماتے ہیں ؎

لازم درگاہ حق باشیم ما
در تظلم خاک می پاشیم ما
پیرہن پوشیم از کاغذ ہمہ
در رسیم آخر بشیخ خود ہمہ

(۲) قصاید رچاچ میں آتا ہے ؎

نیست از سہم سر تیغ تو جز خط و شکر
کاغذیں جامہ کسے بر سر بازار جہاں

(۳) کمال الدین اسمٰعیل ؎

کاغذیں جامہ بپوشید و ببازار آمد
زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا

(۴) بابا فغانی ؎

زخوباں داد میخواہم فغانی مہربانے کو
کہ سازد کاغذیں پیراہن از طومار افسوں ہم

مولانا طبا طبائی اس شعر کو مہمل بتاتے ہیں۔
میرے خیال میں اگر اس شعر کو بھی مہمل کہدیا جائیگا
تو پھر میرزا کے ہاں رہیگا کیا؟
نقش۔ نقش وجود۔　　شوخیِ تحریر۔ تخلیق۔
پیکرِ تصویر۔ افراد موجودات۔ یعنی کائنات
کا ہر فرد اپنے صانع کے عمل تخلیق کے خلاف شکایت
کی آواز بلند کر رہا ہے۔

منظومات

ہیر رانجھا
(نئے روپ میں)
(نظم)

از:-
خان بہادر چودھری خوشی محمد خاں صاحب ناظر
بی-اے (علیگ) ریٹائرڈ گورنر و منسٹر جموں و کشمیر

سرزمین عرب کی طرح پنجاب کی گل زمین بھی اپنی جذبات پروری اور عشاق آفرینی کے لحاظ سے مشہور ہے۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، اور سسی پنوں یہاں کے وہ زندۂ جاوید عشاق ہیں جن کے افسانۂ عشق، آج بھی ارباب دل کی عام و خاص مجلسوں میں ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو گرم کرنے میں مصروف ہیں۔ بالخصوص ہیر رانجھا جو پنجاب کے لیلیٰ مجنوں سمجھے جاتے ہیں۔ پنجابی ادبیات میں بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ جس کے لئے وارث شاہ کا حقیقت نگار اور جذبات آفریں قلم کچھ کم قابلِ ستائش نہیں ہے ؎

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق　　ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

ذیل کی نظم میں ان مشہور عشاق کا تذکرہ ایک نئے رنگ میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ جس کی دلآویزی کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے شاعرانہ انداز کی تعمیر میں وہ حقیقت صرف کی گئی ہے جس کے لئے کہا گیا ہے ؎

طرزِ جنوں نئی نکال اے مری شورشِ طلب　　دیر و حرم کو چھوڑ دے یہ رہ پائمال ہے

خان بہادر چوہدری خوشی محمد خاں صاحب قبلہ کا نام نامی محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی شاعری کی عمر ہماری عمروں سے زیادہ اور ان کی سخن سرائی ہمارے حیطۂ تعریف سے بلند ہے۔ وہ علیگڈھ کے اشعار اولیں، مخزن مرحوم کے دیرینہ مجلسیوں، اور اردو ادب کے نامور محسنوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جن کے لئے بجا طور پر کہا گیا ہے ؎

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ　　یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

آپ کی شہرۂ آفاق نظم "جوگی اور ناظر" کی مقبولیت، برسوں سے افسانۂ بزم و انجمن بنی ہوئی ہے۔
زیرِ نظر نظم، مدت کے طلسم سکوت کی شکست کا نتیجہ ہے جسے "رومان" کی نیازمندیوں کا ادبی معجزہ سمجھنا چاہئے۔
ہم خان بہادر صاحب قبلہ کے اس بزرگانہ التفات خاص کے ممنون اور آپ کی آئندہ توجہات کرم کے متوقع ہیں۔
ناظرین یہ سنکر مسرور ہونگے کہ خان بہادر قبلہ نے "بزم رومان" میں مستقل طور پر شرکت کا وعدہ فرمایا ہے ؎

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

(ادارہ)

دیکھ کر رسم و رہِ دورِ زمن ۔۔۔ عاشقوں نے اِک بنائی انجمن
صدرِ مجلس حضرتِ اقبال تھے ۔۔۔ جو غمِ اُلفت سے مالا مال تھے
سرگروہِ حلقۂ احرارِ عشق ۔۔۔ منکشف جن پر ہوئے اسرارِ عشق
عشق کا حضرت نے احیا کر دیا ۔۔۔ عشق کے کشتوں کو زندہ کر دیا
کشتگانِ خنجرِ تسلیم کی ۔۔۔ تازہ ہو جاتی ہے ہر دم زندگی
ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ اند ۔۔۔ ہفصد وہشتاد قالب دیدہ اند
ہو گئے عاشق شریکِ انجمن ۔۔۔ آ گئے سب چھوڑ کر گور و کفن
بزم میں تھے قیس بھی فرہاد بھی ۔۔۔ اور بہت سے عاشقِ ناشاد بھی
جھنگ سے آکر ہوا رانجھا شریک ۔۔۔ عشق کی دُنیا ہوئی گویا شریک
عاشقوں کا یہ علمبردار تھا ۔۔۔ عشق کی بستی کا نمبردار تھا
گرم ایک مدت سے تھا یہ خواب میں ۔۔۔ زندہ اس سے عشق تھا پنجاب میں
نکلا عاشق کا جلوس اس شان سے ۔۔۔ شہر والے رہ گئے حیران سے
ہر طرف تھی دھوم دھام اس طور کی ۔۔۔ جگمگا اُٹھی فضا لاہور کی
اُس کے سر پر پھول برسانے لگے ۔۔۔ اور گلے میں ہار پہنانے لگے
مال پر سنما میں اور گلزار میں ۔۔۔ شہر کے کوچوں میں اور بازار میں
حسن کے رمنوں کی اس نے سیر کی ۔۔۔ بتکدے کی کنشت و دیر کی
تھا یہی سیر و تماشا چند روز ۔۔۔ عاشقوں کا شور و غوغا چند روز
آخرش رانجھے کا جی اُکتا گیا ۔۔۔ شہر سے صحرا نشیں گھبرا گیا

صدرِ مجلس سے کہا اصرار سے
بندہ پرور مجھ کو رخصت کیجئے

ہنس کے فرمایا یہ سر اقبال نے ۔۔۔ صدرِ بزمِ اہلِ حال و قال نے
کس لئے رانجھا یہاں دلگیر ہے ۔۔۔ گیا خیالِ ہیر دامنگیر ہے؟
شہر میں حوریں بھی ہیں ہیریں بھی ہیں ۔۔۔ کاکلِ پیچاں کی زنجیریں بھی ہیں
صبح راوی کے کنارے جائیے ۔۔۔ عشق کے دریا میں غوطے کھائیے
شام کو جا کر ٹہلئے مال پر ۔۔۔ دل کا سودا ہو کسی کی چال پر

گر گزر ہو جانب لارنس باغ
شعلہ زن واں حسن کے ہوں سب چراغ

تم تو ٹھیرے سرسری لاہور میں
حسن کی ہے زرسری لاہور میں

جھنگ میں تیرے دھرا کچھ بھی نہیں
جھاڑ۔ جنگل کے سوا کچھ بھی نہیں

ہر طرف لاہور میں گلزار ہے
شاہدرہ ہے اور شالامار ہے

حسن کا اک میکدہ لاہور ہے
عشق کے ساغر کا ہر دم دور ہے

جا کے سینما اور تھیٹر دیکھئے
ان میں ایکٹر ماہ پیکر دیکھئے

وہ حسینوں کی ادائیں دلربا
مہ جبینوں کی نوائیں جانفزا

وہ لبوں پر ان کے شیریں زمزمے
عارض رخشاں وہ زلفیں قمقمے

حسن بھی ہے راگ بھی اور رنگ بھی
بزم میں مانی بھی ہے ارژنگ بھی

دور کر دل سے خیال ہیر کو
اس جنوں کی توڑ دے زنجیر کو

کہنہ زنجیروں سے دل آزاد کر
عشق کی دنیا نئی آباد کر

عرض کی رانجھے نے اے سلطان عشق
ہیر سے رانجھے کا ہے پیمان عشق

میں خیال ہیر کیونکر چھوڑ دوں
کس طرح پیمان ازل کا توڑ دوں

ہیر قسمت ہے مری تقدیر ہے
وہ جبین عشق کی تحریر ہے

منزل جانانہ دکھلاتا ہے عشق
راہ اور بے راہ لے جاتا ہے عشق

"رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"

مہر و مہ میں بھی وہی تنویر ہے
جس طرف دیکھوں جمال ہیر ہے

ہیر میرا دل ہے میری جان ہے
ہیر میرا دیں میرا ایمان ہے

نور شمع لایزالی ہیر ہے
مظہر شان جمالی ہیر ہے

ہیر کا جلوہ حسینوں میں نہیں
وہ چمک زہرہ جبینوں میں نہیں

تاب و رنگ حسن جعلی اور ہے
ہیر کے ہونٹوں کی لالی اور ہے

اس کو رنگ آمیزیوں سے عار ہے
ہیر فطرت کا گل گلزار ہے

گرچہ غازہ زینت رخسار ہے
آئینے کا حسن کے زنگار ہے

شاہد پیری ہے مشت استخواں
ہیر کی رگ رگ میں موج خوں رواں

اس کے رخساروں پہ رنگِ زعفران | اُس کے عارض پر ہے حسنِ ارغواں
ہیر کے گیسو وہ بل کھاتے ہوئے | دوش پر ہیں سانپ لہراتے ہوئے
اُس کی آنکھوں میں چمک ہے نور کی | اُس کے ماتھے پر تجلی طور کی
اُس کو شوقِ محفل آرائی نہیں | وہ کوئی معشوق ہرجائی نہیں
ہیر سینما کی چمک سے دور ہے | اُس کی آنکھوں میں اسی کا نور ہے
اُس کو چٹخارہ کوئی بھاتا نہیں | اِس لئے دانتوں کو گھن کھاتا نہیں
تندرستی کی وہ اِک تصویر ہے | دودھ مکھن کی وہ اِک تعمیر ہے
اُس کو آزارِ شکم ہوتا نہیں | اُس کو کچھ ٹی۔بی کا غم ہوتا نہیں
اُس کو فیشن کی نہیں لاچاریاں | اور نہ بیکاری کی ہیں بیماریاں
محو افسانوں میں وہ ہوتی نہیں | ناولوں کو پڑھ کے وہ روتی نہیں
ہیر ہے وہ خوشنما اک بن کا پھول | جس کے منہ کو چوم لے گلشن کا پھول
دیوی دریا کی وہ بن کی مورتی | سرو و شمشادِ چمن کی مورتی
وہ خرامِ ناز صحرا زار میں | جس طرح آہو پھریں تاتار میں
ہائے وہ پھولوں کا بن میں پھولنا | ہیر کا جنگل میں جھولا جھولنا
اک طرف چناب کی موجیں رواں | اک طرف ساحل پہ وہ سروِ رواں
اُس کا خوابِ ناز وہ دریا کنار | جھوم کر لہروں کا وہ گانا ملار

ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی وہ رات کی
میٹھی میٹھی بنسری برسات کی

ہائے یاد آئی وہ پیاری بنسری | ہمدم بادِ بہاری بنسری
وہ نیستاں کی کنواری بنسری | وہ بیاباں کی دُلاری بنسری
ہائے وہ میری رنگیلی بنسری | وہ میری بانکی نکیلی بنسری
وہ میری پیاری رسیلی بنسری | وہ میری میٹھی سُریلی بنسری
وجد میں اس سے ستارے رات کے | مست و بیخود چاند تارے رات کے
محو جب تانوں میں اس کی ہو گئے | گھونسلوں میں بن کے پنچھی سو گئے
چاند بھی نغموں میں اُس کے کھو گیا | چاندنی کا کھیت بن میں ہو گیا

بنسری رانجھے کا سوز و ساز ہے　کشتگانِ عشق کی آواز ہے
دلنوازِ دردِ کیشاں بنسری　چارہ سازِ سینہ ریشاں بنسری
از نیستانم چو نے ببریدہ اند　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
پھر وہ دن اے کاتب تقدیر ہو
وہ نیستاں ہو وہ نے ہو ہیر ہو

عورت

(حکمائے مغرب کے نقطۂ نظر سے)

از:- ملک محمد اسلم خاں ایم۔ اے۔ (کینٹب) بیرسٹر ایٹ لاء

عورت آفرینش کا تاج ہے (ہرڈر)

عورت بہترین اور آخری آسمانی تحفہ ہے۔ (ملٹن)

عورت! تو اے فرشتۂ زمین! تو اے دلرباترین آفریدۂ آسمانی! تو وہ تنہا پر تو ہے جو ہماری زندگی کو روشن کر سکتا ہو (لامارٹین)

عورت وہ مخلوق ہے جس میں لطیف ترین اور صمیمی ترین فضیلتوں کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ (جانسن)

عورت! تو تقدیس کے لئے پیدا کی گئی ہے (ج۔ برڈ)

عورت ایک سمندر کی طرح ہے، جو ہلکے اور مختصر فشاروں کا مقابلہ نہیں کرتا اور سنگین ترین بار اٹھا لیتا ہے۔ (نیلسن)

عورت! تو فرشتہ ہے! مگر آزاد نہیں۔ کیونکہ تو فرشتے سے بلند تر ہے۔ (اٹرج)

عورت، اسرار خلقت کا مخزن ہے۔ (کارل کاٹزکو)

عورت فرشتہ ہے، جو بچپن میں ہمارا پرستار، جوانی میں ہمارا کام بخش، اور بڑھاپے میں ہمارا تسلی دہ ہے (آرڈین)

عورت، زندگی میں میری محبوب ترین اور عزیز ترین پرستشگاہ ہے۔ (برنتیس)

عورت وہ تنہا ہستی ہے جو تنہا عشق پاک کی حقیقت کو پہچانتی ہے۔ (شیلا)

عورت وہ مخلوق ہے جو عمیق تر دیکھتی ہے۔ مرد وہ مخلوق ہے جو دور تر دیکھتا ہے دنیا مرد کے لئے دل ہے۔ اور دل کے لئے دنیا ہے۔ (گرابہ)

عورت دلربائی کا ایک راز ہے۔ جو اسرار سے پوشیدہ ہے۔ مگر اس کا در مقفل نہیں ہے (نوالین)

عورت وہ راز ہے۔ جس کا قلب اسرار سے بھرا ہوا ہے اور کوئی زبان اس کی شرح نہیں کر سکتی (سٹوری)

عورت! تو وہ ہے کہ میں اپنا سب کچھ تیرے قدموں پر نثار کر دینا چاہتا ہوں (شکسپیر)

دانتے

حالات و سوانح

اطالیہ کا زندۂ جاوید شاعر دانتے اور اُس کے حالات

(واقعہ معراج کا اثر مغربی ادبیات پر)

از :- کے۔ اے حمید بی۔ اے (لنڈن) بیرسٹر ایٹ لاء

ہمارے محترم دوست حمید صاحب کو علم ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ قانونی مصروفیتوں سے جو وقت بچتا ہے وہ ادبیاتِ عالم کے مطالعہ کی نذر ہوتا ہے۔ قابل قدر بات یہ ہے کہ وہ مطالعہ کی دلچسپیوں کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اُن سے دوسروں کی نگاہوں کو بھی مستفید ہونے کا موقعہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں متعدد مضامین اُن کے گہرے مطالعے کا نتیجہ بنکر اُردو کے مختلف رسائل میں نکلتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جسے امید ہے قرارِ واقعی دلچسپی سے پڑھا جائیگا ۔ (ادارہ)

زمانہ نے عجیب و غریب رنگ دیکھے۔ مگر ان سب پر فراموشی کی چادر ڈال دی۔ اسکندرِ اعظم، صلاح الدین ایوبی۔ نپولین، چنگیز خاں اور امیر تیمور، ایسی کئی ہستیاں دنیا کے بحرِ ناپیدا کنار میں ابھریں اور ہمیشہ کے لئے غرقاب ہو گئیں۔ وقت کے ابدی مسافر نے ان کی یادوں، یادگاروں پر چار آنسو بہائے اور خاموشی سے گذر گیا۔ اُن کی بنائی ہوئی فلک بوس عمارتیں منہدم ہو کر مٹی ہو گئیں۔ سینکڑوں تاجدار ایسے بھی ہوئے۔ کہ زمانہ اُن کے نام سے محض نابلد و ناآشنا ہے۔ لیکن اقلیمِ سخن کے شہنشاہوں کا کلام ابد الآباد تک زندہ رہیگا۔ قومیں انہیں پڑھکر سر دھنینگی۔ ملکوں کو انکی ہستیوں پر ناز ہوگا۔ اُن کا کلام روحوں کے لئے ایک کیف، اور دماغوں کے لئے مستی پیدا کریگا۔ شہنشاہ اُسے سرہانے رکھ کر سونا فخر خیال کرینگے۔ اُن کے اثرات سے تڑپ پیدا ہو گی خیالات کی رفعت، افکار کی نزاکت اور محاوروں کی بندش سے طلاطم خیز موجیں اُٹھینگی اور بحرِ بیکراں پیدا کر کے دنیا کی کثافت کو نیست و نابود کر دینگی۔ ان شاعروں کی صفِ اوّل میں دانتے کا نام آفتابِ نصف النہار کی طرح دنیا کے قیام تک درخشاں رہیگا ۔

یہ اقلیمِ سخن کا شہنشاہ پندرہ مئی ۱۲۶۵ء کو بمقام فلارنس پیدا ہوا۔ والدہ کا نام نامی "بیلا" تھا۔ والد کا سایہ کم سنی ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ ان کا خاندان تمام اٹلی میں معزز اور شریف سمجھا جاتا تھا۔ اس کے دادا انگلینڈ ا نے بادشاہ

کنارڈ سوم کے ہمراہ صلیبی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور مورث اعلیٰ نے فلارنس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اُس کی والدہ نے اس اعلےٰ طریقہ سے اس کی تربیت کی، کہ دنیا آج تک خراجِ تحسین ادا کر رہی ہے ؎

چوبیس سال کی عمر میں اس نے مشہور و معروف جنگ "کیمپلو ڈینو" میں شمولیت کی اور مردانگی کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ عوام حیران رہ گئے۔ دورانِ جنگ میں اس نے رسالہ کی صف اوّل میں ایک غیر معمولی خصوصیت حاصل کی۔ جس کی وجہ سے اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اُس کی کتاب "ویٹا نیووا" سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جنگ مذکور سے بہت قبل وہ محبت کے تیر سے گھائل ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں بیٹرس کا عشق اس وقت شروع ہوا جب وہ نام خدا آٹھ سال کی تھی۔ اور دانتے کا سن ابھی پورے نو سال کا نہ ہوا تھا ؎

"دانتے کی پہلی ملاقات" فالکو پورٹنری کے مکان پر ہوئی۔ جو بیٹرس کا باپ تھا۔ وہ ایک تقریب کے موقعہ پر اپنی والدہ کے ہمراہ دعوت میں مدعو کیا گیا تھا۔ بیٹرس کو دیکھتے ہی اس کے دل پر اتنا کاری زخم لگا۔ کہ تمام عمر نہ بھر سکا۔ عین عالمِ شباب میں ناکتخدا بیٹرس اس دارفانی سے چل بسی۔ مگر دانتے عمر بھر اس کی نوحہ خوانی کرتا رہا ؎

یہ عجیب بات ہے۔ کہ باوجود عشق و محبت اور لڑائیوں میں شمولیت کے دانتے کی علم و ادب سے دلبستگی نہ گئی۔ اس نے پاڈیوا اور بولانا کے دار العلوم سے تحصیلِ علم کی پھر علم کی تشنگی کشاں کشاں پیرس اور آکسفورڈ کے دار العلوم تک کھینچ لائی۔ اور پیرس سے اُس نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ؎

بیٹرس سے اس کا عشق دن بدن بڑھ رہا تھا۔ وہ زندگی کا بیشتر حصہ اس کی نوحہ خوانی میں بسر کرتا۔ اس کے سر میں اس کا سودا تھا۔ اُس کی آنکھ اس کی متلاشی تھی۔ وہ کہتا تھا

؎ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

۱۲۹۱ء کے آغاز میں اس کے عزیز و اقارب نے اسے مجبور کیا۔ کہ کم از کم وہ غم غلط کرنے کی نیت سے شادی کرے اس اصرار پر اس نے ایک معزز اور شریف گھرانے کی لڑکی "گیما" سے عقد کر لیا۔ جس کے بطن سے اُنکے ہاں کئی بچے پیدا ہوئے۔ لیکن گیما کے مزاج کی تیزی نے انکی زندگی کو تلخ اور بے مزہ بنا دیا۔ وہ آخیر زمیں رقمطراز ہے:-

"میری بیوی کا مزاج اس قدر تیز ہے۔ کہ میں زندگی کو ایک کڑوا پھل تصور کرتا ہوں۔ اس کی ہر بات سے نخوت ٹپکتی ہے۔ اور میری زندگی نہایت بے خانماں ہے"۔

۱۳۰۰ء کے وسط میں وہ فلارنس کے سب سے بڑے معزز عہدہ پر فائز کیا گیا۔ فلارنس ایک ریاست تھی جس کی حکومت ایک کمیٹی کے سپرد تھی۔ کمیٹی مذکور متعدد اشخاص پر مشتمل تھی۔ اور دانتے اُس کا صدر تھا۔ مگر یہی عہدہ اُس کے مصائب کا سبب بنا۔ ان دنوں میں یوں تو کئی پولیٹیکل پارٹیاں تھیں۔ مگر اُن میں قابلِ ذکر صرف دو تھیں۔ ابتدا میں تو اختلاف محض تقریروں تک محدود رہا۔ مگر آخر میں ہاتھا پائی اور گتھم گتھا تک نوبت پہنچ گئی۔ ایک فریق کے ممبر شہر کے ایک گرجا میں جمع ہوئے۔ اور غور و پرداخت کے بعد طے پایا۔ کہ مقدس پوپ کی وساطت سے "چارلس آف والا" کو بُلا کر شہر میں امن و امان قائم کرایا جائے۔ جونہی اس قرارداد

کا پتہ فریق مخالف کو چلا۔ انہوں نے جلسہ عام میں اس کیخلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اُنہوں نے برملا کہا۔ کہ فریق اول نے اُس معاملہ میں جس کا تعلق محض ریاست اور شہر سے تھا۔ حضور پوپ کی مداخلت حاصل کرنے میں گستاخی کی ہے۔ در اصل فریق اول کا ارادہ فریق دوم کے خلاف بغاوت پھیلا کر اُنہیں شہر بدر کرانے کا تھا۔ فریق دوم نے ہتھیار اٹھانے اور حکومت کی کمیٹی سے فریق اول کی جلا وطنی کا مطالبہ کیا۔ دیگر رفقاء کے صلاح و مشورہ کے بعد دانتے نے دونوں فریقین کے سرغنوں کی جلا وطنی کا حکم صادر کر دیا مگر بعد کو غالب فریق سے مرعوب ہو کر دانتے نے اُن کی پارٹی کی جلا وطنی کا حکم یک قلم منسوخ کر دیا۔ پھر کیا تھا لوگوں نے دانتے کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور پوپ سے فریاد کی۔ جس نے "چارلس آف وا ہلا" کو مامور کیا۔ کہ وہ فلارنس پہنچکر تمام امور کو اپنے ہاتھ میں لے اور کمزوروں کی فریاد رسی کرے۔ جب چارلس فلارنس پہنچا۔ تو دانتے ملکی امور کے سلسلے میں روم گیا ہوا تھا۔ چارلس نے سرسری تحقیقات کے بعد دانتے کے تمام احکام منسوخ کر دیئے۔ اس پر طرفداری کا الزام عاید کیا گیا۔ اس کی تمام جائداد ضبط کی گئی۔ اور اس کی جلا وطنی کا حکم صادر کیا گیا۔ دانتے کو جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ فلارنس واپس آئے۔ اس لیے وہ سیدھا "سینا" پہنچا۔ جہاں تفصیل کے ساتھ اسے جلا وطنی کی شرائط کا پتہ چلا۔ یہاں اُس نے بہت اقتدار و رسوخ حاصل کر لیا۔ اور حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ وہ فلارنس پر حملہ کرے۔ ۱۳۰۴ء میں ایک جرار لشکر کے ساتھ اس نے فلارنس پر فوج کشی کی مگر ہزیمت اٹھانی پڑی

اس ناکامی کا اس کی طبیعت پر اس قدر گہرا اثر ہوا۔ کہ وہ سینا چھوڑ کر بہت دیر تک بے خانماں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اس دوران میں اُسے کئی ملکوں کا سفر درپیش آیا۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب اُس کی ملاقات ایک عرب سے ہوئی۔ جس نے پیغمبر اسلام کے معراج کے حالات اُس کے گوش گزار کئے۔ چلبلی طبیعت ان حالات کو سُنکر پھڑک اُٹھی۔ اور وہ ایک زمانہ تک اُس پر سوچ بچار کرتا رہا۔ آخر کار معراج کا قصہ اس کی مشہور و معروف کتاب "ڈیوائن ویِن" لکھنے کا محرک ہوا جس کیوجہ سے اُسے حیات ابدی نصیب ہوئی ۱۳۲۰ء تک وہ بغیر کسی مقصد کے یورپ نورد ی کرتا رہا۔ اس زمانے کی سرگذشت اس کی اپنی زبان سے سُننا خالی از لطف نہ ہوگا ؎

وہ لکھتا ہے۔ "کاش مجھے قادرِ مطلق نے پیدا نہ کیا ہوتا۔ میری جلا وطنی کی داستان اہلِ بصیرت کیلئے درسِ عبرت ہے۔ فلارنس ظالم نے مجھے جلا وطن کر کے ستم ڈھایا ہے۔ میری غربت انتہائی مدارج تک پہنچ چکی ہے۔ میں اُس کشتی کی مانند ہُوں۔ جسکے بادبان نہ ہوں۔ اور جسے ہوا کے تھپیڑے اِدھر اُدھر لئے پھرتے ہوں۔ میں اس شرابی کی مانند ہوں جو اپنے دردسر کا علاج شراب پینے سے کرتا ہے۔ میں اسباب کا قائل ہوں

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے"

فلارنس واپس جانے کی تڑپ اُسے ہر وقت بیقرار رکھتی۔ اُس نے کئی عرضیاں حکومت کے ارباب بست و

کشادکی خدمت میں بھیجیں۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ آخر اُس کی
دعائیں بر آئیں۔ اور اُسے اِس شرط پر وطن واپس آنے
کی اجازت دی گئی۔ کہ وہ حکومت کے خزانہ میں ایک
بہت بھاری رقم بطور جرمانہ داخل کرے۔ اور اپنے جرم کا
اقرار جلسۂ عام میں ملک و ملت سے غیر مشروط معافی کا طلبگار
ہو۔ مگر سقراط کی طرح اُس نے ان بے عزتی کی شرائط کو
قبول کرنے سے جلاوطنی کی زندگی کو ترجیح دی ⁂

راوینا کی حکومت نے جہاں وہ مقیم تھا۔ اس کو ایک خاص
مشن دیکر بطور سفیر وینس بھیجا۔ مگر وہ بادشاہ وقت کی خدمت
میں شرف باریابی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اس مایوسی
اور ناکامی کا اُس کی طبیعت پر اس قدر اثر ہوا۔ کہ ماہ ستمبر ۱۳۲۱ء
کو چھپن سال کی عمر میں اِس دُنیا سے کوچ کر گیا۔ گانید و بادشاہ
رومانیہ نے اُس کی قبر پر ایک نہایت شاندار مقبرہ تعمیر کرانا
شروع کیا۔ مگر وہ اس کی تکمیل نہ کر سکا۔ ۱۳۹۴ء میں کارڈینل
نے اس مقبرہ کی تکمیل کرا دی۔ اور ایک عالیشان مینار اس
کی یاد میں قائم کیا۔ پچاس سال کے بعد اہل فلارنس کو اُسکی
قدر و منزلت کا پتہ چلا۔ اور اُنہوں نے رومانیا سے درخواست
کی۔ کہ وہ دانتے کی لاش کو فلارنس لانے کی اجازت
دے دے۔ مگر اُس نے اس درخواست کو مسترد کر دیا ⁂

۱۷۸۰ء میں کارڈینل کا زنگو نے ایک نہایت عمدہ
میموریل اُس کی یاد میں قائم کیا ⁂

دانتے کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ دو بڑے
لڑکوں کو ذہانت باپ سے ترکہ میں ملی تھی۔ اُنہوں نے باپ
کی کتاب ڈیوائن کامیڈی کا تصویری مرقع بنایا۔ جو بہت ہی
مقبول ہوا۔ اور آج یورپ کے بہترین مرقعوں میں شمار ہوتا
ہے۔ سب سے چھوٹا لڑکا ایک کامیاب بیرسٹر تھا جو ویرونا
میں پریکٹس کرتا تھا۔ دانتے نے اپنی لڑکی کا نام اپنی معشوقہ
کے نام پر بیٹریس رکھا تھا۔ اور اُسے اُس سے گہری دلچسپی
تھی۔ بیٹریس باپ کی وفات کے بعد سنٹ سٹیفنو کی کانونٹ
میں بطور نن شامل ہو گئی۔ اور اپنی تمام عمر باپ کی قبر
کے پاس گذار دی۔ ۱۳۵۰ء میں فلارنس کی حکومت نے بیٹریس
کو اُس کے باپ کی کتاب "ڈیوائن وین" کے صلے میں دس
پونڈ اور خلعت پیش کئے۔ جسے اُس نے بخوشی قبول کیا۔
اُس زمانے میں دس پونڈ اور خلعت انتہائی اعزاز سمجھا جاتا
تھا ⁂

بعید از انصاف ہوگا۔ اگر ہم دانتے کی بیوی کے
متعلق چند سطور سپرد قلم نہ کریں۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ
تیز طبیعت کی عورت تھی۔ مگر ذہانت، قابلیت اور شجاعت
خاص طور پر قدرت نے اُسے ودیعت کی تھیں۔ دانتے کی
جلاوطنی کے بعد اُس نے نہایت فراست سے کام لیا۔ اُس
نے حکومت سے درخواست کی۔ کہ ضبط شدہ جائیداد کا
ایک حصہ دانتے اُسے بطور جہیز دے چکا ہے۔ اس لئے
وہ قابل ضبطی نہیں۔ اس عورت نے حکومت کی کمیٹی کے
روبرو ایسی مدلل تقریر کی۔ کہ حکومت اس حصہ کو واگذار
کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس جائیداد کی قلیل آمدنی سے اُس نے
اس معقولیت سے بچوں کی تربیت کی۔ کہ زمانہ اس کی تعریف
میں رطب اللسان ہے ⁂

دانتے ایک نہایت معقول اور سنجیدہ انسان تھا۔
اُس کا قد میانہ تھا۔ وہ آہو چشم تھا۔ اس کے کالے گھنگریالے
بال نہایت خوشنما تھے۔ بہت زیادہ مطالعہ سے اُس کی

بینائی میں فرق آگیا تھا۔ وہ کھانے میں نہایت اعتدال سے کام لیتا۔ اس کے اخلاقِ حمیدہ ضرب المثل تھے۔ اور فنِ مصوری میں اُسے ملکہ خداداد حاصل تھا ؎

اس نے دو کتابیں "دی منارکیا" اور "ڈوگری اولیک" لاطینی زبان میں لکھی ہیں۔ اول الذکر میں اس نے پوپ کے اختیارات پر بحث کی ہے۔ اس کا خیال ہے۔ کہ پوپ کو دنیوی اختیارات دینا غلطی ہے۔ وہ اسے صرف مذہبی راہنما خیال کرتا ہے۔ اور اس کا دُنیوی امور میں مداخلت کرنا گناہِ عظیم سمجھتا ہے۔ مؤخر الذکر میں اس نے فنِ مصوری اور ادبی کے سفر پر بحث و تمحیص کی ہے ؎

"ویتانیوا" اس نے اس وقت لکھی تھی۔ جب اُس کا سن اٹھائیس سال کا تھا۔ اس میں وہ بیٹریس کے حسن و عشق کا قصہ نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ بیٹریس کے باپ کی وفات کا قصہ خاص طور پر رقت انگیز ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

میں عام لوگوں سے بیٹریس کے عشق کا افسانہ چھپاتا۔ مگر عشق کب تک پردۂ راز میں رہ سکتا تھا۔ مجھے اس کے متعلق غلطی تھی۔ کیونکہ ؎

زمانہ بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتا اور ایک اور خاتون سے اپنے عشق کو منسوب کرتا تھا جس وقت بیٹریس کی وفات کا پتہ چلا۔ میں اُس وقت اُس کی شان میں قصیدہ مدحیہ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں یہ وحشت ناک خبر سنکر بیہوش ہو گیا۔ میں کوچوں سڑکوں اور جنگلوں میں موت کی تلاش میں پھرا مگر موت مجھ سے کوسوں بھاگتی تھی"

اس کی کتاب ضیافت ایک اعلےٰ پایہ کی کتاب تصور ہوتی ہے۔ اس میں اس نے عشق اور نیکی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے چودہ باب ہیں۔ اور لاطینی زبان میں لکھی گئی ہے۔ وہ اس کے متعلق رقمطراز ہے :-

"مجھے اس بات کا احساس ہے۔ کہ میرے ہم وطن بھائی مجھ پر آوازے کسیں گے۔ کہ میں نے یہ کتاب لاطینی میں کیوں لکھی ہے۔ حالانکہ مجھے یہ اطالوی میں لکھنی چاہیئے تھی۔ میں اس امر کو چھپانا نہیں چاہتا۔ کہ اطالوی ابھی بچپن کے عالم میں ہے۔ اور میری نازک خیالیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ یورپ کی دیگر اقوام مثلاً جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور رُوسی بھی میرے خیالات سے بہرہ اندوز ہوں۔ لاطینی یورپ کی عالمانہ زبان ہے اور اس کے مقابلے میں اطالوی سمجھنے والے بہت کم ہیں"۔

اسی کتاب میں وہ فلسفہ کے متعلق لکھتا ہے :-

"بیٹریس کے بعد میری دوسری معشوقہ زمانہ کی دختر نیک اختر ہے۔ جسے فیثا غورث کے متبع فلسفہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ میری آنکھوں کی روح ہے۔ اس کے ذکر سے میرا دل ٹھنڈا ہوتا ہے اور میرے دل کو ایک خاص مسرت ہوتی ہے"۔

اس کی رزمیہ نظمیں بہت دقیق ہیں۔ اور ان کو بغیر شرح کے سمجھنا آسان کام نہیں۔ ہر شعر سے نازک خیالی اور اخلاقی سبق مترشح ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ بیٹرس محض ایک خیالی کیرکٹر ہے۔ مگر آج تحقیق اور جستجو سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ وہ فلارنس کی رہنے والی فالکو پورٹیری کی لڑکی تھی۔ جو چوبیس سال کی عمر میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئی۔

دانتے کی معرکتہ الآرا کتاب "ڈیوائن ورین" ہے۔ جس پر جدید یورپ کو خاص طور پر ناز ہے۔ یورپ بارہا اس امر کا اعادہ کر چکا ہے۔ کہ "اس نوعیت کی کتاب صرف ایک مغربی ہی سپردِ قلم کر سکتا تھا" ہم اس بات کے قائل ہیں۔ کہ چاند پر تھوکنے سے اُس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ ڈیوائن ورین کا خیال یقیناً معراج سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ دانتے نے تفصیل کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اور اپنی بلند پروازی اور خیال کی رفعت سے اسے ایک اعجوبہ بنا دیا ہے۔ ہمیں دانتے سے خاص عقیدت ہے۔ ہم اسے شعر کا شہنشاہ خیال کرتے ہیں۔ اور ڈیوائن ورین کو زمانہ کا شاہکار سمجھتے ہیں۔ لیکن یورپ کے اس شعری کارنامے کی تذلیل کرنے سے ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے۔ کہ "صرف ایک مغربی ایسی کتاب پیدا کر سکتا تھا" کا قصہ "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" کا مصداق ہے۔

ڈیوائن ورین میں عالمِ بالا کے حالات درج ہیں۔ جزا و سزا پر بحث ہے۔ روحوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اور مختلف ممالک کے حالات اس دلچسپی سے درج ہیں کہ محتاجِ بیان نہیں۔

۱۳۵۰ء میں گیوانی وسکونٹی ارچ بشپ میلان نے اٹلی کے چھ عالموں کی ایک کمیٹی اس غرض و غایت سے بنائی کہ وہ کتاب مذکور کی شرح لکھے۔ اس شرح کا مسودہ نہایت احتیاط کے ساتھ فلارنس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۱۳۷۳ء میں اٹلی کے محکمۂ دینیات میں ایک عہدہ قائم کیا گیا جس کی تنخواہ سو پونڈ ماہوار تھی۔ اور جس کا کام صرف یہ تھا۔ کہ وہ ڈیوائن ورین کے متعلق عوام کو درس دے۔ آج کتاب مذکور کی متعدد شرحیں مختلف زبانوں میں ملتی ہیں۔ ایشیا یورپ۔ افریقہ۔ امریکہ اور آسٹریلیا کی مختلف زبانوں میں اصل کتاب ترجمہ ہو چکی ہے۔ اور دنیا کی چند معرکتہ الآرا کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

کتاب کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ کہ دانتے ایک رات لق و دق صحرا کی بادیہ پیمائی کر رہا ہے۔ سامنے ایک پہاڑ نظر آتا ہے جس پر وہ چڑھنا چاہتا ہے۔ مگر خونخوار درندے اس کے عزم میں مانع ہوتے ہیں۔ اس تگ و دو میں اس کی ملاقات ورجل سے ہوئی۔ جس نے اسے دوزخ کے نظارے اور اعراف دکھلانے کا وعدہ کیا۔ بشرطیکہ وہ اُسے اپنا رہنما مان لے۔ دانتے کو سخت تشویش تھی۔ کہ وہ سفر کی تکالیف برداشت کر سکے گا۔ یا نہیں۔ مگر جب ورجل نے اس کی دلجوئی کی۔ تو وہ اُن کے پیچھے ہو لیا۔ ورجل اور دانتے دوزخ کے دروازہ پر پہنچے۔ باوجود اس خوفناک تنبیہ کے جو دروازہ پر کندہ تھی۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ ورجل نے اُسے بتلایا۔ کہ یہاں اُن لوگوں کو سزائیں مل رہی ہیں۔ جنہوں نے زندگی سستی اور کاہلی سے گذاری تھے۔ وہاں سے وہ دریائے اکران پر پہنچے۔ جہاں بڈھا ملاح کران روحوں کو

ایک کشتی میں دریا کی دوسری طرف پہنچا رہا تھا۔ روحوں کا عذاب دیکھ کر دانتے بیہوش ہو گیا۔ بجلی کی کڑک سے دانتے کو ہوش آیا۔ تو وہ اپنے راہنما کے ساتھ "لیمبنو" میں جو دوزخ کا پہلا طبقہ ہے پہنچے۔ یہاں وہ لوگ سزائیں بھگت رہے تھے۔ جو خداوند مسیح پر ایمان نہ لائے تھے۔ پھر وہ دوسرے طبقہ میں پہنچے۔ جہاں انہوں نے فلارنس کے ظالم جج مانوس کو دیکھا۔ تند ہوا کے تھپیڑے دوزخیوں کو ادھر سے اُدھر پھینک رہے تھے۔ یہ دردناک عذاب دیکھ کر دانتے پر غشی طاری ہو گئی۔ جب دانتے کو ہوش آیا۔ تو انہوں نے اپنے آپ کو طبقہ سوم میں پایا۔ جہاں لالچی اور طامع لوگ جمع تھے۔ اُن پر برف شدت سے پڑ رہی تھی۔ اُن کے اوپر گندہ اور غلیظ پانی بہ رہا تھا۔ ایک دوزخی کا یکو نامی نے انہیں بتلایا۔ کہ فلارنس والوں کو اُن کی نااتفاقی کی وجہ سے عنقریب سخت سزا ملنے والی ہے۔ دانتے نے وزجل سے ایک معمہ کا حل دریافت کیا جس کو رہنما نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔

چوتھے طبقہ میں انہوں نے پلوٹس کو دیکھا۔ جہاں فضول خرچ اور حریص اپنے کیفر کردار کے نتائج بھگت رہے تھے پانچویں طبقہ میں مغلوب الغضب لوگوں کو ننگین جھیل میں غوطے دیئے جا رہے تھے۔ جھیل کے قریب ایک مینار تھا۔ دونوں وہاں پہنچے۔ مینار سے ایک جھنڈی لہرائی گئی۔ اور ملاح فلگیاس انہیں جہاز کے ذریعہ سے جھیل کی دوسری طرف لے گیا۔ فلپ ارجنٹی نہایت تکلیف دہ عذاب میں مبتلا تھا۔ پھر وہ شہر ڈِلیس میں پہنچے جس کے دروازے بند تھے۔ اور دیو پہرہ دے رہے تھے۔ اُن کو شہر میں داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ نہایت دِقّت کے بعد وہ شہر میں داخل ہوئے جہاں آگ کے فلک برس شعلے دردناک منظر پیدا کر رہے تھے۔ اِس طور پر انہوں نے دوزخ اور اعراف کے تمام طبقوں کی سیر کی۔

پھر بیٹرس انہیں بہشت میں لے گئی۔ اور وہاں کے عجیب منظر دکھائے۔ دانتے کی اس معرکتہ الآرا کتاب نے تمام دنیا میں ادبی دلچسپی کا ہنگامہ پیدا کر دیا ہے۔ اور اسکی بنا بر اِت اقلیم سخن کا شہنشاہ مانا گیا ہے۔ اندھیری رات میں جب علم کے مسافر بھٹک کر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تو اُسکا کلام چودھویں رات کے چاند کا کام دیتا ہے۔ آج وہ دنیا میں زندہ نہیں۔ مگر اس کا یہ شعری کارنامہ ابدالآباد تک زندہ رہیگا۔

حکیم گفت کسے را کہ بخت والا نیست | بہیچ روئے زمانہ مرا او را جویا نیست
بروم جا ور دریا نشیں مگر روزے | بدستت اُفتد دُرے کجاش ہمتا نیست
خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست | چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست
شدم بدریا، غوطہ زدم، ندیدم دُر | گناہ بخت من است ایں گناہ دریا نیست

(فردوسی)

کلامِ حشرؔ

حضرت آغا حشرؔ کاشمیری!

آغا صاحب کا لاہور میں مستقل قیام "رومان" کیلئے جن ادبی نازشوں کی فراہمی کا باعث ہو سکتا ہے، ذیل کی غزل اسکی روشن مثال ہے، جو ہمارے اصرار پر فی البدیہہ کہی گئی ہے (ادارہ)

تم کیا، ہر ایک مجھ سے بیزار ہے جہاں میں
عنوانِ بیکسی ہوں، دنیا کی داستاں میں

روشن ہے تیرے جلووں سے عالمِ تصوّر
چھٹکے ہوئے ہیں تارے، خاموش آسماں میں

ہے زلفِ خم بخم کے حلقے میں روئے روشن
یا چاند سو رہا ہے آغوشِ کہکشاں میں

مجھ کو بدل دے یا رب، یا دل بدل دے اس کا
یا یہ بتا دے کیونکر زندہ رہوں جہاں میں

سجدے نہیں یہ ہمدم جھک جھک کے پڑھ رہا ہوں
لکھی ہے میری قسمت اس سنگِ آستاں میں

کافر! تری زباں ہے قدرت کا شعرِ رنگیں
ورنہ کہاں سے آیا جادو ترے بیاں میں

اے حشرؔ ہو مبارک، ہے آج وصل کی شب
اک چاند ہے بغل میں، اک چاند آسماں میں

تجربات

از:- عاشق بٹالوی بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔

(۱) کسی شخص کی قوتِ عمل کا امتحان منظور ہو۔ تو دیکھو کہ وہ بے مہریِ ایام اور تلخیٔ دوران کا شاکی تو نہیں جنہیں اپنے پر اعتماد ہوتا ہے وہ زمانہ کی بے اعتنائیوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔

(۲) اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے قناعت ضروری ہے حصولِ قناعت کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ اپنی زندگی کو سادہ بناؤ، ضروریات گھٹا دو اور خواہشات کم کرو۔

(۳) اُمید پر زندگی گذارنا اچھا ہے لیکن رشتۂ اُمید کو طُول نہ دو کہ اُس کے ٹوٹ جانے پر تُم یاس و حرماں کا شکار ہو جاؤ۔

(۴) دنیا سے اُمیدیں کم لگاؤ تا کہ تمہیں مایُوسی بھی کم ہو۔

(۵) مال و دولت اچھی چیز ہے۔ لیکن اُس کے حاصل کرنے میں خود داری و غیرتِ نفس کو ہاتھ سے نہ دے بیٹھو۔ تُمہارے گرد و پیش کتنے مالدار لوگ موجود ہیں جن کی دولت و ثروت کے باوجود تم ان کو اپنے سے کمتر خیال کرتے ہو۔ اگر روپیہ ہی پیدا کرنا ہے تو معزز و محبوب خلائق بنکر پیدا کرو۔

(۶) کسی شخص کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے سے پہلے اچھی طرح معلوم کر لو۔ کہ وہ والدین سے کیسا سلوک کرتا ہے والدین سے زیادہ ہمدرد اور حقیقی محسن دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا، اور جو شخص والدین کے عظیم الشان احسانات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ ایک دوست کا حقِ دوستی کب ادا کرے گا۔

(۷) دولت اور علم شاذ و نادر ہی اکٹھے ہوتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جو مالِ دنیا اور دولتِ علم سے مالامال ہے۔

(۸) محبت ایک کیفیت ہے جس کا تعلق قلب سے ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا اظہار بھی کیا جائے، بلکہ اپنے انتہائی مدارج میں تو وہ شرمندۂ تکلم ہونا گوارا بھی نہیں کرتی۔ جو شخص بار بار اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ سمجھ لو کہ بوالہوس ہے۔

(۹) ہمارے آئے دن کے فسادات اور باہمی رنجشیں محض اس اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہیں کہ ہم میں نکتہ چینی و عیب جوئی کا مادہ حد سے زیادہ ترقی کر گیا ہے اگر ہم میں سے ہر فرد یہ یقین کر لے قولاً نہیں فعلاً، کہ وہ فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے، اور انسان نام ہے۔ اُس ہستی کا جو لغزشوں، کمزوریوں اور خامیوں کی مرکب ہے۔ تو آج ہی کُل مصائب کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ذرا اپنی روزمرہ زندگی کا جائزہ تو لو، دیکھو گے کہ تم بھی گنہگار ہو تم سے بھی خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ اور جب خود تمہاری یہ کیفیت ہے۔ تو تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ خدائی فوجدار بن کر اپنے ہی ایک بھائی کی غلطیوں کو ڈنکے کی چوٹ پیٹ کر اس بیچارے کی زندگی وبالِ جان بنا دو۔

(۱۰) کوئی بھی وقتِ فرصت گذارنے کا ایک کھیل ہے۔ جو شخص عمداً یا سہواً اسلئے آگے بڑھکر اُسے لازمۂ حیات قرار دے لے وہ حقیقتاً فریبِ نفس میں مبتلا ہے جس کا نتیجہ افسوس و تاسف اور شاید ہلاکت بھی ہو۔

عاشق

سفرِ زندگی (نظم)

از میاں تصدق حسین خالد ایم۔ اے
بیرسٹرایٹ لاء (لندن)

جہانِ این و آں کے اُسطرف پہنائے امکاں میں
خلاؤں کی خموشی میں شعاعِ زندگی چمکی
متاعِ درد و غم تڑپی

درختوں کی جواں رعنائیوں کے حُسنِ لرزاں میں
تصوّر کے مقابل اِک حیات آرا تماشا تھا
چمن افروز پھولوں کا

میں کیا تھا کون تھا کیوں رو دیا یُوں بزمِ خنداں میں
شکایت ہے مجھے اِس ذہن کی آشفتہ کاری کی!
مٹی ہے یاد تک اس کی

اندھیری رات میں طُغیانی امواجِ خیزاں میں!
سُنا ہے گیت طوفانی ہواؤں کے تلاطم کا
ترنّم رُوحِ قلزم کا

ازل کے بازوؤں پر اِس کا پیہم رو لتے جانا
ابد کے گوشۂ خلوت میں آخر نیند کا آنا

افسانہ

حیاتِ تازہ

از :- عاشق بٹالوی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

"تم بار بار کہتے ہو کہ خارجی دنیا میرے لئے ختم ہو چکی ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"اس کا مطلب ؟ نہایت صاف، واضح اور بین"

"یعنی ؟"

"یعنی یہ کہ خارجی زندگی کے مظاہر اپنے اندر میرے لئے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ سالہا سال کی تیز و تند کشمکش حیات نے میرے دل و دماغ کو وہ کیفیت بخش دی ہے کہ بیرونی دنیا کا مدوجزر اس پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا اور میں جو کسی زمانے میں زندگی کے ہر نشیب و فراز سے لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا۔ اب ایک ایسے نفس مطمئنہ کا مالک ہوں کہ زمین کی بنیادوں کو ہلا دینے والے زلزلے بھی اس میں رخنہ نہیں ڈال سکتے"

"سکونِ یاس اسی کیفیت کا نام ہے"

"تم اسے سکونِ یاس کہتے ہو؟ حالانکہ امید و رجا کے ولولہ انگیز جوش و مسرت کا احساس ہی مجھے آج ہوا ہے"

"تو کیا تم اشیاء کی خارجی حقیقت سے انکار کرتے ہو؟"

"میں اشیاء کی خارجی حقیقت سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں۔ لیکن ان کی عظمت و اہمیت کا معیار سراسر مختلف ہے۔ تم خارجی دنیا اور اس کے مختلف مظاہر کو رنج و اندوہ اور عیش و مسرت کا سبب سمجھ کر اپنے آپ کو ان مظاہر کا غلام اور اپنے نفس کو ان کا تابع کر لیتے ہو۔ حالانکہ میرے نزدیک زندگی کی اولین شعاع نفس سے پھوٹتی ہے اور خارجی دنیا اسی شعاع سے حرارت حیات حاصل کرتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہماری زندگی کی طاقت و قوت کا مرکز وہ اشیاء ہیں جنہیں ہم مس کر سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں، چکھ سکتے ہیں، یا سن سکتے ہیں۔ حالانکہ میں حواس کی طاقتوں کو اس عظیم الشان طاقت کا جو نفس انسانی کو میسر ہے۔ ایک ادنیٰ کرشمہ سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ زندگی کی رو اندر سے باہر کی طرف جاتی ہے۔ باہر سے اندر کی طرف نہیں آتی۔ خارجی زندگی باطنی

زندگی کا عکس ہے اور ہماری خارجی زندگی کے مظاہر محض اضافی قیمت رکھتے ہیں۔

شہید اپنے دبلے پتلے جسم اور ذہین و شگفتہ چہرے کے ساتھ میرے سامنے آرام کرسی پر بیٹھا اپنے مخصوص انداز میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے دبا دبا کر اور اپنی سرگیں آنکھوں کو جنہوں نے اُس کے چہرے کے دیگر نقوش کے ساتھ مل کر سحر آسا جاذبیت پیدا کر دی تھی، میری آنکھوں میں گاڑ گاڑ کر اپنے دل فریب طرزِ تکلم میں گفتگو کر رہا تھا۔ اُس کا پورا نام امجد حسین شہید تھا اور میرے اُس کے دوستانہ مراسم اُس وقت سے قائم تھے جب ہم حصولِ تعلیم کے لئے نئے نئے لاہور وارد ہوئے تھے۔ اور کالج کے دار الاقامہ میں اقامت اختیار کی تھی اتفاق سے میں اور وہ ایک ہی روز کالج میں داخل ہوئے اور داخلہ کے رجسٹر میں بھی اُس کا نام معاً میرے بعد درج کیا گیا۔ میں وسطی اور وہ مشرقی پنجاب کا باشندہ تھا۔ وہ کسی مالدار آدمی کا بیٹا نہ تھا۔ اگرچہ اُس کے والد مرفہ الحال طبقے کے بزرگ ضرور تھے اور خود شہید ایسے عادات و اطوار کا انسان تھا کہ اُس کی طرزِ زندگی سے ہر شخص یہی اندازہ لگانے پر مجبور ہوتا کہ وہ کسی بہت بڑے رئیس کا لڑکا ہے۔ اُس کی خودداری جو بعض اوقات تکبر کی حد تک پہنچ جاتی تھی اُس کے مزاج کا ایک ایسا نمایاں پہلو تھا کہ اُس سے مختصر سی شناسائی رکھنے والے لوگ بھی اُس کے اس رنگِ طبیعت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اکثر ہنس کر کہا کرتا تھا کہ میں ایک گدائے متکبر ہوں جو خدا کے سامنے بھی سوال کی نیت سے جانا گوارا نہیں کرتا۔ کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ اُس نے دوستوں کے حقوق ادا کرنے میں بخل یا تساہل سے کام لیا ہو لیکن بسا اوقات ایسا ہوا کہ اُس کے مفاد دوسروں کی بے اعتنائی اور بے توجہی سے تلف ہو گئے۔ مگر اُس کی زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا۔ کالج میں کئی طلبا ایسے تھے جنہوں نے اپنے اخراجات بہت وسیع کر رکھے تھے۔ اور اُنہیں ہر ماہ گھر سے کافی رقم منگانا پڑتی تھی۔ شہید کے ذرائع بہت محدود تھے۔ مگر وہ اس خوش اسلوبی سے خرچ کرنے کا عادی تھا کہ بظاہر لوگوں کو یہی معلوم ہوتا کہ وہ حد درجہ امیرانہ زندگی بسر رہا ہے۔ وہ سربلند و گردن کشاں رہنے کا خوگر تھا اور میں نے اُس زمانے میں اکثر لوگوں کو کہتے سُنا کہ شہید رعونت کا مجسمہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس کی سرد مہری، رعونت نما خودداری اور بے نیاز و مستغنی طبیعت ایک ظاہری لباس تھا جس کے اندر وہ رقیق و گداز قلب، متبسم و شگفتہ دماغ اور محبوب و محبت پاش روح چھپائے ہوئے تھا۔ وہ دوست نواز ہی نہیں بلکہ دوست پرست انسان تھا۔ دوستوں کے خطوط کو حرزِ جان بنانے کا عادی نہ تھا لیکن اُنہیں کھولنے سے پہلے چوم ضرور لیا کرتا تھا۔ اُس کے نام کے ساتھ تخلص ابتدا سے موجود تھا لیکن شعر کم ہی کہتا تھا۔ کالج کے چہار سالہ زمانۂ تعلیم میں

میں اُس نے بمشکل آٹھ دس مرتبہ نظم لکھی ہوگی۔ اُس کا ذوقِ ادب نہایت پاکیزہ اور مذاقِ شعر بہت بلند تھا۔ اصنافِ سخن میں وہ صرف تغزل کا شیدا تھا اور اُس کا خیال تھا کہ جس حُسن و خوبی سے ہم اپنے جذباتِ محبت کو غزل میں ظاہر کرسکتے ہیں۔ شعر کی کسی دیگر صنف میں ممکن نہیں۔ اور عشق ہی چونکہ کائنات کی روحِ رواں اور جذباتِ انسانی میں سب سے قوی، سب سے عمیق اور سب سے رنگیں جذبہ ہے اس لئے وہی شاعری کا صحیح و موزوں موضوع بننے کے قابل ہے۔ شہید کی ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ اُسے جس قدر نفرت مرگِ انبوہ میں شریک ہونے سے تھی شاید ہی کسی انسان کو ہوگی۔ اُس کا دائرہ عمل بہت محدود تھا۔ کالج اور دارالاقامہ کے حدود سے باہر جو وسیع ہنگامہ مرگ و زیست برپا تھا اُس سے کسی طالب علم کو دلچسپی نہ تھی۔ ہماری دوستیاں، دشمنیاں، ہماری عداوتیں اور رقابتیں، ہماری حریفانہ چشمکیں اور دوستانہ مروتیں غرضیکہ ہمارا مرنا جینا کالج اور ہوسٹل کی دیواروں کے اندر ہی اندر تھا۔ لیکن اس مختصر اور محدود زندگی میں بھی شہید نے اپنے لئے ایک الگ روش اختیار کر رکھی تھی جسے عامیانہ و سوقیانہ مذاق سے اتنا ہی بعد تھا جتنا اس کی زبان کو غلیظ و غیر مہذب الفاظ سے۔ لباس ہو یا طرزِ کلام، کمرے کی آرائش کا سوال ہو یا اندازِ نشست و برخاست وہ عام رَو میں بہ جانے کو ہمیشہ اخلاقی کمزوری سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ تعجب و تاسف سے ان لوگوں کو دیکھتا تھا جو کانِ نمک میں جاکر خود بھی نمک بن جاتے ہیں اُس کا خیال تھا کہ ہر شخص علیحدہ علیحدہ انفرادیت کا مالک ہے اور نئے تجربات کے ساتھ ساتھ اُس انفرادیت کی تربیت و تکمیل ہر شخص کا مقدس فرض ہے دوسرے کی شخصیت میں اپنی شخصیت کو مدغم کر دینا دوسرے کی آواز میں اپنی آواز کو گم کر دینا یا دوسرے تقلید میں اپنی راہ کو ترک کر دینا عشق کی دنیا میں جائز ہو تو ہو لیکن روزمرہ زندگی میں اُسے یہ طرزِ عمل کسی صورت گوارا نہ تھا۔ وہ دوستوں سے ہمیشہ اردو میں خط و کتابت کرتا تھا۔ اگرچہ انگریزی تحریر و تقریر میں اُسے قابلِ رشک ملکہ حاصل تھا۔ اردو میں گفتگو کرتے وقت اُس کی زبان سے انگریزی کا لفظ نکلنا ناممکن تھا اور انگریزی میں ہم کلام ہوتے وقت عام ہندوستانیوں کی طرح اردو اور انگریزی کی ملی جلی کھچڑی پکانا وہ لغویت خیال کرتا تھا۔ اُس کے کمرے کے در و دیوار تصاویر کی زیب و زینت سے معرّا تھے اور اس محرومیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ کمروں کو تصاویر سے آراستہ کرنے کا شوق دارالاقامہ میں جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا اور اکثر طلبہ سگرٹ کی ڈبیوں سے تصویریں نکال نکال کر دیواروں پر آویزاں کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ اُس کا معمول تھا کہ شام کو پانچ سات میل پیدل سیر جاتا اور باہر جاتے وقت ہمیشہ لکڑی ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اُس کی سُرخ ترکی ٹوپی اور لکڑی اُس

کی شخصیت کے ایسے ضروری اور ناقابل انفکاک لوازم بن گئے تھے کہ میں نے بعض لوگوں کو کہتے سنا کہ شہید کو تصور میں لانا اور اتھا لیکہ اُس کے سر پہ سُرخ ٹوپی اور ہاتھ میں تکڑی نہ ہونا ممکن ہے۔ بال بنا کر ننگے سر کسی شارع عام پر نکلنے سے اُسے سخت نفرت تھی اور وہ اُن طلبہ کو تکلیف دہ حیرت سے دیکھتا تھا جو گھنٹوں کی عرق ریزی کے بعد بالوں کو حد درجہ اعتنا سے آراستہ کر کے بازاروں اور کوچوں میں ننگے سر مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ اُس کا قول تھا کہ ہندوستان میں جہاں چاقو رکھنے پر بھی سرکاری لائسنس عاید ہے آزاد ممالک کی مردانہ صفات کا پیدا ہونا محال ہے۔ لیکن یہ کیا قیامت ہے کہ ہم روغن و عطر سے بالوں کو معطر کر کے اور انہیں خاص دلاویز انداز میں سنوار کر اک شانِ نسائیت پیدا کر کے نمائشِ حُسن کرتے پھریں۔ ایک روز میں اور وہ انارکلی بازار میں سے گزر رہے تھے کہ ہم نے چند نوجوانوں کو ایک فوٹوگرافر کی دُکان پر جمع دیکھا۔ ہم بھی ٹھہر گئے۔ فوٹوگرافر نے دُکان کے باہر چند چوکھٹوں میں چھوٹی چھوٹی تصویریں درجنوں کی تعداد میں چسپاں کر رکھی تھیں۔ ہم نے اِن تصویروں میں اپنے بہت سے ہم سبق و ہم مکتب دوستوں کو بھی پہچانا۔ بات یہ تھی کہ فوٹوگرافر نے اشتہار دے رکھا تھا کہ وہ صرف آٹھ آنے میں چار مختلف انداز کی تصویریں اُتار دیتا ہے اور اس اشتہاری دعوت کو لبیک... کہنے کے لئے صبح سے شام تک بیسیوں طلبا وہاں موجود رہتے تھے۔ جب ہم وہاں سے کچھ دُور نکل آئے تو شہید نے زہرخند ہو کر کہا: "میں حیران ہوں اِن لوگوں کو کب عقل آئیگی۔ فرسٹ ائیر کے طلبہ کا تو خیر کیا ذکر ہے۔ اُن بچاروں کے لئے لاہور بجائے خود ایک میلہ ہے اور وہ اس میلے کی ہر چیز سے لُطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن تم نے دیکھا اس چوکھٹے میں ظہیر اور ہرنش کی تصویریں بھی موجود تھیں۔ یہ دونوں ایم۔ اے کے طالب علم اور کالج میگزین کے ایڈیٹر ہیں۔ اگر یونیورسٹی کی بہترین تعلیم پانے اور تہذیب و شائستگی سے متمتع ہونے کے باوجود یہ لوگ آٹھ آٹھ آنے میں چار تصویریں اُترواتے اور انارکلی ایسے بازار میں دُکانوں کے تختوں پر چسپاں کراتے پھریں تو نوعمر لڑکوں کا خدا ہی حافظ ہے"۔ راہ چلتے وقت بازو میں بازو ڈالنے یا کاندھے پہ ہاتھ رکھنے کو وہ سخت قبیح فعل تصور کرتا تھا۔ لیکن ان تمام صفات کے باوجود جن کی یکجائی ایک انسان کے اخلاق کو قابلِ رشک بلندی پر پہنچا دینے کی ضامن ہے شہید کے مزاج میں چند خامیاں بھی تھیں۔ اگرچہ اُن خامیوں کا تلخ اثر صرف اُس کی ذات تک محدود تھا۔ وہ ذکی الحس اور زود رنج شخص تھا۔ وہ دنیا سے ویسے ہی حسنِ سلوک کی توقع رکھتا تھا جیسا سلوک وہ خود لوگوں سے کرتا تھا وہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیتا تھا اور نہ لوگوں کے عیب و ثواب پر نکتہ چینی کرنے کا عادی تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ لوگ بھی اُس کے ذاتی امور میں خلل انداز نہ ہوں اور نہ اُس کی ذات کو بے سود معرضِ بحث ہی میں لائیں۔ لوگوں کے خانگی حالات یا اُن کے ماضی کو بلا وجہ کرید کرید کر معدوم کرتے پھرنا اُس کے نزدیک

کمینگی کی مکروہ ترین صورت تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اگر زید بکر کو دوست بنانا چاہتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ بکر کو صرف اُسکی موجودہ حالت میں، خواہ وہ حالت قابلِ تعریف ہے یا لائقِ مذمت، قبول کرے۔ بکر کا ماضی، اُس کے خاندانی حالات، اُس کے والد کی حیثیت، یہ سب چیزیں شرفِ دوستی بخشتے وقت غیر ضروری اور ناقابلِ التفات بن جاتی ہیں۔ وہ اپنے پہلو میں ایک محبت کرنے والا، جذباتِ عشق سے معمور اور زندگی کی رنگینیوں سے مسحور دل رکھتا تھا۔ وہ دوستوں کا دوست بلکہ جاں نثار دوست تھا لیکن اپنی ذات کے متعلق کوئی نازیبا لفظ، کوئی اتہام، یا کوئی غیر مناسب فقرہ سننا اُس کی تابِ برداشت سے باہر تھا۔ ایسی اشتعال انگیز حالت میں وہ الزامی جواب دینے یا دوسرے کا گریبان گیر ہونے کے بجائے خاموشی سے خون کا گھونٹ پی کر چُپ ہو رہتا۔ اُسے بحث سے نفرت تھی۔ جب بھی وہ دیکھتا کہ گفتگو بحث کا رنگ اختیار کر رہی ہے وہ فوراً موضوعِ سخن بدل دیتا۔ وہ کہتا تھا کہ "میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو عمداً نقصان نہیں پہنچایا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مجھے بھی کسی سے رنج پہنچے"۔ اپنے منتخب حلقۂ احباب میں اُس کا برجستہ مذاق، اُس کے ترشے ترشائے فقرے، اس کی ادبی چاشنی سے لبریز ظرافت، اُس کی رندانہ نوک جھونک اور سب سے بڑھ کر اُس کے بلند بانگ و فلک شگاف قہقہے اپنی نظیر آپ تھے۔ اُس کے تمام دوست معترف تھے

کہ شہید کی عدم موجودگی سے صحبتِ احباب بہت بے کیف ہونے کے باعث جلد ہی منتشر ہو جاتی ہے وہ بالعموم سچ بولنے کا عادی تھا۔ لیکن دوسروں کی دروغ گوئی سے، جب تک کہ وہ براہِ راست اُس کے مفاد پر اثر انداز نہ ہو، اُسے چنداں رنج نہ پہنچتا تھا۔ وہ قولاً و فعلاً اپنے آپ کو لوگوں کی عزت کرنے کا پابند خیال کرتا تھا۔ اور دوسروں سے بھی ویسے ہی احترام آمیز سلوک کی توقع رکھتا تھا۔ متعدد تقریبوں میں میں نے اُسے اُن اشخاص کے ساتھ انتہائی ادب و احترام سے پیش آتے دیکھا ہے جن سے خلوت میں اُس کی بے تکلفی حدِ بیزاری کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ منظرِ عام میں کسی ایسی حرکت کا مرتکب ہونا جس سے چھچھورا پن یا بازاریت مترشح ہو ہرگز گوارا نہ کرتا تھا۔ ایک روز تمام دن بارش ہوتی رہی اور شام کو مطلع صاف ہوا تو ہم سیر کو نکلے۔ سڑکوں پر سخت کیچڑ ہو رہی تھی اور ہم بچ بچ کر چل رہے تھے، میں نے ازراہِ تمسخر کہا کہ "شہید بڑا مزا ہو اگر میں تمہیں دھکا دے کر اس کیچڑ میں گرا دوں"۔ اس کا چہرہ فوراً زرد پڑ گیا اور سخت انتشار کے عالم میں کہنے لگا: "خدارا کچھ عقل سے کام لو۔ اس گزرگاہِ عام میں سینکڑوں انسانوں کے اندر ایسی حرکت کا ارتکاب؟ توبہ توبہ، مجھے اس خیال ہی سے پسینہ آ گیا ہے"۔ بہت سی باتیں جنہیں اوسط درجہ کی ذہنیت کے آدمی محسوس بھی نہیں کرتے شہید کے لئے بہت اہم تھیں، اس کی وجہ اُس کی ذکاوتِ حس اور اُس کا غیر معمولی جذبۂ

خودداری تھا۔ ایک روز ہم کالج کے ریسٹوران میں چائے
پینے گئے۔ وہاں چند طلبہ اور بھی بیٹھے تھے۔ اُن میں
سے بعض نے شہید کے سلام کا جواب نہ دیا تھا شاید
اس لئے کہ وہ اکل و شرب میں مصروف تھے یا یہ کہ
وہ اس طرف متوجہ ہی نہ تھے۔ اس واقعہ کے بعد
شہید نے کبھی اُن سے علیک سلیک میں پیش قدمی
نہیں کی۔ ایک دفعہ وہ اپنے والد کے حکم کی تعمیل
میں لاہور کے ایک مشہور رئیس سے جس کے ساتھ
اُس کے والد کے دیرینہ مراسم تھے ملنے گیا۔ اُس
نے اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو اندر سے جواب آیا کہ
پوچھو کوئی خاص کام ہے یا آپ یونہی ملنا چاہتے ہیں
اس جواب کے بعد وہ ایک لمحہ وہاں نہ ٹھہر سکا اور
فوراً لوٹ آیا۔ آتے ہی اُس نے والد کو خط لکھ دیا کہ
آیندہ وہ اُس شخص کے ہاں جانے سے قطعی معذور
ہے۔

یہ تھا مختصر سا خاکہ شہید کی اُفتادِ طبیعت کا۔
اُس کی رنگین مزاجی کی داستان بھی اُس کی زندگی
کا ایک دلچسپ باب ہے لیکن میں اُس سے
بوجوہ چند قطع نظر کرتا ہوں۔ اُسے لاہور کی زندگی سے
اس قدر اُنس ہو گیا تھا کہ موسم گرما کی سہ ماہی تعطیلات
بھی یہیں پڑا پڑا گزار دیتا تھا۔ جون جولائی کے
مہینوں میں لاہور کی آتش ریز و شرر بار گرمی سے
بچنے کے لئے صاحبِ استطاعت لوگ پہاڑوں
پر چلے جاتے تھے لیکن یہ شخص لاہور کے ایک مغربی
گوشے میں بیٹھا خزاں رسیدہ لاہور کو دیکھ دیکھ کر
عشرتِ خیال کی گہرائیوں میں غرق ہو ہو جاتا تھا۔
اُسے لاہور میں صرف ایک تکلیف کا سامنا تھا۔ وہ
کہتا تھا کہ یہاں رہ کر مملکتِ دل کو غنیم کے حملوں سے
بچائے رکھنا ایک ایسا کام ہے کہ شاید ہی اولادِ
آدم کا کوئی فرد اس میں کامیاب ہو سکے اور پھر غنیم
بھی ایک ہو تو مضائقہ نہیں۔ قدم قدم پر تیروں کی
بارش اور جگہ جگہ خنجروں کے وار۔ تیر بھی وہ جس کے
متعلق غالب کہہ گیا ہے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

بہرحال شہید جب تک اس ماحول میں رہا اُس نے
بھی ہر دعوتِ ہلاکت کو لبیک کہنے اور دل و جگر کو
خون کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی
اور جب وہ یہاں سے نکلا ہے تو خون کا آخری قطرہ
اس سرزمین کی نذر کر چکا تھا۔ میرا کالج میں آخری
سال تھا جب گرمی کی رخصتوں کے بعد میں اکتوبر کے
اوائل میں لاہور آیا اور شہید کو حسبِ معمول پہلے سے
موجود پایا۔ وہ عادت اور ضرورت سے زیادہ بشاش
نظر آتا تھا۔ اس دوران میں اُس نے یہاں مزنگ کے
ایک خاندان سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی، اور اب شام
کے چند فارغ گھنٹے سیر کے بجائے وہ اُن لوگوں میں
بسر کرتا تھا۔ اُس کی وہی سُرخ ترکی ٹوپی اور لکڑی موجود
تھی، جسم پر وہی کبھی سوٹ اور کبھی شیروانی، وہی جامہ
زیبی، وہی خم سے نامانوس گردن، اور وہی طلاقتِ لسانی۔
غرضکہ شہید اپنی خصوصیات کے لحاظ سے وہی انسان

تھا جس سے میں چند ماہ قبل جدا ہو کر گھر گیا تھا۔ البتہ اب اُس میں شعریت اور خود فراموشی قدرے زیادہ پیدا ہوگئی تھی۔ جب تک کوئی ایسی ہی بات نہ ہو جائے وہ شام کو مزنگ جانے میں ناغہ نہ کرتا تھا۔ شام کا وقت ہی دوستوں سے میل ملاقات کا بہترین موقع تھا اور یہی وقت وہ ہم سے علیحدہ بسر کرنے لگ گیا تھا۔ اس لئے مجلسِ احباب اُس کی شرکت سے یکسر محروم ہوگئی اور ہم سب نے اُس کی عدم موجودگی کو شدت سے محسوس کیا۔ ایک روز میں بھی اُس کے ہمراہ مزنگ چلا گیا۔ اور یوں اُس کے نئے دوستوں سے تعارف کا فخر حاصل کیا۔ مزنگ کے اس حصہ میں جہاں مغربی اور مشرقی طرزِ تعمیر کے مخلوط نمونے نظر آتے ہیں ایک عالیشان مکان اور پائیں باغ تھا۔ ہمارے داخل ہوتے ہی جس گرمجوشی سے ہماری پذیرائی کی گئی۔ اُس سے میں نے شہید کی عظمت اور اُس کے وقار کا اندازہ لگا لیا۔ اور محسوس کیا کہ شہید کی شخصیت کا جادو کالج کے کمروں سے نکل کر محلوں کے رہنے والوں پر بھی چل گیا ہے۔ چند منٹ کے بعد ہم صاحبِ خانہ کے سامنے موجود تھے اور مجھے شہید نے اپنے "عزیز ترین دوست" کی حیثیت سے اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ میں نے وہاں شہید کو کافی بے تکلف پایا۔ وہ نہایت آزادی سے باتیں کرتا تھا اور اُس کے سقف شگاف قہقہے جو ہر اجنبی مقام پر دبی ہوئی ہنسی پر تبدیل ہو جانے پر مجبور ہوتے تھے یہاں فضا کو پوری طاقت سے متاثر کر رہے تھے۔ صاحبِ خانہ کا سن پچاس کے لگ بھگ ہوگا مگر وہ اپنی عمر کے مقابلہ میں بہت جوان نظر آتے تھے۔ فربہ جسم اور سُرخ رنگت کے انسان تھے۔ طرزِ بود و ماند، مکان کی آرائش، خدام کی کثرت، اور دیگر طور طریقوں سے تمول کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ لیکن چند مجبوریوں کے باعث قبل از وقت ہی ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس وطن تشریف لے آئے ہیں۔ اور اب نہایت آسائش اور بے فکری سے اپنے بچوں میں بسر اوقات کر رہے ہیں۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شہید کیونکر اُس خاندان سے متعارف ہوا۔ اور وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے اس قلیل عرصہ میں اُسے ان لوگوں سے بے تکلف کر دیا تھا۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات جو میں نے اُس شام دیکھی اُس نے اس تمام کارروائی کو اور زیادہ پُراسرار بنا دیا۔ صاحبِ خانہ ہمیں گول کمرے میں بٹھا کر خود کسی غرض سے باہر چلے گئے اُن کے جاتے ہی برابر والے کمرے کا پردہ اُٹھا اور ایک بیس اکیس سال کی حسین جمیل لڑکی بیش قیمت لیکن جذبات میں ہیجان بپا کرنے والا لباس پہنے پردے سے باہر آئی اور بمشکل چند لمحے ہمارے سامنے ٹھہر کر مسکراتی ہوئی فوراً غائب ہو گئی۔ شہید نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے بلند آواز میں یہ شعر پڑھا ؎

کس کے جلوے کو دیکھتا ہوں میں
مجھ کو میری نظر نہ ہو جائے

دس ایک منٹ کے بعد صاحبِ خانہ بھی تشریف لے آئے اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں شہید سے شعر سنانے کی فرمائش ہوئی اور اُس نے اپنی ایک پرانی غزل ترنم سے پڑھ کر سنائی۔ اس سارے ٹھاٹھ باٹھ، اس امیرانہ شان و شوکت اور اس پُر تکلف ساز و سامان کے باوجود مجھے صاحبِ خانہ کی شخصیت سے کوئی رغبت پیدا نہ ہوتی تھی۔ اُن کی آنکھوں سے ایک ایسی کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ جس سے عالی خیال اور بلند فطرت لوگوں کی آنکھیں عموماً معرا ہوتی ہیں چھچھورا پن نہ سہی لیکن عامیانہ پن کی بُو اُن کی باتوں سے ضرور آتی تھی۔ وہ بار بار اپنی زندگی کے دورِ رفتہ کی طرف اشارہ کر کرکے اپنے سرکاری عہدہ کی عظمت، ہم عصروں میں اپنے وقار اور رعایا پر اپنے رعب داب کا ذکر کرتے ہوئے دبی زبان میں اپنی رنگینیوں کا نقشہ بھی سنا جاتے تھے۔ میں حیران تھا کہ شہید سا مردم شناس اور ذوقِ سلیم رکھنے والا انسان کیوں کر ان باتوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ وہ نہایت بشاشت سے سب کچھ سُن رہا ہے اور کبھی کبھی زیبِ داستان کے طور پر اپنی طرف سے بھی کچھ بڑھا دیتا ہے۔ شام کا دھندلکا جب رات کی تاریکی میں تبدیل ہونے لگا تو میں نے چاہا کہ اب اجازت لیں۔ شہید بھی یہ دیکھ کر کہ میں واپس چلنے پر مصر ہوں اپنی جگہ سے اُٹھا اور ہم نے صاحبِ خانہ سے مُخلِ خراشی کی معذرت چاہی۔ واپسی پر ہم مختلف موضوعوں پر گفتگو کرتے آئے۔

صرف جب ہم مال سے گزر کر ڈاک خانے کے قریب پہنچے تو اُس نے خود ہی کہا۔

"میں نے شاید تمہیں صاحبِ خانہ کا نام نہیں بتایا؟"

میں نے جواب دیا "نہیں"۔

"آپ کا نام احتشام الحق ہے"۔

میں نے بے پروائی کا اظہار کیا۔ گویا مجھے اس کے نام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ شہید میرے اطوار دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اب میرے لئے بات کرنے کا موقع تھا۔ میں نے کہا۔

"وہ لڑکی کون تھی جسے دیکھ کر تم نے شعر پڑھا تھا؟"

شہید نے اضطرابِ مجسم کی شکل اختیار کر کے کہنا شروع کیا "وہ لڑکی؟ ہمارے میزبان کی صاحبزادی تھی۔ بس یہی ایک چیز ہے جس کی کشش ہر شام مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے۔ خدا کی قسم زندگی بالکل بے کیف گزر رہی تھی۔ قدرت نے خود ہی میری رہبری کی اور مجھے یہاں لے آئی۔ عجب دل فریب جگہ اور دل فریب لوگ ہیں۔ میں نہیں جانتا اس عیشِ ناتمام کا انجام کیا ہوگا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جان و دل اُس کی نذر ہو چکے ہیں"۔

شہید کا معمول جاری رہا اور اس کی ہر شام کو بدستور آفتاب طلوع ہوتا رہا۔ میں نے اُس کے معاملات میں غیر ضروری دخل دینا پسند نہ کیا اور یوں بھی یہ معیوب سی بات تھی کہ میں خواہ مخواہ تفحص و تجسس

کی غرض سے اُس کے پیچھے لگا رہتا۔ لیکن اس عرصے
میں اُس کے نئے دوستوں کے متعلق عجیب عجیب
باتیں میرے کانوں تک پہنچیں۔ میں نے سُنا کہ شہید
کے ممدوح احتشام الحق صاحب کی بیوی عادات اور
چال چلن کے لحاظ سے نہایت پست درجہ کی عورت ہے
اور اُسی کے ہاتھوں ایک مرتبہ صورتِ حالات اس قدر
نازک ہو گئی تھی کہ احتشام صاحب کو وقتِ معیّنہ سے
قبل ہی ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ پھر یہ بھی میں
نے سُنا کہ ایسی ماں کے زیرِ تربیت رہنے والی لڑکیاں
ماں سے بھی چند قدم آگے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ احتشام
صاحب کی دو صاحبزادیاں ہیں اور دونوں کی شہرت
رُسوائی کی حد تک پہنچ چکی ہے اور اُن کا تذکرہ لاہور کے
خوش مزاج نوجوانوں کی صحبتوں کا محبوب موضوع رہتا
ہے۔ میں حیران تھا کہ شہید کیونکر ایسے بدنام گھرانے سے
اپنے آپ کو وابستہ کر کے اپنی ذات کو انگشت نمائی کا مرکز اور
اپنی شخصیت کو لوگوں کے شکوک و شبہات کا شکار
بنانا گوارا کر رہا ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ احتشام الحق
کو اپنے متعلقین کی ہر بات کا علم تھا لیکن
وہ ایک بے حمیت آدمی کی طرح جس نے اپنا زمانہ
تعیش دوسروں کے ہاں تباہ کیا ہو درانحالیکہ خود
اُس کے گھر میں آگ لگ رہی ہو اب بحالتِ شیب
ب رسوائیاں اور تمام ذلتیں انتہائی بے حسی سے
برداشت کرنے پر مجبور رہتے۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ بی اے کے امتحان
میں کامیابی حاصل کی۔ میرا ارادہ نہ ملازمت کا تھا اور
نہ آئندہ تعلیم جاری رکھنے کا۔ میرے عمزاد بھائی دہلی
میں بہت وسیع پیمانے پر چمڑے کی تجارت کرتے تھے
اور گھر والوں کی یہی مرضی تھی کہ میں اُن کے کاروبار میں
شریک ہو جاؤں، چنانچہ امتحان سے فارغ ہوتے
ہی میں دہلی چلا گیا۔ شہید کے متعلق میں نے سُنا کہ وہ
لا کالج میں داخل ہو گیا ہے اور ہوسٹل کے بجائے اس
نے مزنگ میں اقامت اختیار کی ہے۔ شہید شاذ و نادر
ہی خط کا جواب دیا کرتا تھا۔ لیکن دیگر ذرائع سے مجھے
معلوم ہوا کہ اُس نے احتشام الحق کے مکان کے عین
قرب میں اپنے رہنے کا بندوبست کیا ہے اور فراغت
کا سارا وقت تقریباً اُنہی کے ہاں بسر کرتا ہے۔ ان
خبروں سے مجھے تشویش سی پیدا ہوئی کہ شہید کا اس
طرح ہاتھ دھو کر اور عوام کی رازجو نگاہوں سے بے
پرواہ ہو کر ایک بات کے پیچھے پڑ جانا اُس کی شہرت کو
نقصان پہنچانے کے علاوہ اُس کے مستقبل کو بھی
متاثر کئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ تین ماہ کے بعد میں
نے سُن لیا کہ شہید نے احتشام الحق کی لڑکی سے شادی
کر لی ہے۔ مجھے اس اطلاع سے نہ خوشی ہوئی اور نہ
افسوس۔ حیرت ضرور ہوئی۔ میں نے شہید کو خط لکھا
لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ چند اور دوستوں کے خطوط
سے مجھے معلوم ہوا کہ شہید احتشام الحق ہی کے
مکان پر چلا گیا ہے۔ بعد میں میں نے یہ بھی سُنا کہ
شہید کے والد نے اس شادی پر سخت غیظ و غضب
کا اظہار کیا ہے اور غم و غصّہ کی حالت میں شہید سے
تمام تعلقات منقطع کر لئے ہیں۔ یہاں تک کہ اب اُنہوں

نے اُس کے تعلیمی مصارف ادا کرنے سے بھی انکار کر
دیا ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ لاہور جا کر اپنی آنکھوں
سے سب کچھ دیکھوں۔ لیکن مجھے خود اپنی جنگ
درپیش تھی۔ اور کاروبار کی بے لذت مصروفیتوں
سے فرصت قطعی ناپید تھی۔ کبھی کبھی کسی دوست کا
خط آجاتا یا کبھی کبھار لاہور کا کوئی واقف مل جاتا۔ تو
اُڑتی اُڑتی خبریں موصول ہو جاتی تھیں۔ بعد کی حیرت
انگیز اطلاعات سے مجھے معلوم ہوا کہ شہید اب اداس
و دل گرفتہ سا نظر آتا ہے۔ پریشان اور کھویا کھویا
سا پھرتا ہے۔ کالج بہت بے قاعدگی سے جاتا ہے
مکان پر بہت کم وقت گزارتا ہے۔ اکثر باہر گھومتا
رہتا یا لائبریری میں بے دلی سے کتابوں کی
اوراق گردانی میں مصروف رہتا ہے۔ شادی کے
چار مہینے بعد یکایک میں نے سُنا کہ شہید نے اپنی
بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ ساتھ ہی لاہور سے
ایک دوست کا خط موصول ہوا جس میں تفصیلی حالات
درج تھے۔ لکھا تھا کہ شہید کی بیوی شادی سے پہلے
بھی چال چلن کے لحاظ سے سخت بدنام تھی۔ لوگ
متعجب تھے کہ شہید ایسے انسان نے واقعات و کوائف
سے آنکھیں بند کر کے کیونکر اُس سے عقد کر لیا۔ شادی
کے معاً بعد شہید کو اس تلخ حقیقت کا احساس ہو گیا
کہ اُس نے ایک عصمت باختہ عورت سے نکاح کیا
ہے جو اُس کی بیوی بننے سے قبل ہی متاعِ عفت و
عصمت لُٹا چکی تھی اور اب اپنی بد اعمالیوں کے خوفناک
نتائج اُس کے سر تھوپنے کے لئے اُس کے ہاں آ
گئی تھی۔ عرصہ تک شہید ایک خطرناک کشمکش میں مبتلا
رہا۔ اُسے کیا کرنا چاہئے؟ کیا وہ ایسی عورت کو بدستور
اپنی بیوی بنائے رکھے اور دُنیا کے روبرو بے حمیتی
و بے غیرتی کا مکروہ نمونہ پیش کرتا رہے؟ فطرت تو
بڑی بے رحم ہے وہ کسی انسان کی رعایت کرنا نہیں
جانتی۔ چند دنوں میں جب گناہ کا انتقام ایک جیتی
جاگتی ہستی میں نمودار ہوا تو وہ دُنیا کو کیا منہ دکھائے
گا؟ وہ جو ہمیشہ گردن بلند رکھنے اور سینہ اُبھار کر چلنے
کا عادی تھا اب ہم چشموں میں کیونکر آنکھیں اُٹھا
سکے گا؟ آخر اُس نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہئے
تھا یعنی اُس نے اپنی بیوی کو علیحدہ کر دیا" اس خط
میں ضمنی طور پر شہید کے مصائب کا بھی ذکر تھا۔ وہ
لوگ جو ہمیشہ اُس سے خدا واسطے کا بُغض رکھتے تھے
اب کھلم کھلا اُس پر برس پڑے تھے۔ روپیہ پیسہ اُس
کے پاس بالکل ختم ہو چکا تھا اور تنگدستی کا انتہائی عالم
طاری تھا۔ لوگوں کے طعنہ ہائے دل خراش اُس کے
سریع الاحساس قلب و دماغ کو چھلنی کرنے کے لئے
الگ موجود تھے۔ اور دوسری طرف اُس کے والد نے
دستِ اعانت کھینچ کر اُسے اس جنگ میں بالکل یکہ
و تنہا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ پڑھا تو میرے
جگر میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔ شہید ایک دیرینہ مخلص
اور محسن دوست تھا۔ میں اُس کے جذبات و احساسات
کی نزاکت سے خوب واقف تھا۔ اس لئے میں نے
سینکڑوں میل کے فاصلہ پر بیٹھے بیٹھے اچھی طرح محسوس
کر لیا کہ اُس کی موجودہ تکلیف اُس کے لئے کس درجہ

قاتل و تباہ کن ثابت ہو رہی ہوگی۔ اب میں نے لاہور پہنچنے میں مزید تعویق نہ کی بلکہ اسی روز شام کی گاڑی سے روانہ ہو کر علی الصبح لاہور پہنچ گیا۔ مزنگ جانا میں نے بے سود خیال کیا کیونکہ احتشام کے مکان پر شہید کا ملنا ناممکنات سے تھا۔ اُس کے جدید قیام گاہ کا پتہ معلوم کرنا بھی آسان نہ تھا کیونکہ فرداً فرداً میں تمام احباب سے دریافت کر چکا تھا اور کوئی نہ بتا سکا کہ شہید آج کل کہاں رہتا ہے۔ کسی نے گوال منڈی کا پتہ دیا۔ کسی نے کہا وہ راوی روڈ پر چلا گیا ہے۔ غرضیکہ شام تک میں نے لاہور کے بے شمار گلی کوچے اور محلے چھان مارے۔ لیکن شہید بے پتہ ہی رہا۔ مجھے شک ہوا کہیں وہ لاہور سے چلا نہ گیا ہو۔ لیکن اس بارے میں لوگوں نے میرا اطمینان کر دیا کہ وہ باہر کہیں نہیں گیا۔ کیونکہ اکثر یہیں بائیسکل پر گھومتا نظر آتا ہے۔

ہمارا ایک دوست شفیق بھی تھا جس نے ہمارے ساتھ ہی بی۔ اے کیا تھا اور وہ بھی اب لاء کالج میں داخل تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے شہید کی نقل و حرکت کا صحیح علم ہوگا۔ چنانچہ دوسرے روز میں اُس سے کالج میں جا کر ملا اور اُس نے رازدارانہ طریق سے بتایا کہ شہید میاں میر چھاؤنی میں رہتا ہے۔ وہاں اُس کے ایک ہم وطن دوست شیخ عبدالکریم ٹھیکیدار ہیں اور انہیں کے مکان پر اُس کا قیام ہے۔ شہید کا میاں میر چلے جانا اس بات کا زبردست ثبوت تھا کہ لاہور میں اُس کی پذیرائی کے لئے تمام دروازے بند ہو چکے تھے اور یہاں رہ کر عزت مندانہ زندگی بسر کرنے کی تمام راہیں اُس پر مسدود ہو چکی تھیں۔ سہ پہر کے قریب میں چھاؤنی پہنچا اور بڑی دقت سے شیخ عبدالکریم کا مکان تلاش کیا۔ شہید سے ملاقات ہوئی میری خلاف توقع آمد پر وہ حیران سا ہو گیا۔ اُس کا چہرا اُترا ہوا تھا اور جسم بھی پہلے کی بہ نسبت لاغر نظر آتا تھا۔ میں نے ہنسی مذاق کی باتوں سے گفتگو شروع کی لیکن مجھے فوراً محسوس ہوا کہ شہید کے دریائے تکلم کی شہرہ آفاق روانی ختم ہو چکی تھی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا تھا اور بات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُس کے ذہن سے نکلتی تھی۔ بایں ہمہ وہ یہ ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی مسرور و شادکام ہے۔ ہائے اُس کا غرور! وہ شدت مصائب میں بھی اپنے قلب و جگر کی جراحتوں کو دوسروں پر آشکار کرنا نہ چاہتا تھا اور نہ ہی حالات نامساعد کی یورش میں سرنگوں ہونا اُسے گوارا تھا۔ میں نے کہا:۔

"شہید! میں نے تمہارے متعلق بہت سی رنجیدہ باتیں سُنی ہیں۔ ہمارے درمیان جو تعلق خاطر قائم ہے وہ مجھے کشاں کشاں دہلی سے کھینچ لایا ہے بے سود رازداری سے کام نہ لو اور خدارا بتاؤ کہ اصل حقیقت کیا ہے؟"

اُس نے کہا "جو کچھ تم نے سُنا ہے صحیح ہے اور آیندہ بھی جو کچھ سنو گے دُرست ہوگا۔ میرا نام جس کی عزت و حرمت میرا ایمان اور جس کا ادب و احترام میرا مذہب تھا آج ادنیٰ، کم ظرف اور گندہ ذہن لوگوں

کی زبانوں پر چڑھ کر اپنا وقار کھو بیٹھا ہے۔ میرے خلاف اس وسعت و سرعت سے اتہام تراشی کی گئی ہے کہ وہ لوگ بھی جو مجھ سے براہِ راست واقف نہیں ہیں میرا نام لے لے کر تمسخر و استہزا کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ آج لاہور کی تعلیم یافتہ آبادی کے ایک حصہ میں میرا ذکر اس رنگ میں کیا جاتا ہے گویا میں اور ذلت ایک ہی روز پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم جدید کس دن ہمارے اخلاق سنوارنے کے قابل ہوئی تھی کہ آج میں تعلیم یافتہ طبقے سے کسی بہتر طرز عمل کی توقع رکھتا؟ بہت سے لوگ جو رنج و مسرت اور اندوہ طرب میں تمیز کئے بغیر ہر واقعہ کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھ کر اپنی حس تماشا کو تسکین بخش کر محض خوش ہونا جانتے ہیں مجھے دیکھ دیکھ کر اشارے کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ایسے ہیں جو مدت سے میرے خلاف بغض للّٰہی کا شکار ہوئے بیٹھے تھے، جنہیں میری خود مختار، قائم بالذات اور خود دار شخصیت ایک لمحہ کے لئے بھی پسند نہ تھی۔ نہیں معلوم ہے خوشامد اور سخن سازی میری عادات میں داخل نہیں یہ لوگ جو خود ستائی اور خوشامد کے خوگر اور دوسروں پر اپنا تفوق قائم رکھنے کے عادی ہیں۔ ایسی ہستی کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو ان کے اندر رہ کر اپنے شانوں کو سیدھا اور اپنی گردن کو بلند رکھ سکے۔ تم تو میری گذشتہ زندگی کے شریک و سہیم رہ چکے ہو اور جانتے ہو کہ میں دوستوں کا خادم ہونے کے باوجود کیونکر دنیا کے سامنے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک گدائے متکبر ظاہر کرتا رہا ہوں۔ میرا یہ رویہ لوگوں کے لئے ناقابلِ فہم ہونے کے ساتھ ہی ناقابل برداشت بھی تھا۔ چنانچہ جھوٹ یا سچ مجھے بدنام کرنے کا جو بھی پہلا موقع ہاتھ آیا لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کی۔ بے شک میں نے ایک غلطی کی لیکن دنیا میں کون ہے جو غلطیوں سے پاک ہو اور کیا غلطی کا احساس اور اس کی اصلاح بھی کوئی ناقابلِ عفو جرم ہے؟ کیا میرا صرف اتنا ہی قصور نہیں کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ٹھوکر کھائی اور پھر فوراً قدم پیچھے ہٹا لیا؟ ہزاروں نوجوان اس قسم کی لغزشوں کا شکار ہو چکے ہیں لیکن جس طرح مجھ پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اس کی مثال میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اوّل تو ہمارے ہاں سوسائٹی سرے سے مفقود ہے لیکن آبادی کے جس بہیمانہ عنصر اور تماشائیوں کے جس غیر تربیت یافتہ گروہ کو تم سوسائٹی کہتے ہو اس کے خلاف بھی تو میں نے کوئی جرم نہیں کیا کہ یوں تحت الثریٰ کی خبیث روحیں مجھ پر پنجے جھاڑ کر پل پڑتیں۔ میری نادانی اور ناتجربہ کاری کے نتائج کا تعلق صرف میری ذات سے ہے اور میں انہیں طوعاً و کرہاً برداشت کروں گا لیکن عوام کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بے وجہ اور بے مصرف میری ذات کو ہدفِ طعن بنا رہے ہیں۔ میں نے احتشام کی لڑکی سے شادی کر کے اپنے والد کو ناراض کر لیا اور اس ناراضی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ یہ میری شدید غلطی تھی۔ لیکن شادی کے بعد جس خوفناک حقیقت کا انکشاف مجھ پر ہوا اس کے بعد خاموش رہنا اس سے بھی شدید غلطی تھی۔ وہ لوگ جو

آج ہر ناکردنی فعل اور ہر ناگفتنی بات مجھ سے منسوب
کر کر کے اپنے نزدیک گویا بہت بڑی معاشرتی خدمت
انجام دے رہے ہیں کیا اُس وقت خاموش رہتے،
جب شادی کے پانچ ماہ بعد میں ایک نامعلوم الولد
بچے کا باپ بن جاتا؟ یقین مانو اُس وقت یہی لوگ
آگے بڑھتے اور مجھ پر زندگی وبال کر دیتے۔ ان خون
کے پیاسے بھیڑیوں کو آشتی سے مطمئن کرنا ممکن نہیں
جب تک اپنے جسم کا سارا خون اُن کی نذر نہ کر دو گے
اُن کی چیخ پکار جاری رہے گی۔ احتشام تو سخت کمینہ
اور بے غیرت انسان ہے۔ وہی بات جو ایک غیرت
مند باپ کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کے لئے کافی
تھی احتشام کے لئے وجۂ تفاخر نہیں تو کم از کم وجۂ
سُرخروئی ضرور بن چکی ہے۔ کوئی اَور انسان ہوتا۔ تو
اپنی بیٹی کے کرتوت دیکھ کر خودکشی کر لیتا لیکن وہ ہے
کہ ہر کہ ومہ کے پاس جا جا کر مجھے مطعون کر رہا ہے
اور یوں بالواسطہ اپنی ذلت و بے حمیتی کا اشتہار
دے رہا ہے قلیل عرصہ میں اُس نے میرے خلاف
غلط فہمیوں کا ایک انبار کھڑا کر دیا اور میں نے محسوس
کیا کہ ہر طرف سے مجھ پر تہمتوں اور طعنوں کی بارش
شروع ہو گئی ہے۔ میں خاموش رہا۔ میں چاہتا تو
احتشام کے مقابل اُس کے پہلو بہ پہلو اور اُس کے
خلاف خود ایک وسیع مہم شروع کر سکتا تھا۔ لیکن
میں سمجھتا تھا کہ معاملہ اس قدر روشن و بیّن اور میری
حیثیت شک و شبہ سے اس قدر پاک و صاف ہے
کہ دُنیا کسی مغالطہ میں نہیں آ سکتی۔ اس کے علاوہ
لوگوں کے پاس جا جا کر اپنی صداقت و براءت کے ثبوت
پیش کرنا بھی میں کمینگی خیال کرتا تھا۔ میری دُنیا میرے
دوست تھے جن کے خلوص و رفاقت پر مجھے اعتماد تھا
میں سمجھتا تھا کہ وہ دُنیا جس کی محبت اور جس کی عداوت
میرے لئے لاشئے محض ہے۔ اگر میرے متعلق شدید
سوءِ ظن میں مبتلا بھی ہو جائے تو مجھے کیا پروا ہے
درانحالیکہ میرے دوست جن کی محبت میری متاعِ عزیز
ہے میرے ساتھ ہیں۔ احتشام نے اب فرداً فرداً میرے
دوستوں کے پاس پہنچنا شروع کیا۔ ظفر کو تم جانتے
ہو۔ کتنا پرانا اور کیسا عزیز دوست تھا۔ سالہا سال
کی یکجائی سے ہم بھائیوں کی طرح آپس میں گھل مل گئے
تھے۔ ایک روز وہ مجھ سے ملا اور چھوٹتے ہی کہنے
لگا کہ تم نے ایسی قبیح حرکت کی ہے کہ تہذیب و
شرافت شاید ہی تمہیں کبھی معاف کرے۔ میرا تو
خیال نہیں تھا کہ تم ایسے بے رحم اور سنگدل شخص ہو"
میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ
اپنی رائے پر قائم رہا۔ میں نے عاجز آ کر اُس سے کہہ
دیا کہ اگر برسوں کی دوستی کے بعد بھی تم میری سنگدلی
اور بدباطنی نہ پہچان سکے بلکہ ہمیشہ میری وسیع النظری
اور بلند اخلاقی کے مداح رہے اور آج احتشام ایسے
پست فطرت انسان کے کہنے سے مجھے سنگ دل اور
بداخلاق بنا رہے ہو تو میں بھی تم ایسے کور نظر، کند
ذہن، غبی اور تنگ خیال شخص کو اپنا دوست بنانا اپنے
لئے کسرِ شان سمجھتا ہوں۔ وہ دن اور آج کا دن میں
اور ظفر ایک مرتبہ بھی کھُل کر نہیں ملے۔ عنایت سے

بھی تم واقف ہو اور جانتے ہو کہ میرے اُس کے مراسم کتنے گہرے تھے جب مَیں احتشام کے مکان سے نکل آیا تو مجھے سر چھپانے کے لئے لاہور میں کسی کونے کی تلاش تھی۔ مالی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ کرایہ کا مکان لینے کی استطاعت نہ رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد خیال آیا کہ عنایت کے ہاں کیوں نہ جا رہوں۔ امیر آدمی کا اکلوتا بیٹا ہے، خود بھی جائداد کا مالک ہے، ایک دو کمرے آسانی سے میرے لئے الگ کر دے گا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک روز عنایت اپنے تانگہ پر سوار سڑک پر مجھے ملا۔ دُور سے اُس نے مجھے دیکھا اور دیکھتے ہی منہ پھیر لیا اور چُپکے سے میرے قریب سے گزر گیا۔ اس ہتک آمیز بے التفاتی کے بعد دوستوں سے امداد کا طالب ہونا میرے لئے نہ صرف کمینگی بلکہ دیوانگی کا مترادف تھا چنانچہ اس واقعہ کے بعد مَیں چھاؤنی چلا آیا اور اب تک یہیں ہوں"۔

مَیں خاموشی سے شہید کی داستانِ غم سُنتا رہا اور جب اُس نے ایک لمبی سانس کے ساتھ یہ قصّہ ختم کیا تو مَیں نے پوچھا۔

"تم نے کالج جانا ترک کر دیا ہے"؟

"نہیں جاتا ہوں لیکن پہلی سی باقاعدگی نہیں رہی۔ ہفتہ میں کئی ناغے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو ماہ کی فیس بھی ادا نہیں کی۔ سخت پریشانی لاحق ہے۔ دو لشتنیوں میں بیک وقت پاؤں نہیں رکھے جا سکتے۔ حیران ہوں کہ کیا کروں عسرت اور تنگدستی کا یہ عالم ہے کہ آج تک ایسی کیفیت نہ دیکھی تھی۔ والدین سے ناراض ہیں۔ مدت سے اُنہوں نے ایک پیسہ نہیں بھیجا۔ مَیں کس منہ سے اُن کے پاس جاؤں اور جاؤں بھی تو مَیں اُن کی طبیعت سے واقف ہوں، وہ ان حالات میں مجھے کبھی معاف نہیں کرینگے اب تو غیرت کا تقاضا ہے کہ اپنی جنگ خود اپنے ہاتھ سے لڑوں۔ خواہ اس میں مارا جاؤں یا زندہ بچ رہوں، دستِ سوال کسی کے آگے دراز نہیں کرونگا"

مَیں نے کہا: "بات اتنی اہم نہیں جتنی تمہارے تخیل نے بنا رکھی ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں واقعات روزمرہ پیش آتے رہتے ہیں۔ تمہارا معاملہ کوئی دنیا جہان سے نرالا نہیں کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا شروع کر دو۔ مصیبت یہ ہے کہ تم سخت ذکی الحس ہو اور ہر تکلیف کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے ہو۔ تمہاری زندگی اب تک آرام و راحت سے گذر رہی تھی اور تمہیں واقعاتِ مخالف سے دوچار ہونے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ تم نے اپنے قلب و دماغ کی طاقتوں کا اندازہ لگانے میں ہمیشہ مبالغہ سے کام لیا اور اب کہ نامساعدتِ ایام سے پہلی مرتبہ تمہاری آویزش ہوئی تو تم فوراً شکست کھا گئے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جن کی زندگیاں بے حیائیوں اور بداعمالیوں سے لبریز ہیں جن کا دامن شہرت بدنامی کے دھبوں سے سیاہ ہو چکا ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ دُنیا کے سامنے دندناتے ہوئے پھرتے ہیں اور دنیا اُن سے مرعوب ہوتی ہے۔ دُنیا کے ساتھ اُنہی ہتھیاروں

سے جنگ کروگے جو اُس نے تمہارے خلاف استعمال
کئے ہیں تو فتحیاب ہو جاؤگے اور اگر تم چھپ کر اندر بیٹھ
گئے تو یاد رکھو تباہ ہو جاؤگے۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے
کہ تم سا انسان جس نے حقایق زندگی کا ابھی کچھ نہ دیکھا
تھا احتشام جیسے گرگِ باراں دیدہ کے چنگل میں جا
پھنسا جس نے پہلے ہی وار میں تمہارے پرخچے اُڑا
دئے۔ تم کہتے ہو کہ احتشام بے غیرت ہے۔ لیکن
کبھی تم نے سوچا کہ دنیا اُس کی بے غیرتی اور دناءت
کا علم رکھنے کے باوجود اُس کا ساتھ دے رہی ہے
اور تم غیرت مند و شریف النفس ہو کر بھی ابنائے
زماں کے ہاتھوں خوار ہو رہے ہو۔ عزیز دوست اس
جہان میں کمزوری کا نام موت اور قوت کا نام زندگی
ہے۔ یہاں طاقت کے دیوتا کی پرستش ہوتی ہے اور
ضعف و انحطاط کے پجاریوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔
جو شخص طعنِ خلق سے ڈرتا ہے وہی مٹ کر رہ جاتا
ہے اور جو دھڑلے سے سوسائٹی کے خود ساختہ معیار
اخلاق و ضابطہ معاشرت کو پسِ پشت ڈال کر لوگوں
کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے وہی پھلتا پھولتا ہے
حق و صداقت کو کوئی نہیں جانتا۔ طاقت کی قدر ہے
دولت کی قدر ہے، پروپاگنڈا کی قدر ہے۔ بلکہ یوں کہنا
چاہئے کہ بے حیائی و ضمیر فروشی کی قدر ہے۔ میں نہیں
کہتا کہ تم بھی بے حیائی اور ضمیر فروشی کا جامہ پہن لو۔
میرا مدعا یہ ہے کہ دنیا کی رائے کو بالکل اہمیت نہ دو
جمہور کی تعریف و مذمت کے ساتھ اپنی مسرت اور
اپنے رنج کو ہرگز وابستہ نہ کرو۔ جو لوگ ہر کام میں عوام
کی سندِ خوشنودی ہی کو معراجِ کامرانی سمجھتے ہیں وہ
آخر کار عوام ہی کے ہاتھوں ذبح ہوتے ہیں۔ یہ
لوگ اپنی انفرادیت ضائع کر بیٹھتے ہیں اور اُن کی زندگی
کا انحصار عوام کالانعام کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی رائے
پر ہوتا ہے۔ میں تمہارے اس خیال سے اتفاق
کرتا ہوں کہ لوگوں کے سامنے اپنی صداقت و برائت
کے ثبوت پیش کرتے پھرنا کمینگی کی بدترین صورت
ہے۔ دنیا کو کسی معاملہ میں حکم بنا لینا ذہنی تنزل کے
علاوہ ارادے کی کمزوری، اخلاق کی پستی اور فہم و
ادراک کی بے حسی کی علامت ہے۔ تم نے غلطی کی کہ
لاہور چھوڑ کر چھاؤنی چلے آئے۔ تمہارے یہاں آ
جانے کو لوگ فرار سے تعبیر کرکے تمہاری بزدلی پر
خندہ زن ہیں۔ نہیں چاہئے تھا لاہور میں رہتے اور
وہیں رائے عامہ کو سرپائے استحقار سے ٹھکرا کر
اپنے عزم و ارادہ سے مخالفت کے بادلوں کو پارہ پارہ
کر ڈالتے۔ بہرحال کہ اب تم لاہور سے چلے آئے
ہو اور کالج جانا بھی تم نے عملاً ترک کر دیا ہے میری
یہی رائے ہے کہ تم دہلی چلے چلو۔ وہاں بھی قانون
کی تعلیم کا معقول بندوبست ہے۔ اگر چاہو گے تو
وہیں یونیورسٹی میں داخلہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔"
شہید نے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔
"یہ نہیں ہو سکتا۔ چھاؤنی میں رہنے سے یہ فائدہ
ہے کہ میں لاہور سے باہر بھی ہوں اور لاہور کے اندر
بھی ہوں۔ جہاں اطمینان و شہرت کو کھویا ہے انہیں
حاصل بھی وہیں کروں گا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ

جس چیز کو لاہور میں کھو چکا ہوں اُسے دہلی میں تلاش کروں۔ میں نے تم سے ایک نہایت اہم بات کا ذکر نہیں کیا۔ احتشام کی لڑکی سے نکاح کرتے وقت میں نے پانچ ہزار کا مہر باندھ دیا تھا اور اب احتشام نے میرے خلاف اُسی پانچ ہزار کا دعوےٰ دائر کر رکھا ہے۔ عدالت سے سمن جاری ہو چکے ہیں لیکن چونکہ میری جائے قیام کا صحیح علم ایک آدھ شخص کے سوا کسی کو نہیں اس لئے اب تک تعمیل نہیں ہو سکی۔"

میں نے افسوس و حسرت کے ساتھ کہا "تو یوں کہو کہ تم نے اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ دینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ بالفرض اگر سمن کی تعمیل سے تم کچھ مدت گریز کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو کیا عدالت تمہاری غیر حاضری کو نظر انداز کر کے تمہارے خلاف یک طرفہ ڈگری صادر نہیں کر سکتی؟ احتشام تمہیں دق کرنے کی ہر ممکن تدبیر کو کام میں لانے والا انسان معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ڈگری ہو گئی ہو تو روپیہ کہاں سے لاؤ گے؟"

"آہ! میں کیا بتاؤں۔ یہاں کھانے کو نہیں ملتا، تم پانچ ہزار کی رقم کا ذکر کرتے ہو!" میں نے شہید کو اس دوران میں پہلی مرتبہ یاس انگیز تاسف کے ساتھ بے قرار ہوتے دیکھا۔ اُس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا لیا اور جب نظریں اُوپر اُٹھائیں تو اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔ مجھے اُس پر رحم آیا۔ یہ نوجوان جو ہمیشہ بنا ٹھنا رہنے میں مشہور اور دُنیا کے شور و غوغا کو حقارت آمیز تبسم سے دیکھ کر اپنے حال پر نازاں رہنے کا عادی تھا آج اپنے ذکی الحس جذبات کے ہاتھوں اپنی ہی ایک معمولی سی غلطی کو پہاڑ بنا کر اُس بوجھ کے نیچے پسا جا رہا تھا۔ اُس نے دوسری طرف منہ پھیر کر آنکھوں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے کہا "جہاں تک مجھے علم ہے احتشام کو روپیہ کی ہوس نہیں اُس کی شدید خواہش ہے کہ کسی طرح مجھے قید خانے بھجوا دے۔ اگر میرے خلاف ڈگری ہو گئی اور میں روپیہ ادا نہ کر سکا تو احتشام کی یہ خواہش ضرور پوری ہو کر رہے گی۔"

میں نے خلوص دل سے شہید کو دہلی چلنے کی دعوت دی۔ لیکن وہ میانمیر میں رہنے پر مصر تھا۔ بالآخر میں نے اُسے یہ مشورہ دیا کہ وہ والد کے پاس چلا جائے۔ اُس کی موجودہ قابلِ رحم حالت دیکھ کر اُن کی شفقت پدری ضرور جوش میں آئے گی اور اُس کے مصائب کا ایک حد تک خاتمہ ہو جائے گا مگر اُس کے دماغ میں یہ بات پایۂ یقین تک پہنچ چکی تھی کہ والد اُسے ہرگز معاف نہیں کریں گے۔ ان "تکلیف دہ روحانی، جسمانی اور اقتصادی قیود میں شہید کو گرفتار چھوڑ کر میں مجبوراً دوسرے روز دہلی لوٹ آیا۔ روانہ ہوتے وقت مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی بے استطاعتی کا شدید احساس ہوا۔ اگر میں صاحبِ حیثیت انسان ہوتا تو یقیناً پانچ ہزار کی رقم شہید کے حوالے کر کے اُسے اس عذاب سے نجات دلا دیتا۔ میرے دہلی آجانے کے چند ہی ہفتے

بعد احتشام نے اپنے اثر و رسوخ سے شہید کے خلاف عدالت سے پانچ ہزار کی ڈگری حاصل کر لی۔ اور جب شہید نے اس رقم کے ادا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ تو احتشام نے بلا توقف اُس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کرا دئے۔ آسمان نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا۔ اور ذلت و رسوائی کے لبالب بھرے ہوئے پیالے میں تباہی کا آخری قطرہ آ گیا۔ جس بات کا تصور ہی جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا آخر اُس نے واقعیت و حقیقت کا جامہ پہن لیا اور شہید کی خستگی و درماندگی کے محضر پر گویا بربادی کی آخری مہر ثبت ہو گئی۔ اپنی اس دردناک مصیبت و ابتلا میں بھی شہید نے میرے پاس آنا گوارا نہ کیا شاید اُس کے غرور نے اجازت نہ دی کہ وہ اپنی عزت و نیک نامی کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے اُس دوست کو انتخاب کرے جس کی نظروں میں اُس کے عروج و کمال کے شاندار دنوں کا نقشہ ہنوز باقی تھا۔ وہ انتہائی سراسیمگی اور غایت انتشار کے عالم میں کسی چور کی طرح لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر ایک رات چپکے چپکے پشاور بھاگ گیا۔ اُس کے سامنے دو ہی راستے تھے، فرار یا جیل۔ اُس نے مقدم الذکر راستہ کو ترجیح دی۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ لاہور یا لاہور کے قرب و جوار میں رہنا قید خانہ میں داخل ہونے کے برابر تھا۔ وہ کسی ایسے مقام پر جانا چاہتا تھا۔ جہاں اُس کے چلے جانے کا دشمنوں کو سان گمان بھی نہ ہو، اسی لئے اُس نے پشاور پسند کیا۔ اُس کے بہت دور کے قرابت داروں میں ایک شخص پشاور میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھا۔ اور شہید اُسی کے پاس گیا تھا۔ یہ شخص اتفاق سے مدت کے بعد ایک مرتبہ مجھے ملا اور اُس نے شہید کے ورودِ پشاور کی کیفیت اِن الفاظ میں بیان کی کہ جسم پہ صرف ایک قمیض اور پاجامہ، پاؤں میں پھٹا ہوا بوٹ، سر پہ بغیر پھندنے کے میلی سی ترکی ٹوپی۔ ڈاڑھی کے بال جنہیں کئی روز سے اُسترا نصیب نہ ہوا تھا۔ چیونٹیوں کی طرح چہرے کو سیاہ کئے ہوئے۔ سر کے بال پریشان اور سفر کی وجہ سے گرد آلود۔ جیب میں صرف ڈیڑھ روپیہ کی ریزگاری، ہمراہی میں ایک بسترا اور ٹرنک۔ اِس وضع قطع میں شہید پشاور کے اسٹیشن پر اُترا۔ اُنہیں کے میزبان کا قول ہے کہ جب شہید اُس کے مکان پر پہنچا۔ تو اُس کے چہرے سے وحشت و دیوانگی کے آثار ٹپک رہے تھے جنہیں دیکھ کر اُس کو پہچاننا تک مشکل ہو گیا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو ہو کر اُس خرگوش کی طرح جو شکاری کتوں سے بچکر اپنے بھٹ کی طرف بھاگ رہا ہو بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا۔ شاید اب بھی کوئی دشمن اُس کا تعاقب کر رہا ہو۔ وہ کم و بیش ڈیڑھ برس پشاور میں رہا۔ ابتدائی دو مہینے تو اُس نے کامل تعطل اور پوری بے کاری میں بسر کر دیئے۔ اُس کا ذہنی اختلال ایسی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ کہ وہ کوئی کام بھی دلجمعی و یکسوئی سے نہ کر سکتا تھا مستقبل کے اندیشے، ماضی کا غم، حال کا افسوس، یہ سب خوفناک بھوت ہر وقت اُس کے دل و دماغ پر سوار رہتے تھے۔ وہ اپنے اندر صرف علمی و ادبی کام کی استعداد رکھتا تھا اور اب پیہم تفکر و انتشار سے اُس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ کہ جب کبھی قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتا تو گھنٹوں یونہی بیٹھا رہتا۔ اور خیالات دماغ کی الجھنوں سے نکل کر زبانِ قلم تک پہنچنے سے قبل ہی منتشر ہو جاتے تھے۔ وہ جھنجھلا کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اور

اپنی بے بسی پر کبھی رنج و غصہ اور کبھی غم و الم کے آنسو بہانا شروع کر دیتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ از راہ تفاخر و تعلی اپنے آپ کو الفاظ کا بادشاہ کہا کرتا تھا۔ اور اب خود اُس کے جذبات اظہار کے لئے بیتاب تھے لیکن اُس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ اور سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ مسلسل مغموم و پریشان رہنے سے اُس کے دماغ میں ایک لکیر سی بن گئی تھی۔ اور خیالات کی رو اُسی لکیر پر چلنے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ ہزار وقت اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کوئی دلچسپ کتاب پڑھتا، اخبار کا مطالعہ کرتا یا پشاور کی سیرگاہوں اور آدمیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے بازاروں کی سیر کرتا تھا لیکن پھیر پھیر اکر اُس کے خیالات کا سلسلہ اُسی مرکز پر آ ٹھہرتا تھا جہاں سے نکالنے کی اُس نے سعیٔ بلیغ کی تھی۔ کئی کئی دن وہ گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نہ رکھتا تھا۔ یہ خیال ہی کہ وہ مفرور مجرم کی حیثیت سے یہاں روپوش ہے خود اسے اپنی نظروں میں ذلیل کر رہا تھا۔ اُس کے میزبان نے حد درجہ ملاطفت و محبت سے اُسے مشورہ دیا کہ وہ اِس فرصت میں قانون کی کتابیں ہی دیکھنا شروع کر دے۔ تاکہ آئندہ سال خانگی طور پر امتحان دے سکے لیکن اُس نے اپنے دماغ کو عاجز و درماندہ اور اپنے خیالات کو بے ربط و پریشان پا کر یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جو شخص دس منٹ بھی کامل یکسوئی سے کسی مسئلہ پر غور کرنے کے قابل نہ تھا۔ اُس کے لئے قانونی موشگافیوں کا مطالعہ تقریباً ناممکن سی بات تھی۔ پھر اُس کے عزیز نے یہ بھی کہا کہ اگر شہید چاہے تو اُس کے لئے پشاور میں کہیں ملازمت کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ مگر شہید نے ملازمت سے بھی انکار کر دیا۔

اس غربت و بے کسی میں بھی لاہور، کامیابی، عروج، تمکنت اور وجاہت کے خواب ہنوز اُس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ چند ماہ یا ایک آدھ سال کے لئے گذر اوقات کی خاطر کہیں چھوٹی موٹی سی عارضی نوکری کرے لیکن یہ اُسے کسی صورت بھی گوارا نہ تھا کہ ہمیشہ کے لئے کوئی حقیر سا ذریعہ معاش اختیار کر کے تمام عمر قعر گمنامی میں پڑا رہے اُسے رہ رہ کر یقین آتا تھا کہ افلاس و مصیبت اور ذلت و حقارت کے یہ بادل ایک نہ ایک دن ضرور چھٹ کر رہیں گے اور اُس کے مطلع حیات پر یقیناً کامیابی و مسرت کا آفتاب طلوع ہو گا۔ رنج و اندوہ کا طوفان آہستہ آہستہ گذر تا گیا اور شہید کے خیالات پر غم و غصہ کی جس خوفناک تندی نے غلبہ پا رکھا تھا۔ وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئی۔ دو مہینے کے بعد اُس کے دل و دماغ کی حالت کسی حد تک اعتدال پر آگئی اور اُس نے سکون کے ساتھ حالات نامساعد کا مقابلہ کرنے کا عزم راسخ کر لیا اُس نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ہر قسم کی خط و کتابت بالکل بند کر رکھی تھی تاکہ اپنی موجودہ جائے پناہ کو پردہ خفا میں رکھ سکے۔ لاہور میں کسی کو اُس کی نقل و حرکت کا صحیح علم نہ تھا اور اُس کے یکایک غائب ہو جانے کو لوگ تعجب اور تاسف کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ دو مہینے بے کاری میں بسر کر دینے کے بعد اُس نے خیال کیا کہ یوں اپنے میزبان کے لئے بار خاطر بنے رہنا سخت شرم کی بات ہے اُس نے خود بھی کوشش کی اور اُس کے میزبان نے بھی اپنے اثر و

رسوخ سے کام لیا۔ اور چند روز کے اندر اُسے پشاور کے بعض امرا کے بچوں کی تعلیم و تدریس کا کام مل گیا۔ یہ کام ایک حد تک اُس کی طبیعت کے موزوں اور ذوق کے مطابق تھا۔ چنانچہ اُس نے پوری سرگرمی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنا شروع کر دیئے۔ قلیل عرصہ میں اُس کی شہرت بحیثیت ایک قابل معلم اور شفیق اتالیق کے شہر میں پھیل گئی اور اُسے اس کثرت سے کام ملا کہ فراغت کا وقت بچانا اُس کے لئے مشکل ہوگیا۔ مالی لحاظ سے اُس کی حالت کافی سدھر گئی جسمانی و دماغی صحت بھی ترقی کر گئی۔ اور وہ ایک اعتبار سے مطمئن زندگی بسر کرنے لگا۔ لاہور جانے کا خیال اُس کے دل کی گہرائیوں میں بدستور انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اور کبھی کبھی اُسے خیال آتا۔ کہ اگر وہ واپس لاہور چلا جائے تو کیا ہو۔ وہ اپنی تعلیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے سخت بے تاب تھا، لیکن لاہور جا کر باعزت زندگی بسر کرنے اور تعلیمی مصارف مہیا کرنے کے وسائل سراسر مفقود تھے۔ اُس نے یہاں ایک وکیل سے مشورہ کر کے معلوم کیا کہ ڈگری کا روپیہ ادا نہ کرنے کے باعث عدالت دیوانی سے جو وارنٹ گرفتاری جاری ہوتے ہیں۔ اُن کی میعاد عمل تاریخ اجرا سے لے کر ایک خاص وقت تک جس کا تعین عدالت پہلے ہی کر دیتی ہے محدود ہوتی ہے اگر اس میعاد کے اندر شخص مطلوبہ گرفتار نہ ہو سکے تو وارنٹ عدالت متعلقہ میں واپس بھیجے جاتے ہیں۔ اور مدعی جب چاہے اُن کو دوبارہ جاری کرا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے شہید کی گرفتاری کے جو وارنٹ جاری ہوئے تھے۔ اب تک یقیناً عدالت میں واپس بھیجے جا چکے ہوں گے۔ لیکن اگر شہید لاہور چلا گیا اور احتشام نے دوبارہ وارنٹ جاری کرا دیئے تو پھر کیا ہوگا؟ یہی ایک خیال تھا۔ جو بار بار پیدا ہو کر شہید کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا اور وہ پشاور سے جنبش نہ کر سکتا تھا کبھی کبھی ہندوستان سے باہر جانے کا خیال بھی اُس کے دماغ میں نمودار ہوتا تھا، لیکن یہ خیال دلچسپ و جاذب توجہ ہونے کے ساتھ ہی ناممکن العمل بھی تھا۔ کیونکہ غیر ملک میں بالخصوص بلاد مغرب میں جانے کے لئے سرمایہ درکار تھا۔ اور شہید کی موجودہ حالت یہ تھی کہ وہ اپنی حد درجہ غیر یقینی و غیر مستقل آمدنی میں صرف جان و جسم کا رشتہ بحال رکھے ہوئے تھا۔ ڈیڑھ سال انہی خیالات کی بھول بھلیاں میں ٹامک ٹوئیے مارتے بسر ہو گیا اور خلاف توقع شہید کے میزبان کا ایک دور دراز مقام پر تبادلہ ہو گیا۔ اب شہید کے لئے دو ہی صورتیں تھیں، یا پشاور میں رہے یا پشاور چھوڑ دے۔ اُسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ پشاور میں مزید قیام قطعاً بے سود ہے، چنانچہ ہمت و استقلال سے کام لے کر اُس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس کبھی نہ ختم ہونے والے تذبذب، اس جان لیوا کاوش اور اس مصیبت ناک انتظار سے تنگ آ گیا تھا۔ اُس نے تمام پہلوؤں پر غور کر کے ارادہ کر لیا کہ وہ بدترین مصائب کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرے گا، وہ مشکلات کی عمیق وادیوں اور تکالیف کی دشوار گذار گھاٹیوں کو عزم صمیم کی قوت سے عبور کرے گا لیکن موجودہ دور تعطل کو ہرگز طول نہ دے گا۔ ان خیالات و عزائم کے ماتحت اُس نے پشاور کو الوداع کہی۔ ۲۷ نومبر کی صبح تھی۔ جب وہ لاہور کے اسٹیشن پر اُترا ضبط

کی ہزار کوششوں کے باوجود اُس کے قلب میں اضطراب اور دماغ میں ہیجان برپا تھا۔ بارش ہو کر ابھی ابھی مطلع صاف ہوا تھا اور سرد ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس نے اوورکوٹ کا کالر اوپر اٹھا کر کانوں کو ڈھانپ لیا اور ٹرنک سے گرم اُونی ٹوپی نکال کر سر پر اوڑھ لی جس سے اُس کے چہرے کا نصف حصہ اچھی طرح چھپ گیا۔ اس اہتمام سے صرف سردی سے محفوظ رہنا ہی مقصود نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ جب وہ اسٹیشن کے اندرونی حصے سے نکل کر باہر ڈیوڑھی میں آکر کھڑا ہوا تو اُس کے اعصاب میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ لاہور کی خوشنما کشادہ سڑکوں کا جال اور تر و تازہ گھاس کے خوبصورت وسیع قطعے اُس کی نظروں کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ مسافروں کی گہما گہمی اور قلیوں کا شور بدستور موجود تھا۔ ریل کے ملازم اپنے فرائض کی ادائیگی میں بہت مستعدی سے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔ پولیس کے سنتری اپنے افسر کے سامنے نہایت متانت و وقار سے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے انتظام میں مصروف تھے۔ اور مسافروں سے لدے ہوئے تانگے شہر کی سمت بھاگے چلے جا رہے تھے۔ غرضکہ لاہور اپنی تمام دل آویزیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ زندہ تھا اور شہید!.........

......وہ ایک کونے میں کھڑا حسرت بھری آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا بہت سے حسیات و جذبات جو مدت سے سوئے پڑے تھے۔ اب آناً فاناً جاگ اُٹھے تھے اُسے لاہور پہنچ کر فکر ہوئی کہ اب اُسے کس طرف کا رُخ کرنا چاہیئے۔ پہلے اُس نے چھاؤنی جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر خود ہی یہ خیال ترک کر دیا۔ اُس کے ہمراہ کچھ سامان بھی تھا جسے اُس نے اسٹیشن پر ایک سرکاری ملازم کی حفاظت میں رکھ دیا اور خود تن تنہا پیدل نکل کھڑا ہوا۔ وہ بغیر کہیں پہنچنے کے خیال سے جلدی جلدی چل رہا تھا۔ آج وہ اُسی بلدۂ حسن و موسیقی اور مدینۂ شعر و شباب میں موجود تھا جہاں سے ڈیڑھ سال قبل وہ چوروں کی طرح چھپ چھپ کر بھاگا تھا۔ اُس کی رگوں میں خون تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔

وہ سڑکوں پر چلتا رہا۔ کوٹھیوں، بنگلوں اور راہ گیروں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ دن اُسے معمول سے روشن اور ہوا معمول سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ امپرس روڈ طے کر کے وہ اپنی محبوب سڑک میکلوڈ روڈ پر پہنچا اُن ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جہاں اُس نے اپنے دورِ بہاریہ میں دوستوں کی صحبت میں کئی کئی گھنٹے قہقہوں اور بذلہ سنجیوں میں بسر کئے تھے۔ چپہ چپہ پر عہدِ ماضی کی رُوح پرور داستانوں کی یاد اُس کے دماغ میں برق آسا سرعت کے ساتھ تازہ ہو رہی تھی۔ وہ کچھ عرصے کے لئے اپنی موجودہ درد انگیز حالت کو بھول گیا۔ اور محسوس کرنے لگا۔ کہ وہ آج سے چند سال قبل والا شہید ہے جو لاہور کی زندہ دل ہنگامہ پرور اور پُرمسرت آبادی کا ایک فرد تھا۔ اِس اثنا میں وہ ڈاک خانے کے چوک میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں سے مختلف سمتوں کو سڑکیں جاتی ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکا اور سوچنے لگا۔ مال کا رُخ کروں یا انار کلی کی طرف چلوں وہ اب تک آبادی سے کتراتا اور انسانوں کے ہجوم سے بچتا ہوا آ رہا تھا۔ شہر میں داخل

ہونے سے اُسے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اُس نے فوراً ہی فیصلہ کرلیا کہ انارکلی ضرور جاؤں گا۔ وہ اپنے پُرانے کالج کے قریب سے گذرا جہاں اس نے زندگی کے بہترین چار سال نہایت نیک نامی سے بسر کئے تھے۔ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوکر اُس نے کالج کے احاطے اور اُس کی عمارت پر نظر دوڑائی۔ طلبہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ہنستے کھیلتے اور گپیں لگاتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ کچھ گھاس کے میدان میں بیٹھے مصروفِ مطالعہ تھے اور باقی کمروں میں اُستادوں کے لیکچروں سے مستفید ہو رہے تھے چند قدم آگے جاکر اُسے ہوسٹل کی سہ منزلہ خوبصورت عمارت نظر آئی۔ اُس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اُس نے چاہا کہ اندر داخل ہوکر اُس کمرے کی دیواروں کو بوسہ دے جہاں اُس نے بی اے کا آخری سال بصد شان و شوکت بسر کیا تھا۔ اُس کے قدم کسی مقناطیسی قوت کے زیر اثر پھاٹک کی طرف اُٹھے۔ لیکن فوراً ہی رُک گئے۔ وہ اِس ارضِ پاک کو جہاں مسرت، بے فکری، اطمینان اور فارغ البالی کی روحیں بستی تھیں۔ حزن وملال اور رنج وبے کسی کی آہوں سے ملوث کرنے کا مجاز نہ تھا۔ مجبوراً بے بس پجاری کی طرح جو دیوتاؤں کے حکم کے ماتحت مقدس قربان گاہ کو چھونے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہو۔ اُس نے سڑک پر کھڑے کھڑے نیاز مند زائر بن کر ہوسٹل کی دیواروں، دریچوں اور دروازوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا شروع کیا۔ بالائی منزل کی شرقی جانب ایک کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اُسے یاد آگیا۔ کہ بی۔اے کا سال اوّل اُس نے اسی کمرے میں گذارا تھا۔ یونیورسٹی کے امتحان کا ہوّا سر پر نہ تھا اور خدا ہی جانتا ہے۔ کہ یہ سال کن کن دلچسپیوں، دلآویزیوں اور شرارتوں سے لبریز تھا۔ وہ حیران تھا کہ اگر اس کمرے کے در و دیوار کو قوتِ گویائی عطا ہوجائے تو وہ اپنے موجودہ مکین کو عہدِ رفتہ کے کیسے کیسے عجیب و غریب اور دلچسپ افسانے سنائیں۔ نہیں معلوم اب اس کمرے میں کون رہتا ہے۔ اُس کا ذوقِ آرائش کیسا ہے اور اُس نے کمرے کا سامان کس ترتیب سے سجا رکھا ہے۔ شہیدا انہی خیالات میں محو گردوپیش سے بالکل بے خبر اُس دیہاتی کی طرح جو لاہور میں پہلی مرتبہ وارد ہوا ہو۔ سڑک کے کنارے کھڑا چونے اور گارے کی بلند عمارت کو ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا کہ اتنے میں ایک موٹر زور سے ہارن بجاتی ہوئی عین اُس کے قریب سے گذری اور وہ اس شور سے چونک کر ہوش وحواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ایک لمبی سانس لے کر اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے نیلے گنبد کی طرف چل پڑا۔ انارکلی میں داخل ہوا۔ ٹانگوں بائیسکلوں اور موٹروں کے شور، پیدل چلنے والوں کے اژدہام اور دُکانوں کی کثرت کے باعث اُس کی توجہ تخیل کی دنیا سے نکل کر واقعیت کے عالم میں آگئی۔ وہ ہر راہ رو کو غور سے دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کئی آشنا راستے میں ملے لیکن وہ آنکھ بچا کر چپکے سے نکل گیا۔ ایک چھوٹے سے رسیٹوران میں داخل ہوکر اُس نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا۔ خلوے معدہ کی حالت میں اتنی دیر تک پیدل چلنے سے اُس کی اشتہا خوب چمک اٹھی تھی۔ جب انارکلی ختم کرکے لوہاری دروازے کے چوک میں پہنچا تو اُس نے اخبار فروش سے ایک تازہ پرچہ خریدا اور سامنے باغ میں ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ افتتاحیہ

مختصر مقالات اور خبریں پڑھ چکا تو اُس کی نظر اشتہارات پر پڑی۔ ایک مشہور مقامی روزنامہ کے مہتمم صاحب کی طرف سے اشتہار شائع ہوا تھا۔ کہ اُنہیں ایک قابل مترجم کی ضرورت ہے جو تعلیمی لحاظ سے گریجوایٹ ہو اور بے تکلفی سے انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ شہید نے دو تین مرتبہ اشتہار کی عبارت پڑھی اور پھر اخبار ہاتھ سے رکھ کر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اگر اُسے یہ اسامی مل جائے تو کیا ہی اچھا ہو لاہور میں روزگار میسر آ جائے گا۔ اور وہ شاید اس طرح اپنی تعلیم کو بھی حدِ اختتام تک پہنچا سکے۔ اُسے ترجمہ میں اچھی خاصی مہارت تھی۔ ابھی حال ہی میں قیام پشاور کے دوران میں اُس نے آسکر وائلڈ ایسے مصنف کے ایک مشہور ڈرامہ کا ترجمہ کیا تھا جس کا مسودہ اُس کے بکس میں موجود تھا۔ اُمید ایک برقی رو کی طرح اُس کے جسم میں سنسناہٹ کے ساتھ دوڑ گئی۔ اور اُس کا چہرہ جذبات کے تہیج کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔ نصف گھنٹہ تک وہ سوچتا رہا۔ ممکنات و ناممکنات کی دنیا کو اُس نے خیال ہی خیال میں چھان مارا۔ پھر امید و بیم کی شورش سے لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو لے کر اُٹھا، اخبار فروش سے اُس روزنامہ کے دفتر کا پتہ دریافت کیا۔ اور جلدی کے نیال سے تانگہ لے کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ دفتر میں پہنچکر مہتمم کے سامنے حاضر ہو کر اُس نے اپنی آمد کی غرض بتائی اُسے یہ معلوم کرکے گونہ اطمینان ہوا کہ ابھی جگہ خالی تھی۔ اگرچہ ایک سے زیادہ اُمیدوار قسمت آزمائی کر چکے تھے، مہتمم نے اُسے ایڈیٹر کے کمرے میں بھیج دیا کہ آخری انتخاب اُنہی کے ہاتھ میں تھا۔ ایڈیٹر صاحب ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ عینک کے شیشوں کے اندر سے اُن کی آنکھوں کی چمک ذہانت اور معاملہ فہمی کو واضح کر رہی تھی۔ شہید جب حرفِ مدعا زبان پر لایا تو اُس نے کوشش کی کہ بہترین الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرے۔ وہ اس راز سے واقف تھا کہ پہلی ملاقات میں دوسرے کو متاثر کر لینا گویا مستقبل کی کامیابی کا پورا زینہ طے کر لینے کے برابر تھا۔ ایڈیٹر کے استفسار پر اُسے اعتراف کرنا پڑا کہ اُس نے آج تک کسی اخبار میں کام نہیں کیا اور نہ اُسے صحافت کا عملی تجربہ ہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے جو بالالتزام اخبارات کا مطالعہ کرتا ہو، جسے ہند اور بیرونِ ہند کی سیاسی و معاشری تحریکات کا پورا علم ہو اور جس نے اقتصادیات و تاریخ ایسے علوم کو کالج میں طالب علم رہ کر پڑھا ہو اخباری اصطلاحات پر ایک ہی دن میں عبور حاصل کر لینا چنداں مشکل نہیں صحافت ہو یا ادب زبان کا مسئلہ بہر حال سب سے ضروری اور مقدم ہے۔ جو شخص زبان پر قدرتِ کاملہ نہیں رکھتا۔ وہ نہ اچھا ادیب بن سکتا ہے۔ اور نہ اعلیٰ اخبار نویس کسی شخص کا سیاسی مبلغ علم اور تجربہ کیسا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر اُسے زبان پر اقتدار حاصل نہیں تو وہ میدانِ صحافت میں ایک قدم اُٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ شہید نے بر سبیلِ تذکرہ اپنے مختصر افسانوں اور ادبی مضامین کا بھی ذکر کر دیا۔ جو "سامری" کے فرضی نام سے ملک کے مشہور ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ایڈیٹر نے احترام آمیز نظروں سے شہید کو دیکھا۔

وہ "سامری" کے نام سے شائع ہونے والی تحریروں کو کئی مرتبہ خراجِ تحسین ادا کر چکا تھا۔ دل میں وہ شہید کی قابلیت اور ادبی استعداد کا قائل ہو چکا تھا۔ اُس کے معقول دلائل اُس کے پُرشکوہ لیکن حد درجہ شگفتہ اندازِ گفتگو اور اُس کے صحیح لب و لہجہ نے (جو بالعموم پنجاب کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں مفقود ہے) اُس کے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہ رکھی تھی۔ یونہی اتمامِ حجت کے لئے اُس نے پاس پڑا ہُوا ایک انگریزی اخبار اٹھا کر شہید کے حوالے کر دیا۔ اور ایک مضمون پر نشان لگا کر کہا کہ اس کا ترجمہ کر دیجئے۔ مضمون ایک نوجوان کی ناکام حیاتِ معاشقہ کی المناک روئداد تھی۔ جس نے اپنی محبوبہ کے تغافل اور سرد مہری سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔ شہید نے ترجمہ پر مشکل پندرہ منٹ صرف کئے ہونگے۔ اور "شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا" کے دلچسپ عنوان سے خبر مرتب کر کے ایڈیٹر کے پیش کر دی۔ عنوان کی جاذبیت اور زبان دانی ورہ کی خوبیوں نے ایڈیٹر صاحب کو مرعوب کر دیا۔ اور انہوں نے مزید تفحص و جستجو کے بغیر شہید کے کام پر خوشنودی کا اظہار فرما کر اُسے ملازم رکھ لیا۔ ستر روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ اور وقت آنے پر آئندہ ترقی کا وعدہ بھی کیا شہید نے اس عنایت و ذرہ نوازی کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کیا اور اپنی مسافرت و غربت کا ذکر کر کے عرض کیا کہ اگر ایڈیٹر صاحب اجازت دیں۔ تو وہ دو ایک روز کے لئے دفتر ہی میں قیام کر لے۔ تاکہ اس دوران میں اطمینان سے اپنے لئے کہیں علیحدہ مکان کا بندوبست کر سکے۔ ایڈیٹر صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔ اور وہ اپنی رگ رگ میں مسرت و ابتہاج کا طوفان سمیٹ کر دفتر سے نکلا تاکہ اسٹیشن جا کر اپنا سامان لے آئے۔ ستر روپے اس وقت اُس کی نگاہ میں ستر ہزار کے برابر تھے۔ اور وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ تمام راہ بے خبری کے عالم میں چلتا رہا۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا۔ اور پڑتا کہیں تھا۔ واپس آیا۔ تو اُس نے اُسی روز سے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ شام تک اخبار کے لئے ضروری خبروں کا ترجمہ کرتا رہا۔ اطمینان و سکون حاصل ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے اعصاب میں نئی زندگی عود کرتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ اور ایڈیٹر اُس کی صلاحیت و استعداد کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ شام کے قریب وہ بفراغِ خاطر دفتر سے نکلا۔ آج وہ اپنے تئیں ایسا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ گویا کئی من بوجھ اُس کے سر سے اتر گیا ہے۔ وہ ذمہ داری کی گرانباریوں اور پابندیوں سے آزاد ہو کر اس شخص کی مانند جو وقت کو اپنے گھر کا غلام سمجھتا ہو بے فکری سے سڑکوں پر گھومتا رہا۔ مال پر پہنچا۔ تو اُسے معاً مزنگ کا خیال آیا اور ساتھ ہی احتشام کے متعلق اُس کے تردداتت میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ صبح ہی سے جب سے وہ لاہور میں وارد ہوا تھا۔ اُسے رہ رہ کر احتشام کا خیال آ رہا تھا اور وہ حیران تھا کہ اگر احتشام کو اُس کی آمد کی اطلاع مل گئی تو کیا ہوگا۔ لیکن اُس انسان کی طرح جو تمام مصلحتوں اور اندیشوں کی طرف سے آنکھ بند کر کے جان ہتھیلی پر رکھ کر مقابلے کے لئے نکل آیا ہو وہ ہر مصیبت کا خیر مقدم کرنے پر آمادہ تھا۔ لارنس کے بُت کے قریب پہنچ کر اُس کے پاؤں نے خود بخود مزنگ کی راہ اختیار کر لی۔ وہ سڑک کے کنارے

کنارے تاریکی میں چلتا رہا۔ دُور سے اُسے احتشام کے مکان کا بالاخانہ نظر آیا اور اُس کا دِل اضطراری طور سے دھڑکنے لگا کسی قدر فاصلہ پر کھڑے ہو کر اُس نے مکان اور اُس کے احاطے پر ایک نظر ڈالی۔ درو دیوار سے کچھ بے رونقی سی ٹپکی پڑتی تھی۔ صرف دو کمروں میں لیمپ روشن تھے ایک تو اُسے یاد آگیا کہ باورچی خانہ تھا اور دوسرا غالباً زنان خانہ کا کوئی حِصّہ تھا۔ برآمدہ، پائیں باغ، مردانہ نشستگاہ، سب تاریکی کے پردے میں چھپے ہوئے تھے احاطہ میں ایک آدمی بھی چلتا پھرتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ بیس منٹ کے قریب شہید وہاں کھڑا رہا۔ لیکن دو لیمپوں کی روشنی کے علاوہ مکان میں کسی قسم کے آثارِ حیات نظر نہ آتے تھے۔ وہ آگے نکل گیا۔ بے شمار خیالات اُس کے لوحِ دماغ پر متحرک تصاویر کی طرح ناچ رہے تھے بعض بھولی ہوئی شخصیتیں ماضی کے دُھندلکے میں سے نکل کر اُس کی آنکھوں کے سامنے آموجود ہوئی تھیں۔ اُسے وہ دِن یاد آیا جب وہ پہلے پہل اس مکان میں ایک اجنبی کی حیثیت سے داخل ہؤا تھا۔ پھر وہ زمانہ بھی اُس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ جب اُس نے ایک حد تک مالکانہ حیثیت سے اس مکان میں بود و باش اختیار کی تھی اور پھر دردناک انجام کی یاد اُس کے حافظے نے بہ سُرعت تمام تازہ کر دی۔ جب اُس نے انتہائی خستگی و درماندگی کے عالم میں بہ چشمِ اشکبار و دلِ خونچکاں اِس چار دیواری کو خدا حافظ کہا تھا۔ وقت گذر گیا لیکن باتیں یاد تھیں۔ خدا جانے اب اس مکان میں بسنے والے کِس حال میں ہیں۔ اور شہید کو کن لفظوں میں یاد کرتے ہیں

اِس دوران میں ایک ہستی کا خیال بار بار شہید کے دماغ میں پیدا ہوتا اور وہ ہر بار اُسے مٹانے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن جس شدت سے وہ مٹاتا اُسی تندی سے وہ دوبارہ نمودار ہو کر اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتا تھا۔ کسی چیز کو یاد رکھنے کا شاید آسان طریقہ یہی ہے کہ اُسے بھول جانے کی کوشش کی جائے۔ شہید تخیلات کی دنیا میں محو تھا۔ اُس کی چشمِ تصور کے سامنے مختلف شکلیں بن بن کر بگڑ رہی تھیں۔ لیکن اُس کے نہاں خانۂ دماغ میں ایک ہی ہستی تھی۔ جس کا نقش سعیِ پیہم کے باوجود نہ مٹتا تھا۔ یہ احتشام کی لڑکی تھی۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکلی۔ وہ سوچنے لگا کہ گردشِ لیل و نہار بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ جب اُس نے بصد شوق و ارمان اس لڑکی سے رشتۂ مودّت باندھا تھا تو کسے معلوم تھا۔ کہ آسمان اپنا ترکش خالی کرنے کے لئے اُسی کو نشانہ بنائے بیٹھا ہے۔ اور جامِ مسرت اُس کے لبوں تک پہنچتے پہنچتے تلخابۂ حیات میں مبدل ہو جائے گا۔ وہ شبہائے عشرت و روزہائے شادکام کا متوقع تھا۔ لیکن وا حسرتا کہ اُس کی ہر رات کانٹوں پر لوٹ لوٹ کر اور اُس کا ہر دِن آتشِ سوزاں میں جل جل کر بسر ہوا۔ ناسا عدتِ ایام کی کوئی تلخی نہ تھی جس کا ذائقہ اُس کے کام و دہن نے نہ چکھا۔ اور حالاتِ ناسازگار کی کوئی سختی نہ تھی جس کا تجربہ اُس کے دل و دماغ کو حاصل نہ ہوا ہو لیکن ....

اُس نے پھر ایک لمبی سانس لی اور دِل ہی دِل میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ میں اِن آب و آتش کے طوفانوں سے زندہ بچ نکلا"۔

۱

شہید نے مترجم کی حیثیت سے بڑی مستعدی کے
ساتھ کام شروع کر دیا۔ قیام کے لئے اُس نے راوی روڈ
پر ایک مختصر سا مکان بھی کرایہ پر لے لیا۔ کچھ روپے اُس
کے پاس موجود تھے۔ جنہوں نے اُس کے ابتدائی اخراجات
کی کفالت کر دی، اور پھر ماہ بماہ اُسے تنخواہ ملنے لگ گئی۔
جس سے وہ اپنی زندگی نہایت سہولت سے بسر کرنے کے
قابل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے بے تکلفی سے لاہور کی سڑکوں
سیرگاہوں اور تماشا گاہوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔
اب شام کو اُس نے اُسی پرانی سج دھج سے ہاتھ میں لکڑی
لے کر بدن پر کبھی سوٹ کبھی شیروانی اور سر پر سرخ ترکی ٹوپی
پہن کر سیر کے لئے نکلنا شروع کیا۔ دوست آشنا ملتے
تو بڑی سرگرمی سے علیک سلیک ہوتی تھی۔ لیکن شہید
اُن کے استفسارات کا تفصیلی جواب دینے کے بجائے
رمز و کنایہ سے صرف یہ ظاہر کر دیتا تھا۔ کہ وہ حد درجہ مسرور
و مطمئن زندگی بسر کر رہا ہے اور گفتگو اس انداز سے کرتا
تھا کہ گویا اُس کے حال میں اُس کے ماضی کا قطعاً
کوئی دخل نہیں۔ ظفر۔ عنایت۔ جمیل وغیرہ سبھی ملتے
اور شہید کو خوش پوش، شاداں و فرحاں اور سر بلند
و گردن کشاں پا کر دل میں حیران ضرور ہوتے تھے۔ وہ
حقیقتاً اپنے سابقہ طرزِ عمل پر نادم ہو رہے تھے۔ اور
چاہتے تھے کہ شہید سے از سرِ نو ربط و ضبط بڑھائیں
لیکن شہید جس پر چودھویں صدی کی شعلہ آشام دوستیوں
کا پول اچھی طرح کھل چکا تھا، احتراز و کنارہ کشی کو ترجیح
دیتا تھا۔ اُسے صرف ایک خلش بےچین کئے دیتی تھی۔
اور وہ احتشام کا خدشہ تھا۔ وہ حیران تھا کہ احتشام کہاں
ہے، اگر لاہور میں ہے اور شہید کی موجودگی سے باخبر ہے تو
کیوں خاموش ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی ہمدرد و راز آشنا
سے ملاقات ہو۔ تو تفصیل سے معاملات دریافت کرے،
ورنہ یوں وہ ہرگز کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کو
تیار نہ تھا۔ وہ اپنے طرز بود و ماند، اپنے اطوار و حرکات،
اور اندازِ معاشرت سے لوگوں پر یہی ظاہر کرنے کی کوشش
کر رہا تھا۔ کہ وہ ہر قسم کے تفکرات و خدشات سے پاک
خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ اُسے
اپنا پرانا ہم سبق دوست شفیق مل گیا۔ جو قانون کے آخری
امتحان سے فارغ ہو کر اب وکالت شروع کرنے کی فکر
میں سرگرداں تھا۔ شفیق نے اُسے بتایا کہ "تمہارے
لاہور سے چلے جانے کے بعد جب احتشام کو اپنے عزائم
مشئومہ میں ناکامی نصیب ہوئی تو تمہارے اس طرح
یکایک غائب ہو جانے کا کچھ عرصہ تک یہاں خوب
چرچا رہا۔ اکثر لوگ تمہارا تمسخر اُڑاتے تھے۔ احتشام اپنی
روسیاہی کو چھپائے رکھنے کی غرض سے نت نئی تہمتیں
تمہارے خلاف تراشتا تھا۔ اور وہ تمام عیوب و
نقائص جن کا ایک انسان میں موجود ہونا ممکن ہو سکتا ہے
تمہاری طبیعت کا خاصہ بیان کئے جاتے تھے۔ میرے
تمہارے مراسم کا ایک زمانہ کو علم تھا، اس لئے جب
بھی مجھے کسی شناسا سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ تو اکثر و
بیشتر گفتگو کا موضوع تمہاری ہی ذات ہوتی تھی۔ لوگ
بغرضِ استفسار نہیں بلکہ بطور استہزا تمہارے متعلق
پوچھتے رہتے اور بات بات میں طعن و تشنیع کے چبھتے ہوئے
کلمات استعمال کرتے تھے۔ وقت اسی طرح گذرتا چلا،

گیا۔ اور تمہیں لاہور سے گئے ہوئے ابھی شاید پورا ایک سال نہ ہؤا تھا۔ کہ یہاں ایک عجیب واقعہ رونما ہؤا۔ احتشام کی لڑکی گھر سے زرِ نقد اور زیورات کی صندوقچی لے کر ایک نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی۔ احتشام نے اس حادثہ فاجعہ پر پردہ ڈالنے کی بے حد کوشش کی لیکن بات نکل چکی تھی۔ اور احتشام ندامت و شرمندگی کے ساتھ ذلت و رسوائی کے تاریک گڑھے میں ایسا گرا کہ آج تک نیچے ہی نیچے دھنسا چلا جاتا ہے۔ مدت تک وہ اپنے مکان کی چار دیواری کے اندر بند رہا اور دنیا کو منہ نہ دکھا سکا۔ تم جانتے ہو جمہور کا حافظہ تو زیادہ قوی نہیں ہوتا۔ تمہاری غیر حاضری کی وجہ سے لوگ آہستہ آہستہ تمہیں فراموش کر گئے تھے۔ کہ دفعتہً یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا اور شدید ردِ عمل کے ساتھ لوگوں کی ہمدردی تمہاری طرف لوٹ آئی۔ سب تمہیں حق بجانب ٹھہرانے لگے۔ اور جو کچھ تم نے کیا تھا وہ متفقہ طور پر شریفانہ و غیرت مندانہ فعل قرار دیا جانے لگا۔ احتشام اب کس منہ سے تم پر بہتان طرازی کر سکتا تھا۔ جن ہتھیاروں سے وہ تمہارے خلاف مصروفِ پیکار تھا۔ خود انہوں نے اُسے ایسا زخمی کیا کہ وہ اُٹھنے کے قابل بھی نہ رہا۔ جس تن دہی اور چالاکی سے اُس نے رائے عامہ کو تمہارے خلاف مشتعل کیا تھا اُسی تن دہی سے اُس کا ردِ عمل شروع ہؤا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ احتشام کو لاہور کے شرفا اور ذی عزت اصحاب کے حلقہ میں شامل ہونے کی جرأت تک نہیں رہی۔ وہ شاذ و نادر ہی گھر سے نکلتا ہے اور لوگوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ لاہور میں ہے یا کہیں باہر چلا گیا ہے"۔

شہید کے چہرے پر سُرخی سی دوڑ گئی ہے اور اطمینان و کامیابی کے لہجہ میں کہنے لگا "شفیق، میں نہ کہتا تھا۔ کہ وقت ہی سب سے بڑا منصف ہے، وقت ہی کھوٹے کھرے اور حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ ہے اور وقت ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھاتا ہے؛ وقت ہی نے ہمارے درمیان فیصلہ کیا اور یاد رکھو یہی فیصلہ ناطق، برحق اور اٹل ہے"۔

شہید نے اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو مامون و مصئون پا کر اُسی شانِ بے نیازی اور آئینِ خودداری سے رہنا شروع کیا جو ایک زمانہ میں اُس کا شیوۂ خصوصی مشہور تھا۔ لوگوں کو شرفِ دوستی بخشنے میں وہ بہ نسبتِ سابقہ بہت زیادہ بخیل اور محتاط ہو گیا تھا۔ جس طرح ایک بیمار جسم زمانۂ علالت ختم کرنے کے بعد مرض کی سمیت سے صاف ہو کر بہت جلد توانائی حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور خود فطرت حصولِ صحت میں ہر قدم پر اُس کی ممد و معاون بن جاتی ہے اسی طرح نفسِ انسانی جب زہرِ غم سے پاک ہو کر آرام و راحت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ تو خود بخود گذشتہ رنج و اندوہ اور یاس و حرماں کو بھول کر دنوں ہی میں مسرت و شادمانی حاصل کر لیتا ہے شہید اب ایسی طمانیتِ قلب و انبساطِ روحانی کا مالک تھا کہ اس میں معمولی حوادثِ روزگار کا رخنہ انداز ہونا ممکن نہ رہا تھا۔ تیز و تند طوفانوں میں سے گذر کر اور فلک بوس لہروں سے دست و گریباں ہو کر جب بصد مشقت و ہزار دشواری ساحلِ مراد تک رسائی نصیب ہو تو جس دیوانہ وار قوت سے کنارے کو پکڑا جاتا ہے اُس کا اس طبیعت و رائد

گرفت سے کیا مقابلہ۔ جو لبِ دریا کھڑے ہو کر موجوں کا
تماشا دیکھنے والے سبک ساران ساحل کے نازک ہاتھوں
کو حاصل ہے۔ شہید کے پاؤں اب ایک مضبوط چٹان پر
قائم تھے۔ جہاں سے انہیں اکھاڑنا بادِ مخالف کے
جھونکوں کے لئے چنداں آسان نہ تھا۔ محبت، دوستی،
مخالفت، تمول، عسرت، صحت، علالت، غم اور مسرت،
یہ سب چیزیں وہ یکے بعد دیگرے دیکھ چکا تھا۔ اور
اب حیاتِ انسانی کے بہت سے پہلو اُس کی آنکھوں
کے سامنے بے نقاب تھے۔ وہی لوگ جو ایک زمانہ میں
اُسے ہدفِ طعن بنا چکے تھے۔ اب اس گرم جوشی کے ساتھ
ملتے تھے کہ گویا ماضی اور ماضی کے واقعات کبھی معرضِ
وجود میں آئے ہی نہ تھے۔ وہ اس اخوت نما منافقت
کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ لیکن جب اُسے معلوم
ہوا کہ زندگی اسی دھوپ چھاؤں اور بہروپ کا نام ہے
تو اُس نے اپنے جذبات و احساسات کو یکسر علیحدہ
رکھ کر خاموشی سے اس ناٹک کا تماشا دیکھنا شروع کر
دیا۔ اخبار میں کام کرتے ہوئے اُسے سات مہینے گذر چکے
تھے۔ اور عملہ ادارت پر وہ اپنی قابلیت کا سکہ اچھی طرح
بٹھا چکا تھا۔ اُس کی جسمانی و دماغی حالت نہایت
اعلیٰ اور اقتصادی حالت کافی تسلی بخش ہوگئی تھی۔ اب
اُس نے اپنی ہمت و سعی کے میدان کو مزید وسعت دینے
کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ جب نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا
تو وہ فوراً لا کالج میں داخل ہوگیا۔ اُس پر کام کی اہمیت
بخوبی روشن تھی۔ اور وہ خوب جانتا تھا کہ اخبار کی
ملازمت جاری رکھتے ہوئے قانون کا مطالعہ شروع
کرنا سخت کٹھن منزل تھی۔ لیکن اُس نے تہیہ کرلیا تھا۔
کہ وہ اس تعلیمی سلسلے کو جو حالات نامساعد کی وجہ سے
غیر مکمل رہ گیا تھا۔ ختم کر کے چھوڑے گا۔ دوستوں کے
بغیر زندگی گذارنے کی اہلیت تو وہ اپنے اندر پیدا کر
ہی چکا تھا، اب اُس نے اپنے تفریحی مشاغل کو حذف
کر کے مطالعہ کے لئے وقت بچانا شروع کیا۔ آہستہ
آہستہ وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنی جدید و قدیم
مصروفیات کو پہلو بہ پہلو سر انجام دینے کے قابل
ہوگیا۔ پہلا سال اُس نے کامیابی سے ختم کرلیا۔ تو
اُس کے والد نے بالواسطہ خواہش ظاہر کی کہ شہید
اپنی تعلیمی ضروریات کے لئے اُن سے کچھ ماہانہ رقم
لے لیا کرے۔ لیکن شہید نے بصد شکریہ اس پیش کش
کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے نہایت ادب و
انکسار سے عرض کیا کہ وہ اس بارے میں حتی المقدور
اپنا بار خود ہی اٹھائے گا۔ اور جو کچھ وہ اپنی غلطیوں
سے ضائع کر چکا ہے۔ اُسے بحدِ امکان اپنے ہی دستِ
بازو سے حاصل کرے گا۔ دوسرے سال اُس نے
قانون کے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کر کے گویا
اپنے دامنِ شہرت کے سب داغ دھو کر اپنے مستقبل
کو ماضی کے بندھنوں سے کلیتہً آزاد کرلیا۔

اس عرصہ میں میں شہید کے حالت و کوائف سے
ایک حد تک بے خبر ہی رہا۔ مجھے کاروبار کی مصروفیتیں
اور آب و دانہ کی کشش دہلی سے مدراس اور مدراس سے
بنگلور لئے پھرتی رہی۔ دو اڑھائی سال جنوبی ہند میں
بسر کرنے کے بعد میں واپس دہلی آیا اور یہاں آئے چند

ہفتے ہوئے تھے۔ کہ اچانک ایک روز شہید صاحب آدھمکے
اُس کی چال ڈھال، لباس اور چہرے کی بشاشت سے
صاف معلوم ہو رہا تھا۔ کہ حضرت اُس فضا میں سانس لے
رہے ہیں۔ جہاں تنگدستی کی بجائے فراخی، دکھ کی جگہ سُکھ،
اور مایوسی کی بجائے امید و کامرانی کی ہوائیں چلتی ہیں۔
جب ہم تفصیل سے ایک دوسرے کے حالات دریافت کر
چکے تو اُس نے اپنی رام کہانی کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ہر شخص کی تباہی اور بربادی کے ظاہری اسباب
اگرچہ مختلف ہوں۔ لیکن باطنی سبب ایک ہی ہوتا ہے
اور وہ تمام ناکام اشخاص میں مشترک ہے۔ جو انسان اپنے
خیالات پر قابو کھو دے اور ضبطِ نفس کی قوت سے محروم
ہو جائے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں تم آفتاب دے دو۔
اور دوسرے میں ماہتاب، اُس کے قدموں میں بیش قیمت
خزانے لا کر ڈال دو، اور اس کے سر پر دنیا کے سب سے بڑے
شہنشاہ کا تاج لا کر پہنا دو۔ لیکن وہ کامیابی سے ہمیشہ محروم
اور اصلی طاقت سے ہمیشہ بے بہرہ رہیگا۔ یاد رکھو۔ خیال
کی طاقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ خارجی
زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ کامیاب اور ناکام انسان
میں صرف یہی فرق ہے کہ خیالات کامیاب انسان کے
غلام ہوتے ہیں۔ اور ناکام انسان خود خیالات کا غلام،
ہم اشیائے ظاہری کو طاقت و توانائی کا منبع و مخزن سمجھ کر
دیوانہ وار اُن کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہمیشہ
ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔ کہ وہ طاقت جو
پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دے، جو بہتے دریاؤں کی رَوانی
کو تھام لے اور جو زمین کا سینہ چیر کر مادرِ گیتی کے انمول
خزانوں کو باہر کھینچ لائے۔ صرف ہمارے نفس کو میسر ہے
تم میرے اِن الفاظ کو محض میرے زورِ بیان پر محمول نہ کرو
یہ ایک صداقت ہے روشن و بیّن، اور ایک حقیقت ہے
واضح و مبرہن، جس کی شہادت تاریخ عالم کے ہر صفحے
پر ثبت ہے۔ نپولین نے جب غنیم کے ٹڈی دل لشکر کے
سامنے اپنے چند ہزار سپاہیوں کے ساتھ لودی کا پُل
عبور کرنا چاہا تو دشمن کی گولیاں ساون کے مینہ کی طرح
برس رہی تھیں اور پُل پر قدم رکھنا گویا براہِ راست
موت کے منہ میں جانا تھا۔ سپاہیوں نے اس حالت
میں پُل عبور کرنے سے انکار کر دیا۔ تو نپولین، جو حیرت انگیز
شجاعت و بسالت کا مالک انسان تھا، آگے بڑھا اور
نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ پُل پر سے گذر گیا۔ سالار
عسکر کی یہ مثال دیکھ کر سپاہی دیوانہ وار دشمن کی فوج
پر ٹوٹ پڑے اور آناً فاناً میدانِ جنگ کا نقشہ بدل
گیا۔ نپولین کے اِس طرح بچ جانے کو تم اتفاق سے تعبیر
کرو۔ لیکن میرے نزدیک یہ اُس بہادر کی مشہور عالم قوت
ارادہ و جمعیتِ خاطر کا ایک عظیم الشان مظاہرہ تھا۔ ابھی
پچھلے دنوں پشاور میں مجھے ایک ترک فوجی افسر سے ملنے
کا اتفاق ہوا۔ جو افغانستان کی راہ واپس اپنے وطن کو
جا رہا تھا۔ یہ شخص خلافتِ عثمانیہ کے وقت فوج میں کسی
اچھے عہدے پر ممتاز تھا۔ اور جنگِ عظیم میں کئی موقعوں
پر دادِ شجاعت دے چکا تھا۔ اُس کے جسم پر متعدد
زخموں کے نشانات تھے۔ ایک روز میں نے اُس سے
پوچھا کہ "یہ بتائیے کہ جب آپ جنگ میں شامل ہوتے
ہیں۔ اور معرکۂ کشت و خون برپا ہوتا ہے۔ اُس وقت

آپ کے دل میں موت کی دہشت پیدا نہیں ہوتی۔ اور ہلاک ہو جانے کے خیال سے آپ گھبراتے نہیں؟

اُس نے ایک لطیف استعارے میں مجھے جواب دیا۔ کہ "جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف رہا۔ آپ نے تو کبھی میدانِ جنگ کا نقشہ بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، اِس لئے آپ اُن جذباتِ تہور و مردانگی اور اُس جوش و خروش کا ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتے جس سے لڑائی کے وقت ایک سپاہی کا سینہ آتشکدہ بنا ہوتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر گولی کی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ اور جب وہ بندوق کی نالی سے نکلتی ہے۔ تو سیدھی دشمن کے سینہ کا رُخ کرتی ہے۔ جہاں آکر وہ دیکھتی ہے کہ اِس سینہ میں دل ہے یا نہیں۔ اگر اُسے سینہ میں دل نظر آجائے تو واپس لوٹ جاتی ہے اور اگر اُسے معلوم ہو کہ وہاں دل نہیں تو بے تحاشا سینے کے اندر گھس جاتی ہے"۔

اُس تُرک افسر کا یہ شاعرانہ جواب مجھے مدت العمر نہیں بھول سکتا۔ حقیقت یہی ہے کہ جس سینے کے اندر دل ہے۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی آفت کا مقابلہ کر کے موت کو حیات اور مصیبت کو راحت میں تبدیل کر سکتا ہے اور جس شخص کا سینہ دل کی تڑپ سے محروم ہے۔ وہ طوفان کی آمد سے پہلے ہی بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے خوف زدہ ہو کر موت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔ میری چند سالہ پریشانیوں کے اسباب بظاہر کچھ ہی ہوں لیکن یہ امر واقع ہے کہ حقیقی سبب ایک ہی تھا۔ اگر میں اپنے خیالات پر قابو رکھ کر اُنہیں بے راہ رو ہونے سے بچا لیتا تو یقیناً حوادث کے بھنور میں گرفتار نہ ہوتا۔ میری نگاہ میں میرا بدترین اور ناقابل عفو فعل یہ ہے کہ میں نے اپنے معاملہ میں دنیا کو حَکم بنانے کی کوشش کی۔ میری خودداری کو تباہ کر کے اور خود مجھے اپنی نظروں میں ذلیل کرنے کی اس سے مکروہ مثال کیا ہو سکتی ہے۔ کہ میں نے حق و انصاف کے لئے سوسائٹی کو پکارا۔ درآنحالیکہ میں جانتا تھا۔ کہ سوسائٹی کبھی اُن لوگوں کا ساتھ نہیں دیتی۔ جو ہر رطب و یابس میں بلا چون و چرا اُس کے سامنے سرِ تسلیم جھکانا نہیں جانتے۔ مجھے چاہئے تھا کہ خاموشی سے واقعات کی رفتار کا ملاحظہ کرتا اور انجام و نتائج کو وقت کے حوالے کر دیتا۔ کہ وقت کا فیصلہ ہمیشہ غیر جانبدارانہ اور رد و رعایت کی آلودگیوں سے بالکل پاک و صاف ہوتا ہے۔

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

جو ہونا تھا ہو چکا۔ سفرِ زندگی میں طوفانوں کا پیش آنا مقدرات میں داخل ہے۔ ہر انسان کو زود یا بدیر اِن طوفانوں سے دوچار ہونا ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ طوفانوں میں سے گذرے بغیر زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔ لوہا جب تک آہن گر کے ہتھوڑوں سے پس کر نہ رہ جائے۔ فولاد نہیں بنتا۔ آتشِ غم نفس کو بہت سی آلائشوں سے صاف کر کے حیاتِ انسانی کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ یکسر تبدیل کر دیتی ہے لیکن ماضی کی ناکامیوں اور ایامِ رفتہ کے دُکھوں کو بھول جانا ہی قرینِ مصلحت ہے۔ کتنے لوگ ہیں۔ کہ اُن کی زندگیاں محض اِس لئے جہنم زار بن گئیں کہ وہ ماضی کی تلخیوں اور

مصیبتوں کو فراموش نہ کر سکے، اور کتنے انسان ہیں کہ انہوں
نے اپنی زندگیوں کو صرف یادِ ماضی سے مسموم کر کے تباہ کر دیا
یقین مانو ہماری موجودہ خوشی کی قاتل یہی دو چیزیں ہیں،
غمِ ماضی اور فکرِ فردا۔ ہم حال کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے
سے محض اس لئے معذور ہیں۔ کہ ہمارے کاندھے گئے
گذرے دنوں کی تلخ اور بے سود یاد کے بوجھ سے دبے جا
رہے ہیں۔ چند روز ہوئے میرے ایک ستم ظریف کرم فرمانے
از راہ ہمدردی میرے گذشتہ واقعات کو موضوع کلام بنانا
چاہا۔ تو میں نے یہی عرض کیا۔ کہ جو وقت گذر گیا وہ لفظاً
ومعناً گذر گیا۔ اس لئے گڑے مردے اکھاڑ کر از سرِ نو
بین و بکا میں مصروف ہونے سے کچھ حاصل نہیں۔ خوشی
ایک انسانی چیز ہے اور ہر شخص کے لئے خوشی کا علیحدہ علیحدہ
معیار ہے۔ تم نے ابھی میرے متعلق کہا تھا کہ میں جنت
الحمقاء میں گرفتار ہوں۔ یاد رکھو ہر شخص کی اپنے اپنے
حالات و واقعات اور معیارِ عیش و نشاط کے مطابق
الگ الگ جنت ہے اور وہی جنت ہم میں ایک دوسرے
کے نزدیک جنت الحمقاء ہے کون کہتا تھا کہ میرے
افقِ حیات پر بھی آفتاب طلوع ہوگا، لیکن بگڑ کر بننے،
اُجڑ کر بسنے اور گر کر اُٹھنے میں بھی ایک کیف و مسرت ہے
جو اُس شخص کو ہرگز حاصل نہیں۔ جو تمام عمر نہ کبھی گرا اور
نہ تباہی سے دو چار ہوا۔ جس نے شبِ غم کی تاریکی
کو آنسوؤں سے دھو کر صبحِ مسرت کا درخشاں چہرا نہیں
دیکھا۔ وہ خوشی کی حقیقی اور پائیدار لذتوں سے واقف
نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں کہتا کہ صحت کی قدر جاننے
کے لئے بیمار پڑنا یا فارغ البالی کی آسائش پہچاننے کے
لئے تنگ دستی کے شدائد میں مبتلا ہونا ضروری ہے۔ میرا
مدعا یہ ہے کہ زندگی چونکہ ایک طویل جدوجہد کا نام
ہے جہاں تعطل کو موت اور ٹھہر جانے کو ہلاکت سے
موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا سارا زمانۂ حیات
کشاکشِ عمل میں گذار دیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ مقصدِ
زندگی حاصل ہو گیا۔ تخلیقِ انسانی سے قدرت کو صرف
"عمل" مقصود تھا۔ قرآن جہاں کہتا ہے۔ کہ جن و
انس کی پیدائش صرف اس لئے ہوئی کہ عبادت کریں
وہاں عبادت سے مراد بھی "عمل" ہے۔ جدوجہد ہی ہماری
زندگیوں میں ایک جزوِ مشترک ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر،
امیر ہو یا غریب ہر شخص کشاکشِ عمل میں گرفتار ہے۔
منازل کی بلندی و پستی میں امتیاز ہو سکتا ہے، مدعا و
مقصود کی کمتری و برتری میں فرق ممکن ہے، لیکن
اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ ہم میں سے ہر شخص
اپنی اپنی بساط کے مطابق قطع منزل و حصولِ مقصد
کے لئے اعضاء و جوارح کو مصروفِ تگ و دو کئے ہوئے
ہے۔ ہر انسان چھوٹے پیمانے پر خود ایک خالق ہے۔
اور ان تخلیقی قوتوں کو ضائع کرنے کا نام ہی گناہ ہے۔
عملی نقطۂ نظر سے بُرا کام کرنے والا انسان اُس شخص
سے بہتر ہے۔ جس کی قوتیں زنگ آلود ہو کر بے کار ہو چکی
ہیں۔ جس قسم کی زندگی گذشتہ چند برس میں نے بسر
کی ہے۔ وہ کوئی غیر معمولی، انوکھی یا اچنبے کی چیز نہ تھی۔
کہ لوگ یوں حیران ہو ہو کر میری طرف انگلیاں اٹھاتے
پھریں۔ ناکامی زندگی کا ایک جزو ہے۔ اور جو شخص
کُل کو دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ کُل کے مختلف اجزاء دیکھے

بغیر کیوں کر رہ سکتا ہے۔ اگر زندگی کی تعریف کی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ نشیب و فراز، عروج و پستی، ناکامی و کامرانی، تندرستی و بیماری اور اُمید و بیم کا ایک مرقع ہے گویا زندگی کی کامل اور صحیح تعریف میں خوشی کے ساتھ غم اور رنج کے ساتھ مسرت کا آنا لازمی ہے۔ پھر اگر میں نے زندگی کے حسین و روشن رُخ سے لُطف اندوز ہونے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے اُس کے تاریک و درشت پہلو سے متصل رہ کر اپنے دل و دماغ کے لئے سامانِ عبرت و بصیرت حاصل کر لیا۔ تو یقیناً وہی ہوا جو فطرت کا تقاضا اور آئینِ قدرت کا مدعا تھا۔ آگ کی خاصیت ہے کہ وہ ہر چیز کو جلاتی ہے۔ اگر ہم اس آگہی کے بعد اپنا ہاتھ آگ میں رکھیں تو اُس کے جل جانے سے ہمیں حیرت نہیں ہوتی۔ کیونکہ علت و معلول کے سلسلہ میں ان طبعی نتائج کا ظہور ضروری ہے۔ اسی طرح جب زندگی کے متعلق ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ یہاں پھولوں کے پہلو بہ پہلو کانٹے بھی ہیں۔ تو مرغزاروں میں گھومتے اور باغوں میں گل چینی کرتے ہوئے کانٹا چبھ جانے سے شکوہ و شکایت کا دفتر کھول بیٹھنا یا گریہ و زاری سے آسمان سر پر اٹھا لینا ایک مضحکہ انگیز حماقت نہیں تو کیا ہے"؛

عاشق بٹالوی

چند اشعار

از

حضرت آغا حشر کاشمیری

یہی اک عشوۂ رنگیں سے دل کو مست کرتی ہے
وہ دخت چار دہ سالہ جو ہے آغوشِ ساغر میں

نہ پوچھ اے بیوفا کیوں تک رہا ہوں تیری صورت کو
مقدر کی کہانی پڑھ رہا ہوں تیرے تیور میں

کھو زاہد سے کیوں ہے اسقدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیلِ اختر میں

غزل

از:- اختر شیرانی

نکہتِ زُلف سے نیندوں کو بسا دے آکر
میری جاگی ہوئی راتوں کو سُلا دے آکر

فکرِ فردا و غمِ دوش بھُلا دے آکر
پھر اُسی ناز سے دیوانہ بنا دے آکر

عشق کو نغمۂ اُمید سُنا دے آکر
دِل کی سوئی ہوئی قسمت کو جگا دے آکر

کِس قدر تیرہ و تاریک ہے دُنیائے حیات!
جلوۂ حُسن سے اِک شمع جلا دے آکر

عشق کی چاندنی راتیں مجھے یاد آتی ہیں
عمرِ رفتہ کو مری مجھ سے ملا دے آکر

زِندگی بن کے مرے دل میں سما جا سلمیٰ!
موت اِک پردہ ہے یہ پردہ اُٹھا دے آکر

آگ سی دل میں لگا جاتا ہے تیرا ہر خط
آ مرے خرمنِ ہستی کو جلا دے آکر

تیری فرقت میں مرے شعر ہیں کتنے غمگین
مُسکراتی ہوئی نظروں سے ہنسا دے آکر

پھر وہی ہم ہوں، وہی دن ہوں، وہی راتیں ہوں!
یادِ ایام کو آئینہ دکھا دے آکر

شوقِ نادیدہ میں لذت ہے مگر ناز نہیں
آ مرے عشق کو مغرور بنا دے آکر

شبِ فرقت پہ مری ہنستے ہیں، اے خندۂ نور
میرے قدموں پہ ستاروں کو گرا دے آکر

تشنۂ حسن ہوں، اے ساقیٔ میخانۂ حسن
اپنے ہونٹوں سے پھر اک جام پلا دے آکر

کب تلک رونقِ شامِ اودھ اے ماہِ رواں؟
شام لاہور کو بھی صبح بنا دے آکر

ہو چکی سیرِ بہاراں کدۂ قیصر باغ!
باغ لارنس میں بھی پھول کھلا دے آکر

گومتی دیکھ چکی جلوۂ عارض کی بہار
سطح راوی کو بھی آئینہ بنا دے آکر

تیرا "رومان" نیا خواب ہے اختر کیلئے
آ اور اس خواب کی تعبیر بتا دے آکر

ظریفانہ افسانہ

جس روز چچا چھکّن کی عینک کھوئی گئی تھی

(ظریفانہ افسانہ)

از:۔ جناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے

اردو افسانوں میں کردار کشی یا کردار نگاری سے جو افسوسناک بے پروائی برتی گئی ہے، محتاجِ بیان نہیں۔ عمرو عیار اور خوجی کے سوا تقریباً نام ایسا نظر نہیں آتا جسے ایک جامع و مکمل کردار کے عنوان سے یاد کیا جا سکے۔ عمرو عیار کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا "برتی" پیکر اردو ذہانتوں کی پیداوار ہے۔ کیونکہ داستان امیر حمزہ اردو زبان میں فارسی سے منتقل ہوئی ہے، البتہ وہ آب و رنگ جو اس سلسلے کے افسانہائے مابعد میں نصیب ہوا، اسے اردو (لکھنوی) دماغوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اور اس دلچسپ کردار کی تکمیل "ایں ہم غنیمت است" کی روشنی میں ہم سے کچھ نہ کچھ داد ضرور حاصل کر سکتی ہے۔

نظر بر ایں حال "چچا چھکن" کی دلآویز ہستی، اردو کے مزاحی افسانوں اور معاشرتی داستانوں میں، کردار کشی کے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ اور اس کیلئے تاج صاحب کی ژرف نگاہی، افسانوی حقیقت آفرینی، اور تکمیل پردازی، مبارکباد کی مستحق ہے۔

چچا کی بدحواس سیرۃ یا سیرتی بدحواسی کے بعض دلچسپ افسانے قارئین کی نظروں سے گذر چکے ہیں۔ زیر نظر باب اسی سلسلے کی ایک دلکش کڑی ہے۔ جسے امید ہے دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ ہمارے لئے سب سے زیادہ مسرت انگیز امر یہ ہے۔ کہ تاج صاحب یہ دلآویز باب عنایت کرتے ہوئے وعدہ فرماتے ہیں۔ کہ اُن کے ہر قسم کے ذہنی افکار، آیندہ صرف "رومان" کے لئے وقف ہوا کرینگے۔

(ادارہ)

جس روز چچا چھکن کی عینک کھوئے جانے کا حادثہ ہوا۔ اس روز منہ اندھیرے سے وہ بڑے تاؤ میں تھے۔ ایسی حالت میں اگر انہیں جھنجھل اتارنے کا موقع مل جائے۔ جب تو فراغت پاتے ہی اُن کا دل ہر قسم کی کدورت سے

پاک اور آئینہ کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی اتفاق یا مجبوری سے دل کی بھڑاس نہ نکال سکیں۔ تب البتہ گھنٹوں انہیں کل نہیں پڑتی۔ اور جوش کے ریلے بار بار آ کر ایسا بے دھیان کرتے رہتے ہیں۔ کہ آپ میں نہیں رہتے۔ اس روز غسل کے بعد ایسی ہی بے دھیانی میں اپنی عینک کھو بیٹھے۔ اس کے کھوئے جانے کا حادثہ سنانے کے لئے صبح کے وہ واقعات معلوم ہونا ضروری ہیں۔ جن کے باعث چچا اس قدر تپ گئے تھے ✽

سچ پوچھیے۔ تو اس روز چچا کی تنک مزاجی کا کوئی قصور نہ تھا۔ تابڑ توڑ باتیں ہی ایسی ہوئیں۔ جن پر کسی شریف شخص کو غصہ آئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ آپ خیال فرمایئے چلّے کا جاڑا ہو۔ صبح کے تین بجے کا وقت۔ باہر کہرا پڑ رہا ہو۔ گرم گرم لحاف میں میٹھی نیند خراٹے لے رہی ہو اور کوئی شخص نہایت بے احتیاطی سے دروازے کی کنڈی بیٹ پیٹ کر نیند حرام کر ڈالے، اور رسید نہ دیئے جانے پر بھی اپنے اس مذموم فعل سے باز آنے کی ضرورت نہ سمجھے۔ تو خدا لگتی کہیے۔ غصہ آنے کی بات ہے یا نہیں ؟

قہرِ درویش برجانِ درویش۔ لحاف میں سے باہر نکلنا پڑا۔ کنٹوپ پہنا۔ رضائی اوڑھی۔ کھلے میں سے گذر کر سُو سُو کرتے دروازے پر پہنچے۔ کنڈی کھولی۔ دیکھتے ہیں تو خاں صاحب کا ملازم ✽ کہ "ابے پاجی تو اس وقت"؟ بولا "خاں صاحب کے پیٹ میں درد ہے۔ سینک کے لئے ربڑ کی تھیلی مانگی ہے" ✽

خاں صاحب تھیلی لینے خود آ گئے ہوتے۔ تو بالکل جدا بات تھی۔ لیکن ایسے وقت کسی ملازم سے دوچار ہونے اور آداب و تکلفات کو ملحوظ رکھنا واقعہ یہ ہے۔ کہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ✽ چچا نے تھیلی تو لا دی۔ لیکن خانصاحب کی صحت اور درد کی وقت ناشناسی پر ایک مختصر مگر پُرمغز تبصرہ کئے بغیر نہ رہ سکے ✽

ملازم کمبخت کی حماقت دیکھیے۔ کہ تھیلی کے ساتھ ساتھ آپس کی یہ باتیں بھی خاں صاحب کو جا پہنچائیں! چچا دوبارہ لیٹنے نہ پائے تھے۔ کہ کنڈی پھر پٹنی شروع ہو گئی۔ بہت دیر تک انجان بنے رہنے پر بھی گولہ باری تمام نہ ہوئی۔ تو اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔ کہ بعض ناگفتہ بہ الفاظ کہکر دل کا غبار نکالیں۔ اور لحاف پھر اوپر سے الٹ ڈالیں ✽

خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کنڈی کھولی۔ مگر زبان ابھی کھولنے نہ پائے تھے۔ کہ ملازم نے ترت تھیلی ہاتھ میں تھما دی۔ بولا "خان صاحب نے کہا ہے۔ کہ اسے اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجیئے۔ ہم بوتل سے کام چلا لینگے اور اب کبھی آپ ہم سے پالش کی شیشی منگا کر دیکھیئے گا" ✽

سردیوں میں اندھیرے منہ بستر سے باہر نکلوانا۔ اور نوکر کے ہاتھ اخلاق سے ایسی گری ہوئی بات کہلوا کر بھیجنا۔ ایمان ایمان سے کہئے۔ بھلا شرافت ہے ✽ مارے غصے کے چچا کی نیند حرام ہو گئی۔ لیٹے تو۔ مگر تمام وقت بڑبڑاتے ہوئے کروٹیں بدلتے رہے۔ "جیسے ان کے باپ کی میراث میں مجھے ربڑ کی تھیلی ملی تھی . . . اور مزاج تو دیکھیو۔ کہ اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجیے . . . مرغی کا . . . دھمکی دیتا ہے۔ کہ پالش منگا کر دیکھیئے گا . . . جیسے شہر بھر میں یہی تو ایک موچی رہ گیا ہے" ✽

کسی کروٹ نیند نہ آئی۔ تو تنگ آکر سونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُجالا ہونے تک حقے سے غم غلط کرنے کی ٹھانی۔ نوکر چاکر سو رہے تھے۔ چلم لیکر خود باورچی خانے کا رُخ کیا غصہ اسی طرح دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ "آخر گھر ہے کوئی خیراتی ہسپتال تو ہے نہیں۔ کہ جس وقت جس کا جی چاہا۔ سوتوں کو بے آرام کیا۔ اور ربڑ کی تھیلی طلب کر لی۔ چندہ کی تھیلی ہے جو یہ مزاج۔ کہ اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے"؟

باورچی خانے میں جاکر دیکھتے ہیں۔ تو اتفاق سے چولہا ٹھنڈا۔ نہ جانے کچی رات کو بھوبل میں لکڑی دبانا بھول گئی تھیں۔ یا دبی ہوئی لکڑی جل کر راکھ بن چکی تھی۔ چچا کا غصہ اور بھڑک اُٹھا۔ "گھرداری کرنے چلی ہیں۔ آگ تک کا انتظام ٹھیک رکھنے کی توفیق نہیں۔ اور پھر ہر وقت کی یہ ضد کہ میں یہ کرتی ہوں۔ میں وہ کرتی ہوں۔ میں کام سے مری جاتی ہوں۔ حالت یہ ہے کہ گھر میں پالش تک منگا کر رکھنے کا ہوش نہیں۔ ضرورت ہو تو ہمسایوں کے ہاں سے پالش منگایا جاتا ہے۔ اور اُس کم ظرف کو دیکھو۔ کہ پالش کیا دے دی۔ گویا حاتم کی گور پر لات ماردی . . . جو برابر پالش لے لی۔ تو بدلے میں ربڑ کی تھیلی انہیں بخش دو . . . کمینہ کہیں کا"۔

چچا بکتے جھکتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر چلے صحن میں پہنچ کر خیال آیا۔ کہ حقے کے بغیر صبح کرنا محال ہے خود ہی آگ سلگانی چاہیئے۔ واپس ہوگئے۔ دو قدم نہ چلنے پائے تھے۔ کہ پھر لوٹنے کی ٹھان لی۔ پھونکیں مارنے کی زحمت کا خیال آگیا تھا۔ مگر دالان میں پہنچنے کے بعد طلب نے ایسا بے بس کر دیا۔ کہ باورچی خانے میں پہنچے اور آگ سلگانے ہی کی ٹھیرائی۔ بڑبڑاتے ہوئے اِدھر اُدھر سے کاغذ چھیپٹیاں۔ رسی کے ٹکڑے جمع کئے۔ اُن پر کوئلے رکھ کر دیا سلائی دکھائی۔ اور پھونکیں مار مار کر اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑ پھوڑ کر آدھ گھنٹے کی محنت سے کہیں کوئلے دہکائے۔ لیکن اب آپ چلم بھرنے کے لئے تمباکو کے ڈبے کو جو دیکھتے ہیں۔ تو خالی! ڈبہ اٹھا کر زمین پر دے پٹخا! "دیکھی اس کی حرکت! جی میں آتا ہے۔ حرامخور کا قیمہ کرکے رکھ دوں۔ ہزار تاکید کرو۔ پر ان نوکروں کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اور اس بدمعاش کو دیکھو۔ صبح صبح پرائیویٹ بات جاکر خان صاحب سے بیان کر ڈالی۔ کوئی اُس باجی سے پوچھے۔ میں نے خان صاحب کے خیراتی ہسپتال میں داخل ہو جانے کی بات اِس لئے کہی تھی۔ کہ جاکر اُن کے سامنے بیان کر دے۔ مجھے ربڑ کی تھیلی دی ہے۔ تو چپ چاپ جاکر اُن کے حوالے کر آ۔ تجھے دوسروں کے قضیوں سے کیا سروکار؟ اور پھر ان نواب صاحب کا مزاج۔ کہ فرماتے ہیں۔ تھیلی کو اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے"۔

تھیلی کے انڈے یاد آجانے سے غصے کا ایک نیا ریلا آیا۔ جل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں پہنچے جہاں بندو سو رہا تھا۔ سوتے ہوئے کے ایک ٹھڈا رسید کیا۔ اور برس پڑے۔

"حرامخور۔ بدمعاش۔ ہزار دفعہ نہیں کہا۔ کہ ایک چلم کا تمباکو باقی رہے۔ تو اور تمباکو فوراً لے آیا کر۔ مگر لاتوں کے بھوت بھلا باتوں سے مانتے ہیں؟

بندو ہائے رے رائے اور میاں جی میاں جی کرتا ہوا
اُٹھ بیٹھا۔ چچی بھی جاگ گئیں۔ جوتی پہنتی پہنتی لپک کر چچا
کے پاس پہنچیں۔ "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کیوں صبح صبح غریب
پہ برس پڑے"؟

آگ کے سلسلے میں چچی پر بھی غصہ تھا۔ چچا غصے
سے گردن موڑ کر بولے۔ "بس اس معاملے میں میری رائے
محفوظ رہنے دو"۔

بندو بسورتا ہوا بولا "رکھا تو ہوا ہے تمباکو"۔

چچا نے اسے زیادہ نہ بولنے دیا۔ "تو ہم اندھے
ہیں"؟

چچی نے پھر دخل دیا۔ "رات ہی تو اس نے تمباکو
کے لئے مجھ سے چار پیسے لئے ہیں"۔

چچا نے چچی کو کچھ جواب نہ دیا۔ جھک کر بندو کا
کان پکڑا۔ اور اُسے کھڑا کر لیا۔ "دکھا چل کر۔ کہاں ہے
تمباکو۔ تمباکو کے نام سے پیسے لے کر ریوڑیاں اُڑتی
ہیں۔ بدمعاش۔ رات کھا نہیں رہا تھا ریوڑیاں۔ اسی
وقت پیدا نہ کیا تمباکو۔ تو میرے ہاتھوں جیتا نہ بچیگا"۔

بندو نے باورچی خانہ میں پہنچ کر طاق میں سے
تمباکو کا ڈبا نکال چچا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چچا منٹ
بھر ڈبے کو ہاتھ میں لئے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ تمباکو
سے بھرا ہوا تھا۔ پھر گویا اپنی اس خاموشی کی کسر نکالنے
کی غرض سے ایک تھپڑ اور بندو کے رسید کیا۔ "ابے
طاق میں تمباکو۔ تمباکو رکھنے کی جگہ طاق ہے؟ دکان
ہی میں نہ رکھ آیا حرامخور۔ یہ جگہ ہوتی ہے تمباکو رکھنے
کی"؟

بندو آنسو پونچھتے ہوئے بولا: "بیوی جی نے کہا تھا"!

چچا کھسیانے ہو کر اور گرجنے لگے۔ "ابے بیوی جی کے
بچے۔ تجھے خود خیال نہ آیا۔ کہ ضرورت ہوگی۔ تو طاق میں
کہاں تلاش کرتے پھرینگے"؟

بندو نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا: "نیچے
بلیاں گرا دیتی تھیں"۔

مگر چچا کی دلیلیں کہاں ختم ہوتی ہیں۔ "بلیاں گرا دیتی
تھیں۔ باتیں سنو بدمعاش کی۔ تمباکو نہ ہوا دودھ ہو گیا۔ کہ
بلیاں گرا دیتی تھیں"!

چچی دالان میں آ کھڑی ہوئی تھیں۔ غصے کو دبا کر
بولیں: "ہو چکی تفتیش"؟

چچا سر جھکائے جز بز واپس آ رہے تھے۔ جھنجلا کر
بولے: "تمہاری ہی شہ نے نوکروں کو سر پر چڑھا دیا ہے"۔

"کہ تمباکو کا ڈبا طاق میں رکھنے لگے ہیں"؟

"ہمیں کیونکر معلوم ہو سکتا تھا۔ ڈبا طاق میں رکھا
ہے"؟

"عقل سے کام لے کر"۔

چچا نے کچھ کہنا چاہا۔ بات کہنے کے لئے دوبارہ
سینے میں سانس بھرا۔ مگر پھر صرف "ناقص العقل" کہنے پر ہی
اکتفا کیا اور جلدی سے باہر نکل گئے۔

بس یہ واقعات تھے۔ جن کی وجہ سے چچا اس روز
تاؤ میں آ گئے تھے۔ ربڑ کی تھیلی کا قصہ۔ آگ نہ ہونا۔ تمباکو
طاق میں سے نکل آنا۔ بندو کو پیٹنا۔ چچی سے جھڑپ۔ یہ
سب ایسی باتیں نہ تھیں۔ جو دماغی توازن پر اثر ڈالے
بغیر رہ سکتیں۔ صبح سے جو دیوان خانے میں گھسے۔ تو گھنٹوں

باہر نکلنے کا نام نہ لیا۔ چچی نے چائے تیار ہونے کی اطلاع بھجوائی۔ تو امی کو ہاں نہیں کچھ جواب نہ دیا۔ گم سم کھڑے سامنے گھورتے رہے۔ رلو دیکھ دیکھ کر چچی نے چائے کمرے میں بھجوا دی۔ آپ نے لوٹا دی۔ ساتھ کہلا بھیجا۔ "اسے بھی طاق میں رکھ دیں"۔

بس دیوان خانے میں ٹہلے جا رہے تھے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بول بھی رہے تھے۔ کبھی کبھی ہاتھ اور سر ایسے شد و مد سے ہلانے لگتے۔ جیسے پنچوں کے سامنے اپنے طلاق کے دعوے کی وجوہ بیان کر رہے۔ اور اپنی وجوہ کی قوت و صداقت پر مُصر ہیں۔ "نوکروں کے سامنے کیا۔ ہمسایوں تک میں مجھے رسوا کر ڈالا ہے۔ ورنہ اس بچاری کی طاقت تھی۔ کہ پالش کا طعنہ دے جاتا۔ . . . آخر کوئی حد بھی . . . . . بس ہو چکی . . . . اب نہیں . . . اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر انکار . . . . . جب دیکھو نوکروں کی طرفداری۔ جب دیکھو نوکروں کی طرفداری . . . . زندگی اجیرن کر ڈالی ہے . . . . آیا تھا طاق! . . . . طاق کا بچہ . . . . طاق میں پالش کی شیشی منگا کر نہ رکھی گئی . . . . شیشی ہوتی۔ تو میں کیوں منگواتا اس بھڑوے سے پالش؟ میری عقل ماری گئی تھی . . . جو برابر پالش لے کر ربڑ کی تھیلی انہیں دے ڈالو . . . . ہیں تو بڑے چیترا . . . ."

سورج سر پر آ گیا۔ تو نہ جانے بھوک اور حقے کی طلب سے بے چین ہو کر یا ویسے ہی اُکتا کر آپ نے یک لخت باہر جانے کی ٹھیرائی۔ مگر اب تک غسل نہ کیا تھا۔ غسل خانہ اندر تھا۔ اندر کیونکر جائیں؟ دو ایک بار شبنموں میں سے جھانک کر دیکھا۔ کہ اندر کیا صورتِ حالات ہے اور چچی کیا کر رہی ہیں۔ صد افسوس کہ وہ مغموم و متفکر نظر نہ آ رہی تھیں۔ باورچی خانے کے دھندوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ چچا چڑھ کر دروازے کے پاس سے ہٹ آئے۔ کچھ دیر گم سم کھڑے رہے۔ پھر نیت باندھ نہایت بے تعلقی کے انداز سے اندر آئے۔ اور ناک کی سیدھ میں غسل خانے کی طرف چلے۔ چاہتے تھے۔ بغیر کسی کو نظر پڑے غسل خانے میں گھس جائیں۔ اور غسل کے بعد کپڑے بدل کر چپ چپاتے ہمیشہ کے لئے بنے میاں کے ہاں چلے جائیں۔ اور کوئی ہزار بلائے۔ لاکھ منت سماجت کرے ہرگز ہرگز واپس نہ آئیں۔ لیکن حادثاتِ زندگی . . . . . سب کی نظر سے بچ کر غسل خانے تک تو پہنچ گئے مگر داخل ہونے لگے۔ تو سر نے دروازے سے ٹکر کھا کر بتایا کہ چٹخنی لگی ہوئی ہے۔ اُدھر اندر سے للو للکارا۔ "نہیں مانے گا چھٹن۔ میں اماں سے جا کر کہہ دوں گا چھٹن مجھے نہانے نہیں دیتا"۔

چھٹن دیر سے غسلخانے کا دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر للو کو ستا رہا تھا۔ للو نے اس کے دھوکے میں اندر سے چچا کو ڈپٹ دیا۔ اس پر چھٹن کی تو ہنستے ہنستے بُری حالت ہو گئی۔ چچا نے سر سہلاتے ہوئے غصہ سے چھٹن کو دیکھا۔ وہ ہنسی کے مارے دوہرا ہوتا ہوا صحن کی طرف بھاگا۔ اِدھر چوٹ کی تکلیف اور خفت۔ اُدھر اپنے گھر میں آنے کا ایسا نامناسب طریق پر اعلان۔ چچا غصے میں چھٹن کی طرف لپکے۔ وہ دوڑ کر چچی سے جا لپٹا۔ چچی ہنڈیا میں پیاز کڑکڑا رہی تھیں۔ انہوں نے مڑ کر چچا کو دیکھا۔ "ایک کیا ہو؟

ملزم سرحد پار ہو چکا تھا۔ چچا غصے میں لال پیلے ہوتے ہوئے خاموش واپس ہو گئے۔ واپس آ کر دھما دھم غسل خانے کا دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ "نکل باہر۔۔۔ ابھی نکل۔۔۔۔ کہہ جو دیا۔ کہ ابھی نکل۔ جیسا ہے ویسا ہی نکل۔۔۔ آتا ہے یا بتاؤں میں۔۔۔ صابن ہے تو ہُوا کرے۔۔۔"

للّو صابن منہ پر ملے۔ تولیہ لپیٹ باہر نکل آیا۔ چچا نے ایک چانٹا اس کے رسید کیا۔ "پاجی کہیں کا۔ نکل ہی نہیں چکتا تھا۔ ابے کہا جو تھا ہم نے۔ جیسا ہے ویسا ہی نکل آ پیچھے چلا جاتا تھا"۔

ایک چانٹا اور رسید کر کے چچا غسل خانے میں داخل ہو گئے۔ دَن سے دروازہ بند کیا۔ اور کھٹ سے چٹخنی لگا لی۔ اندر چچا غسل میں مصروف تھے۔ دروازے پر للّو کھڑا ریں ریں کر رہا تھا۔ چچی باورچی خانے میں انجان بنی کام میں مصروف تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں غسل خانے کے اندر سے چچا کی آواز سنائی دے جاتی تھی "تو نہیں ہو گا چپ؟۔۔۔ دیکھ میں کہتا ہوں سرک جا یہاں سے۔ نہیں اچھا نہ ہو گا۔۔۔ میں دروازہ کھول کر اتنی لگاؤں گا۔ کہ اماں ربڑ کی تھیلی سے سینک کرتی پھریں گی"۔

تھوڑی دیر بعد چچی چپکی باورچی خانے سے اٹھیں اور للّو کے پاس پہنچیں۔ "کیا ہوا لال؟ کیوں رو رہا ہے؟ آ جا تو میرے پاس آ جا"۔

چچا کی للکار بند تھی۔ پانی گرنے کی آواز بھی اندر سے نہ آ رہی تھی۔ نہ جانے جسم پر صابن لگانے میں مصروف تھے یا چچی کے الفاظ سننے کو کان کواڑ سے لگا رکھے تھے۔ للّو نے سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے بے قصور ہونے کی داستان سنائی۔ چچی اس کی انگلی تھام کر بولیں "چل تو میرے پاس چل۔ ان کے سر پر تو صبح سے بھوت سوار ہے"۔

چچی للّو کو ساتھ لے چل دیں۔ چچی کا یہ فقرہ سن کر اندر چچا چھکّن پر نہ جانے کیا گزری۔ لیکن جب غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلے۔ تو چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اور انداز سے جلالی فقیروں کی بے نیازی کا رنگ جھلک رہا تھا۔ گیلے بدن پر میلا پاجامہ پہنے برآمد ہو گئے تھے۔ اصل میں بڑا تولیہ خود ساتھ لے جانا بھول گئے تھے۔ چھوٹا تولیہ باندھ کر للّو باہر نکل آیا تھا۔ غسل خانے میں سے آواز دیکر تولیہ مانگنا۔ اور اپنی ضرورتمندی کی آواز چچی کے کان تک پہنچانا غالباً حمیّت اور غیرت کو گوارا نہ ہوا تھا۔ سیدھے اس کوٹھڑی میں چلے گئے۔ جہاں کپڑوں کا بکس رکھا رہتا تھا۔

دس منٹ کے بعد چچا کپڑے بدل کر باہر جانے لگے۔ تو عینک کا قصہ درپیش ہو گیا۔ ایک پاؤں دہلیز کے اندر تھا۔ ایک باہر کہ اچانک خیال آیا کہ غسل کے بعد عینک نہیں لگائی۔ عینک لینے غسل خانے میں گئے۔ عینک اتار کر طاق میں رکھنا کچھ کچھ یاد تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اب دیکھا۔ تو وجود نہ تھی۔ طاقوں پر نظر ڈالی۔ ان میں بھی نہ تھی۔ گھڑونچی کو دیکھا۔ فرش اور نالی کا جائزہ لیا۔ کہیں نظر نہ آئی۔ سوچا۔ شاید میلے کپڑوں کے ساتھ کوٹھڑی میں چلی گئی۔ واپس کوٹھڑی میں پہنچے۔ کپڑے لا کر تخت پر رکھے تھے۔ عینک تخت پر بھی نہ تھی۔ ہر کپڑے کو احتیاط سے جدا کر کے اٹھایا۔ ٹٹول

ٹٹول کر دیکھا۔ جھٹکا۔ کہیں بھی نہیں۔ "گئی کہاں"! تو تیں اور نیم دائرہ بناتے ہوئے کھڑے گھومتے رہے۔ سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ کہ لاکر عدم توجہی میں کسی اور جگہ نہ رکھدی ہو۔ مایوسی ہوئی۔ لپکے ہوئے پھر غسل خانے میں پہنچے۔ پھر کھڑکی کو دیکھا۔ کھڑکی کے نیچے نالی تھی۔ اکڑوں بیٹھکر اس کا معائنہ بھی کرلیا۔ اسے ناکافی سمجھ کر باہر گئے۔ غسل خانے سے سڑک تک ساری نالی دیکھ ڈالی۔ نہ ملی۔ واپس غسل خانے میں پہنچے۔ گردن گھما گھما کر طاقوں میں نظر ڈالی۔ گھڑونچی کے نیچے دیکھا۔ گھڑے جگہ سے سرکائے کہیں نظر نہ آئی۔ ذرا دیر پریشانی کے عالم میں کھڑے سر کھجاتے رہے۔ "عجب تماشہ ہے"! لپکے ہوئے پھر کوٹھڑی میں پہنچے۔ میلے کپڑے باری باری سے اس زور سے جھٹکے۔ کہ عینک کیا۔ سوئی بھی لگی ہوتی۔ تو الگ ہوکر گر پڑتی۔ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ"! یک لخت نیا خیال سوجھا۔ بھاگے ہوئے پھر غسل خانے میں پہنچے۔ لوٹے اٹھا کر دیکھنے سے رہ گئے تھے۔ وہاں بھی کچھ نہ نکلا"! آخر ہوئی کیا!" گردن بڑھا کر احتیاطاً ایک نظر لوٹوں کے اندر بھی ڈال لی۔ کہ آپ جانیئے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اس کی قدرت سے کیا بعید ہے۔ کچھ سراغ نہ ملا۔ ڈاڑھی کھجاتے ہوئے پھر کمرے میں آگئے۔ "یعنی یہ قصہ کیا ہے"؟ ذرا دیر کھوئے کھوئے کھڑے رہے۔ پھر تخت پر بیٹھ گئے۔ سر جھکا کر ایک نظر احتیاطاً تخت کے نیچے بھی ڈال لی۔ اچانک خیال آیا۔ کہ شاید عینک لگا کر غسل خانہ میں گئے ہی نہ تھے۔ وہاں عینک اُتار کر رکھنے کا یونہی وہم ہے۔ چپکے بیٹھکر صبح سے اس وقت تک کے واقعات پر

غور فرمانے لگے۔ کہ شاید اسی طرح کسی موقعہ پر عینک اُتارنا اور کہیں رکھنا یاد آجائے۔ صبح کے پہلے واقعے کے ساتھ ہی خانصاحب کا خیال آگیا۔ جل کر بے اختیار منہ سے نکلا۔ "ہُنہہ۔ بڑا کی تھیلی"۔ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سوچا عینک کہیں بستر ہی میں نہ رہ گئی ہو۔ دالان میں جاکر سارے لپیٹے ہوئے بستر تلپٹ کر ڈالے۔ ان میں سے اپنا بستر ڈھونڈ کر نکالا اس کی ایک ایک چیز دیکھی۔ جھٹکی۔ تکیوں میں ٹٹولا۔ عینک کا کچھ سراغ نہ ملا۔ مایوس ہوکر ایک بار پھر غسل خانے میں پہنچے۔ کہ شاید اس دوران میں عینک سیر سپاٹے سے فارغ ہوکر واپس ہوگئی ہو۔ مگر نہیں آئی تھی۔ مجبوراً کوٹھڑی میں تخت پر کھوئے کھوئے جا بیٹھے۔ "یعنی حد ہوگئی"! یکلخت دیوان خانہ میں دیکھنے کا خیال آیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتے وہاں پہنچے۔ میزیں، کرسیاں، فرش، طاق۔ ایک ایک چیز دیکھ لی۔ عینک کہیں ہو تو ملے۔ چچا کھسیانے سے ہو چلے! "کیا واہیات ہے"! بے اختیار جی چاہتا تھا۔ نوکروں اور بچوں کو امداد کے لئے پکاریں۔ لیکن حالات اجازت نہ دیتے تھے۔ چچی سے نوک جھونک ہونے کے بعد نوکر اور بچے چچی کی رعایا معلوم ہونے لگتے تھے۔ ان سے امداد طلب کرنے میں ہیٹی ہوتی تھی۔ پریشانی کے عالم میں یوسف بے کارواں بنے پھر رہے تھے۔ دماغ ایک ہی اُدھیڑ بن میں مصروف تھا۔ کہ اور کس جگہ گئے تھے۔ ممکن ہے عینک وہاں چھوڑ آئے ہوں۔ اچانک باورچی خانے کی یاد آئی۔ وہ طاق والا واقعہ۔ بندو کی حماقت پہ چچی کا نامناسب رویہ۔ دل نے کہا۔ عینک ضرور باورچی خانے میں ہے۔ آگ سلگاتے ہوئے اُتار کر رکھ دی۔ اُٹھانے

کا خیال نہ رہا۔ ایک چور نظر ترچھی پر ڈالی۔ وہ ہنڈیا میں
کفگیر چلا رہی تھیں۔ یہ ایسی چپ چپ اور انجان سی
کیوں بنی بیٹھی ہیں، گویا کوئی بات ہی نہیں۔ اس طرف نظر
نہیں اٹھاتیں۔ چہرے پر کیا پارسائی اور شہید پن برس رہا ہے
یک لخت معمہ حل ہو گیا۔ بیٹیا رہے نمازی تو ضرور ہے
دغا بازی چھپا رکھی ہے عینک جبھی تو بے نیازی کا یہ عالم
ہے۔ کہ آخر ہار جھک مار کر مانگنے آئیگا۔" چچا چل کر اندر چلے
گئے۔ کواڑ کے شیشوں میں سے زیادہ غور سے چچی کو دیکھنا شروع
کیا۔ چچی نے اتفاق سے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا۔
چچا کا شبہ یقین کو پہنچ گیا۔ "اب اس طرف دیکھا نا میں
پہلے ہی جانتا تھا۔ چپکے چپکے میری پریشانی کا تماشہ دیکھ
رہی ہیں۔ اس بچپن کی بھلا کوئی حد بھی۔ کیا بے معنی عورت
ہے۔ اچھی بات ہے۔ میں نے بھی بیگم صاحبہ کا پاندان
ہی غائب نہ کیا ہو تو کہنا"۔

بے تابی کے عالم میں کبھی صحن سے گزر کر باہر جاتے
کبھی اندر آجاتے۔ کنکھیوں سے چچی کو تاڑتے جا رہے تھے
کبھی باہر کھڑے ہو کر داڑھی کھجانے لگتے۔ کبھی اندر آ کر پیٹ
سہلانا شروع کر دیتے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کریں۔" کیا
بیہودہ مذاق ہے! اور اگر میں ان کی اوڑھنی کو دیا سلائی
دکھا دوں۔ جب! اندر کھڑے چور نظروں سے بار بار
باورچی خانے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کہ اتفاق سے بنو
ہنڈکلیا کا سامان لئے ادھر سے گزری۔ چچا نے اسے
اشارے سے بلایا۔ آہستہ سے کہا "بنو! ایک کام کیجو۔
ہماری عینک کھو گئی ہے۔ باورچی خانے میں کہیں
رکھی تھی۔ ڈھونڈ کر لادیگی؟"

بنو نے پوچھا۔ "کون سی عینک"؟
چچا بولے: "احمق کہیں کی۔ جو عینک ہم لگاتے ہیں۔
اور کون سی۔ مگر دیکھ۔ تیری اماں کو نہ معلوم ہونے پائے"۔
بنو چچا کا منہ تکتے ہوئے بولی "اپنی عینک لگا تو
رکھی ہے آپ نے"؟
چچا نے چونک کر ہاتھ آنکھوں کی طرف بڑھایا۔
"ہیں"! یقین نہ آیا۔ کہ جس شے کو ہاتھ نے چھوا۔ وہ عینک
ہی ہے۔ اتار لی۔ ہاتھ میں لیکر گھما گھما کر دیکھنے لگے۔ پھر
حیرت کے عالم میں ایک نظر بنو پر ڈالی "یہ یہیں تھی! کب
لگائی تھی ہم نے"؟
بنو کو چھوٹی ہنسی۔ قہقہہ لگاتی اور اماں اماں کرتی
ہوئی یہ بات سنانے باورچی خانے کو چلی۔ چچا نے لپک
کر پکڑ لیا "ہیں ہیں! کیا ہوا؟ کہاں چلی؟ گلاب جامن
کھائے گی؟ وہ بات تو ہم نے مذاق میں کی تھی۔ پاگل
کہیں کی۔ اس میں اماں کو سنانے کی کیا بات۔ دیوانی ہوئی
ہے۔ کیا لائیں تیرے لئے بازار سے؟ تھپڑ مارونگا میں"۔
بنو نے قہقہہ اور اماں اماں کی رٹ بند نہ کی۔ تو
چچا نے غصے میں اسے دھکا دیا۔ وہ غریب گر کر رونے لگی۔
چچا جلدی سے باہر نکل گئے۔

شام کو چچا گھر آئے۔ تو لدے پھندے تھے۔ ایک
ہاتھ میں مٹھائی کی ٹوکری۔ دوسرے میں کچوریوں کی۔ دروازے
میں قدم رکھتے ہی بچوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ ایسے خوش
گویا صبح کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ سب کو لیکر پلنگ پر بیٹھ گئے۔
مٹھائی اور کچوریوں میں سے قلو اور بنو کو اوروں سے زیادہ
حصہ ملا۔ چچی کا حصہ ان کے لئے باورچی خانے میں بھیج

دیا گیا۔

فراغت پانے کے بعد بندو کو لے کر ڈیوڑھی میں پہنچے گئے۔ اس سے کہا۔ "بندو یار۔ یہ تو لو تم ایک آنہ۔ اور اگر ایک کام کرو۔ تو چونی انعام۔ خاں صاحب نمبر کی دکان پر حجام کے ہاں خط بنوانے آیا کرتے ہیں۔ اپنا بائیسکل باہر رکھ جاتے ہیں۔ اب کے آئیں۔ تو اُن کے بائیسکل میں پنکچر کر دیجیو"۔

اقوالِ زرّیں

از:- آقائی محمد علی خان ایم۔ اے۔ وائس پرنسپل حبیبیہ کالج (کابل)

نیکی، بدسرشت دماغوں میں زہر بن جاتی ہے (بائرن)

ہدف یا نشانے سے دور کھڑا ہونا بہترین سپر ہے۔ (ہوریس)

محتاج کی تکلیف رفع کرنے کے لئے دوسروں سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔ (فیلن)

عشق ایک لطیف دیوانگی ہے لیکن حرص ایک جدی دیوانگی۔ (شانفر)

لفظ "زندگی" کا صرف ایک مترادف ہے۔ اور وہ "فداکاری" ہے (پرنس اسٹفانی)

لوگ کمینے کو کبھی نہ کبھی معاف کر سکتے ہیں مگر تحقیر کو کبھی نہیں۔ (نزول)

سخاوت، زیادہ دینا نہیں موقع سے دینا ہے۔ (لابرودیر)

کارِ خیر سے ہات روکنا ایک بڑے شر کا ارتکاب کرنا ہے۔ (جین جیکوٹی روسیو)

دوسرے کاموں کی طرح، ازدواج میں بھی محبت، ثروت سے بالاتر ہے (مویبر)

شاید کسی چیز میں بھی انسان کے لئے مقصد حاصل کرنا مقدر نہیں ہوا ہے مگر اس کا فرض مقصد کے حصول کی کوشش کرنا ہے۔ (گیبزو)

آنکھ کے آنسو، کدورتوں کو یاس و دیوانگی سے مبدّل نہیں ہونے دیتے۔ (لے ہنٹ)

قانون اور حق دو چیزیں ہیں جن کو خدا نے توام پیدا کیا تھا۔ لیکن لوگوں نے انہیں جدا کر دیا ہے۔ (کولنن)

گذشتہ زندگی کے تصور سے متلذذ ہونا دوبارہ زندگی بسر کرنا ہے۔ (مارشل)

ادائے فرض کے لئے آمادہ ہو جانا کافی نہیں ہے۔ ادائے فرض کا راستہ بھی جاننا چاہئے۔ (گیبزو)

دوستوں کو جلد دوست نہ بناؤ اور جلد دور نہ کرو۔ (سولن)

غزل

اختر شیرانی

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھُلا دیں
محبت کریں، خوش رہیں مُسکرا دیں!

غرور اور ہمارا غرورِ محبت!
مہ و مہر کو اُن کے دَر پر جھُکا دیں!

جوانی ہو گر جاودانی تو یارب
تری سادہ دُنیا کو جنت بنا دیں!

شبِ وصل کی بیخودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں!

بہاریں سمٹ آئیں، کھِل جائیں کلیاں
جو ہم تم چمن میں کبھی مُسکرا دیں

عبادت ہے اِک بیخودی سے عبارت
حرم کو مئے مشکبو سے بسا دیں!

وہ آئیں گے آج اے بہارِ محبت!

ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں!

بناتا ہے منہ تلخیِ مے سے زاہد

ابھی باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں!

ہیں مجنوں مگر ناز لیلےٰ وشی ہے

جسے چاہیں دیوانہ اپنا بنا دیں

جنہیں عمر بھر یاد آنا سکھایا!

وہ دل سے تری یاد کیونکر بھلا دیں؟

تم افسانۂ قیس کیا پوچھتی ہو؟

ادھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں!

یہ بیدردیاں کبتک اے دردِ غربت؟

بتوں کو پھر ارضِ حرم میں بسا دیں!

وہ سرمستیاں بخش، اے رشکِ شیریں،

کہ خسرو کو خوابِ عدم سے جگا دیں

ترے وصل کی مستیاں کہہ رہی ہیں!

دو عالم تو کیا ہم خدا کو بھلا دیں

انہیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا،

مرے عشقِ رسوا کو اختر دعا دیں!

شعرِ منثور

مُردہ زندہ

(مصر کے مشہور ادیب توفیق مفرج کے قلم سے)

مترجمہ:-

پروفیسر عبدالباسط ایم۔اے ایل ایل بی (علیگ) فیلو مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ)

شعر و عشق اور جوانی و دل کو، جو تمامتر زندگی کا خلاصہ ہیں، الوداع کہتا ہوں۔ اُن احساسات سے جن کا شعلہ ہنوز، دل کی انگیٹھی میں بھڑک رہا ہے، موسیقی سے، اس کے شیریں و رنگین نغموں سے، تمام آسمانی الہامات اور خیالات سے، رخصت چاہتا ہوں۔ رخصت ہوتا ہوں ٭

مجھے اپنے راستے پر جانے دو! مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو!

میں ادب و شعر کو چھوڑ کر تجارت میں اور حکمت و افکار سے منہ موڑ کر، مال و دولت جمع کرنے میں مشغول ہو گیا ہوں اور تجھ سے بھی ——— اے میرے قلم! "خدا حافظ"!

آج سے دس سال پہلے میں نے اپنے آپ کو دنیا کے بے کراں دریا کے حوالے کر دیا۔

میں اپنے دل میں کہتا تھا "میں ادیب ہوں۔ ادب سے محبت کرتا ہوں۔ دانشمند ہوں، دانش کی پرستش کرتا ہوں۔ مفکر ہوں، فکر و تامل کو محبوب رکھتا ہوں۔

میں نے راہ گزاروں میں، چوراہوں پر کھڑے ہو کر اپنے افکار و تخیلات کے متاع و ثمر پیش کئے۔

کُند دل اور بد مذاق لوگ جو میرے قریب سے گزرتے تھے۔ مجھے تحقیر و اہانت کی نظروں سے دیکھتے۔ ان کی نگاہوں میں حقارت کی دلآویز "شفقت" اور عیب جوئی کی مسکینی آمیز ہمدردی" جھلکتی تھی ٭

رہگیروں کی باتیں، امواج ہوا کی مدد سے، میرے سامنے کی فضا میں منعکس ہو کر، تکرار کرتی تھیں ——— "ایک بدنصیب شاعر اور بے نوا ادیب"!

میں اپنی فریاد رسا کے پردے میں صدا لگا رہا تھا!
"میرے پاس اشعار ہیں! حکمت کے افکار ہیں!
مجھ سے فلسفہ مانگو! مجھ سے ادب طلب کرو"!
کوئی کان، اس فریاد کو سننے کے لئے موجود نہ تھا۔
کوئی جواب دینے والا نظر نہ آتا تھا۔
کوئی خریدار آگے نہ بڑھتا تھا۔
میرے افکار کی رونق بجھ گئی۔ میرے احساسات کی متاع، دل کے خزانے میں، تباہ ہوگئی۔ میری تمام امیدیں اور آرزوئیں اس کسادی کے ہجوم میں پامال ہوگئیں، نابود ہوگئیں!
لاچار، شعر و حکمت سے کنارہ کش ہوکر، تجارتی کاروبار میں مصروف ہوگیا۔

میں، چند سال بعد، دوبارہ ان لوگوں کے پاس گیا، جنہوں نے شاعری کے زمانے میں میری تحقیر کی تھی میں نے کہا:۔
"تازہ سامان لایا ہوں"۔
کئی موٹروں کا مالک ہوں۔
بیسیوں عمارتیں میرے قبضہ میں ہیں۔
بہت سی جاگیریں خرید چکا ہوں"۔
میں نے دیکھا۔ کہ کل والے دشمن، آج دوست بن گئے ہیں۔
وہی، جو کل کہتے تھے۔ کہ یہ بدنصیب شاعر اور بے نوا ادیب ہے۔ وہی آج بدل گئے ہیں اور کہہ رہے ہیں:۔
"بہت بڑا تاجر، بلند مرتبہ امیر اور دولت مند ہے"!
میرے مادی اسباب نے کامیابی حاصل کی۔ دنیا مادی ہے۔ مادیات کی پرستش کرتی ہے۔
میری ادبی و فکری متاع کساد بازاری کی بھینٹ چڑھی۔ دنیا ادب و شعر اور فلسفہ و حکمت سے روگرداں ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو پسند نہیں کرتی ۔

لیکن میں:۔
وہ تاجر جو بہرہ مندی کے پردے میں زیاں کار ہوں۔

میں ـــــ وہ بے نیاز ادیب جسے اپنے نفقر و ہیچ میرزی کا احساس ہے۔
میں، جو اپنے جسم کی خریداری کے لئے، اپنی روح کو فروخت کرچکا۔
میں، کہ جسمانی لذتوں کے حصول میں، اپنی ادبی روح کھو بیٹھا۔ زندگی اور علوئے زندگی کے بلند قلعوں سے نیچے اتر آیا۔ ایک روشن و پر نور وادی سے ایک تیرہ و تار جنگل میں آ پڑا ٭
آسمانِ خیال سے پست زمین پر آ گرا۔
اپنے سپہر تخیل کے نذین و عالیشان محلات کو فروخت کرچکا۔ تاکہ زمین کی پستیوں میں ایک مختصر و تنگ گوشہ خریدوں۔
میں وہ شاعر ہوں، جس کے دیوان کے لئے محکمۂ عالیہ ادب کی طرف سے ناکامی کا اعلان ہوا۔
میں وہ تاجر شاعر ہوں، جس نے اپنی شاعری کی موت برداشت کی۔ تاکہ ایک تاجر زندہ ہو۔

آج اپنے تمام مال و متاع کو، جو میں نے جمع کیا ہے، اپنے برابر رکھکر دیکھتا ہوں۔ کہ یہ سب کچھ میرے شعر و سخن کے ایک حرف کی برابری نہیں کرسکتا۔
اس لئے کہ:۔
میری شاعری، روح کی زائیدہ اور اس کی زندگی کی غذا ہے۔ میری شاعری روح کی رفیق اور موت کے بعد موت کے ماورا، دُنیائے ابدیت و جاودانیت میں، اس کی مونس ہے۔
کامرانیوں اور شادمانیوں کے ہجوم میں، سوگواریوں اور دلفگاریوں کے موقع پر، روح کی تسکین کا سرمایہ ہے۔ کیونکہ شاعری، بجائے خود ایک دائمی و ابدی، ایک پائیدار و برقرار روح ہے۔
میری شاعری، میری زندگی میں، میرے وجود کا جزو لاینجزیٰ ہے اور موت کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہیگا۔ مگر نقد و زر، مال و متاع ایک طفلانہ بازی گاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ چند روز میں اس کے ساتھ کھیلتا رہوں گا۔ اور بعد ازاں اسے دوسروں کے کھیلنے کے لئے چھوڑ جاؤں گا ٭

آہ! اے خوش رنگ و خوبصورت دُنیا! کہ تیرے بچوں کی معاشرتی صحبتوں کے دوران میں میں نے تجھے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ تو بتا!۔ . . . ہاں تو ہی بتا۔ کہ میں ایک تندرست جسم اور صحیح عقل رکھتے ہوئے، قلم سے کیونکر کنارہ کش ہو جاؤں؟! میں اپنی شاعری کو کس طرح دور پھینک دوں۔ اور وہ بھی محض اس لئے کہ میں تجارت کی طرف لوٹ آؤں۔
میں ایک ایسے کام میں کیونکر محنت کروں۔ جس کا مقصد صرف ایک دن زندہ رہنے کے لئے ابدالآباد تک کے

لئے مرجانا ہو۔

آہ، اے وہ لوگو! کہ مجھے جانتے ہو! مجھ پر ایک نظر ڈالو! مجھ سے اپنی شفقت کو دریغ نہ رکھو! میں ایک زندہ مُردہ ہوں!

ذرا اس مُردے کے کفن کو دیکھو! اس کا کفن سرتاسر کاغذ کا ہے۔ اور اس کے اوپر لکھا ہے۔ کہ اس کی قیمت زر وطلا سے ادا کی گئی ہے +

میرے جنازے کی طرف دیکھو! جو کبیرکا فذاات کا ہجوم اور صفحات کا انبار ہے۔

میری قبر کی طرف دیکھو! چاندی کا ورق ہے جس کی طلائی ورق سے آرائش کی گئی ہے۔

آہ! میں نے دنیا کے لوگوں سے زندگی کا جوا کھیلا۔ اور اپنی روح اس دنیا کے پاس ہار بیٹھا۔

اے آسمان! لے لے! ہاں، میری تمام ہستی کو لے لے! لیکن میری شاعری مجھے واپس دے دے۔

میں نے شاعروں کا لباس پہنا! میرا جسم بھوک اور سردی سے مرجھا گیا۔

میں نے سوداگروں کا لباس پہنا۔ میرا جسم ریشمی لباس کی نعمتوں سے لذت یاب ہو گیا۔ لیکن روح ——

وہ روح، جس نے شاعر کے پیکر میں، فقر و بدنصیبی سے پرورش پائی تھی، وہ رُوح ہے، جو دولت مند تاجر کے جسم میں، ہمیشہ متالم و اندوہگیں ہے —— !!

فوّارہ

میاں تصدق حسین خالد ایم۔ اے

(بیرسٹر ایٹ لا، لندن)

کھیلتا ہے چمن میں فوّارہ
پتیاں گر رہی ہیں گرد اگرد

زرد، اودی، سفید، نیلی، سُرخ
رنگ اُن کا وہ گیروانہ سا

پتھروں سے چمٹتا جاتا ہے
زندگانی کا منہ چڑھاتا ہے

افسانہ

آزادی

(موجودہ تہذیب پر ایک طنز)

از:- م۔عمر فاروق ایم۔اے۔مدیر "غزال"

وہ کمرے کے اندر اس تیزی سے داخل ہوئی جیسے کوئی گیند شیشے کو توڑ کر اندر گرتی ہے۔ اور بات کرنے سے پہلے دیوانہ وار ہنسنے لگی۔ ہنستے ہی ہنستے چلانے لگی۔

"اُف اُف۔ میں نے ایک ماہ پہلے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اور اپنی سہیلی کو بتایا تھا۔ کہ اپنے شوہر سے بدلہ لینے کے لئے اس سے بے وفائی کر کے آئی ہوں۔ لیکن وہ تو صرف اس لئے تھا کہ میرا پہلا شوہر بہت بیوقوف اور حاسد تھا"۔

اس کی سہیلی نے، جو صوفے پر بیٹھی مطالعہ میں مصروف تھی، کتاب پھینک کر اینٹی کی طرف متعجب نظروں سے دیکھا اور ہنسنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پوچھا "آج کیا کارنامہ کر کے آرہی ہو"؟

اُف ——— میری جان ——— میری جان نہایت ہی عجیب بات ہے۔ حد درجہ عجیب ...... خیال تو کرو۔ میں بچ گئی ...... میں آزاد ہوں، آزاد ...... بالکل آزاد"

"کیا مطلب"؟

"ہاں بالکل بچ گئی"۔

"کس مصیبت سے"؟

"اپنے شوہر سے! ...... اب میں آزاد ہوں۔ مجھے نجات مل چکی ہے۔

"کیسی آزادی! — کیسے ملی"؟

"واہ، کیسے ملی؛ طلاق سے اور کیسے۔ تم بھی عجب بھولی بھالی ہو"

"تو تمہیں تمہارے شوہر نے طلاق ......"

"نہیں نہیں۔ ابھی نہیں۔ تم کتنی بیوقوف ہو۔ صرف تین گھنٹے میں تو ایسے کام نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں نے ثبوت مہیا کر لیا ہے کہ اس نے مجھ سے بیوفائی کی ہے ...... خیال تو کرو۔ میں نے ثابت کرنے میں کمال کیا ہے۔ بس اور کیا بتاؤں تم سمجھتی ہو ...... بالکل، بالکل بے وفائی ثابت کر دی"۔

"مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ تو کیا واقعی اُس نے تم سے بیوفائی کی"؟

"ہاں ...... بالکل ...... میرا مطلب ہے، ہاں! — نہیں۔ آہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میرے پاس ثبوت ہیں۔ اور بس۔ اُنہیں کی مجھے ضرورت تھی"۔

"لیکن ثبوت تم نے کیسے حاصل کئے"؟

"واہ ثبوت — دیکھو نا۔ تم جانتی ہو میں کتنی شوخ ہوں اور وہ برابر مجھ پر تین ماہ سے ظلم کر رہا تھا ظلم، سمجھتی ہو نا، مجھے یقین ہو گیا تھا۔ کہ اس سے میری نہ نبھیگی۔ اور انجام کار مجھے علیحدہ ہی ہونا پڑیگا لیکن دقت یہ تھی۔ کہ یہ سب کچھ کیونکر ہو۔ تم جانتی ہو یہ کوئی آسان کام تو ہے نہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ مجھے پیٹے۔ لیکن اس نے مجھے ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس نے میری زندگی دو بھر کر دی جب میں چاہتی کہ گھر پر رہوں وہ مجھے باہر لے جاتا۔ اور جب میں چاہتی کہ تنہا سیر کو جاؤں تو وہ مجھے گھر میں قید رکھتا۔ لیکن افسوس ہے کہ مجھے اس نے پیٹا کبھی نہیں۔ پھر میں اس تلاش میں رہی کہ اس کی کوئی معشوقہ مل جائے۔ اس قماش کے شوہروں کی طرح اس کی بھی ایک معشوقہ تھی ضرور لیکن وہ نہایت احتیاط سے اس سے ملنے جاتا۔ ان دونوں کو یکجا پکڑنا بے حد مشکل تھا۔ بھلا سوچو تو سہی میں نے کیا طریقہ اختیار کیا ہوگا؟"

"مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا۔"

"تمہارے خیال میں یہ بات کبھی آ ہی نہیں سکتی۔ .... میں نے اپنے ایک واقف سے کہا کہ کہیں سے اس کی ایک تصویر مہیا کرے۔"

"تمہارے شوہر کی معشوقہ کی تصویر؟"

"ہاں اسی کی۔ میرے واقف بیچارے نے پندرہ لوئیس خرچ کرنے کے علاوہ سات بجے سے رات کے دو بجے تک وقت ضائع کیا تب کہیں جا کر اس کی تصویر حاصل کی۔"

"لیکن تصویر تو میرے خیال میں اصل کے حاصل کرنے کے بغیر بھی مل سکتی تھی۔"

"نہیں، ایسا نہیں۔ مجھے اس کی خوبصورتی کے علاوہ اور بہت سی باتوں کا مکمل حال معلوم ہونا چاہئے تھا"

"وہ کیوں؟"

"واہ بھولی۔ میں اس تصویر کو لے کر ایک مشہور فرم کے مینیجر کے پاس گئی۔ ایسی فرم جو ہر قسم کے کام کر لیتی ہے۔ تم سمجھتی ہو میرا مطلب کیا ہے؟"

"ہاں ہاں۔ تم بات کئے جاؤ"

"میں نے اسے تصویر دکھا کر کہا کہ مجھے ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ جو اس تصویر کے مشابہ ہو اس کے معاوضہ میں مجھے جو کچھ دینا پڑے گا دوں گی روپے کی پرواہ نہیں خواہ دس ہزار فرانک ہی کیوں نہ ہوں۔ اور یہ لڑکی مجھے صرف تین ماہ کے لئے درکار ہے۔"

مینیجر نے سخت حیران ہو کر کہا "آپ کو نیک اور پاک سیرت خادمہ چاہئے کیا؟"

میں گھبرا سی گئی لیکن میں نے کہا "ہاں بہت نیک۔ دیانتدار......

اس نے پھر کہا "...... اور جناب...... اخلاق اور چال چلن کے متعلق"

جواب دینے کی مجھ سے جرأت نہ ہوئی۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر معاً مجھے خیال ہوا۔ کہ اس کے دل میں میرے متعلق عجیب سے شکوک

پیدا ہو رہے ہیں۔ میں فوراً بول اُٹھی...... جناب...
یہ میرے شوہر کے لئے ہے تاکہ میں اُسے........"
مینیجر بیوقوف نہ تھا۔ وہ سمجھنے لگا اور ہنسنے لگا۔ وہ یقیناً
مجھے ایک بہت ہوشیار عورت سمجھتا ہو گا۔ اُس کا دِل
میرے ساتھ مصافحہ کرنے کو للچا رہا تھا۔ مگر اُس نے کہا۔
"آپ کی چیز آپ کو ایک ہفتے کے اندر مل جائے گی
اگر مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی تو جو جی چاہے عنایت
کیجئے گا۔ ورنہ خیر! ہاں تو یہ تصویر آپ کے شوہر کی معشوقہ
کی ہے"؟

"جی ہاں" میں نے قدرے حیا کی سے کہا۔
وہ بولا" عورت تو واقعی حسین ہے، لیکن اُس
کی خوشبو......."

میں نہ سمجھی کہ وہ کیا کہتا ہے۔ میں نے پوچھا
"خوشبو سے آپ کا کیا مطلب ہے"؟

وہ مُسکرایا" محترم خاتون، مردوں کو جذبات
کا غلام بنانے کے لئے عورتیں خاص خاص خوشبوئیں
استعمال کرتی ہیں۔ اسی لئے میں پوچھتا ہوں۔ کہ یہ
عورت کس قسم کی خوشبو استعمال کرنے کی عادی ہے۔
کیونکہ خوشبو سے اس کی تمام پرانی یادیں تازہ ہو جاتی
ہیں۔ اور زندگی کے اکثر گئے گذرے واقعات دوبارہ
نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور مرد بے تاب سا
ہو جاتا ہے۔ ہاں! آپ کو یہ بھی بتانا ہو گا۔ کہ آپ کے
شوہر اور اُس کی معشوقہ جب کبھی اکٹھے کھانا کھاتے
ہیں۔ تو کون کون سی چیزیں کھانے کی عادی ہیں۔ یہ
میں اس لئے پوچھ رہا ہوں۔ کہ جس روز آپ اپنے شوہر
کی بیوفائی ثابت کرنا چاہیں۔ اُس روز اُس کے وہی
مرغوب خاطر کھانے تیار کرائے...... محترم خاتون!
بس اب آپ کا خاوند ہمارے قبضے میں ہے"

میں خوش خوش واپس آئی مجھے یقین ہو گیا تھا
کہ مینیجر ایک جہاندیدہ اور عقل مند آدمی ہے۔ اس
واقعہ کے صرف تین دن بعد ایک نہایت خوبصورت
مہ وش نوجوان لڑکی میرے مکان میں داخل ہوئی۔
اُس کے چہرے پر شوخی و شرارت کے ساتھ ساتھ
شرم و حیا کے آثار بھی تھے۔ اور یہ چیزیں عام طور پر
اُن لڑکیوں میں ہوتی ہیں جو ہوشیار و زمانہ شناس
ہونے کے علاوہ قدرے آوارہ مزاج بھی ہوں۔ وہ
بہت ادب سے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے
اُسے خاتون" کہہ کر پکارا۔ لیکن اُس نے کہا" مہربان
خاتون آپ مجھے صرف سمن کے نام سے پکارا کیجئے"!

"اچھا سمن، یہ بتاؤ کہ تمہیں معلوم ہے۔ تم یہاں
کیوں آئی ہو"؟

"جی ہاں، مجھے کچھ نہ کچھ علم تو ہے"

"شاباش، اور تمہیں اس کام کے انجام دینے میں
کوئی خاص تکلیف تو نہ ہو گی"؟

"جی نہیں، بالکل نہیں، یہ آٹھویں طلاق ہو گی
...... اگر میں کامیاب ہو جاؤں تو......
میرا تو یہ عام شغل ہو چکا ہے"!

"بہت خوب...... مجھے کچھ زیادہ دیر انتظار
تو نہ کرنا پڑے گا"؟

"بیگم صاحبہ، یہ تو آپ کے شوہر کے مزاج پر منحصر ہے

بہرحال میں جب بھی صرف پانچ منٹ کے لئے اُن سے علیحدگی میں ملی آپ کے اس سوال کا شافی جواب دے سکونگی"۔

"ضرور ملو، لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ وہ کوئی خوبصورت شخص نہیں ہے"۔

"مجھے اس سے کیا غرض بیگم صاحبہ، میں کئی بدصورت خاوندوں پر یہ جادو چلا چکی ہوں۔ لیکن یہ فرمائیے کہ اُن صاحب کی پسندِ خاطر خوشبو کیا ہے"؟

"عطر حنا"

"خوب، بیگم صاحبہ مجھے بھی یہی خوشبو پسند ہے۔ آپ مہربانی کرکے ایک اور بات بتا دیجئے۔ آپ کے شوہر کی معشوقہ سوتی بنیان استعمال کرتی ہے یا ریشمی"؟

"سوتی"

"بس اب میں خوشی سے آپ کے ہاں کام کروں گی"

اس کے بعد وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں یُوں مصروف ہوگئی۔ گویا اُس نے زندگی بھر اس کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام کیا ہی نہ تھا۔ ایک گھنٹہ کے بعد میرا خاوند بھی آگیا۔ لیکن سمن نے آنکھ تک نہ اُوپر اُٹھائی۔ میرے شوہر نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ سمن کے کپڑوں سے عطرِ حنا کی لپٹیں آرہی تھیں۔ جُونہی وہ اُٹھ کر اندر گئی۔ میرے خاوند نے مجھ سے پُوچھا۔

"یہ لڑکی کون ہے"

"میں نے ایک نئی خادمہ رکھی ہے"۔

"کہاں سے ملی یہ"؟

"میری ایک سہیلی لائی ہیں۔ بیچاری بہت نیک لڑکی ہے"۔

"حسین بہت ہے"

"واقعی"؟

ہاں، ہاں۔ لیکن گھر کی ملازمہ کے لئے اتنا حسین ہونا ......"

میں دل ہی دل میں اس گفتگو سے خوش ہو رہی تھی۔ مجھے معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرا شوہر ابھی سے بے تاب ہو رہا ہے۔ اسی شام سمن نے مجھ سے کہہ دیا۔ کہ بیگم صاحبہ آپ کے شوہر بس قابو میں آئے سمجھئے۔ میں نے اُسے پُوچھا" اری تم نے دیکھ بھی لیا اُن کو"؟

"جی ہاں، وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اپنا نام بتا دو۔ اسی طرح تمہاری آواز سُن لیں"

ایک ہفتے کے اندر اندر میرے شوہر نے مکان سے نکلنا بند کر دیا۔ اور تعجب کی بات تھی تو یہ کہ مجھے بھی باہر جانے سے نہ روکتا۔ دراصل بات یہ ہے۔ کہ وہ مکان میں تنہا رہنا چاہتا تھا۔ نویں دن جب سمن میرے کپڑے اُتارنے میں مصروف تھی۔ اُس نے جھجکتے جھجکتے مجھے بتایا کہ "آپ کے شوہر میرے حسن اور اپنے جذبات کے غلام بن گئے ہیں۔ اب جو ثبوت آپ چاہیں فوراً مہیا ہوسکتا ہے۔ گذشتہ تین روز سے وہ مجھے دِق کر رہے ہیں۔ لیکن میں نے

ابھی ایک بوسہ تک نہیں دیا۔ فرمائیے آپ کو ثبوت کس روز چاہیئے؟"

"اس جمعرات کو"

"بہت اچھا ——— لیکن کس جگہ"

"میرے کمرے میں ——— اور اگر تم اپنا فرض انجام نہ دے سکیں تو؟"

"آپ اطمینان رکھئے ...... میں جمعرات تک اُنہیں نزدیک آنے نہ دوں گی"

"اچھا تو جمعرات کو .... کے بجے؟"

"پورے پانچ"

"ضرور؟"

"ضرور!"

تم جانتی ہو میں نے اس کے بعد کیا کیا۔ میں نے اپنے شوہر کے ایک دوست جج کو، اپنے والد کو اور چند دیگر ملاقاتیوں کو جمعرات کے روز اپنے ہاں چائے پر بلا لیا اور اس خاص معاملہ کے متعلق اُن سے بالکل ذکر نہ کیا۔ جب پانچ بجے تو میرا دل دھڑکنے لگا عین پانچ بجے میں نے اپنی خوابگاہ کا دروازہ کھول دیا۔

.... شہادت مکمل تھی۔ میرے شوہر کی شکل دیکھنے کے لائق تھی۔ بالکل اُلو معلوم ہو رہا تھا نوکر نے آگے بڑھ کر اُس کو کپڑے پہنائے۔ میرے والد بے حد غضب ناک ہو رہے تھے۔ اور اُسے جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ آہ ہولناک مذاق ..... سراسر ہولناک۔ اور سمن .... واہ، اُس نے تو کمال ہی کر دیا۔ زار زار رونے لگی۔ میں حیران ہوں۔ وہ کیونکر اس عمدگی سے رو رہی تھی۔ اس کے آنسو یقیناً انمول موتی تھے۔ ہاں، تمہیں اگر کبھی ضرورت پڑے تو اس کار آمد لڑکی کو نہ بھولنا ....

اور اب میں تمہیں بتانے آئی ہوں۔ کہ میں آزاد ہوں ...... ——— یعنی بالکل آزاد۔ زندہ باد آزادی"

وہ خوشی سے کمرے میں رقص کرنے لگی۔ اُس کی سہیلی جو خیالات میں غرق کچھ اُداس سی نظر آ رہی تھی بولی

"تم نے مجھے کیوں اُس وقت نہ بُلایا"

(فرنچ)

عمر فاروق ایم اے

اے شب بکنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش
راز دل من مکن چناں فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم
ہاں اے شب ہجراں چناں باش کہ دوش

حسنِ زباں

از:- پروفیسر شیخ عبداللطیف تپش
ام اے۔ ام۔ او۔ ال گورنمنٹ امیرسن کالج ملتان

تپش صاحب ہمارے صوبے کے غزل گو شعراء میں نمایاں امتیاز رکھتے ہیں۔ اور ایک مخصوص طرزِ تغزل کے مالک ہیں۔ ذیل کی غزل جہاں زبان و بیان کی دلاویزیوں سے معمور ہے۔ وہاں ان کی غزل سرائی کے خاص انداز کی بھی روشن مثال ہے۔
(ادارہ)

سکون و اضطرابِ دل کے نقشے ہیں عیاں کیا کیا
نگاہِ شوق میں پنہاں ہیں نیرنگِ جہاں کیا کیا

فضائے گلشنِ ہستی میں بھی اِک ہُو کا عالم ہے
نسیمِ صبح کے جھونکوں میں ہیں رنگِ خزاں کیا کیا

مری عریاں تنی ملبوسِ عاریت سے بہتر ہے
خزاں میں دامنِ گل کی اُڑی ہیں دھجیاں کیا کیا

بنا ہوں مٹتے مٹتے گردِ راہِ کاروانِ غم!
ملے ہیں بے نشانی سے نشانِ رفتگاں کیا کیا

شبِ غم کیا کٹے تم ہو نہ خنجر میرے پہلو میں
عذابِ جاں ہوئی ہیں زیست کی مجبوریاں کیا کیا

جو یاسِ وصل سے حاصل ہوئی جمعیتِ خاطر
ترا عہدِ وفا بن بن کے ٹوٹا آسماں کیا کیا

اُلجھ کر تنگ ہم وضعیِ خارِ غم سے وحشت میں
مری عریانیِ تن کی اُڑی ہیں دھجیاں کیا کیا

خدا سے پھرتی جاتی ہے تپش چشمِ تماشائی
نجانے رنگ لائیگا ابھی حسنِ بتاں کیا کیا

طیور آوارہ

ریزۂ مینا

مترجمہ:۔

جناب شاہد احمد دہلوی بی۔ اے آنرز (اڈیٹر "ساقی")

بچّے سے

اے بچے! تو کیوں رو رہا ہے؟
کیا تجھے وہ سینکڑوں زنجیریں ابھی سے نظر آ رہی ہیں۔
جو تجھے اپنے حلقے میں لئے ہوئے ہیں؛
جا، اور اپنے لئے دولتِ بہار کے گجرے بنا!
کیا غم کے آنسو شفق گوں رخساروں پر ڈھلکینگے؛
اپنے بچپن کی گریز پا ساعتوں کو سرد آہوں میں نہ گنوا۔
اور نہ بچپن کے شفاف آسمان کو بادلوں سے مکدر ہونے دے۔
اپنے قدموں سے مسرت کی چھلانگوں کی آواز پیدا کر
کیونکہ جب بچے ہی رونے لگینگے۔ تو دنیا بھلا کیسے خوش رہ سکتی ہے؛
نہیں، بچپن کی مسرت کے ساتھ تو ساری کائنات مسکراتی ہے۔
بچوں کے قہقہوں سے تو دنیا کی موسیقی عبارت ہے۔
جس طرح پھٹتے ہوئے بادلوں پر دھوپ کی تُنک کرنیں ناچتی ہیں۔
اسی طرح تیری زندگی کی خوشگوار دوپہر کو مسکراہٹوں سے منور ہونا چاہئے۔
افسوس! دھندلکا بہت جلد چھا جاتا ہے:
مگر خدا جس طرح دعا کو سنتا ہے۔ اسی طرح وہ تیری اس خالص موسیقی کو بھی سُنے گا جو فضا کو نغموں سے بھر دیگی۔
اس سے زیادہ شیریں اور مقدس صدا آسمان کی جانب اور کوئی بلند نہیں ہوتی جتنی کہ
کسی بچے کی ہنسی کی آواز یا کسی طائرِ آزاد کی چہکار

(موپاساں)

اقرارِ محبت

مجھے وہاں چھوڑ دو جہاں سورج سبزے کو جھلس دیتا ہے
یا وہاں جہاں اُس کی شعاعیں برف کو پگھلا بھی نہیں سکتیں۔
یا معتدل گرمی میں جہاں وہ محسوس کیا جاتا ہے۔ اور دیکھا جاتا ہے۔

یا ایسے مجمع کی موجودگی میں جو فرزانوں کا ہو یا دیوانوں کا
مجھے خواہ بلند مرتبہ دو خواہ پست۔
لمبی سے لمبی رات ہو چاہے چھوٹے سے چھوٹا دِن۔
شفاف سے شفاف آسمان میں یا جس پر گھنگھور
گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں۔
ہولناک جوانی میں یا جب میرے بال سفید ہو جائیں۔
مجھے جنت میں چھوڑ دو یا دُنیا میں یا جہنم ہی میں۔
پہاڑوں میں، وادیوں یا کف آلود طوفانوں میں۔
غلامی میں یا آزادی میں، خواہ میں کسی حالت میں
زندہ رہوں۔
بیمار یا تندرست۔ بدنام یا نیک نام۔
میں اُسی کا رہونگا۔ اور صرف اُسی خیال میں محو رہونگا
خواہ میرے لئے کامیابی کا کوئی موقعہ نہ ہو۔

(پیٹرارچ)

چاند سے

اے چاند! تو آسمان کو کس قدر غمناک قدموں سے
طے کر رہا ہے!
کس قدر خاموشی سے، اور تیرا چہرہ کس قدر زرد ہے!
کیا یہ بات ہے کہ فضائے سماوی میں بھی۔
وہ مصروف تیر انداز اپنے تیز تیروں کی آزمائش کرتا ہے!
اگر کسی دیر آشنائے محبت کی نظریں مبتلائے محبت
کو تاڑ سکتی ہیں۔
تو مجھے بھی تُو اپنی وضع سے ایک عاشق نظر آتا ہے
تیرا کُملایا ہوا حُسن مجھ سے تیری کیفیت بیان کر رہا ہے۔
کیونکہ میں خود بھی وہی محسوس کرتا ہوں جو تو محسوس
کر رہا ہے۔
اے میرے شریکِ حال چاند! مجھے بتا۔
کیا وہاں بھی خالص محبت کو دماغ کا خلل موسوم
کیا جاتا ہے؟
کیا حُسن وہاں بھی اس قدر مغرور ہے جس قدر کہ یہاں؟
کیا وہاں بھی چاہے جانے کو چاہا جاتا ہے اور اُس
کے باوجود
اُن عاشقوں کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے جو عشق
کے شکار ہوں؟
کیا وہاں بھی نیکی کو ناشکوری موسوم کیا جاتا ہے؟

سڈنی

کیوپڈ اور میری محبوبہ

کیوپڈ اور میری محبوبہ نے جوا کھیلا۔
کیوپڈ ہارا۔
اُس نے اپنا تیر، کمان اور ترکش لگا دیا۔
اپنی ماں کی قمریاں اور چڑیوں کے جھنڈ لگائے۔
انہیں بھی ہار گیا۔
پھر اس نے اپنے لبوں کا مُونگا، اپنے رخساروں کا گلاب
پیشانی کی چمک اور اپنے چاہِ ذقن کو بھی لگا دیا۔
اور ان سب کو میری محبوبہ نے جیت لیا۔
بالآخر اُس نے اپنی دونوں آنکھیں لگا دیں۔
میری محبوبہ نے انہیں بھی جیت لیا اور کیوپڈ اندھا رہ گیا۔
اے عشق کے دیوتا! جب تو اس نوبت کو پہنچ گیا۔
تو بھلا میرا کیا حشر ہوگا؟

(دہلی)

افسانہ

صنعت گر

(افسانہ)

از:- جناب غلام عباس صاحب ایڈیٹر "پھول"

ایک دفعہ ایک سنگ تراش نے اپنے آقا اور بادشاہ کی خوشنودی کے لئے جواہرات کو تراش کر ایک چھوٹے سے مور کی شبیہ بنانی شروع کی جب وہ تکمیل کو پہنچی۔ تو سنگ تراش پر خود اپنے ہی کام کو دیکھ کر بے خودی طاری ہوگئی۔ وہ جواہرات کا بنا ہؤا مور اُسے اس قدر عزیز ہؤا۔ کہ اُس کا جی اُسے اپنے پاس سے جدا کرنے کو کسی صورت نہ چاہا چنانچہ بادشاہ کے خوف سے وہ گھر بار چھوڑ۔ مور کو ساتھ لے۔ رات رات میں اُس کی مملکت سے بھاگ گیا۔

اس بادشاہ کے مُلک سے سینکڑوں کوس کے فاصلے پر ایک اور بادشاہ کی سلطنت تھی۔ وہ بادشاہ بھی صنعت کی قدردانی کی وجہ سے دُور دُور مشہور تھا۔ چنانچہ سنگ تراش نے اس کے ملک کا رُخ کیا۔ مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے صعوبت راہ سے اس کا حُلیہ بدل گیا۔ کپڑے پھٹ گئے۔ اور سوائے اُس مور کے جسے اُس نے اپنی کمر سے باندھ رکھا تھا۔ اُس کے پاس اور کچھ نہ رہا۔ نیا ملک۔ نئے قانون۔ نئے لوگ۔ سنگ تراش یہاں آکر بہت پشیمان ہوا۔ اُس کے پاس نہ اوزار تھے۔ اور نہ مور کے سوا اپنے کام کا کوئی اور نمونہ ہی تھا۔ کہ کسی کو دکھاتا۔ نہ لباس ہی اچھا تھا۔ کہ بادشاہ کے دربار تک رسائی کی کوشش کرتا۔ نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ اور وہ تنگ آکر محنت مزدوری تلاش کرنے لگا۔

اُس ملک میں بھی ایک سنگ تراش تھا۔ بڑا صاحب کمال اور چابکدست۔ اتفاق سے ایک روز اُس کی اس سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ غریب الدیار جان کر اُس کا حسب و نسب پوچھا۔ اُس نے بوجہ خجالت اپنا حال چھپایا۔ مگر سنگ تراش جوہر شناس نگاہ رکھتا تھا۔ اُسے گھر لاکر کھانا اور کپڑے دئے۔ اور اپنے پاس ٹھہرالیا۔

وہ سنگ تراش جس کمرے میں کام کرتا تھا۔ وہ ایسا آراستہ و پیراستہ تھا کہ بادشاہوں کے کمرے بھی ایسے نہ ہوں گے۔ علاوہ بہت سی قیمتی اشیاء کے اُس کمرے میں اُس سنگ تراش کے بنائے ہوئے طرح طرح کے مجسمے بھی رکھے تھے۔ سب کے سب صنعت گری کا ایسا اعلےٰ نمونہ تھے۔ کہ اس سنگ تراش کا مور اُن کی گرد کو بھی نہ پہنچتا تھا۔ وہ حیران ہو ہو کر ان سب چیزوں کو دیکھنے لگا۔

اُس سنگ تراش نے جب اسے منجمد دیکھا۔ اور فن کا قدر شناس پایا تو کہنے لگا " اے عزیز اچھا ہوا۔ جو تو نے ان مجسموں کو دیکھ لیا۔ کیونکہ یہ سب آج شام کو بادشاہ سلامت اور شہزادوں شہزادیوں کے پاس پہنچ جائیں گے۔ جن کے لئے میں نے انہیں بنایا ہے "

یہ سن کر اس نے کہا " اے ہنر مند صناع - ایسی پیاری پیاری اور حسین چیزوں کو اپنے سے جُدا کرتے ہوئے بے شک تجھے بہت قلق ہوگا "

یہ سُن کر اُس نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا " قلق ؟ یقین جانو۔ میں تو خود ان چیزوں کو جلد سے جلد اپنے پاس سے علیحدہ کر دینا چاہتا ہوں۔ آج تین روز سے یہ میرے پاس پڑی ہیں۔ اور میں سوائے انہیں دیکھتے رہنے کے اور کوئی کام نہیں کر سکا جب یہ میری نگاہ سے ہٹ جائیں گی۔ تو میں پہلے سے بھی زیادہ تن دہی سے کام کروں گا۔ اور صنعت کے ایسے عجیب و غریب نمونے بناؤں گا۔ جن کے آگے ان مجسموں کی کوئی حقیقت نہ ہوگی۔

" جب تک مجھ میں یہ قوت موجود ہے - مجھے اپنے کسی شاہکار کے چھن جانے کا غم نہیں اور جس دن مجھے اس کمی کا احساس ہوگا۔ میں اپنے کام سے دست کش ہو جاؤں گا۔ اور خدا سے موت کی دُعا مانگوں گا "

اس کی یہ باتیں سنکر پہلا سنگ تراش مارے خجالت کے زمین میں گڑ گیا اور اسی وقت اُسکے ہاں سے چلا آیا۔ اور باہر آکر اُس نے اپنے جواہرات کے بنے ہوئے مور کو پتھر پر توڑ ڈالا

اے ساربان

از:- امیر معزی نیشاپوری متوفی ۵۴۲ھ

اے ساربان! منزل مکن، جز در دیار یار من
ربع از دلم پر خوں کنم، اطلال را جیحوں کنم
تا دلبر از من دور شد، دل در برم رنجور شد
از حجرہ تا سعدی بشد، از خیمہ تا سلمیٰ بشد
نتواں گذشت از منزلے، کانجا بیفتد مشکلے
از روئے یار خرگہی، ایواں ہمی بینم تہی
جائیکہ بود آں دلستاں، با دوستاں در بوستاں
ہرجا کہ بود آں نیکپے، گوراں نہادستند پے

تا یک زماں زاری کنم، بر ربع و اطلال و دمن
خاک دمن گلگوں کنم از آب چشم خویشتن
مشکم ہمہ کافور شد، شمشاد من شد نسترن
از حجلہ تا لیلیٰ بشد، گوئی بشد جانم ز تن
از قصہ سنگیں دلے، نوشیں لب سیمیں ذقن
وز قد آں سرو سہی، خالی ہمی بینم چمن
شد گرگ و روبہ را مکاں، شد زاغ و کرکس را وطن
بر جائے چنگ و نائے و نے آواز زاغ است و زغن

”......“ کی یاد میں

از:-
”ع“

میں نے جب پہلے پہل تجھے دیکھا - تو تو اک کلی تھی ناشگفتہ - اِک نغمہ تھی زیرِ لب، اِک خواب تھی حسین و روح پرور - آہ وہ بھی کیا دن تھے - جب

تھی تو اپنے حسن سے غافل میں اپنے عشق سے

تو معصومیت کی الہیتیں چہرے پر بکھیرے آنکھوں میں ضیائے مسرت کی کرنیں سمیٹے، گویا ابھی ابھی آفتاب طلوع ہوا ہے - اور رُخِ روشن پر سماوی تجلیاں نمایاں کئے صحنِ چمن میں یوں پھر رہی تھی - گویا تو بھی ایک نازک و رنگین تیتری ہے - جو وسعتِ فرح کے نظر فریب الوان سے مزین باغ کی معطر فضا میں رنگ و بو کا روح افزا ارتعاش پیدا کرنے کے لئے آئی ہے - تیرے نازک نازک پاؤں جو مخملیں سلیپروں کے اندر سے یوں جھانک رہے تھے - جیسے سبز پتوں میں چھپے ہوئے موتیا کے پھول اس سرعت و بے تکلفی سے باغ کی روشوں پر پڑ رہے تھے - کہ ہر ہر قدم پر تیرا نور و لطافت کے خمیر سے گندھا ہوا بدن دوہرا ہو ہو جاتا تھا - مجھے شک ہوا کہ تو بھی پھولوں کی ایک ڈالی ہے - جو ہوا کے ہر جھونکے سے لچک لچک کر رہ جاتی ہے ؏

پھر ہم میں جدائی پڑ گئی - مجھے افکارِ حیات کھینچ کر لے گئے - اور تیری یاد میرے نہاں خانۂ دماغ میں آبدار موتی کی طرح چھپی رہی - کئی سال گذر گئے اور میں تیرے تصور کی پرستش کرتا رہا - تو اُس روشنی کی طرح جو اُفق کے بعید ترین گوشوں سے پھوٹ پھوٹ کر عالم کو منور کرتی ہے - میری آنکھوں سے اوجھل رہ کر میرے خیالات پر انوار و تجلیات کی بارش کرتی رہی - میری راتیں تیری یاد سے رنگیں اور میرے دن تیرے خیال سے روشن رہنے لگے - میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کی - اور جس جذبۂ بے پناہ کے ساتھ محبت کی - اُس نے میرے دل و دماغ کو ملتہب، میری راتوں کو بے خواب اور دنوں کو وقفِ اضطراب کر دیا - میرے دل کی سوزشیں، میری روح کی آہیں، میرے دماغ کی کاوشیں سب تجھ سے پوشیدہ ہیں - تجھے میرے قلب کی جراحتوں اور میری آنکھوں کی خوں فشانیوں کا بھی علم نہ ہوا - تو نے الھڑپنے سے، بے خبری سے، لاعلمی سے مجھے ایک ایسے جذبے سے سرشار کر دیا - کہ میرے لئے کوئی رنج رنج، کوئی غم غم اور کوئی دکھ دکھ نہ رہا - آہ -

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
تیرے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

کئی برس گذر گئے - اور میں نے دوبارہ لیکن آخری

مرتبہ، تیری زیارت سے آنکھوں کو شاداب و شاد کام کیا۔ ریل کے جنکشن پر ہماری وہی کی ملاقات تھی۔ مگر وہ چند لمحے اب تک، میری زندگی کا سرمایہ، میری تسکین و راحت کا گنجینہ اور بہجت و شادمانی کا خزینہ ہیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، جسم کی ساری قوت کھینچ کر آنکھوں میں آ گئی تھی۔ میں متامل لیکن پُرشوق قدموں سے آگے بڑھا۔ میں نے تجھے دیکھا، آہ کلی کھل کر پھول بن چکی تھی۔ اک بدیعہ جمال اک حدیقہ حسن و شباب میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ خواب کی تعبیر خواب سے زیادہ حسین و روح پرور تھی۔ ہوائے تاہل نے تیرے رخساروں کو آگ لگا رکھی تھی۔ تیری سیاہ گھنی پلکوں کے اندر سے شرابِ عشق چھلکی پڑتی تھی۔ تیری خمار آگیں آنکھوں میں اُس خوش نصیب شخص کی محبت جھلک رہی تھی۔ خواب بھی تیرا ہم سفر تھا۔ وہ دن اور آج کا دن، میں اس اُمید پر زندہ ہوں۔ کہ شاید لیل و نہار کی کوئی خجستہ گردش پھر اُن عنبریں بالوں، اُن گلگوں رخساروں، اُن دلفریب و ہوشربا آنکھوں اور آہ اُن سیاہ لانبی گھنی پلکوں کے جلوے سے مجھے بیخود و سرشار کر دے ۔

میرے خیالوں پر حکمرانی کرنے والی ملکہ! تجھے سندھ کی حُسن پرور و ناز آفریں سرزمین مبارک ہو۔ لیکن جب تو غروبِ آفتاب سے کچھ قبل اپنی گاڑی کی چلمنیں چھوڑ کر سَیر کو نکلے۔ تو سمجھ لیجو۔ کہ میری مضطرب و پریشان روح قیس کی طرح جو صحرائے نجد میں ناقہ لیلے کے پیچھے خاک چھانتا بھاگا کرتا تھا سندھ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں دیوانہ وار تیرا تعاقب کر رہی ہے ۔

محبّت

(نظم)

از:۔ ل۔ب۔ ماثرؔ (کلکتہ)

محبت دلوں کو دکھاتی رہے گی — ہمیشہ ستاتی رُلاتی رہے گی

جواں عشق کے تیر کھاتے رہیں گے — مژہ دِل پہ نشتر چلاتی رہے گی

حسینوں کی چشمِ فسوں گر ہمیشہ — قیامت کے فِتنے اُٹھاتی رہے گی

یہ رو رو کے مرنا۔ یہ مر مر کے جینا — وفا رنگ اپنے جماتی رہے گی

خزاں سے بدلتی رہینگی بہاریں — دلوں کی فضا تلملاتی رہے گی

گل و غنچہ کملا کے گرتے رہیں گے — یہ بُلبل بھی آنسو بہاتی رہے گی

یہ دریا کی موجوں کی دلکش روانی — خوش آہنگ نغمے سُناتی رہے گی

زباں تیری ماثرؔ ہے تفسیرِ فطرت — یہ رازِ حقیقت بتاتی رہے گی

شعریات

شاعر کا مرتبہ

(جرمن شاعر شلر کے خیالات)

از:-
ڈاکٹر احمد علی قریشی ام۔اس۔سی (آنرز)
پی۔اچ۔ڈی (ویلز)

ایک دن خدا نے عرش سے آواز دی:-

"اے میرے بندو! میں نے یہ زمین تمہارے لئے پیدا کی ہے اور میں تمہیں ابدالاباد تک کے لئے اس دنیائے آب و خاک کا وارث بناتا ہوں۔ اٹھو اور اسے آپس میں برادرانہ تقسیم کر لو!"

یہ ندا سنتے ہی، تمام انسان، بوڑھے، بچے اور جوان دوڑے اور اپنے لئے زمین کا ایک ایک حصہ مخصوص کر لیا۔ کسان نے کھیتوں پر قبضہ جمایا، رئیس نے شکار کی غرض سے جنگلوں میں چھاؤنی چھائی۔ سوداگر نے اپنی تھیلیوں اور ہمیانیوں کو مال و دولت سے بھر لیا۔ زاہد گوشہ نشین نے عبادت و ریاضت کے بوریئے سمیٹے اور بادشاہ نے رستوں اور پُلوں پر قبضہ جما کر کہا "لوگو! جو کچھ تمہارے پاس ہے اس سے دس گنا زیادہ مجھے ملنا چاہئے"

جب زمین کی تقسیم ختم ہو چکی تو شاعرِ شیریں کلام ہاں خراماں خراماں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ اُس کیلئے کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے اور زمین کے چپے چپے پر کوئی نہ کوئی قبضہ جما چکا ہے۔ یہ دیکھکر اُس نے عرش کی طرف منہ کر کے فریاد کی کہ

"یا الٰہی! میں جو تیرا صادق ترین فرزند ہوں، کیا اسی طرح تنہا اور بے خانماں رہوں گا؟"

یہ کہا اور عرش کے سامنے گر پڑا۔

خدا کی جانب سے آواز آئی کہ "اے شاعر! اس صورت میں کہ تو اپنے خیالات کی دنیا میں سیر کر رہا تھا، کس سے شکایت کر سکتا ہے؟ اچھا بتا! جس وقت زمین تقسیم ہو رہی تھی۔ اُس وقت تو کہاں تھا؟"

شاعر نے کہا "میرے مالک! اُس وقت میں تیرے پاس تھا۔ میری آنکھیں تیرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، میرے کان تیرے آسمانی ترانوں سے لبریز تھے۔ اور میں ہمہ تن تیرے وصال کی شراب سے سرمست تھا اسلئے زمین کی نعمتوں سے محروم رہ گیا۔ میرا عذر قبول کر اور گناہ بخش دے!"

خدا نے جواب دیا "اب کیا کیا جائے؟ زمین ہاتھ سے گئی۔ باغوں جنگلوں، شکارگاہوں اور بازاروں سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا اسلئے اگر تو چاہے تو آ میرے ساتھ زندگی بسر کر! جس وقت اور جبتک کے لئے تو چاہے میرے پاس آ سکتا ہے۔ میری بارگاہ کا دروازہ ہمیشہ تیرے لئے کھلا رہیگا۔"

مغرب کی مشرقی شاعری

گوئٹے کی ایک غزل

جرمن ملک الشعراء بلبلِ شیراز کی تعریف میں

مترجمہ
اختر شیرانی

"—— ایرانیوں نے ہزاروں شاعروں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا۔ لیکن ان میں سے صرف سات شاعروں کو پسند کیا اور اُستادِ سخن مانا، درحالیکہ اُن شاعروں میں بھی، جو اُن کی بلند خیالی اور پاکیزہ مذاقی کے معیار پر پورے نہیں اُترے، ایسے "اعجوبہ نوا" گزرے ہیں کہ میں اور میرے جیسے شاعر شاید اُن سے کمتر ہیں ——"

(گوئٹے اپنے ایک دوست سے خطاب)

حافظ! اپنے آپ کو تیرے مقابلے میں پیش کرنا اور آہنیں بازو سے پنجہ کرنا دیوانگی کی علامت ہے۔

ہر چند کہ کشتیِ طبع ہوا کے رُخ پر اور موجوں کے آغوش میں رواں ہے۔

تصور کا بادبان آگے بڑھتا ہے اور اوج حاصل کر لیتا ہے۔

لیکن میرے افکار کی کشتی تیرے معنی کے سمندر میں ایک تختے کے ٹکڑے کی طرح ہے۔

تیرے نغمہ ہائے رواں کی فضا میں، آبِ رواں موجزن ہے۔

اور تیرے شاعرانہ تصورات کا آتشیں دریا ایک منظر پرجوش و درخشاں۔

تیرے جذبات کے بھڑکتے ہوئے شعلے میری تفتیدہ ہستی کو جذب کر لیتے ہیں۔

اور ایک ایک نکتہ میری روح کے پروانے کو سمندر (کیڑے) کی طرح بنا دیتا ہے۔

تیری طرح، میں بھی، سرزمینِ آفتاب پر، ایک گل عذار و شیریں کار محبوبہ کا مفتوں رہا۔

اور کچھ مدت تک مدرسۂ عشق میں تعلیم حاصل کرتا رہا ہوں۔

بڑھاپے کی شادی

ظریفانہ نظم

ازجناب سید حسن جعفری صاحب ایم۔اے،
ایم۔او۔ایل، ایل۔ایل۔بی۔پلیڈر

لٹونیات

ایک مُلّا نے مکتبی مضافات لاہور میں کسی مدرسہ میں پڑھاتے ہیں۔ آپ کا قد چھوٹا داڑھی بڑی اور سر مختصر ہے۔ لیکن سر پر پٹے ہیں اور بال سفید ہیں۔ چھوٹے قد کی وجہ سے "مولوی لٹونی" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور بڑھاپے میں بھی شگفتہ مزاجی کا یہ عالم ہے۔ کہ اس نام سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں ڈیڑھ رتی سُرمہ اور داڑھی میں ڈیڑھ پلی تیل ہر وقت پڑا رہتا ہے۔ پان کی وجہ سے مُنہ ہر وقت اُگالدان بنا رہتا ہے۔ آپ کو بڑھاپے میں تیسری شادی کا شوق چرّایا۔ امرتسر میں ایک گھر میں کئی لڑکیاں تھیں۔ لیکن بیاہتے بیاہتے ناکتخدا ایک ہی رہ گئی تھی۔ مولوی صاحب نے اس تلچھٹ کو بھی غنیمت سمجھا۔ اور اس کو اپنے حبالۂ عقد میں لے آئے۔ اس عقد کی تقریب پر مولوی صاحب کی فرمائش اور اُن کے اصرار پر اُن کے ایک دوست نے ذیل کی تازہ تصنیف بجائے سہرہ کے پڑھی +

لٹونیات

اللہ رے اُس کا کرمِ عام لٹونی   تلچھٹ ہے مجھے بادۂ گلفام لٹونی
پھرنے لگوں لٹو کی طرح فرطِ خوشی سے   دیکھوں جو کبھی اُن کو سرِ بام لٹونی
لٹو کی طرح یاں مجھے گردش ہے شب و روز   تھمتی ہی نہیں گردشِ ایّام لٹونی

قطعہ بند

جی میں ہے کہ اب آپ کو ایک قصہ سُنائیں   قصہ نہیں۔ کہیے جسے الہام لٹونی
اک روز یہ سوچا کہ چلو لڑکے پڑھائیں   گھر میں تو نہیں بنتا ہے کچھ کام لٹونی
جب سُرمہ لگا۔ پان چبا۔ پٹے جمائے   بیوی نے کہا: "بن گئے گلفام لٹونی"
داڑھی سے لٹک جائیو اب ہم کو کم از کم   اس لُطف سے تو رکھو نہ ناکام لٹونی

وہ پیک نگل، دیدوں کو مٹکا کے یہ بولے   تلے جوڑتا ہے ہاتھ یہ گمنام لٹونی
مت مجھ سے جھگڑ دیکھ تو اب مان لے کہنا   ہو جائے گا یاں مفت میں بدنام لٹونی
گو اور بھی دُنیا میں لٹونی ہیں بہت سے   میں خاص لٹونی ہوں وہ ہیں عام لٹونی
ڈاڑھی سے اُلجھ مت کہ کمائی کا ہے یہ جال   بیوی : ہے تیرا بندۂ بے دام لٹونی"

ڈاڑھی کو تھپک۔ دل میں یہ کہنے لگے افسوس   (بیٹھک میں جو آ لیٹے بآرام لٹونی
لٹوانی اسی طرح سے کھینچیں گی جو ہر روز   کیا ہوئیگا اس ڈاڑھی کا انجام لٹونی

واں ساس بھی آدھمکی۔ لگی کہنے بگڑ کر   "کیوں دیتے ہو لٹوانی کو الزام لٹونی
خود آپ نے ہی مول لی۔ پیری میں فضیحت   اے کاش نہ کرتے طمع خام لٹونی
جب سرد ہوا دل ہی تو گرمی کی ہوس کیوں   کس برتے پہ آخر کیا حمام لٹونی
اب چلہ میں بیٹھو۔ نہیں کعبے کو سدھارو   بس آج سے ہی باندھ لو احرام لٹونی"

اِتنے میں جو لٹوانی بھی آ پہنچی وہاں پر   سمجھے اُسے بس موت کا پیغام لٹونی
بیوی نے کہا "ہم سے کہاں بھاگو گے چھپ کر   اے آہوئے رم خوردہ! ہوا اب رام لٹونی"
یہ دیکھ کے مضمون خطا ہو گئے اوسان   سر پیٹے۔ مچانے لگے کہرام لٹونی
ماں بیٹی نے یاں ہاتھوں میں پاپوش سنبھالی   اور سر پہ لگیں توڑنے بادام لٹونی
یہ دونوں ادھر جوش میں برساتی تھیں نعلین   پھرتے تھے اُدھر مثل تہی جام لٹونی

دُہری جو لگیں پڑنے تو ایسے ہوئے چمپت   اک گام کی جا بھرتے تھے دو گام لٹونی
لٹو کے یہ اشعار تھے عبرت کی کہانی   جو سنتے ہی گھر پہنچے سر شام لٹونی

اور بیوی کو یہ شعر گلستاں کا سُنا کر
اک حشر اُٹھا گاؤں میں یہ ناچے یہ کُودے
"گر عشق نبودے و غم عشق نبودے
چندیں سخن نغز کہ گفتے کہ شنودے"

عورتوں کیلئے دلچسپ مشغلہ
نئی ایجاد
سوزن کاری کا آسان طریقہ
نئی ایجاد
ٹرانسفر پیپر
میز پوشوں۔ چادروں۔ تکیوں۔ قمیضوں وغیرہ پر مختلف نمونوں کے پھول بنانے کیلئے ٹرانسفر پیپر
استعمال کیجئے۔ آپ پنسل سے ڈیزائن بنوانے کی زحمت سے بچ جائیں گی۔ ٹرانسفر پیپر کپڑے
پر رکھکر گرم استری پھیرنے سے پورا نقشہ اتر آتا ہے۔ اور اسکے مطابق بیل بوٹے آسانی سے
کاڑھے جا سکتے ہیں یونائیٹڈ ایمپائر گرل گائیڈز ایسوسی ایشن آف انڈیا منعقدہ آگرہ نے اسکو بہترین تسلیم کرتے ہوئے
طلائی تمغہ مرحمت فرمایا ہے۔ چھوٹا سائز فی درجن ۶ بڑا سائز فی درجن ۱۲ ۔ ایک کاغذ تین دفعہ چھاپ سکتا ہے
اگر آپ نمونہ دیکھنا چاہتی ہوں تو دو پیسے کے ٹکٹ لفافہ میں بند کرکے بھیجدیں ہم آپکو دو ٹرانسفر پیپر نمونہ کے
بذریعہ پوسٹ بھیج دینگے یہ ضرور لکھئے گا کہ کس مطلب کیلئے ڈیزائن درکار ہے۔
نوٹ ضروری۔ ایک روپیہ سے کم قیمت کا مال بذریعہ وی۔ پی ہرگز نہیں بھیجا جاویگا
بیوپاریوں کے لئے خاص رعایت
رائل
ایمبرائڈری مشین
خواتین کیلئے کار آمد مشغلہ۔ اس مشین سے کوئی گھر خالی نہ رہنا چاہئے۔ ہر قسم
کے کپڑے پر اپنے مذاق کے مطابق خوشنما پھول بیل بوٹے حروف بنا کر اپنے
لباس میں زیبائش پیدا کر سکتی ہیں قیمت ایک روپیہ چار آنے بذریعہ وی پی
ایک روپیہ دس آنے
ملنے کا پتہ
گرلز آرٹ ایمپوریم نزد ڈاکخانہ بیرون موچی دروازہ لاہور

رُومان

قلم تحریر

اختر شیرانی
عاشق بٹالوی

۱۰۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

Price As. 8

ذرّے ذرّے کا دل اک محشر نظارہ ہے
ساری دنیا مرے رومان کا گہوارہ ہے
رومان
اردو کے نوجوان اہلِ قلم کا ادبی و فنّی ماہنامہ
نگارندگانِ خصوصی
سیّد امتیاز علی تاج بی اے
سیّد حسن جعفری ایم اے ایل ایل بی
عاشق بٹالوی بی اے ایل ایل بی
اختر شیرانی
جوش ملیح آبادی
منیجر رسالہ "رومان" ۸ فلیمنگ روڈ - لاہور
(شیخ محمد نواب پرنٹر پبلشر نے گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع کرا کے ۸ فلیمنگ روڈ لاہور سے شائع کیا)

فہرست

جلد ۱ | مضامین بابت جون ۱۹۳۵ء | شمارہ ۲

ادارہ کا اپنے مضمون نگاروں کی ہر ایک رائے سے متفق ہونا کسی حالت میں بھی ضروری نہیں۔

رومان کا خیر مقدم

خان بہادر نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ ممبر لیجسلیٹو کونسل پنجاب

مخدومی و معظمی ۔ السلام علیکم ۔ آپ کے نئے رسالہ ”رومان“ کے مطالعے سے مجھے بیحد مسرت حاصل ہوئی ہیں تو جناب کے مداحوں سے ہوں ۔ ”رومان“ کی خدمت میرے لئے باعث سعادت ہے ۔ مہربانی کر کے میرا نام مستقل خریداروں میں درج کر لیجئے ۔ میں کوشش کرونگا کہ چند اور خریدار بھی دے سکوں ۔

آپ کی کامیابی کے لئے دست بدعا خاکسار احمد یار دولتانہ

نواب صدیار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس حبیب گنج ضلع علیگڑھ

عزیز القدر السلام علیکم ۔ شکریاد فرمائی ۔ رسالے کا اجرا مبارک ہو ۔ والسلام نیازمند حبیب الرحمن

خان بہادر بدر الدین احمد ایم ۔ اے (کلکتہ ہائیکورٹ)

جو رسالے آپکی غزلوں سے مزین ہوں سبحان اللہ انکا کیا کہنا !

غرور اور ہمارا غرور محبت ۔ مہ و مہر کو اُن کے در پر جھکا دیں
شب وصل کی بیخودی چھا رہی ہے ۔ کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

کیسی پیاری بندش ہے ! کہو تو ! ستاروں کی شمعیں بجھا دیں جس شخص کا ایسا کلام ہو وہ شاعر نہیں بلکہ مجسم شعر ہے ۔ ۔ ۔ (مخلص بدر الدین احمد)

حضرت آغا حشر کاشمیری مرحوم

پچھلے نمبر میں ہم نے لکھا تھا کہ ”آغا صاحب کا لاہور میں مستقل قیام ”رومان“ کے لئے جن ادبی نازشوں کا باعث ہو سکتا ہے اسکا ثبوت ذیل کی غزل ہے جو ہمارے اصرار پر فی البدیہہ لکھی گئی ہے “ کسے معلوم تھا کہ مرحوم کی یہ آخری غزل ہوگی اور ہم اس نمبر میں اُن کی غزل کے بجائے انکا مرثیہ لکھنے پر مجبور ہونگے ۔ آغا صاحب کی وفات اردو شاعری ڈراما اور فلم کی دنیا کے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ ہے ۔ جو مدتوں فراموش نہیں ہو سکتا ۔ ہمیں اس عظیم المناک حادثے میں مرحوم کے متعلقین سے دلی ہمدردی ہے اور ہم دست بدعا ہیں کہ خدا ان کو صبر کی توفیق اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔ مرحوم کی یاد میں اپنے اختصاص غم کا اظہار کرنے کے لئے ”رومان“ کا اگلا نمبر ”حشر نمبر“ کے نام سے شایع ہوگا ۔ جسے سید امتیاز علی صاحب تاج ۔ بی ۔ اے ۔ مرتب فرمائیں گے ۔

(ادارہ)

افتتاحی

اردو ادب کا فروغ

از:- آنریبل خان بہادر شیخ سر عبد القادر بی اے بیرسٹر ایٹ لا ممبر انڈیا کونسل

اگر ادبی رسالوں کی کثرت - اخبارات کی بہتات اور نئی کتابوں کے اشتہارات کو دیکھ کر رائے لگائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے - کہ اس زمانہ میں علم ادب کو بہت فروغ ہے - اور اردو زبان کے دن پھرنے والے ہیں - لیکن نظر غائر سے دیکھیں تو یہ آثار ترقی محض سطحی ہیں - اور ابھی ہمارے ملک میں لٹریچر کی وہ قدر جس کا وہ مستحق ہے پیدا نہیں ہوئی - ابھی نہ ادیبوں کو یہ خبر ہے کہ ان کے سینوں میں کیسی دولت اور ان کے دماغوں میں کیسی قوت پنہاں ہے - اور نہ ان کے خرمنِ ادب کے خوشہ چین یہ جانتے ہیں کہ انہیں ادبی خدمت کرنے والوں کی کس درجہ قدر کرنی چاہیئے -

دنیا میں لٹریچر سے بڑے بڑے کام نکلے ہیں اور نکل سکتے ہیں - لیکن ہندوستان کی اردو خواں دنیا ابھی اس اصول سے بہت کچھ بے خبر ہے - لٹریچر بظاہر تو الفاظ کا مجموعہ ہے - مگر الفاظ اگر دل سے نکلیں اور کسی عالی دماغ کے افکار کا نتیجہ ہوں - تو تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں - اور دلوں میں گھر کر جاتے ہیں - لیکن شرط یہ ہے کہ ادیب فنا فی الادب ہو جائے - اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اُسے فکرِ سخن کے سوا اور کوئی کام نہ ہو - نہ ہو اور اُس کی کتابیں - وہ ہو اور اُس کے خیالات - دنیا کے معمولی تفکرات سے جہاں تک ممکن ہو اُس کی قوم یا اُس کا ملک اس کو بے فکری مہیا کر دے اور عملی زندگی کی کشمکش سے وہ الگ اور آزاد رہے - یہاں کیا ہوتا ہے - جہاں کہیں کسی شخص میں اس کمال کی جھلک نظر آئی - لوگ ہر قسم کی توقعات اس سے وابستہ کر لیتے ہیں - کوئی کہتا ہے معمولی تحریرات کا کام بھی اسی سے لو - کوئی کہتا ہے تقریر کے لئے بھی اسے ہی بلاؤ - کوئی اسے کسی تحریک کا بانی بنانا چاہتا ہے - کوئی کسی تجویز کا عملی پیشوا - بے چارہ ادیب آخر انسان ہی تو ہے اور کوئی انسان کمزوریوں سے خالی نہیں - اسے یہ لوگوں کا رجوعِ خلائق اپنی جگہ ٹھہرا نہیں رہنے دیتا - کہیں میدانِ تعریف کی تالیوں کی دلکش آواز اُسے لبھاتی ہے - کہیں عارضی تحریروں کی داد اُسے اپنی طرف کھینچتی ہے - کبھی سیاسی تحریکوں کی دلچسپی اور آسان شہرت اُسے اپنا گرویدہ بناتی ہے - اور کبھی وہ تجارتی تجاویز سے - مالا مال ہونے کی آرزو کا شیدائی ہوتا ہے - اس رنگا رنگ کی کشش کے

سبب خالص ادبیات کی راہ سے معراجِ کمال پر پہنچنا اسے ایک کٹھن راستہ نظر آتا ہے۔ جب وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر وہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر محوِ سخن رہے گا تو خواہ وہ کیسے ہی اچھے اور اچھوتے خیال پیدا کرے۔ مدتوں خود اس کے سوا کوئی انکا مزا لینے والا نہ ہوگا۔ اگر ان کو شایع کرنا چاہے گا۔ تو اس کے پاس اشاعت کے خرچ کے لئے روپے نہ ہونگے۔ اور اگر صرف برداشت بھی کر سکے گا تو شاید دیر تک اس مطبوعہ جنس کا کوئی خریدار نہ پیدا ہو۔ تو وہ اس شہرت کو جو فوراً یا جلد ہاتھ آ سکے۔ خواہ ناپائدار ہو۔ شہرتِ پائدار پر جو ایسی مصائب کے بعد ہاتھ آئے ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو ترقیِ جاہ و منصب کی ہر بلندی اور ہر شہرت اس حیاتِ جاوید کے مقابل جو ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جنہوں نے اعلیٰ لٹریچر کی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ کیا حقیقت رکھتی ہے؟

آجکل بہت سے ادبی قابلیت والے دماغ اپنا کام معمولی مضمون نگاری سے شروع کر کے مضمون نگاری پر ختم کر دیتے ہیں۔ مضمون نگاری بطور مشق تو ابتدا میں لازم ہے۔ مگر حیف ہے۔ اگر یہی انتہا ہو۔ قوت مضمون نگاری اکثر وقفِ سیاسیات نظر آتی ہے۔ سیاسیات بجائے خود اہمیت رکھتی ہیں۔ اور جدید زندگی کے لوازم میں ہیں۔ لیکن جو درجہ ہمہ اوست کا سیاسیات کو ہمارے ملک میں بعض اصحاب نے دے رکھا ہے۔ یہ نہ اُن کے لئے نہ اغراض ملکی کے لئے مفید ہے۔ بلکہ خود سیاسیات کی خدمت لٹریچر کے ذریعے سے بہت کچھ ہو سکتی ہے۔ کسی اُستادِ فن کا ایک فقرہ یا ایک مصرعہ بسا اوقات زبان زدِ خاص و عام ہو کر سیاسی تخیل میں ایسی لہر پیدا کرتا ہے۔ جو سارے ملک میں پھیل جاتی ہے اور ملک کی سیاسی زندگی میں جان ڈال دیتی ہے۔ جو لوگ اس ایک فقرہ یا ایک مصرع سے محظوظ ہوتے ہیں اُنہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ جس شخص کی زبان سے وہ فقرہ یا وہ مصرع نکلا ہے اس نے کتنے ایسے فقرے یا مصرعے سوچے اور رد کئے ہوں گے۔ پیشتر اس کے کہ اس کی نگاہِ انتخاب ان موزوں الفاظ پر پڑی جنہیں سن کر ہر سننے والے نے یہ سمجھا۔ کہ کہنے والے نے گویا اس کے دل کی بات کہدی ہے۔ امیر مینائی نے کیا خوب کہا ہے ؎

امیر اک مصرعۂ تر تب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب شاعر کے ہوتا ہے لہو برسوں

یہ محنت۔ یہ کوفت برداشت کرنا۔ یہ سوز یہ گداز۔ ادیب کی زندگی کے لئے مایۂ ناز ہے۔ اور اپنے جوہر اصلی کی حفاظت کرنا اس پر فرض ہے۔ اور اس کو اس کی حفاظت میں مدد دینا اہلِ ملک کے لئے لازم ہے۔

یہ اصول اگر عام طور پر تسلیم ہو جائے اور اس پر عملدرآمد ہونے لگے۔ تو ادب کو وہ فروغ نصیب ہو جسکی آرزو ہے۔ اور اس سے ملک کے حق میں مفید نتائج پیدا ہوں۔ جب اہل ادب اس اصول پر کاربند ہوں۔ اور ان کے ابنائے ملک ان کے کام کی کما حقہ قدر کریں۔ تو ادب کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہو۔ اس نئے دور کے متعلق اردو کی ادبی دنیا کو چند باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ اول یہ کہ اعلیٰ درجہ کے ماہران فن کے کمالات تو اپنی قدردانی پر خلائق کو خود مجبور کر لیتے ہیں۔ قدردانی وہ چاہیئے جو ہر کہ و مہ کو حسب مراتب نصیب

ہو۔ یعنے جیسے کسی عمارت کے کام میں معمار۔ مزدور۔ نجار آہن گر۔ نقشہ نویس۔ اُوورسیر۔ انجنیئر سب درکار ہیں۔ اسی طرح ایوانِ ادب کی تکمیل کے لئے ناظم۔ ناثر۔ فسانہ نویس مورخ اور مترجم سب کارآمد ہیں۔ اور ہر کسی کا کام اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ گو شایقین ادب کے زمرہ میں کچھ لوگ نظم کے زیادہ دلدادہ ہوں گے۔ اور کچھ نثر کے زیادہ قائل۔ بعض فسانوں کے مشتاق۔ اور بعض تاریخ کی طرف مائل۔ کوئی ترجمہ سے حظ اُٹھانیوالے اور کوئی طبعزاد مضامین کی تلاش میں رہنے والے۔ لیکن یہ کسی کو حق نہیں کہ ادبیات کے کسی ایک حصے کو بے قدر یا حقیر جانے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ادبی دنیا کے سب کارکن فروغِ ادب کے خواہاں ہیں اور انکا مقصد اصلی ایک ہے۔

افکارِ پریشاں

از:- اختر شیرانی

عشق کہ جس کے دین میں صبر و سکوں حرام ہے
ایک نظر کا کام ہے، ایک اثر کا نام ہے

گلکدۂ مجاز میں جس کا بہشت نام ہے
اُس کی بہارِ حسن کی نکہتِ ناتمام ہے

فکر و نظر کی عفتیں، رنگِ ہوس میں غرق ہیں
اب تو جہانِ عشق میں، ذوقِ گناہ عام ہے

پائے طلب کے واسطے، کوئی نئی زمیں بنا!
وادیٔ مہر و ماہ تو لغزشِ نیم گام ہے!

شان میں مے کی زاہدا، اسکے سوا میں کیا کہوں؟
میرے لئے حلال ہے، تیرے لئے حرام ہے!

باقیات الصالحات

عُجب وغرور

از:-

علامہ سید جمال الدین افغانی علیہ الرحمہ

عجب وخود پسندی انسان کو کبر وغرور کی دعوت دیتی ہے۔ اور کبر وغرور کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان تمام دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اُس سے ناشائستہ اور غیر مطبوع افعال سرزد ہوتے ہیں۔ عجب چھوٹے آدمیوں کی خاصیت ہے۔ یہ ان عقول کے لوازم میں سے ہے جن کے ادراک کا دائرہ محدود اور تنگ ہوگیا ہو۔ کیونکہ اگر کسی شخص کا ادراک وسیع اور اُس کے افکار بلند ہوں تو اُسے معلوم ہوگا کہ انسانی مراتب خواہ وہ معنوی ہوں خواہ صوری غیر متناہی ہیں۔ جب یہ حقیقت کسی پر منکشف ہو جائیگی تو وہ بلند پائگی کا حامل ہوگا۔ اور جب اپنے مافوق پر نظر ڈالیگا تو انفعال خجالت اور اعتراف قصور کے سوا اس کو کچھ حاصل نہوگا۔ انسانی علم کی انتہا ہے نہ اس کی قوت کی نہایت اور نہ اس کی غنا و ثروت کی نہایت موجود ہے۔ متناہی کو غیر متناہی سے کوئی نسبت نہیں۔ پس اگر کوئی شخص بعض انسانی رتبوں کے حصول سے، تعجب کا مرکز بن جائے تو یہ اُس کی عقل کی کوتاہی ہے کہ وہ اپنے مرتبے کو انسانی مراتب کا منتہی الیہ سمجھنے لگے۔ اس کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسروں پر تفوق دے اور اس کا انحطاط نفس اور ضعف مزاج اس کا سبب بنے کہ بعض انسانی مراتب کی کامیابی کی بنا پر اسے اس درجہ نشہ وسکر حاصل ہو کہ اس کی ذات سے عالم انسانی کے ساتھ ناشائستہ افعال ظاہر ہوں اور وہ دوسرے انسانوں کی توہین وتحقیر کرے۔ کیونکہ عجب وکبر ایک مہلک مرض ہے۔ اس کی وجہ سے انسانوں کو کتنی ہی مضرتوں اور مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

عجب وکبر کا اوّلین نقصان یہ ہے کہ وہ انسان کو کمالات غیر متناہیہ کے مدارج حاصل کرنے سے روکتے نفس وعقل کو بلندیوں اور برتریوں کی طلب سے باز رکھتے اور اس کو ان دو عادتوں کے سبب سے محدود مواقع پر قانع کر دیتے ہیں۔ اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ بیہودہ افعال اور ناشائستہ حرکات کے سبب سے جو ان کے نتائج ہیں دوسرے لوگوں کو انسان کی عداوت کی دعوت دیتے اور اتحاد و یکجہتی کے رشتے کو جو انسانی تعلقات کی پائداری کی بنیاد ہے قطع کرتے اور

اس بیچارے کو اسی سبجیہ دنیہ کے باعث تنہائی و وحشت کے گوشے میں بے دست و پا کرکے محبوس کر دیتے ہیں

اس عادت کا اگر صرف یہی نقصان ہو کہ تمام انسان ایک شخص کو مکروہ و مبغوض سمجھیں تو کافی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ کہ مارے غرور کے دنیا میں نہیں سماتے۔ فخر و عظمت کی رو سے زمین و آسمان پر احسان کرتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان کو کوئی ایسی برتری حاصل نہیں ہوتی جو کسی قسم کے غرور کا باعث ہو۔ کیا تم ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو گھمنڈ میں پاؤں پہ پاؤں دھرے انتہائی اکڑفوں کے ساتھ کوچہ و بازار سے گزرتے ہیں؟ کیا تم نے انکو نہیں دیکھا جو گھوڑوں کی پشت پر اکڑے ہوئے ٹوپی ٹیڑھی رکھے، شاہراہوں سے گزرتے ہوئے دائیں بائیں متکبرانہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں؟ کونسی مملکت کو فتح کیا ہے؟ کونسے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دی ہے؟ کونسی عجیب چیز اختراع کی ہے؟ کون سا علم جدید نکالا ہے؟ کون سے دشوار سیاسی عقدے کو حل کیا ہے؟ کون سے اسرارِ وجود کو کشف کیا ہے؟

سبحان اللہ! کیا یہ شخص مارشل ملٹک ہے؟ جنرل کرکو ہے؟ جنرل گھری بالڈی ہے؟ لبسمارک ہے؟ غرچیکف ہے؟ نیوٹن ہے؟ کلفلر ہے؟ گلیبلو ہے؟ آخر کون ہے؟ کیا ٹیلیگراف کی ایجاد اسی نے کی ہے؟ ریلوے انجن کا موجد یہی ہے؟ یہ صنائع بدیعہ اسی شخص کے افکار کے آثار ہیں؟

یہ ہے بیجا غرور! یہ ہے بے معنی تکبر! خاکش بر سر۔ اگر اسے ذرا بھی شعور ہوتا یا تھوڑی سی بھی شرم و ننگ محسوس کرتا تو اُسے لازم تھا کہ خجلت سے پانی پانی ہو جاتا۔ یا مارے شرم کے اپنے آپ کو کسی گوشۂ گمنامی میں مقید کر لیتا۔

یہ ناپسندیدہ عادت اور کمینہ خصلت، مشرق سے باہر کم ملتی ہے۔

اخذ و ترجمہ از:۔

اختر شیرانی

. . . .

رُباعی

موسم بھی ہے، عمر بھی، شباب بھی ہے
ساقی بھی ہے، ساز بھی، شراب بھی ہے

دنیا میں اب اور چاہیئے کیا مجھ کو
پہلو میں وہ جانِ ماہتاب بھی ہے

(اختر شیرانی)

یادِ رفتگاں

سر سیّد کے خطوط

شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی کے نام

(مسلسل)

مرتبہ:-

سیّد امتیاز علی تاج بی-اے

مجتبی مکرمی - آپ کا عنایت نامہ پہنچا - جس جوشِ محبت سے آپنے وہ عنایت نامہ لکھا ہے اسکا دل سے شکرگذار ہُوا - سول اسٹیشن میں مطلقاً بیماری نہیں ہے اور شہر میں بھی نہایت کم ہے - گو ہم نیچری ہیں مگر ہم کو خدا پر مولویوں سے زیادہ بھروسہ ہے - میں تفسیر لکھنے میں بہت زیادہ مشغول ہوں - اور نہایت مشکل مشکل مقام لکھ چکا ہوں - آپ دیوبند میں کب تک قیام کریں گے - والسّلام

خاکسار سیّد احمد - علی گڑھ

۱۶ اگست ۱۸۸۴ء

مجتبی مکرمی مولوی سیّد ممتاز علی صاحب - آپ کا عنایت نامہ پہنچا تفسیر کا کام ابھی تک شروع نہیں ہُوا رپورٹ سال تمام و بجٹ مرتب کر چکنے کے بعد شروع کرونگا - جو مضامین تفسیر کے آپ نے پسند کئے - وہ باعث میرے اعزاز کا ہے - حیدر آباد کی جو خبریں آپ نے سنیں سب غلط ہیں - میں صرف نواب سالار جنگ کی ملاقات کو گیا - مل کر چلا آیا - ما ہوار دو ہزار روپیہ ماہانہ کالج کا جو اضافہ ہُوا تھا - اُس کی منظوری حضور نظام سے ابھی تک نہیں ہوئی تھی - میرے جانے پر اُس کی منظوری ہوگئی - دیگر ایں - قرآن مجید اور اُس کی کنکارڈنس دونوں کے ٹیٹل پیج کی نقل بھیجتا ہوں - تصانیف احمدیہ تصنیف کی ترتیب سے چھپی ہیں - رسالہ طعام اہلِ کتاب چھپ رہا ہے - اس کے بعد خطبات احمدیہ چھپنی شروع ہوگی - اس سفر میں مجھ کو بہت تکلیف ہوئی - میں بیمار ہوگیا تھا - ابھی تک ایک شمہ تکان یا بیماری کا باقی ہے - بڑا فکر یہ ہے کہ سنٹرل ہال کا چندہ پورا ہونے کو ۴۸ ہزار باقی ہیں ان کا پورا ہونا نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے - دن رات یہی فکر ہے - دو یورپین پروفیسر کالج کے لئے کیمبرج سے بلائے گئے ہیں - امید ہے کہ یکم اکتوبر تک آجاویں گے - خدا سے امید ہے کہ آپ بفضلہ تعالیٰ بصحت و تندرست اور ہم نیازمندوں کے حال پر مہربان ہیں - والسّلام

خاکسار سیّد احمد - علی گڑھ

۱۰ اگست ۱۸۸۸ء

لیڈر اور شاعر کا مناظرہ

(نظم)

از: "خان بہادر" چودھری خوشی محمد خان ناظر
بی اے (علیگ) سابق گورنر کشمیر

کہا لیڈر نے شاعر سے بہت شیریں نوا تم ہو
مگر بازارِ عالم میں تو جنسِ ناروا تم ہو

تصوّر میں مہ و روز و شب رخ و زلفِ خیالی کے
مگر ذوقِ حقائق سے عجب ناآشنا تم ہو

نہ منزل کی خبر تم کو نہ شوقِ جادہ پیمائی
مگر اک کاروانِ رفتہ کی بانگِ درا تم ہو

بیانِ حالی و قالی ہے سب تقلید و نقالی
گہے رندِ خراباتی ہو گاہے پارسا تم ہو

محبت ہے تو بازاری مذاقِ عشق سے عاری
رقیبوں سے سرِ بازار سرگرمِ دغا تم ہو

ہوئیں زنجیرِ پا شاعر کی کچھ مخصوص تشبیہیں
کمندِ زلفِ پیچاں میں گرفتِ بلا تم ہو

تمہارا سب تخیل پر تو اوہام باطل ہے
ہمیشہ سرحدِ علم الیقیں سے ماورا تم ہو

براتِ شاعرِ عجز بیاں ہے بادہ پیمائی
نسیمِ صبح کے ہمدم ہو ہمرازِ صبا تم ہو

نہیں مقصود دنیا میں کوئی شاعر کی ہستی کا
مگر سرمستِ تحسین و صدائے مرحبا تم ہو

قرار اک دم نہیں اہلِ سخن کو فرشِ خاکی پر
کبھی تحت الثریٰ تم ہو کبھی فوق السما تم ہو

زباں پر آپکی ہر دم ہے قبل از مرگ واویلا
اجل کا تم ہو فرماں اور منشورِ قضا تم ہو

تمہاری زندگی دنیا میں اک ماتم مسلسل ہے
کہ ہر دم تازہ اک کرب و بلا کا کربلا تم ہو

ہمارے دم قدم سے ہے بنی آدم کی بیداری
مگر غفلت کے بیماروں کو خواب آور دوا تم ہو

زمانہ میں دماغی ارتقا کی ابتدا تم ہو
مگر ذہنی تنزل کی جہاں میں انتہا تم ہو

زمانِ جاہلیت کے اگر تابندہ اختر تھے
تو برقی قمقموں میں آج مٹی کا دیا تم ہو

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس دار الحوادث میں

میں ایک کتاب لکھی ہے جسمیں "مصحف رش" کا ایک نمونہ درج کیا ہے۔ ہم علامہ مذکور کے اقتباس کو بعینہٖ یہاں نقل کر دیتے ہیں تاکہ ناظرین کو ان خرافات کا اندازہ ہو سکے۔ جو عقل و منطق کے لئے کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ کتاب مذکور میں درج ہے :-

"تمام طوائف انسانی آدم و حوا کی نسل سے ہیں لیکن شیث۔ نوح اور انوش جو یزیدیوں کے آباء و اولین ہیں صرف آدم کی نسل سے ہیں۔ اور ان کی اصل توام نر د مادہ سے ہے جو خارق العادہ آدم سے وجود پذیر ہوئے۔ یزیدیوں کے لئے جو طوفان آیا وہ طوفان نوح کے بعد آیا تھا۔ اور آج اسے سات ہزار سال گزرتے ہیں۔ ہر ہزار سال کے بعد ایک خداوند آسمان سے نازل ہوتا۔ اور ان کے لئے تازہ شرع و سنن لاتا ہے۔ اور یزیدی کہ یہ جماعت اس سے منسوب ہے۔ ان سات خداؤں میں سے ایک ہے۔"

یزیدیوں کی شریعت و طریقت

یزیدیوں کے مذہبی شرائع و طرق عجیب ہیں جن سے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ میں نے بعض کا علم ذاتی طور پر حاصل کیا ہے اور بعض کو دوسرے مولفین سے نقل کیا ہے۔ مگر ثانی الذکر بیانات کی صحت کا میں ضامن نہیں ہوں اور نہ میں نے ان پر تنقید کی ضرورت محسوس کی ہے یہ امر ان باحیثیت مصنفین کے حوالے ہے جو میرے بعد اس بحث میں داخل ہوں۔

نماز روزہ

یزیدیوں کے روزے تین دن کے ہوتے ہیں۔ اور "ماہ کانون الاول" (مطابق ماہ دسمبر) میں رکھے جاتے ہیں۔ اس بدعت سے غالباً ان کا مقصد قرآن مجید کی اس آیۂ کریمہ سے تطبیق ہو کہ "من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا" اور انہوں نے تین دنوں کو روزوں کے لئے کافی اور تیس روزوں کے برابر سمجھا ہو۔ ایک یزیدی نے مجھ سے بیان کیا کہ روزوں کے باب میں جو حکم نازل ہوا وہ اجمالی تھا اور حق العباد کے مطابق اس کی تفسیر نہیں کی گئی۔ کیونکہ فارسی الفاظ میں "سہ روز" آیا ہے نہ "سی روز" جیسا کہ مسلمان خیال کرتے ہیں۔

یزیدیوں کی نماز یومیہ ہے۔ ہر یزیدی کے لئے لازم ہے کہ وہ عین طلوع آفتاب کے وقت سجدے میں گر جائے اور اپنے "لغات رکیکہ و معانی ربیکہ" کے ساتھ سجدہ کرے۔ علامہ کرملی نے اس نماز کا فصیح زبان میں ترجمہ کیا ہے جو یہ ہے :-

"آفتاب مجھ پر طلوع ہوا۔ دو نفر جلادین مجھ پر وارد ہوئے۔ یعنی خدا ایک ہے اور بادشاہ شیخ حبیب اللہ ہے۔ سلام ہو شیخ عدی پر اور اس کی امت پر اور اس کے ماتحت موجود و بزرگ ہستیوں پر اور سلام ہو قبۂ توریس پر اور فخر الدین[1] پر اور شیخ و پیر پر اور دیہ آصور کی زیارتگاہ پر اور اس پر شہادت دے کہ شیخ (عدی)

[1] سورج کا نام ان کے نزدیک فخر الدین ہے

کی قوت وذراع کے سبب سے ہے
کہ لوگوں نے رفعت پیدا کی اوریزیدی
ہوگئے ہیں۔"

یزیدیوں کی ایک اوردعاہے جسے وہ صرف جمعہ اور چہارشنبہ کے روز صبح کے وقت پڑھتے ہیں۔ یہ دعا بھی غلطیوں اور خبط وابہام کا مجموعہ ہے۔ ہم اسے بعینہ محقق فاضل یعقوب آفندی سرگیس کی کتاب سے نقل کرتے ہیں:۔

"آمین آمین، اللہ تبارک الدین الاولین
الانبین (؟) الخادمین یااللہ یادائم یا
غفوریاموجودیافتح یا رزاق یامدبرالکون
یاساتر یاآدمین یاشمس الدین یافخرالدینؒ[1]
یاسجادین یاعزرائیل یاجبرائیل یاسمنائیل
یامیکائیل یادردائیل یااسرافیل یاربی
انت تبارک الدین یاربی علی شانک
علی مکانک علی سلطانک علی عظمتک
ادعی واسجد۔ مالنا غیرک یاقائم ابن قوم
نزحم ترحمنی انت کریمی انت دوائمی
انت موجود انت معبود انت خدائے
نوری نوراللہ ودرم مندم تو خدائی
بیسوجی بی کوتاہ حایدی تعبیک داحی
ملک ملک جہانی خالف سوق خلقی۔"

اسی قسم کے لغو اور خرافات اور مبہم الفاظ ہیں۔ جو تمامتر مورد تامل ہیں۔

شادی بیاہ کے رسوم

زناشوئی کے سلسلے میں یزیدیوں کی ایسی عادتیں ہیں کہ شاید ہی کسی اور قوم میں پائی جاتی ہوں۔ اگر کوئی یزیدی کسی یزیدیہ سے شادی کرنا چاہے تو اُس کا فرض ہے کہ پہلے اُس عورت کی رضامندی حاصل کرے۔ جب جانبین باہم راضی ہو جائیں تو لڑکے کا اپنے باپ کو اور لڑکی کا اپنی ماں کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔ ماں باپ کی آگاہی کے بعد مہر کی گفتگو ہوتی ہے۔ شرط یہ کی جاتی ہے کہ مہر چاندی کی رقم کا ہو۔ نکاح کے وقت قبیلے کے کسی شیخ کے مکان سے ایک روٹی آتی ہے۔ جسے عروس و داماد آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں۔ اگر روٹی نہ ملے تو شیخ عدی کے مرقد کی ایک چٹکی خاک کافی سمجھی جاتی ہے۔

دولھا دولھن کے ماں باپ کو شادی کی ممانعت کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اگر وہ کسی وجہ سے اس شادی کو روکنا چاہیں تو دولھا دولھن کو حق حاصل ہے کہ وہ فراراً ہوجائیں اور باہر جاکر شادی کرلیں۔ اس قسم کے معاملات میں قوم کے بزرگ دخل دے کر طرفین میں صلح کرادیتے ہیں اور زوجین گھر واپس آجاتے ہیں۔

مکرر طلاق اور تعدد ازدواج ان کے ہاں جائز ہے اور سال کے پہلے ماہ نیساں (اپریل) میں زناشوئی ممنوع ہے۔

لڑکیوں کو باپ کی وراثت میں سے حصہ نہیں ملتا۔ کیونکہ شادی کے وقت وہ "فروخت شدہ" سمجھی

[1] سورج کا نام ان کے نزدیک فخرالدین ہے۔

جاتی ہے۔ شادی فسخ ہونے یا طلاق کی صورت میں لڑکی تمام عمر خدمت میں مصروف رہنے پر مجبور ہے۔ شیوخ کے لڑکوں کو عوام کی لڑکیوں سے شادی کرنیکا حق نہیں۔ اسیطرح عوام شیوخ کی لڑکیوں سے شادی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کے مختلف طبقوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم طبقہ لوگوں ہی میں شادی کریں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فسق، یزیدیوں میں مطلقاً حلال ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ البتہ اگر کوئی یزیدی عورت کسی یزیدی مرد کے فسق کا تختۂ مشق بنے تو قابلِ معافی ہے۔ لیکن اس یزیدی کے بجائے اگر کوئی غیر یزیدی ہو تو اس کی سزا قتل ہے۔ کیونکہ اس طرح انکے خون میں اجنبی خون کے شامل ہونے کا خوف ہے۔

یزیدیوں کی ایک خاص رسم ہے جس کو اکثر محققین نے اُن کے نزدیک زنا کے مباح ہونے کی دلیل سمجھا ہے۔ وہ رسم یہ ہے کہ خاص خاص مواقع پر وہ شیخ عدی کے مقبرے پر حج کرنے جاتے ہیں۔ اور وہاں ہر قسم کی ہنسی مذاق اور بے شرمی و بے حیائی کو جائز خیال کرتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ زنا پر منجر نہ ہو۔ لیکن غیر یزیدیوں کے ساتھ یہ صورت حال جائز نہیں۔ غالباً یہ عادت انہوں نے یونانیوں یا مدیوں سے اخذ کی ہے۔ کیونکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی عبادتیں بھی عجیب و غریب تھیں۔ خاص طور پر خاص خاص عیدوں کے موقع پر ہر قسم کا مزاح اور فسق مباح سمجھا جاتا تھا۔

(باقی)

حُسن متحرک (نظم)

از:- یحییٰ دولت آبادی (اسلامبول)

اندیشہ کناں نشستہ بودم　　در رہگذر پریشاں دوش

حوری صفتاں ہمی گذشتند　　پے در پے یا کہ دوش با دوش

ہر فکر و خیال بود در سر　　از یاد برفت و شد فراموش

واز شیشۂ دوربین دیدہ　　لوح دل بیقرار مدہوش

زاں منظرہ شگفت بگرفت

حسن متحرکے در آغوش!!

منظومات

رخصت کی شام

(نظم)

از:- حضرت جوش ملیح آبادی

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اُداسی وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے
وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت الاماں
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے
وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش الاماں
وہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں ہائے ہائے
وہ مرے اطوار میں انداز سیلِ بے پناہ
وہ تری آواز میں آثارِ طوفاں ہائے ہائے
اِس طرف اُلجھی ہوئی موج حیاتِ یک نفس
اُس طرف بکھرے ہوئے گیسوئے تاباں ہائے ہائے
یاں اسیرِ بے قراری جذبۂ صبر و سکوں
واں رہینِ ابتلا شرمِ فراواں ہائے ہائے
یاں ہر اک تارِ نظر زنجیرِ پائے عافیت
واں ہر اک موجِ نفس دیوار زنداں ہائے ہائے

اِس طرف تاریکیٔ شامِ مریضانِ کہن
اُس طرف آلامِ صبحِ سوگواراں ہائے ہائے
اِس طرف کھلتا ہوا آنکھوں میں پرچم ہجر کا
اُس طرف اُڑتی ہوئی زلفِ پریشاں ہائے ہائے
یاں کفِ پا چوم لینے کی بھی سی آرزو
واں بغل گیری کا سر تا پا سا ارماں ہائے ہائے
میں سراپا سازِ عشرت اور رہینِ بزمِ غم
تو مجسم نازکی اور بارِ حرماں ہائے ہائے
قطع ہوتی ہی نہیں زلفِ درازِ زندگی
چاک ہوتا ہی نہیں ہستی کا داماں ہائے ہائے
اے ستاروں کے خدا شمس و قمر کے رازداں!
گل ہوئی جاتی ہے اک شمعِ فروزاں ہائے ہائے
ایسی صناعی کا اے صانع بچانا فرض ہے
جس کے دم سے ہے بہارِ بزمِ امکاں ہائے ہائے
بخش دے گا اس مصیبت سے اگر اس کو نجات
پھر تو لانا ہی پڑے گا تجھ پہ ایماں ہائے ہائے
وائے بر تقدیر حکمت وہ ہو مجبورِ دعا
جس کی سرحد ہو ورائے کفر و ایماں ہائے ہائے
وائے قسمت **جوشؔ** سے پھر مائلِ طوفِ حرم
پھر ہوا جاتا ہے اک کافر مسلماں ہائے ہائے

مغربی مصوّری پر ایک نظر

از :-
میرزا اویردی

انسان کی فطرت میں قدرت نے تنوع کا مادہ ودلیعت کیا ہے جس کی بدولت تاریخ کے ہر دور میں بیشمار نشیب و فراز نظر آتے ہیں۔ جو تمدن میں بہت بڑی تبدیلیوں کے باعث ہوئے ہیں۔ خواہ یہ تبدیلیاں ملک کے اندرونی یا بیرونی اثرات ہی سے کیوں نہ رونما پذیر ہوئی ہوں۔ انہوں نے طبائع انسانی پر خاموشی سے اثر کیا۔ اور ان کا اظہار علوم و فنون کے ذریعہ مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہُوا۔ قلوب انسانی ایسے ماحول سے متاثر ہو کر اختراع کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر دور میں علوم و فنون میں مختلف اسباب و علل کی رو سے انکے نتائج صوَر متخیلہ کے ماتحت صور بالقوہ میں نمودار ہوئے۔ اگرچہ ان دونوں میں بیّن فرق ہے۔

یورپ کی مصوّری میں ایسے انقلابات کا مرکز فرانس ہے جہاں اس قسم کی انقلاب آفرین فنی تحریکیں نمودار ہوئیں۔ اور وہیں سے دور دراز تک ان کا اثر پہنچا۔ نزاکت کے اعتبار سے بھی فرانس دوسرے مغربی ممالک پر فوقیت رکھتا ہے جو جلد اثر قبول کرتی ہے۔ وہاں کے ماہرین کے دماغ نے کبھی اطالوی فن تعمیر کی تصویری منظومیت گوارا نہیں کی۔ چنانچہ فرانس کے زبردست مصوّر موّلینز نے جو اپنے اندر فن تصویر کے کامل اوصاف رکھتا تھا۔ سب سے پہلے اطالوی ماحول مصوری سے انحراف کیا تھا۔ کیونکہ عام طور پر یہ امر محال تھا کہ کوئی یورپی مصوّر اطالوی فن تصویر کی تاثیر کے بغیر کامیاب ماہر بن سکے۔ ان لوگوں نے اس کے برعکس زیادہ تر جرمنی اور فلیمش مصوّرین سے رشتہ پیدا کر لیا تھا۔ جو دراصل اطالوی مصوّری کے مذہبی جنون کے خلاف جہاد تھا۔

یونان اور روما کی ثقافت نے تمام یورپ پر اثر کیا۔ جس کو عام طور پر کلاسیکل کہا جاتا ہے۔ مگر وسط یورپ میں اس سے بھی بیزاری کے آثار موجود ہیں۔ کیونکہ اس میں دل و دماغ پابند نظر آتے ہیں۔ فرانس کا فن تعمیر اگرچہ گوتھک ہے۔ مگر مصوّری میں کلاسیکل اطالوی مصورین پرمیٹیکو اور زخیرہ وہاں بھی نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں مصوّری کو

علم ادب سے تطبیق دے کر معاشرتی بنانے کی کوشش کی گئی۔ یعنے مصوّری اور شاعری فنون لطیفہ میں پھر ایک ہوئے۔ اس زمانہ کے وسط یورپ کے مصورین ریمبراں (۱۶۰۶ - ۱۶۶۹) اور پوزین (۱۵۹۴ - ۱۶۶۵) امام فن نظر آتے ہیں۔ پوزین کی تصاویر ”قتل بیگناہ“ و ”فتح گلاتا“ اور ریمبراں کی معرکتہ الآرا تصاویر ”صنف نازک کو فعلِ شنیعہ کی ترغیب“ و دیگر تشبیہات اس کا بیّن ثبوت ہیں بعض خوش عقیدہ حضرات نے ان کے ایسے کارناموں کو دیکھ کر ان کو خدا کا مرسل تصوّر کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے قلوب ابھی تک اطالوی مصوّرین کے دورِ احیا کے فنّی نمونوں سے متاثر تھے۔ اور ان کے لئے یہ غیر معمولی چیزیں تھیں خاصکر انہیں سے پوزین نے بہت گہرا اثر کیا۔

اس وقت پیوریٹانیکل تحریک بھی زوروں پر تھی۔ جس کی وجہ سے مصوّری کو بے انتہا صدمہ پہنچا اور بڑے سے بڑے مصوّر بھی آخر اس کا شکار ہوئے۔ مگر پوزین کہا کرتا تھا خواہ کچھ ہو مصوّری کا انجام فرحت بخش ہے۔

ان کے علاوہ اس وقت قدرتی مناظر کی عمدہ تصویر بنانے والا کلاوڈ (۱۶۰۰ - ۱۶۸۲) فرانسیسی تھا ٹرنر (۱۷۷۵ - ۱۸۵۱) اس کے سامنے احمق نظر آتا ہے۔ ان کے مقلدین ہوئے۔ مانے۔ پینیزارو سیسلے وغیرہ وغیرہ نہایت کامیابی سے ” “ پیرس کے قہوہ خانہ میں بیٹھ کر دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مناظر پر ان کی مختلف کیفیات۔ ان کے ”ورنائوں کے گرجا“ اور ”ریخانہ“ وغیرہ سے عیاں ہیں۔

وسط یورپ میں مصوّر واٹیو (۱۶۸۴ - ۱۷۲۱) نے معاشرتی زندگی کی تصاویر میں معتدبہ تغیر پیدا کیا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ امرا اور فضلا کا ملاپ ہونے لگا۔ بوٹاسیلی (۱۴۴۴ - ۱۵۱۰) نے ”ولادت وینس“ میں اُس جدید دنیا کا خواب پیش کیا۔ جیورجیون (۱۴۷۸ - ۱۵۱۱) استادِ ٹیشین نے بھی بہت سا مسالہ اس قسم کا بہم پہنچایا۔ ادھر جرمن لوتھر (۱۴۸۳ - ۱۵۴۶) کا رومن کیتھولک کے خلاف جہاد جو تحریک اصلاح مذہب کے نام سے شروع ہوا تھا اس امر میں کافی ممد ثابت ہوا۔ اطالیہ کے خالص مذہبی مصوّری کے خلاف ڈیورر (۱۴۷۱ - ۱۵۲۸) کے ”چار سوار“ ”قضا و قدر“ اور ہولبین صغیر کے ”سفیر“ اور ”شاہی شاہین باز“ شدومد سے اسی کے آئینہ دار ہیں۔ روبنز (۱۵۷۷ - ۱۶۴۰) نے بھی ”گلستانِ عشق“ میں ایسے ہی آثار کو داخل کیا۔ غرضکہ انہیں مصوّرین کے کام کو دیکھ کر مشہور فلاسفر ڈاکٹر فرائڈ نے کہا ہے کہ تکمیل آرزو خالصاً فنّی تخلیق کی تشریح ہے۔ اسی وجہ سے واٹیو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ محض ظاہری اشیاء کا مصوّر تھا اور انتخاب مضمون کی نفسیاتی قدر و منزلت میں اگرچہ وہ بہت بڑا شاعر تھا۔ مگر اس کے اندر ایک اعلیٰ حسن کار کی گہری نگاہ نہیں تھی۔ جس سے وہ باہر کو معنوی حالت میں دیکھ سکتا اور اس کو مصوّر کرسکتا۔

دورِ جدید میں مصوّری تاریخی انقلاب اور فرانس کے مشہور مصور ڈیوڈ (۱۷۴۸ - ۱۸۲۵) کی مطلق العنانی کی وجہ سے بیحد تغیر پذیر ہوگئی۔ اور اسیطرح بولشویکو نے اسی حالت کا بار بار اعادہ کیا۔ اور اس اصول کی بنیاد رکھی کہ مصوری میں محض مکعبیت اسی حکومت میں دخل پا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ تمام لوگ قدیم طریق مصوّری سے تنگ آچکے تھے۔ یہی کمی مصور رینائر (۱۸۴۱ - ۱۹۱۹) کے کام کے حسن میں تھی۔ انگرس (۱۷۸۰ - ۱۸۶۷) نے اوّل اوّل عوام کو اپنی جدت سے خوفزدہ کیا۔ جو ڈیوڈ کے یونان و روما کے ماحول کی شان و شوکت کو "سقراط کی موت" اور "حلف ہیوٹی" وغیرہ میں بےحس حالت میں دیکھنے کے عادی تھے۔ انگرس کے اس عمل سے اُنہوں نے تصوّر کیا کہ اس نے فطرت سے انحراف کیا ہے اس دور کو رومانی کہا جاتا ہے۔ مصور گیری کولے اور کورو کے "غلام گھوڑے کو سنبھالے" اور "موسم بہار" کے بہترین نمونے اس ضمن میں سمجھے اور دیکھے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

انہیں ایّام میں انگلینڈ میں بعض سچے مصوّرین نے مل کر رسکن کی ہدایت سے ایک تحریک پری رفائلائٹ کے نام سے شروع کی جو بہت کم عرصہ زندہ رہی۔ ان میں محض روزیٹی کی معشوقہ "بشارت" ملٹیر کی "اندھی لڑکی" اور برن جونز کی "بادشاہ کو فیتو و دوشیزہ گدا" قابل ذکر ہیں۔ برن جونز ہمیشہ متمنی رہا کہ وہ "اس نور کی تصویر بنائے جو بحر پر ہے نہ ارض پر۔"

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں ریل ازم (تمثیلیت) کا دور آیا جو دراصل صنعتی فروغ اور فنون لطیفہ کا انحطاط تھا اور انقلاب فرانس کی وجہ سے ظہور میں آیا تھا۔ اس زمانہ کا بڑا مصوّر کوربے (۱۸۱۹ - ۱۸۷۷) تھا جو "خبازہ در اورنانس" میں حسن کے علاوہ رسم کا زیادہ متلاشی نظر آتا ہے۔ یہ تمثیلی مصوّری یورپ میں امپریشن ازم کا پیش خیمہ تھی۔ مگر کوربے نے اس کو علی الاعلان پیش کیا۔ ڈومیر (۱۸۰۸ - ۱۸۰۹) انہیں اصول کے ماتحت بالکل صورت کا غلام نظر آتا ہے۔ کورو نے ڈومیر کی تصویر بنائی جو اس کا خلاصہ ہے اور مانے کے خاکے بھی امپریشن ازم کے آثار ظاہر نہیں کرتے۔

عام طور پر تمام یورپ میں اور بالخصوص فرانس میں انقلاب عظیم کے بعد ایسا زمانہ تھا جبکہ لوگ تمام قیود سے اُکتا چکے تھے۔ مصوری اور علم ادب کے لئے یہ دور واقعی رومانی تھا۔ جس کی وجہ سے علم ادب میں اسقدر انقلاب ہُوا کہ اس سے پیشتر ہرگز نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہٰذا مصوّری میں بھی بعض مصورین نے از سرِ نو امپریشن ازم کی بنیاد رکھی جس میں اُنہوں نے اپنے مافی الضمیر کو خارجی اسباب سے متاثر ہو کر اس طرح ظاہر کیا کہ اس سے ایسا ماحول ان کی تصاویر میں آجائے جو ایک مقررہ نقطہ سے آنکھ پر ظاہر ہو۔ اس سے اشیا کو ہو بہو پیش کرنا ہرگز مقصود نہیں تھا۔ بلکہ جسے نظر کی وساطت سے دل محسوس کرے +

دو بڑے مصور پیسزارو (۱۸۳۰-۱۹۰۳) اور سیسلے (۱۸۳۹-۱۸۹۹) جنہوں نے مونے کی تقلید کی۔ ڈیگاز (۱۸۳۴-۱۹۱۷) کی "رقاصہ" و "درس رقص" اس طرز کی عام فہم بنیادیں ہیں۔ جن میں اس نے اشیا کے اعضا کی منظومیت کو عمدگی سے برقرار رکھا ہے۔ وہ اسی جدوجہد میں بوڑھا ہوگیا۔ اگرچہ رینار اور ڈیگاز ہمعصر ہیں لیکن کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ رینار مصوری میں تغزل کو معمولی سے برسات کے روز "چھتریوں" تک کے ہجوم میں نہایت کامیابی سے نہاں کرتا ہے۔

ذیل میں خصوصیت سے ایسے مصورین سے متعلق چند الفاظ فرداً فرداً درج کئے جاتے ہیں جن پر آج تمام یورپی مصوری کا انحصار ہے۔ اور جو اپنے زمانہ کے مجتہد نظر آتے ہیں۔

سیزان۔ ایکس (قریب مارسیلز) میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوا۔ اس نے بربوائن کالج میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد کچھ وقت فری سوس اکیڈیمی پیرس میں گذارا۔ باقی زندگی ایکس کے گردو نواح میں گذاری جہاں سے وہ اکثر اوقات پیرس و بلجیم گیا۔ ابتدا میں وہ محض ناقابل توجہ امپریشنسٹوں میں سے تھا۔ لیکن بعد میں وہ اسی نئے دور کا پیشرو بنا۔ اس کا مقابلہ مشہور اطالوی مصور جیٹو (۱۲۷۶-۱۳۳۷) سے بحیثیت موجد پستان امپریشنزم کیا جاتا ہے۔ آج یہ ایک نمایاں شخصیت ہے۔ اس نے خود مسئلہ استعمال رنگ کو اجسام کے اظہار کے لئے محل کیا۔

وان گوگھ کی مصوری علم الحرکت ہے۔ وہ زندرٹ میں نورتھ برانیٹ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۵ء تک وہ کسی تصاویر بیچنے والے کے ہاں ملازم رہا۔ بعد میں بوریج میں آزاد واعظ کی حیثیت سے مقیم رہا۔ جس کے بعد آرلینز میں مصوری میں مصروف ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں خودکشی کر لی۔ اس کے دور کی مصوری کی زندہ زبان امپریشن ازم ہے۔ اس میدان میں اس کا کام زیادہ تر بوجھل اور بھدا تھا۔ اس نے مذہبیت سے آزاد ہو کر اپنے قدرتی زور طبع سے اتحاد کیا۔ اور اپنے اخیر زمانہ کو ایسا کر دیا جو در اصل ترکیب اور چکدار رنگ جذب کرنے والا جذبہ بن گیا۔

گادگن ۱۸۴۸ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ اسکا زمانہ طفولیت لیما میں گذرا۔ اور آرلینز میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں کسی تاجر کے ہاں ملازم ہوگیا۔ ۲۵ سال کی عمر میں مصوری کی طرف متوجہ ہوا۔ پکاسو سے تلمذ کا شرف رکھتا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں فوت ہوا۔ اس نے بھی ایک عجیب و غریب راستہ اپنے کام میں اختیار کیا۔ یعنے جسقدر مفید کام کیا اسیقدر غیر مفید۔ مفید وہ جو اس نے سیزینی اور وان گوگھ کی شرکت میں کیا۔ اس نے واضح طور پہ زور طبیعت سے قدیم روایات پر انحصار رکھا جس کی وجہ سے بآسانی اس کے کام کا تتبع ہو سکتا ہے۔ اس کا کام رومانی اور جذباتی ہے۔ اور ذہنی نکتہ رسی سے معرا ہے۔

پکاسو۔ ملاگا (ہسپانیہ کے بندر) میں پیدا ہوا۔

اوائل زمانۂ طفولیت بارسیلونا (ہسپانیہ) میں گذارا
بعد میں پیرس میں مقیم ہُوا۔ چودہ سال کی عمر میں
فنونِ لطیفہ کا تمغہ حاصل کیا۔ مگر وہ رسمی مصوری سے
اُکتا گیا تھا۔ اور اس نے بہت سے تجربات کئے
جو اس کی شہرت کا باعث ہوئے۔ اس ضمن میں
کہنا چاہئے کہ اس کی کوششوں کا مدعا ارفع و اعلیٰ
تھا۔ اگرچہ اس نے مصوری میں مکعبیت (کیوب ازم)
کی بنیاد رکھ کر اسے تمام قدیم طرز و ں کا نعم البدل بنادیا

اخیر میں قدرے قدیم روایات کی طرف رجوع کیا۔
اس کی اختراعات اس کے لئے حیات جاودانی کا
باعث ہیں۔ کوئی مصور اس قدر کامیاب نظر نہیں آتا
جو اپنے عہد کا خود اس درجہ کامل اظہار ہو۔

ان کے بعد تمام یورپ میں ان کے اتباع کا
سیلابِ عظیم آیا۔ اور ہر ایک نے فخریہ ان کی تتبع
میں کام شروع کیا۔ آج ڈاڈ برا کسٹر اور لارڈ اناتت وغیرہ بے
انہیں بھی اختراعات کیں جنکو محققین پوسٹ امپرشنزم اور فیوچرازم

غزل

بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست　　بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست

یکدست جام بادہ و یکدست زلفِ یار　　رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزوست

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

زایں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت　　شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مولانا رومی

منظومات

ستائشِ حسن

(نظم)

از

آقائی مرزا بیضا خاں مردی ایرانی

رفتم سوئے بوستاں کہ چینم - گلہائے شگفتہ بہاریں
لالہ بگرفت آستینم - مے داد مرا بجامِ لعلیں
شد جلوہ فروش در قرینم - غنچہ دہنے بہ ناز و تمکیں
بربود متاعِ عقل و دینم - آں شوخ ز شیوہائے رنگیں

فرمود بمدح شعر تر آر

آفاق ز حُسنِ تست پُر نور - اے نیّرِ آسمانِ خوبی
در ہجر تو بودہ ایم رنجور - اے نوگلِ بوستانِ خوبی
لاریب بود رُخ تو اے حور - ایمانِ جمال و جانِ خوبی
از حسن تو بود جلوہ بر طور - دانند مبصّرانِ خوبی

ہر ذرّہ تراست آئنہ دار

کے ہمسر تست گل بہ گلشن - روئے توز نو بہار خوشتر
خون شہدائے تو بہ برزن - از جلوۂ لالہ زار خوشتر
داری تو شمیم زلفِ پُر فن - از نافۂ صد تتار خوشتر
عشاق ترا فغان و شیون - از زمزمۂ ہزار خوشتر
ای روئے تو نور و خوئے تو نار

دیدارِ تو ہست عاشقاں را - سرمایۂ عیش و کامرانی
رُوحی تو حیاتِ جاوداں را - مرگ است بجز تو زندگانی
از یادِ تو راحت است جاں را - در خانۂ دل مگر نہانی
اینست دعا دل و زباں را - تا دیر خدا کند بمانی
مخلاو بپائے نازکت خار

از فرطِ تحیّر است لب بند - بیضا چہ دگر سخن سرائی
با جانِ وفا خوریم سوگند - آید ز تو بوئے آشنائی
ہستی بہ دگر چہ آرزو مند - اے شکوہ طراز نارسائی
محبوب بگفتنت از شکر خند - بے شبہ تو پیکر وفائی
عاشق لقب آمدت سزاوار

افسانہ

حکایتِ خونچکاں

(افسانہ)

از:۔
عاشق بٹالوی۔ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

بعض کہتے ہیں عشق سلگتی ہوئی آگ ہے جو تپ دق کی طرح آہستہ آہستہ ہڈیوں کو پگھلا دیتی ہے بعض کے نزدیک عشق بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جو چشم زدن میں جان و جسم کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ میں جس قصۂ غم و الم اور داستانِ حزن و ملال کو سپردِ قلم کرنے والا ہوں اُس میں عشق جب اپنی پوری تمام تر تلخیوں اور کامل ہلاکت آفرینیوں کے ساتھ نمودار ہوا تو وہ بیک وقت سلگتی ہوئی آگ بھی تھا۔ اور بھڑکتا ہوا شعلہ بھی افضال مرحوم کے خطوط جنہیں اُس کی حیات معاشقہ کی رُوداد کہنا چاہئے اِس وقت میرے پیش نظر ہیں اور میں اُس زخم کی گہرائی، اُس سوز دروں کی تپش اور اُس درد جانستاں کی اذیت کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ جس نے اُس کی زندگی کے آخری ایام کو ایک بے پناہ خلش و اضطراب، ایک بے درماں پیچ و کرب اور ایک ناقابلِ بیان یاس و حرمان سے لبریز کر دیا تھا۔ میں مرحوم کے کسی سربستہ راز کو منکشف کرنا نہیں چاہتا۔ اور اب کہ خود اُس کی موت نے تمام واقعات سے پردہ اُٹھا دیا ہے میری اس تحریر کو افشائے راز سے منسوب نہ کیا جائے گا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اُس آگ کی ذرا سی گرمی۔ اُس شعلے کی خفیف سی حدت اور اُس التہاب کا تھوڑا سا سینک آپ تک پہنچا دوں۔ جس نے افضال کو آتش بجاں کر رکھا تھا۔ اُس جذبہ بے اختیار کی ایک جھلک آپ کو دکھا دوں جو ہر قسم کی آلائش سے پاک و صاف تھا۔ اور جس نے آناً فاناً دل و دماغ میں وہ انقلاب بپا کیا کہ

> گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء دو سال اپنی سیاسی اہمیتوں کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ترکِ موالات کی ہنگامہ خیز و عظیم الشان تحریک انہی ایام میں اپنے انتہائی عروج پر پہنچی اور ہندوستانیوں کی سرفروشانہ جد و جہد اور متفقہ سعی عمل نے ایک عالم کو انگشت بدنداں کر دیا۔ ترکِ موالات کے لائحہ عمل میں سرکاری درسگاہوں کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ جونہی ملک کے سیاسی رہنماؤں نے اس طرف توجہ کی کالج اور اسکول دھڑا دھڑ بند ہونا شروع ہو گئے۔ طلبہ خدمت ملک و ملت کے جذبہ سے بیتاب ہو ہو کر میدانِ عمل میں نکل آئے اور درسگاہوں پر قفل

چڑھا دیئے گئے۔ افضال اُس وقت بی اے کر چکا تھا اور قانون کی تعلیم میں اُس کا پہلا سال تھا۔ وہ تو یوں بھی جذبات کی لاتعداد چنگاریوں کا ایک مجموعہ تھا اب بھلا کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس سیاسی ہلچل سے جس نے برِاعظم ہند کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک متحرک کر رکھا تھا متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ مادرِ وطن کی پہلی ہی آواز پر اُس نے پورے جوش سے لبیک کہا اور وقت کی تمام مصلحتوں اور مستقبل کے تمام خطرات کو پسِ پشت ڈال کر جلتی آگ میں کود پڑا۔ تحریک کے بانیوں نے ایسے طلبہ کے آئندہ طرزِ کار کے لئے کوئی خاص پروگرام معین نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ قوم کے تمام اعضا موجود الوقت حکومت کے ساتھ عدم تعاون کر کے اس کل کے پُرزوں کو یک لخت معطل کر دیں۔ ساری توجہ تخریب پر مرکوز کر دی گئی تھی۔ اور ایک ایسا ماحول وضع کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں کہ جس کے ماتحت ملک میں اندھا دھند انقلاب برپا کرنے کے امکانات بآسانی پیدا ہو سکیں۔ افضال بھی ترک تعلیم کے بعد اپنے لئے کوئی مستقل راہ اختیار نہ کر سکا۔ چند ہفتے تو اُس نے یونہی لاہور کے سیاسی جلسے جلوسوں میں شامل ہوتے ہوتے گذار دیئے۔ پھر کچھ عرصہ کے لئے وہ احمد آباد کی قومی یونیورسٹی میں چلا گیا۔ تاکہ براہِ راست بانیٔ تحریک کے زیرِ اثر رہ کر مکمل طور سے استفادہ کر سکے۔ پانچ سات مہینے وہاں ٹھہرا ہوگا۔ کہ تحریک میں زیادہ تندی پیدا ہونا شروع ہو گئی اور قید و بند کے شدائد زیادہ عام ہوتے چلے گئے۔ وہ واپس لاہور آ گیا۔ اور اس عزمِ صمیم کے ساتھ آیا کہ تعلیم و تعلم کو قطعی طور پر خیرباد کہہ کر محشرستانِ عمل میں اپنے جسم و جان کا نذرانہ پیش کرے گا۔ چنانچہ جب میں اُس کی پذیرائی کے لئے ریل کے اسٹیشن پر گیا تو پہلی ہی نظر میں میں نے دیکھ لیا کہ وہ ظاہر و باطن میں اس قدر تغیر پیدا کر کے آیا ہے کہ کم از کم پوشاک اور آرائش کے معاملے میں تو اُس نے ہمیشہ کے لئے لطافت و کثافت کا امتیاز اُٹھا دیا ہے۔ گھٹنوں سے نیچے تک گاڑھے کا ایک لمبا کرتا اور موٹے کھدر کا پاجامہ اُس کا لباس تھا۔ سر پر درویشانہ رنگ میں گاندھی ٹوپی اوڑھے اور پاؤں میں چپل پہنے ہوئے تھا۔ سب سے دلچسپ چیز اُس کی داڑھی تھی۔ جسے دیکھ کر مجھے ہنسی تو آئی۔ لیکن جلد ہی میری آنکھیں نمناک بھی ہو گئیں۔ ہندوستان کی تحریکِ قومیت نے ہمارے نوجوانوں کے دلوں کی دنیا بدل ڈالی تھی۔ یہی شخص جو آج سے چند ماہ پہلے لباس کی تراش خراش اور انگریزی طور طریقوں سے اپنے ہمعصروں میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور چہرے کو حشو و زوائد سے پاک رکھنے کا اس درجہ پابند تھا کہ بیمار پڑنے پر بھی روزانہ خود اپنے ہاتھ سے حجامت بنانے کا عادی تھا۔ اب ایک فقیرانہ تقشف کے ساتھ ظاہری تکلفات سے بے نیاز عجز و فتادگی کا مجسمہ بنا ہوا لاہور ایسے شہر کے اسٹیشن پر ہزاروں انسانوں کے مجمع میں بے تکلفی سے گھوم رہا تھا ریل سے اُترنے کے بعد افضال نے اصرار کیا کہ وہ اپنا سامان خود ہی اُٹھائے گا۔ گویا قلی لینا اُس کے نزدیک

اسراف اور مزدور کے سر پر اسباب رکھوانا اصول مساوات کے خلاف تھا میں نے اُس کے اس خیال کا نہ صرف مضحکہ ہی اُڑایا بلکہ مذمت بھی کی کہ یہ کہاں کی قوم پرستی ہے کہ اب بستر اور صندوق بھی خود اُٹھائے جائیں۔

افضال نے لاہور پہنچتے ہی کانگرس کے رضاکاروں میں اپنا نام درج کرالیا۔ اور صبح و شام جلوس کے ساتھ شہر میں گشت کے لئے نکلنا شروع کردیا۔ بعض موقعوں پر اُس نے انقلاب انگیز خیالات کے ماتحت بہت پُر جوش تقاریر بھی کیں۔ حکومت نے جیش رضاکاران کو خلاف قانون جماعت قرار دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قانون شکن جماعت کا رکن ہونے اور چند اشتعال انگیز تقریریں کرنے کی بناء پر افضال گرفتار کرلیا گیا۔ مقدمہ چلا اور بالآخر دو سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی۔

جب وہ قید سے رہا ہوکر نکلا تو ملک کی حالت یکسر بدل چکی تھی۔ اتحاد و یگانگت کی جگہ انتشار و افتراق اور خلوص و ایثار کی بجائے بغض و عداوت کا دور دورہ تھا۔ شدھی اور سنگھٹن کی بے محل تحریکات نے تحریک وطنیت کو عملاً فنا کردیا تھا۔ ہندوستان کی دونوں قومیں بدگمانی اور ناراضی کے عالم میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہی تھیں۔ چند مخلصین جو اس افسوسناک ردعمل سے ابتک متاثر نہیں ہوئے تھے۔ قومی جدوجہد کی عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان کی مساعی ناکام ہوتی نظر آتی تھیں۔ اس ناسازگار ماحول نے ملک کے بہت سے صحیح الدماغ کارکنوں کو گوشۂ عزلت میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ اور آہستہ آہستہ ملکی تحریک قوم پرور عنصر سے کلیتہً محروم ہوگئی۔ افضال کے لئے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ وہ سیاسیات کے جن اصولوں پر کاربند تھا۔ ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ آخری دم تک قومی مطمح نظر کے حصول کے لئے جنگ کی جائے۔ لیکن حالاتِ ناساعد جو ملک پر ابرِ سیاہ کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اُسے اس منزل کی طرف ایک قدم اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ فکرِ معاش سے وہ بے نیاز نہیں تھا۔ اور اب تو اُس کی مالی و اقتصادی حالت خاص طور پر مخدوش ہوگئی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے والد کا دست نگر تھا لیکن ترکِ موالات میں شامل ہونے کے بعد کانگریس اُس کے مصارف کی کفیل رہی تھی۔ اب کہ خود کانگریس کے اقتدار کا جنازہ نکل رہا تھا۔ وہ کیونکر اُس سے مالی امداد کا خواہاں ہوسکتا تھا۔ بہت سے نوجوان جنہوں نے عدم تعاون کی وجہ سے تعلیم ترک کردی تھی حالات کی یہ مایوس کن روش دیکھکر دوبارہ کالجوں میں داخل ہوگئے۔ افضال کے لئے یہ بھی ممکن نہ رہا تھا۔ وہ آگے قدم بڑھاکر پیچھے ہٹنا گناہ سمجھتا تھا۔ اُس کی اُفتادِ طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ جس چیز کو وہ مضر و قابلِ نفرت خیال کرکے چھوڑ دے اُسے دوبارہ اختیار کرنا اُس کے امکان سے باہر تھا۔ مجبور ہوکر اُس نے ایک قومی درسگاہ میں ملازمت اختیار کرلی۔

لیکن اسکے مزاج کی شگفتگی۔ اُس کی طبیعت کی ظرافت اور
اُس کے دل و دماغ کی بیتابی اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔
تکدر آمیز متانت اور سکوت افزا افسردگی نے
اُس کے اندر گھر کر لیا تھا۔ فضا کی ناسازگاری اور زمانے
کی غیر مساعدت کا شکوہ اکثر اُس کے لبوں پر رہتا تھا
وہ دیکھتا اور خون کے گھونٹ پی پی کر چپکا ہو رہتا تھا کہ
اتحادِ قومی و تحریک حریت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے
والی شر انگیز طاقتیں بر روئے کار آ رہی ہیں۔ اور
خادمِ ملک و ملت کے صحیح جذبہ سے سرشار
لوگوں کو مطعون کیا جا رہا ہے۔ واقعات کی رفتار
ظاہر کر رہی تھی کہ آئندہ ایک طویل و غیر معین عرصہ
تک ہندوستان کے اندر کسی قومی تحریک کے پنپنے
کے آثار باقی نہیں رہے۔ افضال نے آزادی کی
دیوی کے مندر پر اپنی اعلیٰ تعلیم اپنے درخشاں مستقبل
اور اپنی گراں بہا زندگی کی جو عظیم الشان قربانی پیش کی
تھی وہ بظاہر رائیگاں ہی گئی۔ اس خیال نے اُس کے
اندر ایک ایسا شدید جذبۂ یاس و قنوط پیدا کر دیا کہ اُسے
کسی طرف سے فلاح و مسرت کی توقع نہ رہی۔ اُس نے
مجبور و لاچار انسانوں کی طرح کبھی مقدر کا گلہ نہیں کیا
تھا۔ اور نہ وہ اپنے اُن ساتھیوں سے حسد کرتا
تھا جو تحریک میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اور
فارغ التحصیل ہونے کے بعد اب معزز سرکاری
عہدوں پر فائز تھے۔ اُس نے حکومت اور حکومت
کے جاہ و منصب سے برضا و رغبت آنکھ موڑ کر وادیٔ
رنج و محن میں قدم رکھا تھا۔ اس لئے اب اُسے
افلاس و نکبت کی شکایت کا کوئی حق نہیں تھا۔
وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ استخلاص وطن کے جس مقصد
اعلیٰ کو پیش نظر رکھ کر قربانیاں کی گئیں تھیں۔ کاش
اُس مقصد کی خاطر ہندوستان کا ہر فرزند باہمی تفرقے
اور جھگڑے بھول کر آب و آتش کے طوفان میں کودنے
پر آمادہ ہو جائے۔ ہندوستان کی سیاسیات بد سے
بدتر ہوتی چلی گئیں۔ اور ساتھ ہی افضال کے تکدر،
اضمحلال اور تردد و انتشار میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُسکی صحت
خراب رہنے لگ گئی تھی جس نے اُس کی اقتصادی
پریشانیوں کے ساتھ مل کر اُس کے مستقبل کو بےحد
تاریک، مبہم اور اندیشناک بنا دیا تھا۔ اُس کے تمام
دوست متفکر تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ افضال
اس یاس انگیز ماحول سے نکل کر کسی اچھے مقام پر چلا
جائے۔ اس دوران میں ریاست ندیا کے دیوان
کو اپنے خورد سال بچے کے لئے ایک قابل اتالیق کی
ضرورت محسوس ہوئی۔ شرط یہ تھی کہ اتالیق شمالی
ہند کا باشندہ ہو۔ وقت کی بات کہئے یا خوش قسمتی کہ
تھوڑی سی کوشش کرنے سے افضال کو یہ جگہ مل گئی
پہلے تو وہ ندیا ایسے دور افتادہ مقام پر جانے سے
گھبراتا تھا۔ لیکن ہم سب نے زور دیا تو رضامند ہو گیا۔
ندیا میں افضال بمشکل ڈیڑھ پونے دو سال رہا ہوگا۔
اس عرصہ میں وہ کس قسم کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اور کن کن
حوادث سے دوچار ہوا۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے
میرے پاس واقعات کا کوئی عینی شاہد موجود نہیں ہے۔
اُس کے خطوط میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ

خطوط اُس کے جذبات وخیالات کے آئینہ دار ہیں۔ انہی خطوط میں بعض بعض مقامات پر اُس نے اپنا دل چیر کر رکھدیا ہے۔ اور یہی خطوط ہیں جن کی مدد سے میں اُن حیرت انگیز قلبی ودماغی تغیرات کا مطالعہ کرتا ہوں جو لاہور سے جانے کے بعد یکایک اُس کے اندر رونما ہوئے ہیں اس کہانی کو خود اُسی کی زبانی بیان کروں تو بہتر ہے اُس کے متعدد مکاتیب سے مندرجہ ذیل اقتباسات اسی غرض سے دیئے گئے ہیں :۔

۳۰ر اگست ۱۹۲۴ء

تم پوچھتے ہو ندیا کیسی جگہ ہے۔ میرا جواب ہے کہ ندیا خوب جگہ ہے۔ جہانتک مناظر کا سوال ہے۔ قدرت نے اس خطۂ ارض پر اپنے الطاف و اکرام کی بے دریغ بارش کرنے میں بخل نہیں کیا۔ قدم قدم پر فطرت نے حسن ورعنائی کے لازوال خزانے بکھیر دیئے ہیں۔ آب رواں اور گل وگلزار کی وہ کثرت ہے کہ اس سرزمین کو جنوبی ہند کا کشمیر کہنا بجا ہے۔ موسم بہت خوشگوار ہے اور رہتا ہے کہ سال بھر ایسا ہی رہتا ہے۔ کم از کم لاہور کی جون جولائی والی گرمی سے یہاں لوگ آشنا نہیں ہیں تم میرے مذاق سے واقف ہو اور جانتے ہو کہ میں گنجان آبادی سے کتنا متنفر اور باغوں، پہاڑوں، سبزہ زاروں کا کیسا شیدائی ہوں۔ بس فطرت نے میری دلبستگی کے لئے اس زمین کو تختۂ باغ بنانے میں کمی نہیں کی صرف اتنا رنج ہے کہ ہم خیال وہم ذوق دوست میسّر نہیں۔ ندیا مختصر سی جگہ ہے۔ لیکن حکومت کا مستقر ہونے کی وجہ سے ریاست بھر میں سب سے اہم مقام ہے۔ شہر بھی خوبصورت ہے۔ صاف ستھری سڑکیں اور چوڑے چکلے بازار ہیں۔ مہاراجہ کے عالیشان محلات اور امراء کے وسیع ورفیع ایوان صنعتِ تعمیر کے حسین ترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ ریاست کی خاموش وپُرسکون زندگی برطانوی ہند کی ہنگامہ خیز زندگی سے' جس کا ہر نیا دن ایک نئے فتنے کو لے کر طلوع ہوتا ہے۔ دور کی نسبت بھی نہیں رکھتی۔ یہاں لوگ بہت چپ چاپ رہنے کے عادی ہیں۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ گذشتہ چند برس کی تیزوتند سیاسی دوڑ دھوپ کے بعد میں اپنے دل و دماغ کی غیر معمولی حدت رفع کرنے کے لئے ندیا کی برودت وخنکی سے استمداد کروں۔"

۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۴ء

"میرے مشاغل ومصروفیت کا حال کیا پوچھتے ہو پڑھنے لکھنے کا عادی ہوں اور معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے لکھنے ہی کے لئے قدرت نے یہ موقع وفرصت عطا کی ہے دیوان صاحب کا وطن مالوف دہلی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند کی ایک ریاست کے وزارت پناہ ہونے کے باوجود اُنہوں نے اپنے بچے کی تعلیم وتدریس کے لئے شمالی ہند کا باشندہ طلب فرمایا ہے۔ دیوان صاحب مشرق ومغرب کی تعلیم وتہذیب کے جامع ہیں۔ کیمبرج میں تین سال رہ کر اُنہوں نے تاریخ وادب میں منتہی کا درجہ حاصل کیا ہے لندن کے قانون دان بیرسٹر ہیں۔ اور ولایت جانے سے پہلے علیگڑھ کے مدرسۃ العلوم میں بھی رہ چکے ہیں۔ اُردو

فارسی ادبیات کا اتنا صحیح مذاق رکھتے ہیں کہ ان کی اس
پاکیزگیٔ ذوق پر رشک آتا ہے۔ اُن کا بیش قیمت کتبخانہ
تو میرے لئے ایک نعمت ثابت ہُوا ہے۔ ریاست
کی سرکاری لائبریری سے استفادہ کرنے کی بھی مجھے
اجازت ہے۔ اٹھارہویں صدی کی ہندوستانی سیاسیات پر
اتنا گرانقدر اور مستند تاریخی مواد موجود ہے۔ کہ اگر اس
کی چھان پھٹک کر کے کسی خاص ترتیب کے ساتھ
اُسے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو تاریخ ہند
کے اُس افسوسناک لیکن صد درجہ دلچسپ دور سے تاریکیوں
کے بہت سے پردے دور ہو سکتے ہیں۔ غرضکہ جہاں
تک علم و ادب کا تعلق ہے ندیا کے اندر بہت سے
قیمتی خزانے پنہاں ہیں۔ اگرچہ مجموعی طور پر اس جگہ کا
ماحول علمی۔ ادبی نہیں میرے اوقات کا بیشتر حصہ
دیوان صاحب کے صاحبزادے خالد کی تعلیم میں ہی
بسر ہوتا ہے۔ یہ ذہین و خوش فہم لڑکا اپنے بلند اقبال
والدین کا تنہا نورِ نظر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دیوان
صاحب اس کی تعلیم و تربیت میں بہت کوشاں ہیں
دیوان صاحب خود بھی بالکل نوجوان ہیں اور ان کی
موجودہ بلند و بالا حیثیت کے پیشِ نظر تو انہیں بہت
ہی نو عمر کہنا چاہیئے۔ اگر ترقی مدارج کی یہی رفتار
رہی تو مجھے اُن کا مستقبل بے حد شاندار نظر آ رہا ہے
خالد بہت ہی پیارا بچہ ہے اور حیرت انگیز دماغی استعداد
کا مالک ہے۔ دیوان صاحب کی بیگم صاحبہ اودھ
کی رہنے والی ہیں۔ اور اس طرح اس گھرانے میں دہلی
و لکھنو کی تہذیب کے بہترین عناصر جمع ہو گئے ہیں۔
رہنے سہنے کے طریقے تمام تر مغربی ہیں۔ لیکن زبان جو
استعمال ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کوثر
سے دھل کر آئی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے بھی اردو دانی
کا زعم ہے۔ لیکن "لکھنے کی اردو کا"۔ "بولنے کی
اردو" کا نہیں۔ یوں تو بولنے میں بھی مجھ سے محاورہ
کی غلطی کبھی نہیں ہوتی۔ لیکن ہائے وہ دلی کا لب و
لہجہ اور لکھنؤ کی لچک کہاں سے لاؤں۔ ابھی کل ہی کا
ذکر ہے کہ دیوان صاحب میرے مضامین کی بہت
تعریف کر رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہندوستان کا
ترقی یافتہ ادب اپنے لئے یہی اردو اختیار کرے گا۔
جو علیگڑھ۔ لاہور اور حیدرآباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے
ذوق سلیم رکھنے والے لوگ استعمال کر رہے ہیں۔
یہ سارا قصہ بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ تم پر واضح
کر دوں کہ آجکل لیل و نہار کیونکر گذر رہے ہیں۔ ایسی
اچھی فضا میں زندگی بسر کرنے اور دن کا زیادہ حصہ کام
میں مصروف رہنے کے باوجود میں بعض اوقات اپنے
تئیں سخت تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اور ایک نامعلوم سی
افسردگی و محرومی طبیعت پر چھا جاتی ہے۔ یہ شاید اس
لئے کہ آپ لوگوں سے دور ہوں۔ یا اس لئے کہ واہمہ
کبھی کبھی موہوم و بے نام سے خدشات پیدا کرنا شروع
کر دیتا ہے۔"

---

۲۹ نومبر ۱۹۲۴ء

"تم بعض دفعہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھ بیٹھتے ہو کہ
مجھے تمہاری اس مین میخ کی داد دینا پڑتی ہے۔ گذشتہ

خط میں تم نے پوچھا تھا کہ میرے کھانے کا انتظام کیا ہے
تمہاری اس ہمدردانہ توجہ کا بہت شکریہ۔ لیکن تم
بے فکر رہو۔ میں تمہیں یہاں بیٹھ کر لاہور سے کھانا نہیں
منگواؤں گا۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ میرا قیام دیوان صاحب
کی طویل و عریض اور عظیم الشان و خوشنما کوٹھی میں ہے۔ اور
جب قیام یہاں ہے تو سمجھ لو کہ طعام بھی یہیں ہوگا۔ میرے
رہنے کے کمرے دیوان صاحب کے دفتر سے کچھ فاصلہ
پر ہیں اور تمدن جدید کے لحاظ سے تمام ضروری سامان
سے مکمل اور لوازم آرائش سے مزین ہیں۔ کھانا انگریزی
بھی ہوتا ہے اور ہندوستانی بھی۔ دیوان صاحب اکثر انگریزی
قسم کا کھانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن بیگم صاحبہ کے مرغوب
خاطر ہندوستانی کھانے ہیں۔ اس طرح میرے دسترخوان
پر بیک وقت اُبلا ہوا انگریزی گوشت بھی ہوتا ہے۔ اور
لکھنؤ کی بورانی و مزعفر بھی۔ سچ بتاؤ تمہارے منہ میں
پانی تو بھر نہیں آیا؟

ناصر سچ کہتا ہوں یہ دونوں میاں بیوی میرے
لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسے اخلاق
فاضلہ کے انسان ہیں کہ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔
حکومت و تمول کے باوجود رعونت کا نام و نشان نہیں۔
ملازموں سے روزانہ تاکید ہوتی ہے کہ میرے آرام و
راحت کا ہر لحظہ خیال رکھیں۔ پھر اس پر بار بار مجھ سے دریافت
کیا جاتا ہے کہ کوئی تکلیف تو نہیں۔ میں تو بعض اوقات
ان کی خاطرداریوں سے شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ اور یہ سارا
کاروبار مصنوعی یا تکلف نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن امر واقع
یہ ہے۔ کہ یہ سب کچھ تکلف نہیں بلکہ اُن کی فطرت کی
بلندی طینت کی نیکی اور سرشت کی پاکیزگی کا اظہار ہے
لاہور سے آکر میری طبیعت میں ایک عجیب سرمدی سکون
پیدا ہو گیا ہے۔ شاید یہ ماحول کا اثر ہو۔ یا خود میری گذشتہ
شورانگیزیوں کا طبعی ردِّعمل۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میں
اپنے دل کو پہلے کی بہ نسبت شاداں و فرحاں اور دماغ کو
مسرور و مطمئن پاتا ہوں۔

شام کا کھانا میں بالعموم دیوان صاحب۔ بیگم صاحبہ
اور خالد کے ہمراہ ہی کھاتا ہوں۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر
میں بتا دوں کہ دیوان صاحب پردے کی رسم قبیح کے قائل
نہیں ہیں۔ اس لئے بیگم صاحبہ مروّجہ پردے کی پابندی
نہیں فرماتیں۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم گھنٹہ پون
گھنٹہ وہیں میز پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی دیوان صاحب اپنے
قیام انگلستان کے زمانے کی کوئی دلچسپ بات چھیڑ دیتے
ہیں۔ یا کبھی تہذیب و معاشرت کے کسی پہلو پر گفتگو شروع
ہو جاتی ہے۔ جس میں ہم سب دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں۔
حتٰی کہ ننھا خالد بھی اپنی بساط کے مطابق شرکت سے محروم
نہیں رہتا۔ دیوان صاحب حد درجہ مہمان نواز انسان ہیں
اور ان کی مہمان نوازیوں کے چرچے یہاں خاص و عام کی زبان
پر ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ اور ہر ہفتے
دور و نزدیک سے ایک آدھ دوست اُن سے ملنے آ
ہی جاتا ہے۔ اُن کے تمام دوست اخلاق و ذہانت کے
لحاظ سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اور اپنی
شائستہ کلامی و عالی دماغی کے باعث ہندوستان کی بہترین
سوسائٹی کا سرمایہ کہے جا سکتے ہیں۔"

۲۷ دسمبر ۱۹۲۴ء

"تم چونکہ ہر روز شام کا وقت ایک تفریحی پروگرام کے ماتحت صرف کرنے کے عادی ہو۔ اسی لئے بار بار پوچھتے ہو کہ میری شام کیونکر گذرتی ہے۔ میں اگر اس نگارستانِ ہند میں ہوتا جسے عرفِ عام میں لکھنؤ کہتے ہیں تو شاید اپنے مجروح و درماندہ قلم کی زندگی کی آخری رمق کو کام میں لاکر شامِ اودھ کی لٹی ہوئی بہاروں کا ہلکا سا نقشہ کھینچ دیتا لیکن وائے قسمت کہ نہ یہاں ہوں یہاں نہ لاہور کی مال ہے اور نہ لکھنؤ کا چوک۔ پھر ان حالات میں مجھ سے میری شاموں کی تفصیل طلب کرکے میری سوگواریوں میں اضافہ کرنا ہی مقصود نہیں تو کیا ہے؟ میں عام طور پر دیوان صاحب کے ساتھ شام کو ٹینس کھیلتا ہوں۔ یا کبھی کبھی بیگم صاحبہ اور خالد کی ہمراہی میں ہوا خوری کے لئے چلا جاتا ہوں۔ خالد مجھ سے بہت مانوس ہوگیا ہے اور ہمیشہ ساتھ چلنے پر اصرار کرتا ہے۔ راستے میں عجیب عجیب سوال پوچھتا ہے جو اس کے بھولپن کی وجہ سے بڑی دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کہتا ہے کہ آپ کا لاہور اچھا ہے یا ندیا؟ میں جواب دیتا ہوں لاہور پھر فوراً پکار اٹھتا ہے وہ کیوں؟ میں نے تو سنا ہے کہ وہاں بہت گرمی پڑتی ہے۔ اور وہاں پہاڑ بھی نہیں ہیں۔ پھر لاہور کیونکر اچھا ہوگیا۔ بیگم صاحبہ مسکرانے لگتی ہیں اور میں بھی ہنس کر کہتا ہوں کہ ہاں واقعی ندیا لاہور سے اچھا ہے لیکن اسی وقت تک کہ تم یہاں ہو۔ اگر تم یہاں سے چلے گئے تو میں واپس لاہور بھاگ جاؤنگا۔

میں نے شاید پہلے بھی تمہیں لکھا تھا کہ بیگم صاحبہ مروجہ پردے کی پابند نہیں ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پردے سے نصف لطفِ زندگی ضائع ہو جاتا ہے۔ دیوان صاحب کی خانگی زندگی قابلِ رشک مسرت و اطمینان سے گذر رہی ہے۔ اور میں نے بہت کم گھرانوں میں حیاتِ ازدواجی کو اسقدر برکتوں اور سعادتوں سے لبریز پایا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا تحریک میں شامل ہونے سے پہلے جب فارغ البالی میسر تھی تو ہم کبھی کبھی اپنی ازدواجی زندگی کے پُرکیف خواب دیکھا کرتے تھے۔ اور تخیل کی مدد سے ایک ایسی فضا پیدا کرتے تھے۔ جہاں محبت، شعریت اور محبوبیت کے بادل سایہ فگن ہوں۔ وہ فضا حقیقتاً میری آنکھوں نے یہاں آکر دیکھی ہے۔ اور میں بعض اوقات سخت دلگیر و دل گرفتہ ہو کر سوچتا ہوں کہ کیا قدرت مجھے کبھی ایسی پُرامن زندگی سے ہمکنار نہ کرے گی۔ آہ ناصر تم ہی انصاف کرو کہ گردشِ ایام کے تیز و تند بگولوں اور زہرہ گداز جان کو پگھلا دینے والے طوفان میں سے گذرنے کے بعد بھی کیا میں ایسی زندگی کا حقدار نہیں رہا؟

---

۳۱ جنوری ۱۹۲۵ء

"کل شام سیر کے لئے ہم باہر جانے لگے۔ تو موسم میں معمول سے زیادہ خنکی تھی۔ میں ہلکا سا لباس پہنے ہوئے تھا۔ گاڑی میں سوار ہوتے وقت میری مالکہ (میری مراد بیگم صاحبہ سے ہے) نے میری طرف دیکھ کر حیرت سے کہا کہ آپ اس لباس میں سیر جائیں گے۔ دیکھئے تو سہی موسم کسقدر سرد ہو رہا ہے۔ اور آپ نے کپڑے

پہننے میں اتنی سب احتیاطیں کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ نزلہ ہو جائے تو؟ میرے دل میں تشکر و امتنان اور عقیدت و عبودیت کا وہ ناقابل بیان جذبہ پیدا ہُوا کہ بے اختیار جی چاہا کہ اپنا سر اُن کے پاؤں پر رکھدوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں ان دنوں اپنی ضروریات کی طرف سے کچھ غافل سا ہوتا جارہا ہوں۔ کھانا کبھی کھاتا ہوں اور کبھی بغیر کھائے ہی دن گذار دیتا ہوں۔ خدا جانے یہ وحشت کس پر اسرار ذریعہ سے میرے مزاج میں داخل ہوگئی ہے۔ اور خود میری یہ حالت ہے کہ میں اس وارفتگی کی وجہ دریافت کرنے پر بھی قادر نہیں معلوم ہوتا ہے کوئی خوش آیند شے میرا راستہ کاٹ گئی ہے۔ بعض اوقات ایسے تباہ کن خیالات دماغ پر طاری ہوتے ہیں کہ اُن کا اظہار تو ایک طرف میں اُن کے تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتا ہوں۔ میں زندگی کی عام شاہراہ سے ہٹ کر ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈیوں پر چلنا نہیں چاہتا۔ میری عافیت اسی میں ہے کہ کنارے پر آہستہ آہستہ گامزن رہوں۔ دریا میں کودنے اور موجوں سے ہم آغوش ہونے کی نہ تمنّا ہے۔ اور نہ ہمّت تم بتاؤ میں کیا کروں۔

دیوان صاحب کا میں بہت ادب کرتا ہوں۔ اور اسیطرح بیگم صاحبہ کا احترام بھی میرے لئے ایمان کا مرتبہ رکھتا ہے۔ میں دیوان صاحب کو اپنا مالک سمجھتا ہوں اور بیگم صاحبہ کو اپنی مالکہ۔ آہ اس خیال میں کتنی دلفریبی ہے۔ اپنے قلب کے تمام عجز و نیاز اور اپنی روح کی تمام عبودیت و فتادگی کے ساتھ اپنی ہستی کو اپنی روحیت و معنویت کو دوسرے کے حوالے کر دینا۔ اپنے کو غلام اور دوسرے کو مالک سمجھنا ایک ایسا جذبہ ہے کہ اُس سے سرشار ہونے کے بعد خودی کا سارا سحر اور انفرادیت کا سارا جادو دھواں بنکر اُڑ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتک میری ذات ہی میرے افکار کا مرکز و محور رہی ہے۔ میرے تردّدات و تفکرات کا تعلق تنہا میری شخصیت ہی سے تھا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ سے اطمینان و سکون ہمیشہ غائب اور فراغ خاطر ہمیشہ مفقود رہا ہے۔ اپنی خوشی سے دوسرے کی خوشی کو مقدّم اور اپنی راحت سے دوسرے کی راحت کو عزیز جاننا بھی تزکیۂ نفس و بالیدگیٔ خیال کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ یہ حقیقت مجھ پر اب واضح ہوئی ہے میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جنہوں نے کبھی اپنا آرام دوسروں کی خاطر قربان نہیں کیا۔ جنہوں نے کبھی دوسروں کی فلاح و انبساط کو اپنے آرام و آسائش پر ترجیح نہیں دی کسقدر تیرہ بخت انسان ہیں۔ میں سُنا کرتا تھا کہ اصلی مذہب محبّت ہے اور محبّت کی معراج قربانی و ایثار۔ ان الفاظ کی حقیقی روح مجھ پر اب منکشف ہو رہی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے ذاتی آلام و افکار سے نکل کر نوع انسان کی خدمت کرنے کے جذبہ سے ناآشنا ہیں۔ نہ محبّت کی ماہیت سمجھ سکتے ہیں۔ اور نہ مذہب کی غرض و غایت میری اس تحریر کو بے ربط نہ سمجھو۔ میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں اُس کا عشیر عشیر بھی صفحۂ قرطاس پر ظاہر کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ شاید ایک دن ایسا آئے کہ تم میرے قلب کی عمیق گہرائیوں میں آرام کرنیوالے

رازسے آشنا ہوسکو۔ لیکن نہیں نہیں مجھے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے ۔میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے ہمیشہ پرہیز کرونگا۔

۴ر جون ۱۹۲۵ء

" تم شکایت کرتے ہو کہ میرے خطوط بے معنی ہوتے جارہے ہیں۔ میری تحریر سے تم کوئی خاص مفہوم اخذ کرنے سے قاصر ہو۔ تمہاری شکایت صحیح اور تمہارا اعتراض درست لیکن یاد رکھو خیالات اپنے اظہار کے لئے ہمیشہ الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر میری تحریر میں الجھن اور میرے الفاظ میں ابہام ہے تو سمجھ لو کہ میرے خیالات میں بھی انتشار اور میرے جذبات میں بھی ہیجان موجود ہے میں واقعات کی بعض ادنیٰ جزئیات بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ تم مجھے بیوقوف سمجھ کر ہنس دوگے تم نہیں سمجھتے، آہ نہیں سمجھ سکتے ۔کہ معمولی معمولی باتیں جن کی سود و زیاں والی کاروباری دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں میرے لئے کسقدر اہم ہیں۔ میرے دل میں نئی نئی آرزؤں نے گھر کر لیا ہے۔ میرے نوزائیدہ خیالات نے حیات انسانی کے مدوجزر کے متعلق میرا نقطۂ نگاہ یکسر تبدیل کردیا ہے ۔غم کا مفہوم بدل گیا ہے۔ خوشی کے معانی تبدیل ہوگئے ہیں اور زندگی نے اپنی پرانی کینچلی اُتار کر پھینک دی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ننھا خالد کچھ بیمار ہوگیا تو گھر بھر میں پریشانی پھیل گئی تھی۔ صبح و شام صحت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ خدا خدا کرکے وہ تندرست ہُوا تو ہماری جان میں جان آئی۔ اس خوشی میں بیگم صاحبہ نے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا جس کے بندوبست کے لئے بہت سے امور مجھی کو سرانجام دینا پڑے۔ اپنی مالکہ کے احکام کی تعمیل، اُس کے ارشادات پر بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کرنا۔ بتاؤ اس سے بڑھ کر انبساط روحانی و تفرح دماغی کا اور کیا سامان ہوسکتا ہے۔ اپنی مالکہ کو خوش و خرم اور شادمان و مسرور دیکھنا ہی ایک غلام کی منتہائے زلیست ہے ۔میرے فرائض منصبی تو یہی ہیں کہ خالد کی تعلیم و تدریس میں کوشاں رہوں اور خدا جانتا ہے کہ میں کس کوشش و تندہی سے ان فرائض کی ادائی میں مصروف رہتا ہوں ۔لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے آقا کے آرام و راحت کی خاطر زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کردوں۔ چند روز ہوئے میں نے بیگم صاحبہ سے عرض کیا کہ ملازموں کی موجودگی ضرورت سے زیادہ ہے ۔چند ایک کو برطرف کردیجئے۔ میرے اوقات کا کافی حصّہ خالی رہتا ہے اور میں نہایت سہولت سے بیکاری کا وہ وقت آپ کی خدمت میں صرف کرنے پر آمادہ ہوں۔ بیگم صاحبہ نے شاید میری اس تجویز کو تکلف پر محمول کیا۔ اور حسب عادت مسکرادیں۔ کس قدر نیکدل و پاکیزہ خصلت خاتون ہیں۔ اُن کی گفتگو انسان کے خیالات کو اعلیٰ و ارفع اور اُن کی موجودگی فضا کو معطر و منور بنا دیتی ہے ۔میں تو نظر بھر کر انہیں دیکھتا بھی نہیں۔ بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ دیکھ سکتا بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری ان باتوں کا مذاق اُڑاؤ گے لیکن کاش تم انہیں ایک مرتبہ دیکھکر فیصلہ کرتے کہ انسانیت و نسائیت کو اُن کے اندر جلوہ گر ہونے کے لئے عروج و کمال کے کتنے مراحل طے

کرنا پڑے ہوں گے۔ اور حسن سیرت وصورت کو اُن
کا قالب اختیار کرنے میں کن کن کاوشوں سے کام
لینا پڑا ہوگا۔ اُن کا نام تمہیں بتا دوں؟ آہ نہیں! ہرگز
نہیں۔ میں اس معاملہ میں سخت خود غرض ہوں۔ میں
اس عشرت لازوال میں کسی کو اپنا شریک بنانا گوارا
نہیں کرتا۔ اُن کا نام اُن کی دلفریب شخصیت کا ایک جزو
ہے۔ تمہیں ان کا نام بتا دوں تو گویا اُن کی محبوب شخصیت
کا ایک جزو تم تک پہنچ جائے گا۔ میں بھلا یہ کب برداشت
کر سکتا ہوں۔ اچھا سنو، ان کا نام ز سے شروع ہوتا
ہے۔ آہ ز، ز، ز، ز۔"

۱۲ راگست ۱۹۲۵ء

"تمہارا خط میرے پیش نظر ہے اور میں تمہاری
زجر و توبیخ کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ مجھے دیوانہ
کہو یا حواس باختہ۔ گنہگار قرار دو یا مصلحت نااندیش
لیکن خدارا میرے معصوم جذبات کی تحقیر اور میری پاکیزگی
خیال کی تضحیک نہ کرو۔ میرا دل چھلنی ہو چکا ہے۔ اب للہ
نمک پاشی سے اُس کی اذیت نہ بڑھاؤ۔ مجھے اپنے
دل پر قابو نہیں رہا۔ میرا دماغ میرے قلب کی بغاوت
فرو کرنے سے عاجز ہے۔ ستم ظریف قدرت کا شاید یہی
فیصلہ ہے کہ میری چند روزہ زندگی ہمیشہ طوفانوں میں ہو کر
گزرتی رہے۔ میں آگ کے شعلوں سے زندہ بچ نکلا
تو میرے دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن
کسے معلوم تھا کہ اب الفت آلود موجوں کی طغیانیاں اور
باد و باراں کی تباہ کاریاں منہ کھولے بیٹھی ہیں۔ تم مجھے
عقل وخرد کا درس دیتے ہو۔ لیکن یہاں یہ حالت ہے
کہ ہوش وحواس کے ماتم کی فرصت بھی نصیب نہیں۔
میں صبر و شکیب کی طاقت کہاں سے لاؤں۔ جبکہ یہاں
دلِ ناصبور کی پذیرائی کے لئے سوائے بجلیوں کے ہے
ہی کچھ نہیں ع

الفراق اے صبر و تمکیں الوداع اے عقل و دیں

میں تنہا ہوں اور بے حد پریشان و مضطرب۔ ہر چیز میرے
اختیار سے باہر ہے۔ میری آرزوئیں۔ میری تمنائیں۔
میری کاوشیں ایسی ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کرو تو ایک ایک
ذرہ میں میری موت و ہلاکت کا سامان پاؤ گے۔ بتاؤ
وحشت وبربادی کے اس مسکن میں مجھ خانماں خراب کے
لئے عافیت کہاں۔ میرے دل کا ایک گوشہ اگر دنیا پر
بے نقاب ہو جائے تو یقین جانو زمین و آسمان کی ان
وسعتوں میں میرے لئے کہیں ٹھکانا نہ رہے۔ یہ راز ایک
آگ ہے سلگتی ہوئی آگ۔ جو اندر ہی اندر میرے دل و
جگر کو جلا کر راکھ کر رہی ہے۔ آہ شعلوں کی طرح بھڑک
اٹھنا کتنا آسان ہے۔ لیکن تنور کی طرح جسم وجان کو گداز
کر دینے والی گرمی کے ساتھ اندر ہی اندر پکنا کس قدر مشکل۔
میرے اللہ یہ عذاب الیم اور میری جانِ ناتواں۔ یہ بارِ
عظیم اور میرے نحیف وزار کاندھے!

میرے عزیز دوست، بتاؤ میں کہاں جاؤں۔ میں
ایک قیدی ہوں۔ لیکن زنجیروں کو کاٹنا نہیں چاہتا۔ میں
ایک غلام ہوں لیکن حریت و آزادی کی بجائے اس غلامی
پر جان دیتا ہوں۔ کیا تم نے کبھی ایسے مجانین کو دیکھا ہے
جو آبِ حیواں کا جام چھوڑ کر زہر کے پیالے کو منہ لگا دیتے

میں تامل نہیں کرتے؟ اگر دیکھا ہے تو سمجھ لو کہ میرے دل و دماغ کی کیفیت آجکل وہی رنگ اختیار کر رہی ہے۔ دنیا یہی کہے گی نا کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے محبت کی۔ آہ محبت! کیا اُس قاتل جذبے کو صرف محبت سے تعبیر کرو گے جس نے میری راتوں سے خواب اور دنوں سے آرام چھین لیا ہے جس نے زندگی سے بیزاری اور موت سے ہم آغوشی کی تمنا پیدا کر دی ہے۔ جس نے میرے دل و دماغ کا گودا پگھلا دیا ہے۔ اور جس کے ہاتھوں جگر خون ہو کر آنکھوں کی راہ بہہ گیا ہے؟ کثرتِ عمومیت نے اس لفظ کے معنے کو ان کی حقیقی عظمت و رفعت سے محروم کر دیا ہے۔ یہ بوالہوسوں کی دنیا ہے یہاں فسق کو محبت اور ہوس کو عشق کہنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ مجھے اپنی فریفتگی و دیوانگی کو اب کسی اور نام سے موسوم کرنا پڑے گا۔ ہائے غالب

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

۵ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

تمہارا خط پہنچنے سے پہلے بھی مجھے علم تھا کہ میری کاوشوں کا انجام کچھ نہیں۔ اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ میری قسمت میں محرومی و ناکامی کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ تم مجھ سے کرید کرید کر کیا پوچھتے ہو۔ تمہارے اندازِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ تم میری صداقت پر اعتبار نہیں کرتے خدا گواہ ہے میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپا رکھی۔ میں نے اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھدیا ہے۔ اس دنیا میں تنہا تم ہی وہ شخص ہو جسے میں نے اپنے محبوب و مہلک راز سے آگاہ کرنے کی جرأت کی ہے۔ اس پر بھی تم میری طرف شک و شبہ کی نظروں سے دیکھو تو بتاؤ! میری جانِ حزیں پر اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے۔ میں تم سے کسی امداد کا خواہاں نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس درد کا درماں ممکن نہیں۔ مجھے علم ہے کہ اس مرض کا علاج پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس حالت ناامیدی میں سبب تکلیف کے ازالے کی نہ خواہش ہے نہ کوشش۔ میں تم سے کس چیز کا متوقع ہو سکتا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کم از کم اپنا پند و نصائح کا دفتر کچھ عرصے کے لئے طے کر رکھو اور میرے جذبات کی توقیر کرنا سیکھو۔ میرے یہ خطوط میرے نالۂ بے اختیار کی دلدوز چیخیں اور میرے گریۂ بیقرار کے چند خون آلود آنسو ہیں۔ جب پیمانۂ صبر و ضبط سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے تو تمہیں خط لکھ کر بارِ غم ہلکا کر لیتا ہوں۔ ذرا غور کرو فطرت کی جفا پیشگی اور میری بے چارگی پر غور کرو کہ ستم ایجاد قدرت نے برق و خرمن کو ایک جگہ بنا کر رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں قطرۂ شبنم کی ہستی ہی کیا کہ اس کی آزمائش آفتاب کے روبرو کی جائے۔ میں مبتلا ہوں گھڑا اپنے لیڑوں کو پانی میں تر ہونے سے بچا رہا ہوں۔ کیا تنکے کو آگ میں رکھ کر جلنے سے روکنے کی کوشش بارآور ہو سکتی ہے اور کیا شمع و پروانہ کی یکجائی سے موت و بربادی کے سوا کسی اور منظر کی توقع بھی قائم کی جا سکتی ہے؟ صبح سے شام اور شام سے پھر طلوعِ سحر تک ایک غیر مختتم سلسلۂ خیالات کی الجھنوں میں گرفتار رہتا ہوں۔ ایک ہی مکان

میں ایک ہی ماحول کے اندر مجھ سے چند گز کے فاصلے پر "وہ" مقیم ہے۔ جب قرب کا یہ عالم ہو تو بتاؤ دلِ دیوانہ اگر آپے سے باہر ہو جائے تو کیا عجب ہے۔ لیکن یقین جانو ہرچند کہ میرے جذبات میں آگ لگ رہی ہے۔ میری آنکھوں اور میرے ہونٹوں پر مُہر ثبت ہو چکی ہے۔ میری ایک بدلی ہوئی نگاہ میرا ایک معنی خیز لفظ میری ہلاکت کا باعث اور ایک گھرانے کی ذلت و رسوائی کا پیامبر بن سکتا ہے۔ قطرے دریا میں اور چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہونا چاہتی ہیں۔ تمنائیں تڑپ تڑپ کر اور دل مچل مچل کر اپنی داستانِ غم سنانے پر مصر ہے لیکن میں ہوں کہ پتھر کی بوجھل سِل اپنے سینے پر رکھ کر آہوں کے دبانے اور نالوں کے روکنے میں مصروف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ غم و اندوہ کا یہ طوفان رُکنے والا نہیں۔ اور یہ دریا ایک نہ ایک روز ضرور بہ نکلے گا۔ لیکن اُس ساعت کا تصور اور اُس انجام کا تخیل ہی میرے رگ و ریشہ سے زندگی کی حرارت کھینچ لیتا ہے۔ میری یہ حیاتِ مستعار "یقیناً" ایک حقیر شے ہے۔ لیکن "ز" کی عزت و آبرو ایک فردوسی، ایک ملکوتی، ایک آسمانی ہیرا ہے۔ اور اگر اس ہیرے کی آب و تاب کو برقرار رکھنے کی خاطر مجھے اپنی قربانی کی ضرورت پیش آئی۔ تو میں ہرگز دریغ نہیں کرونگا۔

---

۱۱ رفروری ۱۹۲۶ء

"سینکڑوں مرتبہ ایسا ہوا کہ قریب تھا میں اُسے اپنے آغوش میں لے لوں۔ الٰہی یہ کسقدر روح فرسا عذاب ہے کہ حُسنِ مجسّم ہو کر آنکھوں کے سامنے پھرے اور اُسے مس کرنے کی بھی اجازت نہ ہو! حالانکہ مس کرنا نفسِ انسانی کے تمام جبلّی رجحانات میں اوّل درجے پر ہے! کیا بچے ہر چیز کو چھونے کی کوشش نہیں کرتے؟"

یہ الفاظ جرمنی کے مشہور فلسفی ادیب گوئٹے کی ایک اہم تصنیف سے میں نے نقل کئے ہیں۔ لیکن ہائے ان الفاظ کے معانی ان الفاظ کی بجائے نگدا از حقیقت کوئی میرے دل سے پوچھے۔

کئی روز ہوئے میں نے شام کی ہوا خوری ترک کر دی ہے۔ شام کی سیر میں مجھے خالد اور "ز" کے ہمراہ جانا پڑتا تھا تم پوچھو گے کہ پھر اُس کا قرب حاصل کرنے کا یہ ذریعہ میں نے برضا و رغبت کیوں ضایع کر دیا بھائی اس کا جواب یہی ہے کہ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ گاڑی میں اُس کے بالمقابل بیٹھ کر مجھ پر ایک بیخودی ایک وارفتگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اُس کی سیاہ آنکھیں جنہیں دیکھتے رہنا میرے لئے ہزار عشرتوں کی ایک عشرت ہے میرے سامنے ہوں، اُس کے ریشمین ملبوس سے ہلکی ہلکی خوشبو نکل کر میرے مشامِ جان کو معطر کر رہی ہو، اُس کے لب ہائے لعلیں کا ہوشربا تبسم مجھ پر بجلیاں گرا رہا ہو اور وہ بایں ناز و رعنائی اپنی دلبری کی ساحرانہ قیامتوں کے ساتھ عین میرے سامنے اک بدلیۂ جمال، اک حدیقۂ حسن و شباب بنکر بیٹھی ہو ——— یوں بیٹھی ہو کہ میرا جسم اُس کے لباس کی سرسراہٹ اور اُس کے ہاتھوں کا لمس تک محسوس کر رہا ہو ———

تو بتاؤ اس جذبات انگیز فضا میں اگر میں اندھا ہو جاؤں
ہوش و حواس کھو دوں۔ موت اور زندگی میں تمیز
کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھوں تو کیا عجب ہے گزشتہ
ہفتے کا ذکر ہے جب ہم سیر کے لئے نکلے تو گاڑی میں
سوار ہوتے وقت اتفاق سے میرا ہاتھ اس کے ہاتھ
سے چھو گیا۔ میرے اعصاب میں ایک بجلی سی دوڑ گئی
اور مدت تک میں اپنے اندر ایک ارتعاش سا
محسوس کرتا رہا۔ اس روز وہ خلاف معمول لکھنؤ کی بیگمات
کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے حسین و شاداب چہرے
پر ایسی تروتازگی تھی جیسے موسم برشگال میں کھل کر بارش
ہو جانے کے بعد ٹھنڈی ہوا میں لہلہاتے ہوئے گلشن
کا روح افزا نظارہ۔ میں بار بار اس کے چہرے کی
طرف آنکھیں اٹھاتا اور پھر دائیں بائیں دیکھنے لگ جاتا
تھا۔ وہ موسم کی خوبی کا ذکر کر رہی تھی۔ لیکن میرے لئے
فطرت کے حسین مناظر۔ پہاڑیوں کے خوشنما سلسلے۔
آفتاب بہار کی تابانی اور بید کے درختوں کے درمیان
آہستہ آہستہ بل کھاتی ہوئی بہنے والی ندی اپنی تمام
دلکشی ضائع کر بیٹھی ہے۔ خارجی دنیا کا حسن سمٹ سمٹا کر
میرے لئے صرف ایک نقطہ میں جمع ہو گیا ہے۔ اور
اب اگر کوئی چیز خوبصورت نظر آتی بھی ہے تو اسی کے
پرتو سے۔ اور اگر کوئی شے گھڑی بھر کے لئے میری
توجہ کو جذب کرنے میں کامیاب بھی ہوتی ہے تو اسی
صورت میں کہ وہ اس کے عکس جمال سے منور ہو رہی ہو
میرا یہ طرز عمل بے اختیارانہ اور بہت حد تک مجبورانہ
ہے۔ کوئی شخص میرے دل میں مسرت و انبساط اور بہجت و
شادمانی کے وہ جذبات داخل نہیں کر سکتا جن کے قبول
کرنے کی مجھ میں فطرتاً استعداد نہیں۔ خود میں شب و
روز صبح و شام اپنے سینے میں ایک خلا محسوس کر رہا ہوں
—— ایک وحشت انگیز خلا! آہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں
کہ اگر ایک بار صرف ایک بار اسے اپنے سینے سے
لگا لوں تو یہ خلا ہمیشہ کے لئے پُر ہو جائے گا۔

۱۴ر مئی سنہ ۱۹۲۶ء

اس کا التفات میرے لئے اور زیادہ تباہ کن
ہے۔ اس کی لطف و عنایت کی نگاہیں جو وہ مجھ پر کبھی
کبھی ڈالتی ہے۔ میرے صبر و شکیب کی سب سے
خطرناک آزمائش ہیں۔ میری طبیعت کی اداسی اور جذبات
پنہاں کی طویل کشمکش نے میری صحت پر بہت برا اثر
ڈالا ہے۔ اگرچہ اب موت اور زندگی۔ صحت اور بیماری
زخم اور اندمال میرے لئے مترادف الفاظ رہ گئے
ہیں۔ میں کئی دن سے سیر نہیں گیا۔ کھانا بھی متعدد بار نہیں
کھایا۔ عذر یہی پیش کرتا رہا ہوں کہ بیمار ہوں۔ آخر وہ
خود کل میرے دیکھنے کے لئے آ گئی۔ اس کے آنے سے
ایک گھنٹہ پہلے میں بے اختیار رو رہا تھا۔ میں حیران
ہوں میری آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں سے آ گئے
تمہیں یاد ہے میں زندگی کی بڑی سی بڑی مصیبت پر بھی
رونا نہیں جانتا تھا میں نے قید و بند کے شدائد جھیلے ہیں
میں نے حکومت وقت کی شدید ترین سزائیں برداشت
کی ہیں لیکن میری آنکھیں ہمیشہ خشک رہیں۔ اب میں ہوں
اور شغل گریہ۔ وہ میرے کمرے میں آئی اور آتے ہی نہایت

ملاطفت سے میری طبیعت کا حال پوچھنا شروع کیا۔
ادھر میری گھبراہٹ کا یہ عالم تھا جیسے اسکول کا کوئی
طالب علم شرارت کرتا ہوا پکڑا جائے۔ گویائی کی طاقت
میری زبان سے زائل ہوگئی۔ اور میں حیرت و استعجاب
سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بیس منٹ کے قریب بیٹھی
مجھے دوا اور غذا کے متعلق ہدایات دیتی رہی خوش و خرم
رہنے کی نصیحتیں کرتی رہی۔ وہ مجھ سے اس قدر نزدیک
بیٹھی تھی کہ میں اُس کے تنفس کی گرمی محسوس کر رہا تھا
میرے جی میں آئی کہ اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے
لگا لوں۔ اپنے سر کو اُس کے قدموں پر گرا کر اُس کے پاؤں
کو آنسوؤں سے تر کر ڈالوں۔ اور اگر وہ چند لمحے اور بیٹھی تو
شاید میں یہ سب کچھ کر ہی گزرتا۔

میرے عزیز بھائی! یہ بارِ غم، یہ اندوہِ محبت، یہ
کاہشِ فراق میں کب تک برداشت کئے جاؤں، میرا سینہ
اس راز کی تاب نہ لا کر ایک نہ ایک روز پھٹ جائیگا
لیکن وہ روز میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ غالب کے
اس شعر کا مفہوم میں غالب سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

۳ر جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

خدارا یوں دق نہ کرو۔ تم مجھے بار بار لاہور کیوں
بلاتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں "اُس" سے دور رہ کر زندگی
گزار سکونگا؟ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو اس خیال کو جلد
از جلد اپنے دماغ سے نکال دو۔ اگرچہ یہاں رہنا بھی میرے
جسم و جان کے لئے ایک مستقل عذاب سے کم نہیں۔
لیکن اتنا تو ہے کہ میں "اُسے" دن میں چند بار دیکھ لیتا ہوں
یہ عجب کشمکش ہے کہ یہاں رہ کر بھی میں خوش نہیں اور یہاں
سے چلے جانا بھی مجھے منظور نہیں۔ آخر اس درد و کرب کا
اس حزن و ملال کا، اس تپش ناتمام کا انجام کیا ہوگا۔ تم نے
کبھی سوچا؟ اگر نہیں سوچا تو مجھ سے سن لو۔ اس کا انجام
ہے ــــــــــ موت!!

اُس کی ماہ پیکر و حور تمثال شخصیت کا عکس اپنے
آئینۂ قلب پر اُتار کر اُس کے تصور کی مدہوشیوں سے
اپنے دل و دماغ کو مخمور کئے اُس کی سیاہ آنکھوں کے
تابناک جلوؤں سے اپنی روح کی ویران خلوتوں کو منور
کر کے اس جہان سے گذر جانا۔ اس ظلمت کدۂ ارضی سے
سفر کر جانا ــــــ ــــــ آہ کس قدر
حسین و دلآویز تخیل ہے۔ شاعری کی دنیا اسی تخیل سے
رنگین ہے، ادب کا سرمایہ اسی تخیل سے برقرار ہے اور
مصوری کا جہانِ آب و رنگ اسی تخیل سے نظر فریب ہے
اصمعی کی وہ مشہور نظم جس کا ترجمہ نادر کاکوروی نے
کیا تھا تم نے پڑھی ہی ہوگی ایک فرقت زدہ مریضِ عشق
کے لئے اُس نے کیسا اچھا نسخہ تجویز کیا ہے ؎

جس کو فرقت بہت ستاتی ہو
جس نے کھایا ہو چاہ میں دھوکا
جس کو افشائے راز کا ڈر ہو
جس سے اب صبر ہو نہیں سکتا
اُس کا عمدہ علاج مرنا ہے
اس سے بہتر نہیں کوئی نسخہ

اب میری یہی آرزو ہے کہ تم مجھے موتوں اور ہلاکتوں کے لئے تنہا چھوڑ دو اور بھول جاؤ۔ اس مقتل میں میری ناچیز جان کا ہدیہ اُن قربانیوں کی طویل فہرست میں ایک حقیر سا اضافہ کریگا۔ جو قربانگاہِ عشق پر روزِ ازل سے انسان پیش کرتا آرہا ہے اور یونہی پیش کرتا چلا جائیگا ——

اُس وقت تک کہ انسانی دل دردِ محبت کی خلش سے محروم نہیں ہوجاتے۔ میں اپنے اندر انبساط و انقباض کے مخلوط جذبات کی شورش محسوس کررہا ہوں۔ خدا جانے کیوں چاہیئے تو یہ تھا کہ اس وقت جب میں آخری نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں مجھ پر خوشی طاری ہوتی یا غم، یہ دونوں کی آمیزش کیسی؟ شاید اس لئے کہ اُس "غارتگرِ دین و ایماں"۔ اُس "فتنہ گرِ ہوش و حواس"۔ اُس "جانِ آرزو" اور ہائے اُس "آرزوئے جاں" کے کان میرے افسانۂ غم سے ابتک آشنا نہیں ہوئے۔ اُس کی آنکھیں میرے دل کی حشر سامانی اور میرے جگر کی خونچکانی سے اب تک واقف نہیں ہوسکیں۔ کیا اس سے زیادہ جبر کوئی انسان اپنے نفس پر کرسکیگا۔ اور کیا اس سے بڑھ کر حرماں نصیبی و تیرہ بختی ابنِ آدم کے حصے میں آسکتی ہے؟ آہ اس کرۂ ارض پر اس روئے زمین پر تم ہی وہ شخص ہو جسے اس راز سے آگہی ہے۔ جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اور جو شاید میرے ساتھ ہی زمین میں دفن ہوجائے گا۔"

یہ خط ملا تو گویا مستقبل کے تمام اندیشے حقیقتِ مجسم بنکر میرے سامنے آگئے اور میں پریشان و ہراساں ہوکر اپنی اولیں فرصت میں ندیا کی طرف بھاگا۔ جو تھے روز وہاں پہنچا لیکن افضال میرے پہنچنے سے قبل خودکشی کرچکا تھا۔

انتظار (نظم)

از:-
پروفیسر سید عابد علی ایم اے ایل ایل بی۔

بزمِ دل جلوہ گہِ کاہکشاں ہے ہمدم! سوئے درچشمِ تماشا نگراں ہے ہمدم،
انکے آنے کی خبر وردِ زباں ہے ہمدم

شوق ہے محو بہ آرائشِ گیسوئے وفا، ذرّے ذرّے سے مجھے آتی ہے خوشبوئے وفا
ذرّہ ذرّہ مجھے انوار فشاں ہے ہمدم

پیہم آتی ہے جو کانوں میں صدائے ساقی ہے اُدھر وجد میں محفل بہ صلائے ساقی
اور ادھر شیشۂ مے رقص کناں ہے ہمدم،

اس سے پہلے مری نظروں میں تھی دنیا تاریک مہر و مہتاب تھے بے نور ثریا تاریک
آج پھر کون و مکاں کون و مکاں ہے ہمدم

فکاھی

چچا چھکّن نے سب کے لئے کیلے خرید ے

(فکاہی افسانہ)

از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج - بی - اے -

ایک بات میں شروع ہی میں عرض کر دوں۔ یہ واقعہ بیان کرنے سے حاشا و کلا میری غرض یہ نہیں کہ اس سے چچا چھکن کی فطرت کے جس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ اُس کے متعلق آپ کوئی مستقل رائے قایم کر لیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چچا چھکن کا اس نوع کا واقعہ مجھے صرف یہی ایک معلوم ہے۔ نہ اس سے پہلے کوئی واقعہ میری نظر سے گزرا۔ اور نہ بعد میں۔ ایمان کی پوچھئے۔ تو اس کے برعکس واقعات بڑی کثرت سے میرے دیکھنے میں آ چکے ہیں۔ بارہا میں خود دیکھ چکا ہوں کہ شام کے وقت چچا چھکن کچوریاں یا گنڈیریاں یا چلغوزے اور مونگ پھلیاں ایک بڑے رومال میں باندھ کر گھر بھر کے لئے لے آئے ہیں۔ اور پھر کیا بڑا اور کیا چھوٹا۔ ہر ایک میں برابر برابر تقسیم کر کے کھاتے کھلاتے رہے ہیں۔ پر اُس روز اللہ جانے کیا بات ہوئی۔ کہ ــــ مگر اسی کی تفصیل تو مجھے بیان کرنی ہے۔

اس روز سہ پہر کے وقت اتفاق سے چچا چھکن اور بندو کے سوا کوئی بھی گھر پر موجود نہ تھا۔ میر منشی صاحب کی بیوی کو پرسوت کا بخار آ رہا تھا۔ چچی دوپہر کے کھانے سے فراغت پا کر اُن کے ہاں عیادت کے لئے چلی گئی تھیں۔ بنو کو گھر چھوڑے جا رہی تھیں۔ کہ چچا نے فرمایا عیادت کو جا رہی ہو۔ تو شام سے پہلے بھلا کیا لوٹنا ہوگا بچی پیچھے گھبرائے گی۔ ساتھ لے جائیں۔ وہاں بچوں میں کھیل کر بہلی رہے گی۔ چچی بڑبڑاتی ہوئی بنو کو ساتھ لے گئیں۔ امامی چچی کو میر منشی صاحب کے گھر تک پہنچانے جا رہا تھا۔ مگر بنو ساتھ کر دی گئی تو بچی کے خیال سے اُسے بھی وہیں ٹھہر الینا پڑا۔

للو کے مدرسہ کا ڈی۔ اے۔ وی سکول سے کرکٹ کا میچ تھا۔ وہ صبح سے اُدھر گیا ہوا تھا۔ مودے کی رائے میں للو اپنی ٹیم کا بہترین کھلاڑی ہے۔ اپنی اس رائے کی بدولت اُسے کرکٹ کے اکثر میچوں کا تماشائی بننے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ حسب معمول آج بھی وہ للو کی اردلی میں تھا۔

دو بجے سے سینما کی میٹنی شو تھی۔ ودّو چچا سے اجازت لے کر تماشہ دیکھنے جا رہا تھا چھٹن کو جو پتہ لگا۔

کہ وہ تماشے میں جا رہا ہے۔ تو عین وقت پر وہ مچل گیا۔ اور ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ چچا نے اس کی تربیت کے بعض پہلوؤں پر چچی کا حوالہ دے دے کر ایک مختصر مگر پرمغز تبصرہ کرتے ہوئے اُسے بھی اجازت دیدی۔ واقعہ اصل یہ ہے۔ کہ چچی کہیں ملاقات کو گئی ہوں۔ تو باقی لوگوں کو گھر سے باہر جانے کے لئے چچا سے اجازت لے لینا دشوار نہیں ہوتا۔ ایسے نادر موقعوں میں چچا مکمل تنہائی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ دوسری مصروفیات نے جن امور کی طرف چچی کو عرصہ سے توجہ کرنے کی اجازت نہیں دی ہوتی۔ ایسے وقت چچا ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اس سے چچی کو یہ احساس دلانا مقصود ہوتا ہے۔ کہ گھر کی مشین میں ان کی ہستی ایک بیکار پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اور یہ چچا ہی کی ذات والاصفات کا ظہور ہے کہ چشم بینا کو گھر میں سلیقے اور سگھڑاپے کے کوئی آثار نظر آتے ہیں۔

آج آپ کے شغل آفریں دماغ نے چچی کی غیر حاضری میں گھر کے تمام ایسے برتن جو پیتل کے تھے۔ صحن میں جمع کر لئے تھے۔ بندو کو بازار بھیج کر دو پیسے کی املی منگائی تھی۔ صحن میں مونڈھا ڈال کر بیٹھ گئے تھے پاؤں مونڈھے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ حقے کی نے منہ سے لگی تھی۔ ذاتی نگرانی میں پیتل کے برتنوں کی صفائی کا اہتمام ہو رہا تھا۔

"ارے احمق اب دوسرا برتن کیا ہوگا۔ جو برتن صاف کرنے ہیں۔ ان ہی میں سے کسی ایک میں املی بھگو ڈال۔ اور کیا — یوں — بس یہی پیتل کا لوٹا کام دے جائے گا۔ صاف تو اسے کرنا ہی ہے ایک دوسرا برتن لاکر اُسے خراب کرنے سے حاصل؟ ایسی باتیں تم لوگوں کو خود کیوں نہیں سوجھ جایا کرتیں؟"

بندو نے تعمیل ارشاد میں کچھ کہے بغیر املی لوٹے میں ڈال بھگو دی۔ چچا نے فخر سے اطمینان کا اظہار کیا "کیسی بتائی ترکیب؟ ضرورت بھی پوری ہو گئی۔ اور اپنا — یعنی کام بھی ایک حد تک ہو گیا۔ لے اب باورچی خانے جا کر برتن مانجھنے کے لئے تھوڑی سی راکھ لے آ۔ کس برتن میں لائے گا بھلا؟"

بندو نے بڑی ذہانت سے تمام برتنوں پر نظر ڈالی۔ اور اُن میں سے ایک سینی اُٹھا کر چچا کی طرف دیکھنے لگا۔ چچا بھی اس غرض کے لئے شاید سینی ہی تجویز کرنا چاہتے تھے۔ ہدایت دینے کا افتخار نہ مل سکا۔ تو پوچھنے لگے۔ "کیوں بھلا؟"

بندو بولا "چولھے سے اُٹھا کر اس میں آسانی سے راکھ رکھ لونگا"۔

"احمق کہیں کا۔ علاوہ ازیں راکھ کھلے برتن میں ہوگی تو اُٹھا اُٹھا کر برتن مانجھنے میں آسانی نہ ہوگی؟"

بندو ابھی باورچی خانے سے راکھ لانے نہ پایا تھا کہ دروازے پر ایک پھل والے نے صدا لگائی۔ کلکتیا کیلے بیچنے لایا تھا۔ اُس کی صدا سُن کر کچھ دیر تو چچا خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہے لیکن البتہ جلدی جلدی لگا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا دماغ میں کسی قسم کی کشمکش جاری ہے جب آواز سے معلوم ہوا کہ پھل والا واپس جا رہا ہے۔ تو جیسے بے بس سے ہو گئے۔ بندو کو آواز دی ذرا جا کر

دیکھو تو۔ کیلے کس حساب دیتا ہے۔"

بندو نے واپس آکر بتایا" چھ آنہ درجن"

"چھ آنے کے درجن۔ تو کیا مطلب ہُوا؟ کہ چوبیس پیسے کے بارہ۔ بارہ دونی چوبیس۔ یعنی دو دو پیسے کا ایک۔ مہنگے ہیں۔ جاکر کہہ تین تین پیسے کے دو دیتا ہے تو دے جائے۔"

دو منٹ بعد بندو نے کہا کہ" مان گیا۔ کتنے کیلے لینے ہیں؟"

پھل والا اس آسانی سے رضامند ہوگیا۔ تو چچا کی نیّت میں فتور آیا۔ "یعنی تین تین پیسے کے دو؟ کیا خیال ہے۔ مہنگے نہیں اس بھاؤ پر؟"

بندو بولا:" اب تو اس سے بھاؤ کا فیصلہ ہوگیا۔"

"تو کسی عدالت کا فیصلہ ہے۔ کہ اتنے ہی بھاؤ پر کیلے لئے جائیں۔ ہم تو تین آنے درجن لیں گے دیتا ہے دے۔ نہیں دیتا نہ دے۔ وہ اپنے گھر خوش۔ ہم اپنے گھر خوش۔"

بندو پس و پیش کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔

"ابے تو جاکر کہہ تو سہی۔ مان جائے گا۔"

بندو جانے سے کترا رہا تھا۔" آپ خود کہہ دیجئے۔"

چچا نے جواب میں آنکھیں پھاڑ کر بندو کو گھورا وہ غریب ڈر گیا۔ مگر اب بھی وہیں کھڑا رہا۔ چچا کو اسکا پس و پیش شاید کسی قدر بجا معلوم ہُوا۔ اُسے ذلیل کا راستہ سمجھانے لگے۔" تو جاکر یوں کہہ کہ میاں نے تو تین آنے درجن ہی کہے تھے۔ میں نے آکر غلط بھاؤ کہہ دیا۔ تین آنے درجن دینے ہوں تو دے جائے۔"

بندو دل کڑا کرکے باہر چلا گیا۔ چچا جانتے تھے بھاؤ ٹھہرا کر اس سے پھر جانے پر کیلے والا غل مچائیگا باہر نکلنا قرین مصلحت نہ معلوم ہوتا تھا۔ دبے پاؤں اندر گئے اور کمرے کی جو کھڑکی ڈیوڑھی میں کھلتی تھی۔ اُس کا پٹ ذرا سا کھول باہر جھانکنے لگے پھل والا گرم ہو رہا تھا" آپ ہی تو ایک بھاؤ ٹھہرایا۔ اور آپ ہی زبان سے پھر گئے۔ بھانہ نوکر کی بھول کا جیسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ یا بے ایمانی تیرا ہی آسرا۔"

بندو غریب چپکا کھڑا تھا۔ پھل والا بکتا جھکتا خونچہ اُٹھا چلنے لگا۔ بندو بھی اندر جانے کو مڑ گیا۔ دروازے تک پہنچنے نہ پایا تھا۔ کہ پھل والا رک گیا۔ خونچہ اُتار کر بولا" کتنے لینے ہیں؟"

بندو اندر آیا تو چچا چھکن مونڈھے پر بیٹھے جیسے کسی خیال کی محویت میں حقّہ پی رہے تھے۔ چونک کر بولے" مان گیا؟ ہم نہ کہتے تھے مان جائیگا۔ ہم تو ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ تو کے کیلے لینے مناسب ہوں گے؟" چچا نے اُنگلیوں کی پوروں پر گن گن کر حساب لگایا" ہم آپ۔ چھٹن کی اماں۔ للّو۔ ودّو۔ بنّو اور چھٹن۔ گویا چھ۔ چھ دونی کیا ہُوا؟ خدا تیرا بھلا کرے بارہ۔ یعنی ایک درجن۔ فی آدمی دو کیلے بہت ہوں گے۔ پھل سے پیٹ تو بھرا نہیں جاتا۔ منہ کا ذائقہ بدلا جاتا ہے۔ پر دیکھو دو تین کچھے اندر لے آنا۔ ہم آپ ان میں سے

اچھے اچھے کیلے چھانٹ لیں گے"۔

پھل والے نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کیلوں کے گچھے اندر بھیج دئے۔ چچا نے کیلوں کو دبا دبا کر دیکھا۔ ان کی چھتیوں کا مطالعہ کیا اور درجن بھر کیلے علیحدہ کر لئے۔ کیلے والا باقی کیلے لیکر بڑبڑاتا ہوا رخصت ہوگیا۔ چچا نے بندو کی طرف توجہ کی "یہ لے انہیں کھانے کی ڈولی میں حفاظت سے رکھدے رات کے کھانے پر لاکر رکھنا۔ اور اب جلدی سے آکر برتن مانجھنے کے لئے راکھ لا۔ بڑا وقت اس قصّے میں ضایع ہوگیا"۔

بندو کیلے اندر رکھ آیا۔ اور باورچی خانے سے راکھ لاکر برتن مانجھنے لگا۔ "یوں...... ذرا زور سے ہاتھ۔ تاکہ برتن پر رگڑ پڑے۔ اس طرح! پیتل کے برتن صاف کرنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ املی کے استعمال سے قبل انہیں ایک بار خوب اچھی طرح مانجھ کر صاف کر لیا جائے۔ ایسے سب برتنوں کی صفائی کے لئے املی لاجواب نسخہ ہے۔ گرہ میں باندھ رکھ کسی روز کام آئے گا + اور ایک پیتل ہی کا کیا ذکر دھات کی جملہ اشیا املی سے دمک اُٹھتی ہیں۔ ابھی ابھی تو آپ دیکھو کہ ان کالے کالے برتنوں کی صورت کیا نکل آتی ہے + ہاں اور وہ میں نے کہا۔ کیلے احتیاط سے رکھ دیئے ہیں نا؟ ڈولی میں؟ ہُوں + اچھے بھاؤ مل گئے۔ کیا ایک ایک کے لئے دو دو ٹھیک رہینگے؟ ــــ یوں۔ بس منجھ گیا۔ اب مگر اس پر املی۔ اس طرح دیکھا میل کس طرح کٹتا ہے کیسی چمک آتی جا رہی ہے یہ املی فی الواقعی بڑی بے نظیر شے ہے + مگر میں نے کہا بندو میرا بھائی۔ ذرا اُٹھیو تو۔ ان کیلوں میں سے جو دو ہمارے حصّے کے ہیں ہمیں لا دیجو۔ ہم تو ابھی کھائے لیتے ہیں۔ باقی لوگ جب آئیں گے اپنا حصّہ کھاتے رہیں گے"+

بندو نے اُٹھ کر دو کیلے چچا کو لا دیئے۔ چچا نے مونڈھے پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے پینترا بدلا۔ اور کیلوں کو تھوڑا تھوڑا چھیلنا اور تکلّف سے نوش فرمانا شروع کیا "تو کئے جا اپنا کام۔ ذرا جھپاک سے۔ ہاں دیکھنا اب ذرا سی دیر میں ان برتنوں کی شکل کیا نکل آتی ہے.... اچھے ہیں کیلے۔ بس یونہی ذرا زور سے ہاتھ.... اس طرح.... چھٹن کی ماں دیکھیں گی تو سمجھیں گی۔ آج ہی نئے برتن خرید کئے ہیں + اور پھر لطف یہ کہ خرچ کچھ بھی نہیں۔ ہرا لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ آخر کتنے کی آگئی املی۔ نہ نہ خود ہی کہو۔ کتنے کی آئی املی۔ دو پیسے کی نا؟ تو آپ خرید کر لایا تھا۔ اور پھر جو کچھ کیا تو نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہ تو ہُوا ہی نہیں کہ تجھ سے آنکھ بچا کر ہم نے بیچ میں کچھ ملا دیا ہو۔ بس یہ جتنی بھی کرامات ہے صرف املی کی ہے۔ محض املی کی۔ اور وہ میں نے کہا اب کے کیلے باقی رہ گئے ہیں؟ دس ہوں۔ خوب شے ہے نا املی؟ ایک ٹکے کے خرچ میں چیزوں کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ مگر بندو ان دس کیلوں کا حساب اب ہوئیگا کس طرح؟ یعنی ہم شریک نہ ہوں جب تو ہر ایک کو دو دو کیلے مل رہیں گے لیکن ہماری شرکت کے بغیر شاید دوسروں کا جی بھی کھانے کو نہ چاہے۔ کیوں؟ چھٹن کی

اماں تو ہمارے بغیر نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہیں گی۔ تو نے خود دیکھا ہوگا۔ کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اور بچوں میں بھی دوسرے ہزار عیب ہوں پر اتنی خوبی ضرور ہے۔ کہ ندیدے اور خود غرض نہیں ہیں، سب نے مل کر شریک ہونے کے لئے ہم سے اصرار شروع کر دیا تو بڑی دقت ہوگی۔ برابر برابر تقسیم کرنے کو کیلے کاٹنے ہی پڑینگے اور کلکتیا کیلے کی بساط بھلا کیا ہوتی ہے۔ کاٹنے میں سب کی مٹی پلید ہو جائے گی۔ کَے کیلے بتائے تھے تو نے؟ دس؟ دس کیلے اور چھ آدمی۔ ٹیڑھی بات ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں مثلاً فی آدمی ایک ایک کا حساب رکھ دیا جائے تو؟ دو دو نہ سہی ایک ایک ہی ہو۔ مگر کھائیں تو سب ہنسی خوشی مل جل کر۔ ٹھیک ہے نا؟ گویا چھ رکھ چھوڑنے ضروری ہیں۔ تو اس صورت میں کَے کیلے ضرورت سے زیادہ ہوئے؟ چار نا؟۔ ہوں تو میرے خیال میں وہ چاروں زاید کیلے لے آتا۔ باقی کے چھ تو اپنا ٹھیک حساب کے مطابق تقسیم ہو جائینگے"۔

بندو اُٹھ کر چار کیلے لے آیا۔ چچا نے اطمینان سے اُنہیں باری باری نوش فرمانا شروع کر دیا۔

"ہاں تو تو قائل بھی ہوا املی کی کرامت کا؟ بیشمار فوائد کی شے ہے۔ مگر کیا کیجئے اس زمانہ میں دیس کی چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ یہی املی اگر ولایت سے ڈبوں میں بند ہو کر آتی تو جناب لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے۔ ہر گھر میں اس کا ایک ڈبا موجود رہتا۔ مگر چونکہ پنساری کی دوکان سے دستیاب ہو جاتی ہے۔ کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ اور پھر ایک برتنوں کی صفائی کا کیا ذکر۔ اس کے اور بھی تو بہتیرے فوائد ہیں۔ یعنی دوران سر کی شکایت کے لئے اس سے بہتر شے سننے میں نہیں آئی۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ کڑوی کسیلی ہو۔ یا بدمزہ بودار ہو۔ شربت بنائیے۔ کھٹا میٹھا ایسا لذیذ ہوتا ہے کہ کیا کہئے...... کیلے بھی نہایت لذیذ ہیں۔ زیادہ نہ لے لئے تو نے....... املی کا شربت تو شاید تو نے بھی پیا ہو۔ کیسا خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو نعمت ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ مفید بھی بیحد۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ امتلا کو یہ روکتا ہے۔ امتلا نہیں جانتا؟ ارے احمق متلی کی شکایت اس کے علاوہ صفرا کے لئے یہ مفید ہے۔ صفرا بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ پھر کبھی سمجھائیں گے۔ تو وہ کیلے تو اب چھ ہی باقی رہ گئے ہیں نا؟ کچھ نہیں۔ بس ٹھیک ہے۔ سب کے حصے میں ایک ایک آجائیگا۔ ہمیں ہمارے حصے کا مل جائے گا۔ دوسروں کو اپنے اپنے حصے کا۔ کانٹ چھانٹ کا جھگڑا تو ختم ہوا اپنے اپنے حصے کا کیلا لیں۔ اور جو جی چاہے کریں جی چاہے آج کھائیں۔ آج جی نہ چاہے کل کھالیں اور کیا۔ ہونا بھی یہی چاہئے۔ رغبت کے بغیر کوئی چیز کھائی جائے تو جزو بدن نہیں بننے پاتی۔ یعنی اکارت چلی جاتی ہے۔ کوئی چیز آدمی کھائے اُسی وقت جب اُس کے کھانے کو جی چاہے۔ چھٹن کی اماں کی ہمیشہ سے یہی کیفیت ہے۔ جی چاہے تو چیز کھاتی ہیں نہ چاہے تو کبھی ہاتھ نہیں لگاتیں۔ ہمارا اپنا یہی حال ہے۔ یہ متفرق چیزیں کھانے کو کبھی کبھار ہی جی چاہتا

ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ اب یہی کیلے ہیں بیسیوں
مرتبہ دکانوں پر رکھے دیکھے۔ کبھی رغبت نہ ہوئی آج
جی چاہا۔ تو کھانے بیٹھ گئے۔ اب پھر نہ جانے کب جی
چاہے۔ ہماری تو کچھ ایسی ہی طبیعت ہے۔ نہ جانے
شام کو جب تک سب آئیں رغبت رہے یا نہ
رہے۔ یقین سے کیا کہا جا سکتا ہے۔ دل ہی تو ہے
ممکن ہے اس وقت کیلے کے نام سے طبیعت نفور
ہو۔ تو ایسی صورت میں ہم جانیں۔ ہم تو بقیہ چھ کیلوں
میں سے اپنے حصے کا ایک کیلا ابھی کھا لیتے۔
کیوں؟ اور کیا اپنی اپنی طبیعت ہے۔ اپنی اپنی
بھوک۔ جب جس کا جی چاہے کھالے۔ اس میں
تکلف کیا۔ ایسے معاملوں میں تو بے تکلفی ہی اچھی ہے

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

تو ذرا اٹھیو میرا بھائی۔ بس میرے ہی حصے کا کیلا لانا
باقی کے سب وہیں احتیاط سے رکھے رہیں +

حسب الارشاد بندو نے کیا۔ چچا کو لا دیا۔ چچا
چھیل کر نوش فرمانے لگے۔

"دیکھا کیا صورت نکل آئی برتنوں کی۔ سبحان اللہ
یہ املی کا نسخہ موثر ہی ایسا ہے۔ اب انہیں دیکھ کر کوئی
کہہ سکتا ہے کہ پرانے برتن ہیں۔ جو دیکھے گا یہی
سمجھیگا۔ ابھی ابھی بازار سے منگوا کر رکھے ہیں۔ دوسروں
کا کیا ذکر۔ ہماری غیر حاضری میں یوں صاف کئے گئے
ہوتے تو واپس آکر ہم خود نہ پہچان سکتے چھٹن کی
اماں بھی دیکھیں گی تو ایک بار تو ضرور چونک پڑیں گی۔
تجھ سے پوچھیں تو کہہ دیجو۔ میاں ساری دوپہر بیٹھ کر
صاف کراتے رہے ہیں۔ پر ایک بات۔ املی کا ذکر نہ
آنے پائے۔ ہاں ایسی بات بتا دو۔ تو کام کی وقعت
کھو جاتی ہے۔ سمجھ گیا نا؟ بس اب یہ املی کی بات آگے
نہ نکلنے پائے۔ جو پوچھے یہی کہو میاں نے ایک نسخہ
بنا کر اس سے صاف کرائے ہیں۔ بچوں سے بھی
ذکر نہ کیجو۔ ورنہ نکل جائے گی بات۔ کب تک آئینگے
بچے؟ للو کا میچ تو شاید شام سے پہلے ختم نہ ہو۔ اس
کے کھانے چائے کا انتظام ٹیم والوں نے ہی کر دیا ہوگا
ورنہ خالی پیٹ کس سے کھیلا جاتا ہے۔ کوئی انتظام نہ
ہوتا تو مودے کو بھیجکر وہیں کھانے منگوا سکتا تھا خوب
تر لقمے اڑائے ہوں گے آج۔ میوے مٹھائی سے
ٹھساٹھس پیٹ بھر لیا ہوگا۔ چلو کیا مضائقہ ہے۔
یہی عمر کھانے پینے کی ہے۔ اور پھر گھر کے دوسرے
لوگ نعمتیں کھائیں۔ تو وہ غریب کیوں پیچھے رہے؟
ودو اور چھٹن تو ٹکٹ کے دام کے ساتھ کھانے پینے
کے لئے بھی پیسے لے کر گئے ہیں۔ اور کیا؟ وہیں کسی
دکان پر میوہ مٹھائی اڑا رہے ہوں گے۔ خدا خیر کرے
ثقیل چیزیں کھا کھا کر کہیں بدہضمی نہ کر لائیں۔ ساتھ
کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے۔ تردد ہوتا ہے
بنو کا تو یہ ہے کہ ماں ساتھ ہے۔ وہ خیال رکھے گی۔ کہ
کہیں زیادہ نہ کھا جائے۔ مگر بس کہتا ہوں۔ کیلے ہم
نے آج بڑے بے موقع لئے۔ اس وقت خیال ہی نہ
آیا کہ آج تو یہ سب بڑی بڑی نعمتیں اڑا رہے ہونگے۔
کیلوں کو کیوں خاطر میں لانے لگے۔ اور تو نے بھی یاد

فارسی ادبیات کا اتنا صحیح مذاق رکھتے ہیں کہ ان کی اس پاکیزگیٔ ذوق پر رشک آتا ہے۔ اُن کا بیش قیمت کتبخانہ تو میرے لئے ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ ریاست کی سرکاری لائبریری سے استفادہ کرنے کی بھی مجھے اجازت ہے۔ اٹھارھویں صدی کی ہندوستانی سیاسیات پر اتنا گرانقدر اور مستند تاریخی مواد موجود ہے۔ کہ اگر اس کی چھان پھٹک کر کے کسی خاص ترتیب کے ساتھ اُسے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو تاریخ ہند کے اُس افسوسناک لیکن صد درجہ دلچسپ دور کے تاریکیوں کے بہت سے پردے دور ہو سکتے ہیں۔ غرضکہ جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے ندیا کے اندر بہت سے قیمتی خزانے پنہاں ہیں۔ اگرچہ مجموعی طور پر اس جگہ کا ماحول علمی۔ ادبی نہیں میرے اوقات کا بیشتر حصہ دیوان صاحب کے صاحبزادے خالد کی تعلیم میں ہی بسر ہوتا ہے۔ یہ ذہین و خوش فہم لڑکا اپنے بلند اقبال والدین کا تنہا نورِ نظر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دیوان صاحب اس کی تعلیم و تربیت میں بہت کوشاں ہیں دیوان صاحب خود بھی بالکل نوجوان ہیں اور ان کی موجودہ بلند و بالا حیثیت کے پیشِ نظر تو انہیں بہت ہی نوعمر کہنا چاہیئے۔ اگر ترقی مدارج کی یہی رفتار رہی تو مجھے اُن کا مستقبل بیحد شاندار نظر آرہا ہے خالد بہت ہی پیارا بچہ ہے اور حیرت انگیز دماغی استعداد کا مالک ہے۔ دیوان صاحب کی بیگم صاحبہ اودھ کی رہنے والی ہیں۔ اور اس طرح اس گھرانے میں دہلی و لکھنؤ کی تہذیب کے بہترین عناصر جمع ہو گئے ہیں۔

رہنے سہنے کے طریقے تمامتر مغربی ہیں لیکن زباں جو استعمال ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کوثر سے دھل کر آئی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے بھی اُردو دانی کا زعم ہے۔ لیکن ”لکھنے کی اُردو کا“ ”بولنے کی اردو“ کا نہیں۔ یوں تو بولنے میں بھی مجھ سے محاورہ کی غلطی کبھی نہیں ہوتی۔ لیکن ہائے وہ دلّی کا لب و لہجہ اور لکھنؤ کی لچک کہاں سے لاؤں۔ ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ دیوان صاحب میرے مضامین کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہندوستان کا ترقی یافتہ ادب اپنے لئے یہی اُردو اختیار کرے گا۔ جو علیگڑھ۔ لاہور اور حیدرآباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے ذوقِ سلیم رکھنے والے لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ سارا قصہ بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ تم پر واضح کر دوں کہ آجکل لیل و نہار کیونکر گذر رہے ہیں۔ ایسی اچھی فضا میں زندگی بسر کرنے اور دن کا زیادہ حصہ کام میں مصروف رہنے کے باوجود میں بعض اوقات اپنے تئیں سخت تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اور ایک نامعلوم سی افسردگی و محرومی طبیعت پر چھا جاتی ہے۔ یہ شاید اس لئے کہ آپ لوگوں سے دور ہوں۔ یا اس لئے کہ واہمہ کبھی کبھی موہوم و بے نام سے خدشات پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے“

---

۲۹ نومبر ۱۹۲۴ء

”تم بس ذرا ذرا سی چھوٹی چھوٹی باتیں پر بگڑ بیٹھتے ہو کہ مجھے تمہاری اس ذہنیت کی داد دینا پڑتی ہے۔ گذشتہ

خط میں تم نے پوچھا تھا کہ میرے کھانے کا انتظام کیا ہے۔ تمہاری اس ہمدردانہ توجہ کا بہت شکریہ۔ لیکن تم بے فکر رہو۔ میں ندیا میں بیٹھ کر لاہور سے کھانا نہیں منگواؤں گا۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ میرا قیام دیوان صاحب کی طویل و عریض اور عظیم الشان و خوشنما کوٹھی میں ہے۔ اور جب قیام یہاں ہے تو سمجھ لو کہ طعام بھی یہیں ہوگا۔ میرے رہنے کے کمرے دیوان صاحب کے دفتر سے کچھ فاصلہ پر ہیں اور تمدن جدید کے لحاظ سے تمام ضروری سامان سے مکمل اور لوازم آرائش سے مزین ہیں۔ کھانا انگریزی بھی ہوتا ہے اور ہندوستانی بھی۔ دیوان صاحب اکثر انگریزی قسم کا کھانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن بیگم صاحبہ کے مرغوب خاطر ہندوستانی کھانے ہیں۔ اس طرح میرے دسترخوان پر بیک وقت ابلا ہوا انگلش گوشت بھی ہوتا ہے۔ اور لکھنؤ کی بورانی و مزعفر بھی۔ سچ بتاؤ تمہارے منہ میں پانی تو بھر نہیں آیا؟

ناصر! سچ کہتا ہوں یہ دونوں میاں بیوی میرے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسے اخلاق فاضلہ کے انسان ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ حکومت و تموّل کے باوجود رعونت کا نام و نشان نہیں۔ ملازموں سے روزانہ تاکید ہوتی ہے کہ میرے آرام و راحت کا ہر لحظہ خیال رکھیں۔ پھر اس پر بار بار مجھ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ کوئی تکلیف تو نہیں۔ میں تو بعض اوقات ان کی خاطرداریوں سے شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ اور یہ سارا کاروبار مصنوعی یا متکلف نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ یہ سب کچھ تکلف نہیں بلکہ اُن کی فطرت کی بلندی، طینت کی نیکی اور سرشت کی پاکیزگی کا اظہار ہے۔

لاہور سے آکر میری طبیعت میں ایک عجیب سرمدی سکون پیدا ہوگیا ہے۔ شاید یہ ماحول کا اثر ہو۔ یا خود میری گذشتہ شورانگیزیوں کا طبعی ردِّعمل۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے دل کو پہلے کی بہ نسبت شاداں و فرحاں اور دماغ کو مسرور و مطمئن پاتا ہوں۔

شام کا کھانا میں بالعموم دیوان صاحب، بیگم صاحبہ اور خالد کے ہمراہ ہی کھاتا ہوں۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر میں بتادوں کہ دیوان صاحب پردے کی رسم قبیح کے قائل نہیں ہیں۔ اس لئے بیگم صاحبہ مروّجہ پردے کی پابندی نہیں فرماتیں۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم گھنٹہ پون گھنٹہ وہیں میز پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی دیوان صاحب اپنے قیام انگلستان کے زمانے کی کوئی دلچسپ بات چھیڑ دیتے ہیں۔ یا کبھی تہذیب و معاشرت کے کسی پہلو پر گفتگو شروع ہو جاتی ہے جس میں ہم سب دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ننھا خالد بھی اپنی بساط کے مطابق شرکت سے محروم نہیں رہتا۔ دیوان صاحب حد درجہ مہمان نواز انسان ہیں اور ان کی مہمان نوازیوں کے چرچے یہاں خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ اور ہر ہفتے دور و نزدیک سے ایک آدھ دوست اُن سے ملنے آ ہی جاتا ہے۔ اُن کے تمام دوست اخلاق و ذہانت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اور اپنی شائستہ کلامی و عالی دماغی کے باعث ہندوستان کی بہترین سوسائٹی کا سرمایہ کہے جاسکتے ہیں۔"

۲۷ دسمبر ۱۹۲۴ء

"تم چونکہ ہر روز شام کا وقت ایک تفریحی پروگرام کے ماتحت صرف کرنے کے عادی ہو۔ اسی لئے بار بار پوچھتے ہو کہ میری شام کیونکر گذرتی ہے۔ میں اگر اس نگارستانِ ہند میں ہوتا جسے عرفِ عام میں لکھنؤ کہتے ہیں تو شاید اپنے مجروح و درماندہ قلم کی زندگی کی آخری رمق کو کام میں لا کر شامِ اودھ کی لٹی ہوئی بہاروں کا ہلکا سا نقشہ کھینچ دیتا۔ لیکن وائے قسمت کہ ندیا میں ہوں جہاں نہ لاہور کی مال ہے اور نہ لکھنؤ کا چوک۔ پھر ان حالات میں مجھ سے میری شاموں کی تفصیل طلب کر کے میری سوگواریوں میں اضافہ کرنا ہی مقصود نہیں تو کیا ہے؟ میں عام طور پر دیوان صاحب کے ساتھ شام کو ٹینس کھیلتا ہوں۔ یا کبھی کبھی بیگم صاحبہ اور خالد کی ہمراہی میں ہوا خوری کے لئے چلا جاتا ہوں۔ خالد مجھ سے بہت مانوس ہو گیا ہے اور ہمیشہ ساتھ چلنے پر اصرار کرتا ہے۔ راستے میں عجیب عجیب سوال پوچھتا ہے جو اس کے بھولپن کی وجہ سے بڑی دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کہتا ہے کہ آپ کا لاہور اچھا ہے یا ندیا؟ میں جواب دیتا ہوں لاہور۔ پھر فوراً پکار اٹھتا ہے وہ کیوں؟ میں نے تو سنا ہے کہ وہاں بہت گرمی پڑتی ہے۔ اور وہاں پہاڑ بھی نہیں ہیں۔ پھر لاہور کیونکر اچھا ہو گیا۔ بیگم صاحبہ مسکرانے لگتی ہیں اور میں بھی ہنس کر کہتا ہوں کہ ہاں واقعی ندیا لاہور سے اچھا ہے لیکن اسی وقت تک کہ تم یہاں ہو۔ اگر تم یہاں سے چلے گئے تو میں واپس لاہور بھاگ جاؤں گا۔

میں نے شاید پہلے بھی تمہیں لکھا تھا کہ بیگم صاحبہ مروجہ پردے کی پابند نہیں ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پردے سے نصف لطفِ زندگی ضائع ہو جاتا ہے۔ دیوان صاحب کی خانگی زندگی قابلِ رشک مسرت و اطمینان سے گذر رہی ہے۔ اور میں نے بہت کم گھرانوں میں حیاتِ ازدواجی کو اسقدر برکتوں اور سعادتوں سے لبریز پایا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا تحریک میں شامل ہونے سے پہلے جب فارغ البالی میسر تھی تو ہم کبھی کبھی اپنی ازدواجی زندگی کے پُر کیف خواب دیکھا کرتے تھے۔ اور تخیل کی مدد سے ایک ایسی فضا پیدا کرتے تھے۔ جہاں محبت، شعریت اور محبوبیت کے بادل سایہ فگن ہوں۔ وہ فضا حقیقتاً میری آنکھوں نے یہاں آ کر دیکھی ہے۔ اور میں بعض اوقات سخت دلگیر و دل گرفتہ ہو کر سوچتا ہوں کہ کیا قدرت مجھے کبھی ایسی پُر امن زندگی سے ہم کنار نہ کرے گی۔ آہ ناصر تم ہی انصاف کرو گردشِ ایام کے تیز و تند بگولوں اور جسم و جان کو پگھلا دینے والے طوفانوں میں سے گذرنے کے بعد بھی میں ایسی زندگی کا حقدار نہیں رہا؟

---

۲۱ جنوری ۱۹۲۵ء

"کل شام سیر کے لئے ہم باہر جانے لگے۔ تو موسم میں معمول سے زیادہ خنکی تھی۔ میں ہلکا سا لباس پہنے ہوئے تھا۔ گاڑی میں سوار ہوتے وقت میری مالکہ (میری مراد بیگم صاحبہ سے ہے) نے میری طرف دیکھ کر حیرت سے کہا کہ آپ اس لباس میں سیر کو جائیں گے۔ دیکھئے تو سہی موسم کس قدر سرد ہو رہا ہے۔ اور آپ نے کپڑے

پہننے میں اتنی بے احتیاطی کرتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ نزلہ ہو جائے تو؟ میرے دل میں تشکر و امتنان اور عقیدت و عبودیت کا وہ ناقابل بیان جذبہ پیدا ہوا کہ بے اختیار جی چاہا کہ اپنا سر اُن کے پاؤں پر رکھدوں یہ ہے بھی سچ کہ میں ان دنوں اپنی ضروریات کی طرف سے کچھ غافل سا ہوتا جا رہا ہوں۔ کھانا کبھی کھاتا ہوں اور کبھی بغیر کھائے ہی دن گذار دیتا ہوں۔ خدا جانے یہ وحشت کس پر اسرار ذریعہ سے میرے مزاج میں داخل ہو گئی ہے۔ اور خود میری یہ حالت ہے کہ میں اس وارفتگی کی وجہ دریافت کرنے پر بھی قادر نہیں معلوم ہوتا ہے کوئی خوش آیند شے میرا راستہ کاٹ گئی ہے۔ بعض اوقات ایسے تباہ کن خیالات دماغ پر طاری ہوتے ہیں کہ اُن کا اظہار تو ایک طرف میں اُن کے تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتا ہوں۔ میں زندگی کی عام شاہراہ سے ہٹ کر ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈیوں پر چلنا نہیں چاہتا۔ میری عافیت اسی میں ہے کہ کنارے پر آہستہ آہستہ گامزن رہوں۔ دریا میں کودنے اور موجوں سے ہم آغوش ہونے کی نہ تمنا ہے۔ اور نہ ہمت تم بتاؤ میں کیا کروں۔

دیوان صاحب کا میں بہت ادب کرتا ہوں۔ اور اسیطرح بیگم صاحبہ کا احترام بھی میرے لئے ایمان کا مرتبہ رکھتا ہے۔ میں دیوان صاحب کو اپنا مالک سمجھتا ہوں اور بیگم صاحبہ کو اپنی مالکہ۔ آہ اس خیال میں کتنی دلفریبی ہے۔ اپنے قلب کے تمام عجز و نیاز اور اپنی روح کی تمام عبودیت و فتادگی کے ساتھ اپنی ہستی کو اپنی روحیت و معنویت کو دوسرے کے حوالے کر دینا۔ اپنے کو غلام اور دوسرے کو مالک سمجھنا ایک ایسا جذبہ ہے کہ اُس سے سرشار ہونے کے بعد خودی کا سارا سحر اور انفرادیت کا سارا جادو دھواں بنکر اُڑ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتک میری ذات ہی میرے افکار کا مرکز و محور رہی ہے۔ میرے ترددات و تفکرات کا تعلق تنہا میری شخصیت ہی سے تھا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ سے اطمینان و سکون ہمیشہ غائب اور فراغ خاطر ہمیشہ مفقود رہا ہے۔ اپنی خوشی سے دوسرے کی خوشی کو مقدّم اور اپنی راحت سے دوسرے کی راحت کو عزیز جاننا بھی تزکیۂ نفس و بالیدگیٔ خیال کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ یہ حقیقت مجھ پر اب واضح ہوئی ہے میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جنہوں نے کبھی اپنا آرام دوسروں کی خاطر قربان نہیں کیا۔ جنہوں نے کبھی دوسروں کی فلاح و انبساط کو اپنے آرام و آسائش پر ترجیح نہیں دی کسقدر تیرہ بخت انسان ہیں۔ میں سُنا کرتا تھا کہ اصلی مذہب محبّت ہے اور محبّت کی معراج قربانی و ایثار۔ ان الفاظ کی حقیقی روح مجھ پر اب منکشف ہو رہی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے ذاتی آلام و افکار سے نکل کر نوع انسان کی خدمت کرنے کے جذبہ سے نا آشنا ہیں۔ نہ محبّت کی ماہیت سمجھ سکتے ہیں۔ اور نہ مذہب کی غرض و غایت میری اس تحریر کو بے ربط نہ سمجھو۔ میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں اُس کا عشیر عشیر بھی صفحۂ قرطاس پر ظاہر کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ شاید ایک دن ایسا آئے کہ تم میرے قلب کی عمیق گہرائیوں میں آرام کرنیوالے

رازسے آشنا ہوسکو۔ لیکن نہیں نہیں مجھے ہرگز ایسا نہیں
کرنا چاہئے۔ میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے
ہمیشہ پرہیز کرونگا۔

۳ر جون ۱۹۳۵ء

"تم شکایت کرتے ہو کہ میرے خطوط بے معنی ہوتے
جارہے ہیں۔ میری تحریر سے تم کوئی خاص مفہوم اخذ
کرنے سے قاصر ہو۔ تمہاری شکایت صحیح اور تمہارا اعتراض
درست۔ لیکن یاد رکھو خیالات اپنے اظہار کے لئے ہمیشہ
الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر میری تحریر میں الجھن
اور میرے الفاظ میں ابہام ہے تو سمجھ لو کہ میرے خیالات
میں بھی انتشار اور میرے جذبات میں بھی ہیجان موجود ہے
میں واقعات کی بعض ادنیٰ جزئیات بیان کرنا چاہتا ہوں
لیکن میں جانتا ہوں کہ تم مجھے بیوقوف سمجھ کر ہنس دوگے
تم نہیں سمجھتے، آہ نہیں سمجھ سکتے۔ کہ معمولی معمولی باتیں جن
کی سود و زیاں والی کاروباری دنیا میں کوئی قدر وقیمت
نہیں میرے لئے کسقدر اہم ہیں۔ میرے دل میں نئی
نئی آرزوؤں نے گھر کر لیا ہے۔ میرے نوزائیدہ خیالات
نے حیات انسانی کے مدوجزر کے متعلق میرا نقطۂ نگاہ
یکسر تبدیل کردیا ہے۔ غم کا مفہوم بدل گیا ہے۔ خوشی
کے معانی تبدیل ہو گئے ہیں اور زندگی نے اپنی پرانی
کینچلی اُتار کر پھینک دی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ننھا
خالد کچھ بیمار ہوگیا تو گھر بھر میں پریشانی پھیل گئی تھی۔
صبح وشام صحت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ خدا خدا کرکے
وہ تندرست ہُوا تو ہماری جان میں جان آئی۔ اس خوشی
میں بیگم صاحبہ نے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ جس
کے بندوبست کے لئے بہت سے امور مجھی کو سرانجام
دینا پڑے۔ اپنی مالکہ کے احکام کی تعمیل، اُس کے ارشادات
پر بلاچون وچرا سرِ تسلیم خم کرنا۔ بتاؤ اس سے بڑھ کر
انبساطِ روحانی وتفریحِ دماغی کا اور کیا سامان ہوسکتا
ہے۔ اپنی مالکہ کو خوش وخرم اور شادمان ومسرور دیکھنا
ہی ایک غلام کی منتہائے زیست ہے۔ میرے فرائض
منصبی تو یہی ہیں کہ خالد کی تعلیم وتدریس میں کوشاں رہوں
اور خدا جانتا ہے کہ میں کس کوشش وتندہی سے ان
فرائض کی ادائی میں مصروف رہتا ہوں۔ لیکن میرا دل
چاہتا ہے کہ اپنے آقا کے آرام وراحت کی خاطر زندگی
کا ایک ایک لمحہ وقف کردوں۔ چند روز ہوئے میں نے
بیگم صاحبہ سے عرض کیا کہ ملازموں کی موجودہ تعداد ضرورت
سے زیادہ ہے۔ چند ایک کو برطرف کردیجئے۔ میرے
اوقات کا کافی حصّہ خالی رہتا ہے اور میں نہایت سہولت
سے بیکاری کا وہ وقت آپ کی خدمت میں صرف کرنے
پر آمادہ ہوں۔ بیگم صاحبہ نے شاید میری اس تجویز کو
تکلف پر محمول کیا۔ اور حسب عادت مسکرادیں۔ کس قدر
نیکدل و پاکیزہ خصلت خاتون ہیں۔ اُن کی گفتگو انسان کے
خیالات کو اعلیٰ وارفع اور اُن کی موجودگی فضا کو معطر ومنور بنا
دیتی ہے۔ میں تو نظر بھر کر انہیں دیکھتا بھی نہیں۔ بلکہ یوں کیوں
نہ کہوں کہ دیکھ سکتا بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری
ان باتوں کا مذاق اُڑاؤ گے لیکن کاش تم اُنہیں ایک مرتبہ
دیکھکر فیصلہ کرتے کہ انسانیت ونسائیت کو اُن کے اندر
جلوہ گر ہونے کے لئے عروج وکمال کے کتنے مراحل طے

کرنا پڑے ہوں گے۔ اور حسن سیرت وصورت کو اُن کا قالب اختیار کرنے میں کن کن کاوشوں سے کام لینا پڑا ہوگا۔ اُن کا نام تمہیں بتادوں؟ آہ نہیں، ہرگز نہیں۔ میں اس معاملہ میں سخت خود غرض ہوں۔ میں اس عشرت لایزال میں کسی کو اپنا شریک بنانا گوارا نہیں کرتا۔ اُن کا نام اُن کی دلفریب شخصیت کا ایک جزو ہے۔ تمہیں ان کا نام بتادوں تو گویا اُن کی محبوب شخصیت کا ایک جزو تم تک پہنچ جائے گا۔ میں بھلا یہ کب برداشت کرسکتا ہوں۔ اچھا سنو، ان کا نام "ز" سے شروع ہوتا ہے۔ آہ "ز" "ز" "ز" "ز"

---

۱۴ راگست ۱۹۲۵ء

"تمہارا خط میرے پیش نظر ہے اور میں تمہاری زجر و توبیخ کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ مجھے دیوانہ کہو، باحواس باختہ۔ گنہگار قرار دو یا مصلحت نااندیش لیکن خدارا میری معصومی جذبات کی تحقیر اور میری پاکیزگی خیال کی تضحیک نہ کرو۔ میرا دل چھلنی ہوچکا ہے۔ اب للہ نمک پاشی سے اُس کی اذیت نہ بڑھاؤ۔ مجھے اپنے دل پر قابو نہیں رہا۔ میرا دماغ میرے قلب کی بغاوت فرو کرنے سے عاجز ہے۔ ستم ظریف قدرت کا شاید یہی فیصلہ ہے کہ میری چند روزہ زندگی ہمیشہ طوفانوں میں ہو ہو کر گزرتی رہے۔ میں آگ کے شعلوں سے زندہ بچ نکلا تو میرے دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ اب غم آلود موجوں کی طغیانیاں اور بادوباراں کی تباہ کاریاں منہ کھولے بیٹھی ہیں۔ تم مجھے عقل و خرد کا درس دیتے ہو۔ لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ ہوش و حواس کے ماتم کی فرصت بھی نصیب نہیں۔ میں صبر و شکیب کی طاقت کہاں سے لاؤں۔ جبکہ یہاں دلِ ناصبور کی پذیرائی کے لئے سوائے بجلیوں کے ہے ہی کچھ نہیں ع

الفراق اے صبر و تمکیں الوداع اے عقل و دیں

میں تنہا ہوں اور بے حد پریشان و مضطرب۔ ہر چیز میرے اختیار سے باہر ہے۔ میری آرزوئیں۔ میری تمنائیں۔ میری کاوشیں ایسی ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کرو تو ایک ایک ذرّہ میں میری موت و ہلاکت کا سامان پاؤ گے۔ بتاؤ وحشت و بربادی کے اس مسکن میں مجھ خانماں خراب کے لئے عافیت کہاں۔ میرے دل کا ایک گوشہ اگر دنیا پر بے نقاب ہوجائے تو یقین جانو زمین و آسمان کی ان وسعتوں میں میرے لئے کہیں ٹھکانا نہ رہے۔ یہ راز ایک آگ ہے، سُلگتی ہوئی آگ۔ جو اندر ہی اندر میرے دل و جگر کو جلا کر راکھ کر رہی ہے۔ آہ شعلوں کی طرح بھڑک اُٹھنا کتنا آسان ہے۔ لیکن تنور کی طرح جسم و جان کو گداز کردینے والی گرمی کے ساتھ اندر ہی اندر پکنا کس قدر مشکل۔ میرے اللہ یہ عذاب الیم اور میری جانِ ناتواں۔ یہ بارِ عظیم اور میرے نحیف و زار کاندھے!

میرے عزیز دوست، بتاؤ میں کہاں جاؤں۔ میں ایک قیدی ہوں۔ لیکن زنجیروں کو کاٹنا نہیں چاہتا۔ میں ایک غلام ہوں لیکن حریت و آزادی کی بجائے اس غلامی پر جان دیتا ہوں۔ کیا تم نے کبھی ایسے مجانین کو دیکھا ہے جو آبِ حیواں کا جام چھوڑ کر زہر کے پیالے کو منہ لگادیتے

میں تامل نہیں کرتے؟ اگر دیکھا ہے تو سمجھ لو کہ میرے دل و دماغ کی کیفیت آجکل وہی رنگ اختیار کر رہی ہے۔ دنیا یہی کہے گی نا کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے محبت کی۔ آہ محبت! کیا اُس قاتل جذبے کو صرف محبت سے تعبیر کرو گے جس نے میری راتوں سے خواب اور دنوں سے آرام چھین لیا ہے جس نے زندگی سے بیزاری اور موت سے ہم آغوشی کی تمنا پیدا کر دی ہے۔ جس نے میرے دل و دماغ کا گودا پگھلا دیا ہے۔ اور جس کے ہاتھوں جگر خون ہو کر آنکھوں کی راہ بہہ گیا ہے؟ کثرت و عمومیت نے اس لفظ کے معنے کو ان کی حقیقی عظمت و رفعت سے محروم کر دیا ہے۔ یہ بوالہوسوں کی دنیا ہے یہاں فسق کو محبت اور ہوس کو عشق کہنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ مجھے اپنی فریفتگی و دیوانگی کو اب کسی اور نام سے موسوم کرنا پڑے گا۔ ہائے غالبؔ

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

۵ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

تمہارا خط پہنچنے سے پہلے بھی مجھے علم تھا کہ میری کاوشوں کا انجام کچھ نہیں۔ اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ میری قسمت میں محرومی و ناکامی کے سوا کچھ نہیں لکھا تم مجھ سے کرید کرید کر کیا پوچھتے ہو۔ تمہارے اندازِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ تم میری صداقت پر اعتبار نہیں کرتے خدا گواہ ہے میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپا رکھی۔ میں نے اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس دنیا میں تنہا تم ہی وہ شخص ہو جسے میں نے اپنے محبوب و مہلک راز سے آگاہ کرنے کی جرأت کی ہے۔ اس پر بھی تم میری طرف شک و شبہ کی نظروں سے دیکھو تو بتاؤ! میری جانِ حزیں پر اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے۔ میں تم سے کسی امداد کا خواہاں نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس درد کا درماں ممکن نہیں۔ مجھے علم ہے کہ اس مرض کا علاج پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس حالت نا اُمیدی میں سبب تکلیف کے ازالے کی نہ خواہش ہے نہ کوشش۔ میں تم سے کس چیز کا متوقع ہو سکتا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کم از کم اپنا پند و نصائح کا دفتر کچھ عرصے کے لئے طے کر رکھو اور میرے جذبات کی توقیر کرنا سیکھو۔ میرے یہ خطوط میرے نالۂ بے اختیار کی دلدوز چیخیں اور میرے گریۂ بیقرار کے چند خون آلود آنسو ہیں۔ جب پیمانۂ صبر و ضبط سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے تو تمہیں خط لکھ کر بارِ غم ہلکا کر لیتا ہوں۔ ذرا غور کرو فطرت کی جفا پیشگی اور میری بے چارگی پر غور کرو کہ ستم ایجاد قدرت نے برق و خرمن کو ایک جگہ لا کر رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں قطرۂ شبنم کی ہستی ہی کیا کہ اُس کی آزمائش آفتاب کے روبرو کی جائے میں عین منجدھار میں کھڑا اپنے کپڑوں کو پانی میں تر ہونے سے بچا رہا ہوں۔ کیا تنکے کو آگ میں رکھ کر جلنے سے روکنے کی کوشش بارآور ہو سکتی ہے اور کیا شمع و پروانہ کی یکجائی سے موت و بربادی کے سوا کسی اور منظر کی توقع بھی قائم کی جا سکتی ہے؟ صبح سے شام اور شام سے پھر طلوعِ سحر تک ایک غیر مختتم سلسلۂ خیالات کی الجھنوں میں گرفتار رہتا ہوں۔ ایک ہی مکان

میں ایک ہی ماحول کے اندر مجھ سے چند گز کے فاصلے پر دہ نشیں ہے۔ جب قرب کا یہ عالم ہو تو بتاؤ دلِ دیوانہ اگر آپے سے باہر ہو جائے تو کیا عجب ہے۔ لیکن یقین جانو ہر چند کہ میرے جذبات میں آگ لگ رہی ہے۔ میری آنکھوں اور میرے ہونٹوں پر مُہر ثبت ہو چکی ہے۔ میری ایک بدلی ہوئی نگاہ میرا ایک معنی خیز لفظ میری ہلاکت کا باعث اور ایک گھرانے کی ذلت و رسوائی کا پیامبر بن سکتا ہے۔ قطرے دریا میں اور چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہونا چاہتی ہیں۔ تمنائیں تڑپ تڑپ کر اور دل مچل مچل کر اپنی داستانِ غم سنانے پر مصر ہے لیکن میں ہوں کہ پتھر کی بوجھل سِل اپنے سینے پر رکھ کر آہوں کے دبانے اور نالوں کے روکنے میں مصروف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ غم و اندوہ کا یہ طوفان رُکنے والا نہیں۔ اور یہ دریا ایک نہ ایک روز ضرور بہ نکلے گا۔ لیکن اُس ساعت کا تصوّر اور اُس انجام کا تخیل ہی میرے رگ و ریشہ سے زندگی کی حرارت کھینچ لیتا ہے۔ میری یہ حیاتِ مستعار یقیناً ایک حقیر شے ہے۔ لیکن "ز" کی عزت و آبرو ایک فرشتے جیسی، ایک ملکوتی، ایک آسمانی ہیرا ہے۔ اور اگر اس ہیرے کی آب و تاب کو برقرار رکھنے کی خاطر مجھے اپنی قربانی کی ضرورت پیش آئی۔ تو میں ہرگز دریغ نہیں کرونگا۔

---

۱۱ فروری ۱۹۲۶ء

"سینکڑوں مرتبہ ایسا ہُوا کہ قریب تھا میں اُسے اپنے آغوش میں لے لوں۔ الٰہی یہ کسقدر روح فرسا عذاب ہے کہ حُسنِ مجسّم ہو کر آنکھوں کے سامنے پھرے اور اُسے مس کرنے کی بھی اجازت نہ ہو! حالانکہ مس کرنا نفسِ انسانی کے تمام جبلّی رجحانات میں اوّل درجے پر ہے! کیا بچّے ہر چیز کو چھونے کی کوشش نہیں کرتے؟"

یہ الفاظ جرمنی کے مشہور فلسفی ادیب گوئٹے کی ایک اہم تصنیف سے میں نے نقل کئے ہیں۔ لیکن ہائے ان الفاظ کے معانی ان الفاظ کی جا نگداز حقیقت کوئی میرے دل سے پوچھے۔

کئی روز ہوئے میں نے شام کی ہوا خوری ترک کر دی ہے۔ شام کی سیر میں مجھے خالد اور "ز" کے ہمراہ جانا پڑتا تھا تم پوچھو گے کہ پھر اُس کا قرب حاصل کرنے کا یہ ذریعہ میں نے برضا و رغبت کیوں ضایع کر دیا بھائی اس کا جواب یہی ہے کہ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ گاڑی میں اُس کے بالمقابل بیٹھ کر مجھ پر ایک بیخودی ایک وارفتگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اُس کی سیاہ آنکھیں جنہیں دیکھتے رہنا میرے لئے ہزار عشرتوں کی ایک عشرت ہے میرے سامنے ہوں، اُس کے ریشمیں ملبوس سے ہلکی ہلکی خوشبو نکل کر میرے مشامِ جان کو معطر کر رہی ہو، اُس کے لب ہائے لعلیں کا ہوشربا تبسّم مجھ پر بجلیاں گرا رہا ہو اور وہ با ایں ناز و رعنائی اپنی دلبری کی ساحرانہ قیامتوں کے ساتھ عین میرے سامنے اک بدلیۂ جمال، اک حدیقۂ حسن و شباب بنکر بیٹھی ہو ——

یوں بیٹھی ہو کہ میرا جسم اُس کے لباس کی سرسراہٹ اور اُس کے ہاتھوں کا لمس تک محسوس کر رہا ہو ——

تو بتاؤ اس جذبات انگیز فضا میں اگر میں اندھا ہو جاؤں ہوش و حواس کھو دوں۔ موت اور زندگی میں تمیز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھوں تو کیا عجب ہے گزشتہ ہفتے کا ذکر ہے جب ہم سیر کے لئے نکلے تو گاڑی میں سوار ہوتے وقت اتفاق سے میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھو گیا۔ میرے اعصاب میں ایک بجلی سی دوڑ گئی اور مدت تک میں اپنے اندر ایک ارتعاش سا محسوس کرتا رہا۔ اُس روز وہ خلاف معمول لکھنؤ کی بیگمات کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے حسین و شاداب چہرے پر ایسی تروتازگی تھی جیسے موسم برشگال میں کھل کر بارش ہو جانے کے بعد ٹھنڈی ہوا میں لہلہاتے ہوئے گلشن کا روح افروز نظارہ۔ میں بار بار اُس کے چہرے کی طرف آنکھیں اُٹھاتا اور پھر دائیں بائیں دیکھنے لگ جاتا تھا۔ وہ موسم کی خوبی کا ذکر کر رہی تھی۔ لیکن میرے لئے فطرت کے حسین مناظر۔ پہاڑیوں کے خوشنما سلسلے۔ آفتاب بہار کی تابانی اور بید کے درختوں کے درمیان آہستہ آہستہ بل کھاتی ہوئی بہنے والی ندی اپنی تمام دلکشی ضایع کر بیٹھی ہے۔ خارجی دنیا کا حسن سمٹ سمٹا کر میرے لئے صرف ایک نقطہ میں جمع ہو گیا ہے۔ اور اب اگر کوئی چیز خوبصورت نظر آتی بھی ہے تو اُسی کے پرتو سے۔ اور اگر کوئی شے گھڑی بھر کے لئے میری توجہ کو جذب کرنے میں کامیاب بھی ہوتی ہے تو اسی صورت میں کہ وہ اُس کے عکس جمال سے منوّر ہو رہی ہو میرا یہ طرز عمل بے اختیارانہ اور بہت حد تک مجبورانہ ہے۔ کوئی شخص میرے دل میں مسرت و انبساط وہ بہجت و شادمانی کے وہ جذبات داخل نہیں کر سکتا جن کے قبول کرنے کی مجھ میں فطرتاً استعداد نہیں۔ خود میں شب و روز صبح و شام اپنے سینے میں ایک خلا محسوس کر رہا ہوں — ایک وحشت انگیز خلا! آہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر ایک بار صرف ایکبار اُسے اپنے سینے سے لگا لوں تو یہ خلا ہمیشہ کے لئے پُر ہو جائے گا۔

---

۱۴ مئی ۱۹۲۶ء

اُس کا التفات میرے لئے اور زیادہ تباہ کن ہے۔ اُس کی لطف و عنایت کی نگاہیں جو وہ مجھ پر کبھی کبھی ڈالتی ہے۔ میرے صبر و شکیب کی سب سے خطرناک آزمائش ہیں۔ میری طبیعت کی اُداسی اور جذبات پنہاں کی طویل کشمکش نے میری صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ اگرچہ اب موت اور زندگی۔ صحت اور بیماری، زخم اور اندمال میرے لئے مترادف الفاظ رہ گئے ہیں۔ میں کئی دن سے سیر نہیں گیا۔ کھانا بھی متعدد بار نہیں کھایا۔ عذر یہی پیش کرتا رہا ہوں کہ بیمار ہوں۔ آخر وہ خود کل میرے دیکھنے کے لئے آ گئی۔ اُس کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے میں بے اختیار رو رہا تھا۔ میں حیران ہوں میری آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں سے آ گئے تمہیں یاد ہے میں زندگی کی بڑی سی بڑی مصیبت پر بھی رونا نہیں جانتا تھا میں نے قید و بند کے شدائد جھیلے ہیں میں نے حکومت وقت کی شدید ترین سزائیں برداشت کی ہیں لیکن میری آنکھیں ہمیشہ خشک رہیں۔ اب میں ہوں اور شغل گریہ۔ وہ میرے کمرے میں آئی اور آتے ہی نہایت

ملاطفت سے میری طبیعت کا حال پوچھنا شروع کیا۔ ادھر میری گھبراہٹ کا یہ عالم تھا جیسے اسکول کا کوئی طالب علم شرارت کرتا ہوا پکڑا جائے۔ گویائی کی طاقت میری زبان سے زائل ہوگئی۔ اور میں حیرت و استعجاب سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بیس منٹ کے قریب بیٹھی مجھے دوا اور غذا کے متعلق ہدایات دیتی رہی خوش و خرم رہنے کی نصیحتیں کرتی رہی۔ وہ مجھ سے اس قدر نزدیک بیٹھی تھی کہ میں اُس کے تنفس کی گرمی محسوس کر رہا تھا میرے جی میں آئی کہ اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لوں۔ اپنے سر کو اُس کے قدموں پر گرا کر اُس کے پاؤں کو آنسوؤں سے تر کر ڈالوں۔ اور اگر وہ چند لمحے اور بیٹھی تو شاید میں یہ سب کچھ کر ہی گزرتا۔

میرے عزیز بھائی! یہ بارِ غم، یہ اندوہِ محبت، یہ کاہشِ فراق میں کب تک برداشت کئے جاؤں۔ میرا سینہ اس راز کی تاب نہ لاکر ایک نہ ایک روز پھٹ جائیگا لیکن وہ روز میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ غالب کے اس شعر کا مفہوم میں غالب سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

۳ر جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

خدا را یوں دق نہ کرو۔ تم مجھے بار بار لاہور کیوں بلاتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں "اُس" سے دور رہ کر زندگی گذار سکونگا؟ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو اس خیال کو جلد از جلد اپنے دماغ سے نکال دو۔ اگرچہ یہاں رہنا بھی میرے جسم و جان کے لئے ایک مستقل عذاب سے کم نہیں۔ لیکن اتنا تو ہے کہ میں "اُسے" دن میں چند بار دیکھ لیتا ہوں یہ عجب کشمکش ہے کہ یہاں رہ کر بھی میں خوش نہیں اور یہاں سے چلے جانا بھی مجھے منظور نہیں۔ آخر اس درد و کرب کا اس حزن و ملال کا، اس تپش نا تمام کا انجام کیا ہوگا۔ تم نے کبھی سوچا؟ اگر نہیں سوچا تو مجھ سے سن لو۔ اس کا انجام ہے ———————— موت!!

اُس کی ماہ پیکر و حور تمثال شخصیت کا عکس اپنے آئینۂ قلب پر اُتار کر اُس کے تصور کی مدہوشیوں سے اپنے دل و دماغ کو مخمور کئے اُس کی سیاہ آنکھوں کے تابناک جلوؤں سے اپنی روح کی ویران خلوتوں کو منور کرکے اس جہان سے گذر جانا۔ اس ظلمت کدۂ ارضی سے سفر کر جانا ———— ———— آہ کسقدر حسین و دلآویز تخیل ہے۔ شاعری کی دنیا اسی تخیل سے رنگین ہے، ادب کا سرمایہ اسی تخیل سے برقرار ہے اور مصوری کا جہانِ آب و رنگ اسی تخیل سے نظر فریب ہے

اصمعی کی وہ مشہور نظم جس کا ترجمہ نادر کاکوروی نے کیا تھا تم نے پڑھی ہی ہوگی ایک فرقت زدہ مریضِ عشق کے لئے اُس نے کیسا اچھا نسخہ تجویز کیا ہے ؎

جس کو فرقت بہت ستاتی ہو
جس نے کھایا ہو چاہ میں دھوکا
جس کو افشائے راز کا ڈر ہو
جس سے اب صبر ہو نہیں سکتا
اُس کا عمدہ علاج مرنا ہے
اس سے بہتر نہیں کوئی نسخہ

اب میری یہی آرزو ہے کہ تم مجھے موتوں اور ہلاکتوں کے لئے تنہا چھوڑ دو اور بھول جاؤ۔ اس مقتل میں میری ناچیز جان کا ہدیہ اُن قربانیوں کی طویل فہرست میں ایک حقیر سا اضافہ کریگا۔ جو قربانگاہِ عشق پر روزِ ازل سے انسان پیش کرتا آرہا ہے اور یونہی پیش کرتا چلا جائیگا ـــــــ

اُس وقت تک کہ انسانی دل دردِ محبت کی خلش سے محروم نہیں ہوجاتے۔ میں اپنے اندر انبساط و انقباض کے مخلوط جذبات کی شورش محسوس کر رہا ہوں۔ خدا جانے یوں چاہیئے تو یہ تھا کہ اس وقت جب میں آخری نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں مجھ پر خوشی طاری ہوتی یا غم، یہ دونوں کی آمیزش کیسی؟ شاید اس لئے کہ اُس "غارتگرِ دین و ایمان"۔ اُس "فتنہ گرِ ہوش و حواس"۔ اُس "جانِ آرزو" اور ہائے اُس "آرزوئے جاں" کے کان میرے افسانۂ غم سے ابتک آشنا نہیں ہوئے۔ اُس کی آنکھیں میرے دل کی حشر سامانی اور میرے جگر کی خونچکانی سے اب تک واقف نہیں ہوسکیں۔ کیا اس سے زیادہ جبر کوئی انسان اپنے نفس پر کرسکیگا۔ اور کیا اس سے بڑھ کر حرماں نصیبی و تیرہ بختی ابنِ آدم کے حصّے میں آسکتی ہے؟ آہ اس کرۂ ارض پر، اس روئے زمین پر تم ہی وہ شخص ہو جسے اس راز سے آگہی ہے۔ جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اور جو شاید میرے ساتھ ہی زمین میں دفن ہوجائے گا۔"

یہ خط ملا تو گویا مستقبل کے تمام اندیشے حقیقتِ مجسم بنکر میرے سامنے آگئے اور میں پریشان و ہراساں ہوکر اپنی اوّلین فرصت میں ندیا کی طرف بھاگا۔ چوتھے روز وہاں پہنچا لیکن افضال میرے پہنچنے سے قبل خودکشی کرچکا تھا۔

انتظار (نظم)

از:-
پروفیسر سید عابد علی ایم اے ایل ایل بی۔

بزم دل جلوہ گہ کاہکشاں ہے ہمدم! سوئے در چشم تماشا نگراں ہے ہمدم،
انکے آنے کی خبر وردِ زباں ہے ہمدم

شوق ہے محو بہ آرائش گیسوئے وفا ذرّے ذرّے سے مجھے آتی ہے خوشبوئے وفا
ذرّہ ذرّہ مجھے انوار فشاں ہے ہمدم

پیہم آتی ہے جو کانوں میں صدائے ساقی ہے اُدھر وجد میں محفل بہ صلائے ساقی
اور ادھر شیشۂ مے رقص کناں ہے ہمدم،

اس سے پہلے مری نظروں میں تھی دنیا تاریک مہر و مہتاب تھے بے نور ثریا تاریک
آج پھر کون و مکاں کون و مکاں ہے ہمدم

فکاہی

چچا چھکّن نے سب کے لئے کیلے خریدے

(فکاہی افسانہ)

از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج۔ بی۔ اے۔

ایک بات میں شروع ہی میں عرض کردوں۔ یہ واقعہ بیان کرنے سے حاشا وکلا میری غرض یہ نہیں کہ اس سے چچا چھکن کی فطرت کے جس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ اُس کے متعلق آپ کوئی مستقل رائے قایم کرلیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چچا چھکن کا اس نوع کا واقعہ مجھے صرف یہی ایک معلوم ہے۔ نہ اس سے پہلے کوئی واقعہ میری نظر سے گزرا۔ اور نہ بعد میں۔ ایمان کی پوچھئے۔ تو اس کے برعکس واقعات بڑی کثرت سے میرے دیکھنے میں آچکے ہیں۔ بارہا میں خود دیکھ چکا ہوں کہ شام کے وقت چچا چھکن کچوریاں یا گنڈیریاں یا چلغوزے اور مونگ پھلیاں ایک بڑے رومال میں باندھ کر گھر بھر کے لئے لے آئے ہیں۔ اور پھر کیا بڑا اور کیا چھوٹا۔ ہر ایک میں برابر برابر تقسیم کرکے کھاتے کھلاتے رہے ہیں۔ پر اُس روز اللہ جانے کیا بات ہوئی۔ کہ ـــ مگر اسی کی تفصیل تو مجھے بیان کرنی ہے۔

اس روز سہ پہر کے وقت اتفاق سے چچا چھکن اور بندو کے سوا کوئی بھی گھر پر موجود نہ تھا۔ میر منشی صاحب کی بیوی کو پرسوت کا بخار آرہا تھا۔ چچی دوپہر کے کھانے سے فراغت پاکر اُن کے ہاں عیادت کے لئے چلی گئی تھیں۔ بنو کو گھر چھوڑے جارہی تھیں۔ کہ چچا نے فرمایا عیادت کو جا رہی ہو۔ تو شام سے پہلے بھلا کیا لوٹنا ہوگا بچی پیچھے گھبرائے گی۔ ساتھ لے جائیں۔ وہاں بچوں میں کھیل کر بہلی رہے گی۔ چچی بڑبڑاتی ہوئی بنو کو ساتھ لے گئیں۔ امامی چچی کو میر منشی صاحب کے گھر تک پہنچانے جارہا تھا۔ مگر بنو ساتھ کردی گئی تو بچی کے خیال سے اُسے بھی وہیں ٹھہرا لینا پڑا۔

للو کے مدرسہ کا ڈی۔ اے۔ وی سکول سے کرکٹ کا میچ تھا۔ وہ صبح سے اُدھر گیا ہوا تھا۔ مودے کی رائے میں للو اپنی ٹیم کا بہترین کھلاڑی ہے۔ اپنی اس رائے کی بدولت اُسے کرکٹ کے اکثر میچوں کا تماشائی بننے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ حسب معمول آج بھی وہ للو کی اردلی میں تھا۔

دو بجے سے سنیما کی میٹنی شو تھی۔ ودّو چچا سے اجازت لے کر تماشہ دیکھنے جارہا تھا چھٹن کو جو پتہ لگا۔

کہ وہ تماشے میں جارہا ہے۔ تو عین وقت پر وہ مچل گیا۔ اور ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ چچا نے اُس کی تربیت کے بعض پہلوؤں پر چچی کا حوالہ دے دے کر ایک مختصر مگر پرمغز تبصرہ کرتے ہوئے اُسے بھی اجازت دیدی۔ واقعہ اصل یہ ہے۔ کہ چچی کہیں ملاقات کو گئی ہوں۔ تو باقی لوگوں کو گھر سے باہر جانے کے لئے چچا سے اجازت لے لینا دشوار نہیں ہوتا۔ ایسے نادر موقعوں میں چچا مکمل تنہائی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ دوسری مصروفیات نے جن امور کی طرف چچی کو عرصہ سے توجہ کرنے کی اجازت نہیں دی ہوتی۔ ایسے وقت چچا ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اس سے چچی کو یہ احساس دلانا مقصود ہوتا ہے۔ کہ گھر کی مشین میں ان کی ہستی ایک بیکار پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اور یہ چچا ہی کی ذات والاصفات کا ظہور ہے کہ چشم بینا کو گھر میں سلیقے اور سگھڑاپے کے کوئی آثار نظر آتے ہیں۔

آج آپ کے شغل آفریں دماغ نے چچی کی غیر حاضری میں گھر کے تمام ایسے برتن جو پیتل کے تھے۔ صحن میں جمع کر لئے تھے۔ بندو کو بازار بھیج کر دو پیسے کی املی منگائی تھی۔ صحن میں مونڈھا ڈال کر بیٹھ گئے تھے پاؤں مونڈھے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ حقے کی نے منہ سے لگی تھی۔ ذاتی نگرانی میں پیتل کے برتنوں کی صفائی کا اہتمام ہو رہا تھا۔

"ارے احمق اب دوسرا برتن کیا ہوگا۔ جو برتن صاف کرنے ہیں۔ ان ہی میں سے کسی ایک میں املی بھگو ڈال۔ اور کیا ــــ یوں ــــ بس یہی پیتل کا لوٹا کام دے جائے گا۔ صاف تو اسے کرنا ہی ہے ایک دوسرا برتن لاکر اُسے خراب کرنے سے حاصل؟ ایسی باتیں تم لوگوں کو خود کیوں نہیں سوجھ جایا کرتیں؟"

بندو نے تعمیل ارشاد میں کچھ کہے بغیر املی لوٹے میں ڈال بھگو دی۔ چچا نے فخر سے اطمینان کا اظہار کیا "کیسی بتائی ترکیب؟ ضرورت بھی پوری ہوگئی۔ اور اپنا ــــ یعنی کام بھی ایک حد تک ہوگیا۔ لے اب باورچی خانے جا کر برتن مانجھنے کے لئے تھوڑی سی راکھ لے آ۔ کس برتن میں لائے گا بھلا؟"

بندو نے بڑی ذہانت سے تمام برتنوں پر نظر ڈالی۔ اور اُن میں سے ایک سینی اُٹھا کر چچا کی طرف دیکھنے لگا۔ چچا بھی اسی غرض کے لئے شاید سینی ہی تجویز کرنا چاہتے تھے۔ ہدایت دینے کا افتخار نہ مل سکا۔ تو پوچھنے لگے۔ "کیوں بھلا؟"

بندو بولا۔ "چولھے سے اُٹھا کر اس میں آسانی سے راکھ رکھ لونگا۔"

"احمق کہیں کا۔ علاوہ ازیں راکھ کھلے برتن میں ہوگی تو اُٹھا اُٹھا کر برتن مانجھنے میں آسانی نہ ہوگی؟"

بندو ابھی باورچی خانے سے راکھ لانے نہ پایا تھا کہ دروازے پر ایک پھل والے نے صدا لگائی۔ کلکتیا کیلے بیچنے لایا تھا۔ اُس کی صدا سن کر کچھ دیر تو چچا خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہے لیکن البتہ جلدی جلدی لگا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا دماغ میں کسی قسم کی کشمکش جاری ہو جب آواز سے معلوم ہوا کہ پھل والا واپس جا رہا ہے۔ تو جیسے بے بس سے ہوگئے۔ بندو کو آواز دی ذرا جاکر

دیکھو تو۔ کیلے کس حساب دیتا ہے۔"

بندو نے واپس آکر بتایا "چھ آنہ درجن"

"چھ آنے کے درجن۔ تو کیا مطلب ہُوا؟ کہ چوبیس پیسے کے بارہ۔ بارہ دونی چوبیس۔ یعنی دو دو پیسے کا ایک۔ مہنگے ہیں۔ جاکر کہہ تین تین پیسے کے دو دیتا ہے تو دے جائے۔"

دو منٹ بعد بندو نے کہا کہ "مان گیا۔ کتنے کیلے لینے ہیں"؟

پھل والا اس آسانی سے رضامند ہوگیا۔ تو چچا کی نیّت میں فتور آیا "یعنی تین تین پیسے کے دو؟ کیا خیال ہے۔ مہنگے نہیں اس بھاؤ پر؟"

بندو بولا "اب تو اس سے بھاؤ کا فیصلہ ہوگیا۔"

"تو کسی عدالت کا فیصلہ ہے۔ کہ اتنے ہی بھاؤ پر کیلے لئے جائیں۔ ہم تو تین آنے درجن لیں گے دیتا ہے دے۔ نہیں دیتا نہ دے۔ وہ اپنے گھر خوش۔ ہم اپنے گھر خوش۔"

بندو پس و پیش کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔

"ابے تو جاکر کہہ تو سہی۔ مان جائے گا۔"

بندو جانے سے کترا رہا تھا۔ "آپ خود کہہ دیجئے۔"

چچا نے جواب میں آنکھیں پھاڑ کر بندو کو گھورا وہ غریب ڈر گیا۔ مگر اب بھی وہیں کھڑا رہا۔ چچا کو اسکا پس و پیش شاید کسی قدر بجا معلوم ہُوا۔ اُسے دلیل کا راستہ سمجھانے لگے "تو جاکر یوں کہہ کہ میاں نے تو تین آنے درجن ہی کہے تھے۔ میں نے آکر غلط بھاؤ کہہ دیا۔ تین آنے درجن دینے ہوں تو دے جائے۔"

بندو دل کڑا کرکے باہر چلا گیا۔ چچا جانتے تھے بھاؤ ٹھہرا کر اس سے پھر جانے پر کیلے والا غل مچائیگا باہر نکلنا قرین مصلحت نہ معلوم ہوتا تھا۔ دبے پاؤں اندر گئے اور کمرے کی جو کھڑکی ڈیوڑھی میں کھلتی تھی۔ اُس کا پٹ ذرا سا کھول باہر جھانکنے لگے پھل والا گرم ہو رہا تھا "آپ ہی تو ایک بھاؤ ٹھہرایا۔ اور آپ ہی زبان سے پھر گئے۔ بھانہ نوکر کی بھول کا جیسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ یا بے ایمانی تیرا ہی آسرا۔"

بندو غریب چپکا کھڑا تھا۔ پھل والا بکتا جھکتا خونچہ اُٹھا چلنے لگا۔ بندو بھی اندر جانے کو مڑ گیا۔ دروازے تک پہنچنے نہ پایا تھا۔ کہ پھل والا رک گیا۔ خونچہ اُتار کر بولا "کتنے لینے ہیں"؟

بندو اندر آیا تو چچا جھکن مونڈھے پر بیٹھے جیسے کسی خیال کی محویت میں حقّہ پی رہے تھے۔ چونک کر بولے "مان گیا؟ ہم نہ کہتے تھے مان جائیگا۔ ہم تو ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ تو کے کیلے لینے مناسب ہوں گے؟" چچا نے اُنگلیوں کی پوروں پر گن گن کر حساب لگایا "ہم آپ۔ چھٹن کی اماں۔ للو۔ ودّو۔ بنّو اور چھٹن۔ گویا چھ۔ چھ دونی کیا ہُوا؟ خدا تیرا بھلا کرے بارہ۔ یعنی ایک درجن۔ فی آدمی دو کیلے بہت ہوں گے۔ پھل سے پیٹ تو بھرا نہیں جاتا۔ منہ کا ذائقہ بدلا جاتا ہے۔ پر دیکھو دو تین تجھے اندر لے آنا۔ ہم آپ ان میں سے

اچھے اچھے کیلے چھانٹ لیں گے"۔
پھل والے نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کیلوں کے گچھے اندر بھیج دئے۔ چچا نے کیلوںکو دبا دبا کر دیکھا۔ ان کی چھتیوں کا مطالعہ کیا اور درجن بھر کیلے علیحدہ کر لئے۔ کیلے والا باقی کیلے لیکر بڑبڑاتا ہوا رخصت ہوگیا۔ چچا نے بندو کی طرف توجہ کی "دُلے انہیں کھانے کی ڈولی میں حفاظت سے رکھ دے رات کے کھانے پر لاکر رکھنا۔ اور اب جلدی سے آکر برتن مانجھنے کے لئے راکھ لا۔ بڑا وقت اس قصے میں ضایع ہوگیا"۔
بندو کیلے اندر رکھ آیا۔ اور باورچی خانے سے راکھ لاکر برتن مانجھنے لگا۔ "یوں۔۔۔۔۔۔ ذرا زور سے ہاتھ۔ تاکہ برتن پر رگڑ پڑے۔ اس طرح ا پیتل کے برتن صاف کرنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ املی کے استعمال سے قبل انہیں ایک بار خوب اچھی طرح مانجھ کر صاف کر لیا جائے۔ ایسے سب برتنوں کی صفائی کے لئے املی لاجواب نسخہ ہے۔ گرہ میں باندھ رکھ کسی روز کام آئے گا۔ اور ایک پیتل ہی کا کیا ذکر دھات کی جملہ اشیا املی سے دمک اُٹھتی ہیں۔ ابھی ابھی تو آپ دیکھو گے کہ ان کالے کالے برتنوں کی صورت کیا نکل آتی ہے۔ ہاں اور وہ میں نے کہا۔ کیلے احتیاط سے رکھ دیئے ہیں نا؟ ڈولی میں؟ ہُوں۔ اچھے بھاؤ مل گئے۔ کیا ایک ایک کے لئے دو دو ٹھیک رہینگے؟ ۔۔۔۔ یوں۔ بس منجھ گیا۔ اب مگر اس پر املی۔ اس طرح دیکھا میل کس طرح کٹتا ہے کیسی چمک آتی جا رہی ہے یہ املی فی الواقعی بڑی بے نظیر شے ہے۔ مگر میں نے کہا بندو میرا بھائی۔ ذرا اُٹھیو تو۔ ان کیلوں میں سے جو دو ہمارے حصے کے ہیں ہمیں لا دیجو۔ ہم تو ابھی کھائے لیتے ہیں۔ باقی لوگ جب آئیں گے اپنا حصہ کھاتے رہیں گے"۔
بندو نے اُٹھ کر دو کیلے چچا کو لا دیئے۔ چچا نے مونڈھے پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے پینترا بدلا۔ اور کیلوں کو تھوڑا تھوڑا چھیلنا اور تکلف سے نوش فرمانا شروع کیا "تو کئے جا اپنا کام۔ ذرا چھپاک سے۔ ہاں دیکھنا اب ذرا سی دیر میں ان برتنوں کی شکل کیا نکل آتی ہے۔۔۔۔ اچھے ہیں کیلے۔ بس یونہی ذرا اور سے ہاتھ۔۔۔۔ اس طرح۔۔۔۔۔ چھٹن کی ماں دیکھیں گی تو سمجھیں گی۔ آج ہی نئے برتن خرید کئے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ خرچ کچھ بھی نہیں۔ ہرا لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ آخر کتنے کی آگئی املی۔ نہ نہ خود ہی کہو۔ کتنے کی آئی املی۔ دو پیسے کی نا؟ تو آپ خرید کر لایا تھا۔ اور پھر جو کچھ کیا تو نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہ تو ہُوا ہی نہیں کہ تجھ سے آنکھ بچا کر ہم نے بیچ میں کچھ ملا دیا ہو۔ بس یہ جتنی بھی کرامات ہے صرف املی کی ہے۔ محض املی کی۔ اور وہ میں نے کہا اب کے کیلے باقی رہ گئے ہیں؟ دس ہوں۔ خوب شے ہے نا املی؟ ایک ٹکے کے خرچ میں چیزوں کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ مگر بندو ان دس کیلوں کا حساب اب ہوگا کس طرح؟ یعنی ہم شریک نہ ہوں جب تو ہر ایک کو دو دو کیلے مل رہیں گے لیکن ہماری شرکت کے بغیر شاید دوسروں کا جی بھی کھانے کو نہ چاہے۔ کیوں؟ چھٹن کی

ہاں تو ہمارے بغیر نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہیں گی۔ تو نے
خود دیکھا ہوگا۔ کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اور بچّوں میں بھی
دوسرے ہزار عیب ہوں پر اتنی خوبی ضرور ہے۔ کہ
ندیدے اور خود غرض نہیں ہیں۔ سب نے مل کر شریک
ہونے کے لئے ہم سے اصرار شروع کر دیا تو بڑی دقت
ہوگی۔ برابر برابر تقسیم کرنے کو کیلے کاٹنے ہی پڑینگے
اور کلکتیا کیلے کی بساط بھلا کیا ہوتی ہے۔ کاٹنے میں
سب کی مٹی پلید ہو جائے گی۔ کے کیلے بتائے تھے
تو نے؟ دس؟ دس کیلے اور چھ آدمی۔ ٹیڑھی بات
ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں مثلاً فی آدمی ایک ایک کا حساب
رکھ دیا جائے تو؟ دو دو نہ سہی ایک ایک ہی ہو۔ مگر
کھائیں تو سب ہنسی خوشی مل جل کر۔ ٹھیک ہے نا؟
گویا چھ رکھ چھوڑنے ضروری ہیں۔ تو اس صورت میں
کے کیلے ضرورت سے زیادہ ہوئے؟ چار نا؟ ہوں
تو میرے خیال میں وہ چاروں زاید کیلے لے آتا۔ باقی
کے چھ تو اپنا ٹھیک حساب کے مطابق تقسیم ہو جائینگے۔"

بندو اُٹھ کر چار کیلے لے آیا۔ چچا نے اطمینان سے
اُنہیں باری باری نوش فرمانا شروع کر دیا۔

"ہاں تو تو قائل بھی ہوا املی کی کرامت کا؟ بیٹا
فوائد کی شے ہے۔ مگر کیا کیجئے اس زمانہ میں دیس کی
چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ یہی املی اگر ولایت
سے ڈبوں میں بند ہو کر آتی تو جناب لوگ اس پر ٹوٹ
پڑتے۔ ہر گھر میں اس کا ایک ڈبا موجود رہتا۔ مگر چونکہ
پنساری کی دوکان سے دستیاب ہو جاتی ہے۔ کوئی
خاطر میں نہیں لاتا۔ اور پھر ایک برتنوں کی صفائی کا
کیا ذکر۔ اس کے اور بھی تو بہتیرے فوائد ہیں۔ یعنی
دوران سر کی شکایت کے لئے اس سے بہتر
شے سننے میں نہیں آئی۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ کڑوی
کسیلی ہو۔ یا بدمزہ بودار ہو۔ شربت بنا لیجئے۔ کھٹا میٹھا
ایسا لذیذ ہوتا ہے کہ کیا کہئے۔ ..... کیلے بھی نہایت
لذیذ ہیں۔ زیادہ نہ لے لئے تو نے۔ ...... املی کا
شربت تو شاید تو نے بھی پیا ہو۔ کیسا خوش ذائقہ
ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو نعمت ہے۔ اور پھر لطف
یہ کہ مفید بھی بیحد۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ امتلا کو یہ روکتا
ہے۔ امتلا نہیں جانتا؟ ارے احمق متلی کی شکایت
اس کے علاوہ صفرا کے لئے یہ مفید ہے۔ صفرا بھی
ایک چیز ہوتی ہے۔ پھر کبھی سمجھائیں گے۔ تو وہ
کیلے تو اب چھ ہی باقی رہ گئے ہیں نا؟ کچھ نہیں۔ بس
ٹھیک ہے۔ سب کے حصّے میں ایک ایک آجائیگا۔
ہمیں ہمارے حصّے کا مل جائے گا۔ دوسروں کو
اپنے اپنے حصّے کا۔ کانٹ چھانٹ کا جھگڑا تو ختم ہوا
اپنے اپنے حصّے کا کیلا لیں۔ اور جو جی چاہے کریں
جی چاہے آج کھائیں۔ آج جی نہ چاہے کل کھالیں
اور کیا۔ ہونا بھی یہی چاہئے۔ رغبت کے بغیر کوئی چیز
کھائی جائے تو جزو بدن نہیں بننے پاتی۔ یعنی اکارت
چلی جاتی ہے۔ کوئی چیز آدمی کھائے اُسی وقت
جب اُس کے کھانے کو جی چاہے۔ چھٹن کی اماں
کی ہمیشہ سے یہی کیفیت ہے جی چاہے تو چیز کھاتی ہیں
نہ چاہے تو کبھی ہاتھ نہیں لگاتیں۔ ہمارا اپنا یہی حال
ہے۔ یہ متفرق چیزیں کھانے کو کبھی کبھار ہی جی چاہتا

ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ اب یہی کیلے ہیں بیسیوں
مرتبہ دکانوں پر رکھے دیکھے۔ کبھی رغبت نہ ہوئی آج
جی چاہا۔ تو کھانے بیٹھ گئے۔ اب پھر نہ جانے کب جی
چاہے۔ ہماری تو کچھ ایسی ہی طبیعت ہے۔ نہ جانے
شام کو جب تک سب آئیں رغبت رہے یا نہ
رہے۔ یقین سے کیا کہا جا سکتا ہے۔ دل ہی تو ہے
ممکن ہے اس وقت کیلے کے نام سے طبیعت نفور
ہو۔ تو ایسی صورت میں ہم جانیں۔ ہم تو لقبیہ چھ کیلوں
میں سے اپنے حصّے کا ایک کیلا ابھی کھا لیتے۔
کیوں؟ اور کیا اپنی اپنی طبیعت ہے۔ اپنی اپنی
بھوک۔ جب جس کا جی چاہے کھالے۔ اس میں
تکلّف کیا۔ ایسے معاملوں میں تو بے تکلفی ہی اچھی ہے

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلّف نہیں کرتے

تو ذرا اٹھیو میرا بھائی۔ بس میرے ہی حصّے کا کیلا لانا
باقی کے سب وہیں احتیاط سے رکھے رہیں +

حسب الارشاد بندو نے کیلا چچا کو لا دیا۔ چچا
چھیل کر نوش فرمانے لگے۔

" دیکھا کیا صوت نکل آئی برتنوں کی۔ سبحان اللہ
یہ املی کا نسخہ موثر ہی ایسا ہے۔ اب انہیں دیکھ کر کوئی
کہہ سکتا ہے کہ پرانے برتن ہیں۔ جو دیکھے گا یہی
سمجھیگا۔ ابھی ابھی بازار سے منگوا کر رکھے ہیں۔ دوسروں
کا کیا ذکر۔ ہماری غیر حاضری میں یوں صاف کئے گئے
ہوتے تو واپس آکر ہم خود نہ پہچان سکتے۔ چھٹن کی
اماں بھی دیکھیں گی تو ایک بار تو ضرور چونک پڑیں گی۔
تجھ سے پوچھیں تو کہہ دیجو۔ میاں ساری دوپہر بیٹھ کر
صاف کراتے رہے ہیں۔ پر ایک بات۔ املی کا ذکر نہ
آنے پائے۔ ہاں ایسی بات بتا دو۔ تو کام کی وقعت
کھو جاتی ہے۔ سمجھ گیا نا؟ بس اب یہ املی کی بات آگے
نہ نکلنے پائے۔ جو پوچھے یہی کہو میاں نے ایک نسخہ
بنا کر اس سے صاف کرائے ہیں۔ بچّوں سے بھی
ذکر نہ کیجو۔ ورنہ نکل جائے گی بات۔ کب تک آئینگے
بچّے؟ للّو کا میچ تو شاید شام سے پہلے ختم نہ ہو۔ اس
کے کھانے چائے کا انتظام ٹیم والوں نے ہی کر دیا ہوگا
ورنہ خالی پیٹ کس سے کھیلا جاتا ہے۔ کوئی انتظام نہ
ہوتا تو مودے کو بھیجکر وہیں کھانے منگوا سکتا تھا خوب
تر لقمے اُڑائے ہوں گے آج۔ میوے مٹھائی سے
ٹھساٹھس پیٹ بھر لیا ہوگا۔ چلو کیا مضائقہ ہے۔
یہی عمر کھانے پینے کی ہے۔ اور پھر گھر کے دوسرے
لوگ نعمتیں کھائیں۔ تو وہ غریب کیوں پیچھے رہے؟
ودّو اور چھٹن تو ٹکٹ کے دام کے ساتھ کھانے پینے
کے لئے بھی پیسے لے کر گئے ہیں۔ اور کیا؟ وہیں کسی
دکان پر میوہ مٹھائی اُڑا رہے ہوں گے۔ خدا خیر کرے
ثقیل چیزیں کھا کھا کر کہیں بدہضمی نہ کر لائیں۔ ساتھ
کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے۔ تردد ہوتا ہے
بنّو کا تو یہ ہے کہ ماں ساتھ ہے۔ وہ خیال رکھے گی۔ کہ
کہیں زیادہ نہ کھا جائے۔ مگر میں کہتا ہوں۔ کیلے ہم
نے آج بڑے بے موقع لئے۔ اُس وقت خیال ہی نہ
آیا کہ آج تو یہ سب بڑی بڑی نعمتیں اُڑا رہے ہونگے۔
کیلوں کو کیوں خاطر میں لانے لگے۔ اور تو نے بھی یاد

نہ دلایا۔ ورنہ کیوں لیتے۔ اتنے بہت سے کیلے بیکار ضایع جائیں گے۔ ان پر رات گذر گئی تو خاک بھی باقی نہ رہے گی۔ سوکھ کر سیاہ پڑ جائیں گے۔ گر خود کردہ را علاجے نیست۔ اب خرید جو لئے۔ کیا کیا جائے۔ کسی نہ کسی طرح تو نیگ لگانا ہی پڑے گا۔ پھینکے تو جا نہیں سکتے۔ پھر لے آنا ہیں۔ مجبوری کو میں ہی انہیں ختم کر ڈالوں +

موسیقی

(نظم)

از :-

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بی اے بیرسٹرایٹ لا مرحوم

جسم نغمہ حباب ساغر ہے

جان نغمہ شراب ساغر ہے

شبنم غوں عذار گل آویز

نیستی کیف رنگ سے لبریز

وسعت آبجو میں یخ بستہ

اک پریشاں صبا کا گلدستہ

بلبلے ہیں سرود کے عریاں

خواب ہائے شباب ہیں گریاں

(آکسفورڈ ۱۹۱۴ء)

وکٹوریہ میموریل (کلکتہ) میں!

(نظم)

(چند زندہ تصویریں دیکھکر)

(ارمغاں بخدمت ناظرین بنگال)

از:۔ اختر شیرانی

حسین چہروں سے رنگیں نقاب اُٹھائے ہوئے
شریر آنکھوں میں سو بجلیاں بسائے ہوئے

خرامِ ناز پہ مستانہ لغزشوں کا ہجوم
فضا کی گود میں مینانے تھر تھرائے ہوئے

سیاہ پردوں میں شاداب و نازنیں چہرے
حسین تارے گھٹاؤں میں جگمگائے ہوئے

گھنیری زلفوں کے سائے میں عارضوں کی بہار
اندھیری شاخوں میں کچھ پھول لہلہائے ہوئے

سیہ نقاب میں روشن شفق نما رخسار
چراغ رات کے پردوں میں جھلملائے ہوئے

شفق کی موجوں پہ تنویرِ رنگ و بوئے فشاں
کہ ان کے لب پہ تبسم سے لہلہائے ہوئے

فسردہ کیسے گلِ ماہتاب کا جس کو
رخِ حسین پہ وہ نور جگمگائے ہوئے

جنہیں بہار کی راتوں کا رس کہا جائے جوان آنکھوں میں وہ خواب مسکرائے ہوئے

رخِ صبیح پہ گیسوئے مشکبو کا ہجوم فرشتے جانبِ افلاک پر اُٹھائے ہوئے

فضائے کاکلِ مشکیں میں شعلہ گوں عارض سوادِ شام میں آتشکدے جلائے ہوئے

قدم قدم پہ نگاہوں کو دعوتِ سجدہ کنارِ شام میں تبخانے سے بسائے ہوئے

فضائے باغ میں لرزاں وہ پھول سی پیکر شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے!

وہ ہر نظر میں کوئی ماجرا طراز ادا وہ ہر ادا میں کوئی راز سا چھپائے ہوئے

زبان حافظ و خیام میں تکلم ریز شراب و شعر کے بادل فضا پہ چھائے ہوئے!

بھلا چکی جنہیں صدیوں سے سرزمینِ عجم نقاب میں وہی آتشکدے چھپائے ہوئے!

ہر اک ادا عجمیت کے رنگ سے سرشار میموریل کو سوادِ عجم بنائے ہوئے

نگاہِ یاس کو اذنِ کلام دیتی جاؤ!

مسافرانِ حزیں کا سلام لیتی جاؤ!

[کلکتہ ۱۹۲۸ء]

خیال اور تعمیر حیات

از:-
عاشق بٹالوی۔ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

"ہم وہی ہیں جو ہمارے خیالات ہمیں بنا دیں"
کائنات روز ازل سے ایسی ہی تھی جیسی آج ہے۔ فطرت کے دامن میں کانٹے بھی تھے اور پھول بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ تو دنیا سراسر پھولوں اور پنکھڑیوں سے لدی ہوئی گویا عروس بہار معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسرے ہی لمحہ میں یہ لہلہاتا ہوا گلشن جو شگوفوں اور کلیوں کی کثرت سے جنت نگاہ بن رہا تھا۔ یک لخت خار زار اور لق ودق ریگستان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جہاں قدم قدم پر کانٹوں سے پاؤں لہولہان اور جسم باد سموم کے آتشین تھپیڑوں سے جھلس جاتا ہے؟ یہ ہماری نگاہ کی تبدیلی نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ کہیں گے پھر یہ تمام دکھ اور مصیبتیں جن سے دنیا بھرپور رہے۔ جن کے ہاتھوں ہر انسان نالاں ہے اور جو بھیڑوں کی طرح ہمیں کاٹ رہی ہیں حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتیں؟ حیران نہ ہوجئے میرا یہی جواب ہے کہ فی الحقیقت ان کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب کچھ جسے ہم دکھ اور تکلیف سمجھ رہے ہیں۔ ہمارے ہی تخیل کی بے راہ روی اور خیال کی بغاوت کا نتیجہ ہے۔ ہم دنیا کو رنگین چشموں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ رنگوں کا اختلاف اشیاء کی نوعیت و ماہیت نہیں بدل سکتا لیکن کتنے عقلمند ایسے ہیں جن کی زندگیاں اس نظریہ کا عملی ثبوت پیش کر سکتی ہیں؟ اگر چشمہ گدلا ہے تو بلاشبہ کل جہان گدلا نظر آئے گا اور صاف و خوشرنگ ہے تو زمان و مکان متبسم نظر آئیں گے۔ یقین نہ آئے تو آزما دیکھو۔ آخر وہ چشمہ کیا ہے جو ہماری حیات کی تعمیر و تخریب میں اس قدر دسترس رکھتا ہے؟

سنئے، وہ خاموش خیالات ہیں۔ جو ہر لحظہ انسانی زندگی کو اپنے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ تم بیخبری کے عالم میں اونگھ رہے ہو اور دلپذیر مواقع کی سوچ میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا بیٹھے ہو۔ اور وہ بظاہر نحیف و کمزور خیالات، جو تمہارے نزدیک لاشے محض ہیں جن پہ توجہ کرنا بھی تم نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ اندر ہی اندر ایک خاص کیمیاوی ترکیب سے تمہارے گرد آہنی زنجیروں کا جال بچھا رہے ہیں جس سے تم چاہو بھی تو نہ نکل سکو گے۔

تمہارے دل کی دنیا میں برقی شعاعیں پھوٹ پھوٹ
کر ہر لحظہ تمہارے ماحول کی تخلیق میں مصروف ہیں
اور تم خارجی اسباب کے انتظار میں ہو جو خود بخود
آ کر تمہاری قسمت تبدیل کر دیں گے۔

خارجی اسباب؟ ہم ایک خطرناک مغالطہ اور
فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں حالات
نامساعد وہ واقعاتِ مخالف کی حقیقت سے انکار
کرتا ہوں۔ میں بلیات و مصائب کی طرف سے آنکھ
بند نہیں کر سکتا۔ جبکہ خود ایک طویل عرصہ تک حوادثِ
دہر و بلائے آسمانی کا شکار رہ چکا ہوں۔ لیکن زندگی
کی ترتیب میں ہم کلیتہً کیوں بیرونی اسباب کے
ماتحت چلتے ہیں؟ قصرِ حیات کی ذمہ داری تین حصے
تمہارے سر عائد ہوتی ہے۔ اور ایک حصہ اُن
امور پر جو بظاہر پردۂ غیب سے ازخود نمودار ہو کر
تمہاری مساعی پر فتح و شکست کی مُہر ثبت کرتے ہیں
میں نے اس میں بھی رعایت سے کام لیا ہے۔ ورنہ
وہ لوگ جنہوں نے محض اپنے بل بوتے سے مخالف
قوتوں پر غلبہ پایا۔ جنہوں نے اپنے دست و بازو
سے متصادم عناصر کو زیر کر کے اس اژدہام کو چیر
کر اپنی راہ آپ بنائی یہی کہیں گے کہ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اُن کے سامنے "قسمت" کا نام لینا گویا انسانیت
اور ان محیر العقول طاقتوں کی جو اس ایک لفظ "انسانیت"
میں مضمر ہیں ہتک کرنا ہے۔ آپ میرے سامنے
کئی مثالیں لے آئیں گے "فلاں شخص نے
سالہا سال کوشش کی پھر بھی اپنے حالات تبدیل
نہ کر سکا۔ وہ کئی برس جدوجہد میں مصروف رہنے پر بھی بدقسمتی
اور نحوست کو جو اُس کے گرد احاطہ کئے ہوئے تھی
رفع نہ کر سکا۔ اُس نے مدتوں مشکلات کی سنگین دیواروں
سے بے سود ٹکریں ماریں لیکن دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔
وغیرہ وغیرہ"۔

شاید آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان حالات
کا غلام ہے۔ اور تقدیر کے زنداں سے نکل نہیں سکتا
الفاظ کا غلط استعمال نہ صرف انسانی تعلقات کو بہت
کشیدہ کر سکتا ہے۔ بلکہ ہمارے علم کو غیر صحیح اور ناقص
بنا دیتا ہے۔ کسی چیز کی "خواہش" کرنے اور اُس کے
حصول کی "کوشش" کرنے میں نمایاں فرق ہے۔
ہم میں سے پچانوے فیصدی لوگ اپنے مطمحِ نظر
کو بہت بلند کر لیتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں فرشِ خاکی
سے بلند ہو کر فضائے آسمانی کی سیر میں مصروف
رہتی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایک ہی جست میں
دنیا اور اُس کی آلودگیوں کو چھوڑ کر عالمِ بالا میں پہنچ جائیں
مگر قوائے عمل اور استقلال کی یہ حالت ہے کہ اس
پہنائے عظیم کو طے کرنے کی ہمت تو کجا اُس کی وسعت
پر نگاہ ڈال کر ہی دل بیٹھ جاتا ہے۔ جب تخیل اور عمل
خواہش اور کوشش میں اتنا بُعد اور فرق ہو۔ تو
اطمینانِ قلب کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ شاعرِ بے نظیر
نے سچ کہا ہے ؎

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

جب کبھی تم ایسے شخص کو دیکھو جو کسی چیز کا خواہشمند ہے اور بظاہر اُس کے حصول میں کوشاں بھی ہے لیکن پھر ناکام رہتا ہے۔ تو سمجھ لو کہ اُس کی کوششوں میں نقص ہے۔ ناممکن ہے کہ تم سیدھے راستے پر گامزن رہو اور پھر منزل مقصود پر پہنچ سکو۔ سَو میں ننانوے ناکامیاں ایسی ملیں گی جن کی وجہ خواہش کی موجودگی اور کوشش کا فقدان ہوتا ہے۔ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی تک پہنچنے، امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے اور اپنے ہم جنسوں میں دنیوی اعزاز و مراتب پانے کے لئے جہاں تمہارے اندر شدید خواہش اور آتش خیز ولولے کی ضرورت ہے۔ ایسا ولولہ جو تمہارے جسم اور روح میں ایک برقی رَو دوڑا دے۔ جو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے تمہیں بیقرار رکھے، وہاں یہ بات بھی اشد ضروری ہے کہ تمہارا عمل ایسا محکم، ارادہ ایسا مصمم اور ہمت اسقدر مضبوط ہو کہ راستے کی مشکلات تمہارے ماتھے پر شکن تک نہ ڈال سکیں۔

ا۔ ب دو طالب علم ایک جماعت اور ایک ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں۔ دونوں یکساں طور پر ذہین اور محنتی ہیں۔ دونوں کی مالی اور معاشرتی حالت بھی قریب قریب ایک سی ہے۔ دونوں بیک وقت امتحان میں شامل ہوتے ہیں۔ اور سوءِ اتفاق سے دونوں ہی ناکام رہتے ہیں۔ اس ناکامی سے ا اسقدر متاثر ہوتا ہے کہ اپنی طبیعت کا توازن بھی قایم نہیں رکھ سکتا۔ ہر وقت متفکر و مغموم۔ افکار اُس کے دماغ کو پریشان کئے دیتے ہیں۔ دل برداشتہ ہو کر وہ مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔ اور آخر سال بھر حزن و ملال کا شکار رہ کر ناچار ایک معمولی سے سلسلۂ روزگار میں منسلک ہو جاتا ہے۔

ادھر ب کے لئے امتحان میں ناکامی کی خبر ہر چند کہ بالکل غیر متوقع تھی۔ ایک تازیانہ کا کام دیتی ہے وہ سوچتا ہے اُس کی محنت بار آور نہیں ہوئی۔ لیکن مایوس نہیں ہوتا۔ ایک نئی ہمت، نئی زندگی، نئے ارادے کو دل میں جگہ دے کر غم ماضی کو بالکل فراموش کر کے وہ پھر کتاب اُٹھا کر مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ سال بھر کے بعد امتیازی کامیابی حاصل کر کے آئندہ تعلیم جاری رکھتا ہے۔ اور سالہا سال کے بعد مکمل تعلیمی سلسلہ کو بخیر و خوبی ختم کر کے ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے۔

اب بتائیے اگر ہم خارجی حالات کے غلام ہوتے تو امتحان کی ناکامی نے ا اور ب دونوں کی زندگیوں پر کیوں ایک سے نتائج مترتب نہ کئے؟

علامہ اقبال کے نام

(بال جبریل دیکھکر)

ایک وطن پرست کا پیام

از:-
میر نور بخش تاثر سیالکوٹی (کلکتہ)

زمانہ اُس کا ہی جو بنائے عمل کو تقدیر جاودانہ
جو اپنی قسمت کا رازداں ہی نظر اُسی کی ہے عارفانہ

مدینہ اُس کا سفینہ اُسکا دفینہ اُسکا خزینہ اُسکا
جو اپنے ذوقِ عمل سے بخشے نظر کو افسونِ ساحرانہ

حیات پائندہ تر ہی اُسکی ممات تابندہ تر ہی اُسکی
جو مثل شبیر تیز کر دے رگوں میں خونِ مجاہدانہ

وہ ڈوب جائیگا نزدِ ساحل جو سیلِ دریا سے بیخبر ہی
وہ ناخدا ہو حکیم ہو فلسفی ہو یا شاعرِ یگانہ

دیارِ مغرب کی فتنہ کاری فضائے مشرق پہ چھاگئی ہی
کہیں بہ شمشیر تاجرانہ کہیں بہ افیون دلبرانہ

فریب خوردہ ہیں شیخ و افغاں عراق و مصر و حجاز و ایراں
کوئی بانداز میر جعفر۔ کوئی باسلوبِ نادرانہ

چمن میں بیگانہ وار رہنا۔ وطن میں بے اختیار رہنا
جہاں میں بے اعتبار رہنا یہی ہیں کردار عاقلانہ؟

غرض ہے فطرت کی یہ کہ جور و ستم سے دنیا نجات پائے
مٹے یہ افسونِ قیصرانہ و بے فسادِ "مقامرانہ"

جہاں کی منزل ہے بسکہ مشکل عمل کی راہیں جدا جدا ہیں
کہیں عصا ہی۔ کہیں اہنسا۔ کہیں ہی چرخے کا تازیانہ

یہ کس کے فیضِ جنوں سے ماثر جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا
یہ آدمِ نو ہے۔ کون۔ جسنے سکھائے اندازِ عاشقانہ

وہ مردِ حق کوش و صدق آئیں زمانہ کہتا ہی جسکو گاندھی
وہ جسکا ہر لفظ عشق پرور وہ جسکی ہر بات عارفانہ

وہ مردِ آزاد جو غلامی میں ایک مینارِ زندگی ہے
وہ جسکا ہر قول نعرۂ حق۔ وہ جسکا ہر فعل غازیانہ۔

وہ جس نے مشرق کے زیردستونکو عزم جنگِ نوی دیا ہی
وہ جسنے بھارت کے شودرونکو سکھائے اندازِ خسروانہ

وہ جسکے روزے نے اہلِ دل کو پیام جوشِ بقا دیا ہی
وہ جسکی قربانیونکو تونے کہا ہی اک رائیگاں فسانہ

وہ جس نے دیر و حرم کے سجدونکو ایک رُخ پر بہا دیا تھا
گروہ تو جس نے کر دیا ہے جدا انہیں مشکل دانہ دانہ

فسادِ مغرب کا ترجماں تو۔ سکونِ مشرق کا رازداں وہ
تری محبت منافقانہ۔ پیام اُس کا پیمبرانہ

تو فخرِ ہندوستاں نہیں ہے۔ تو شاعرِ ایشیا نہیں ہے
تو فرقہ پرور ہے۔ فتنہ زا ہے۔ برنگِ اعجازِ شاعرانہ

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے جانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمیں سے سلوک تیرا مخاصمانہ

اسی نے پالا اسی نے پوسا۔ اسی نے بخشی تجھے جوانی
تو دل کی آنکھوں سے دیکھ انکو یہ کارنامے ہیں مخلصانہ

اگر یہ جنت ہے جنتی تو اگر یہ دوزخ ہے دوزخی تو
یہ قول ہے۔ قولِ عاشقانہ۔ یہ راز ہے رازِ محرمانہ

وطن اسیر و غلام تیرا۔ کلام ہے بے پیام تیرا
گرہ غلامی کی کون کھولے تری خموشی ہے مجرمانہ

زبان کھولے کہ چپ رہے تو۔ جو کام ہونا ہے ہو رہیگا
وطن پرستوں میں یہ خموشی بنیگی نفرت کا تازیانہ

مثالِ فکرِ فرنگ تو نے دلوں کو درسِ ہوس دیا ہے
تجھے فقیری سے واسطہ کیا۔ کہ روح تیری ہے قیصرانہ

وہ برق بیباک جو فضائے دماغِ روما میں کوندتی ہے
اسی کی جانسوز وادیوں میں بنا لیا تو نے آشیانہ

وہ خون آشام تیرا شاہیں۔ کبوتروں کی ہوس ہے جسکو
وہ خون چکھنے کا گر جسکو ملا ہے۔ کیا خوب اک بہانہ

بنائے قوت ہے تیری حکمت جسے تلاش شکار ہر دم
کبھی بطرزِ نپولین ہے کبھی بطرزِ سکندرانہ

کمال تیری فلاسفی کا، مآل تیری فلاسفی کا
یہ ظالمانہ ہے ظالمانہ۔ یہ کافرانہ ہے کافرانہ

حسینؓ پیدا ہوں اس چمن میں تری نوا سے یہ غیر ممکن
کہ لَے حجازی ہے تیری بیشک مگر بطرزِ "معاویانہ"

اسی نے آئینِ مہر و الفت کو اس جہاں سے مٹا دیا ہے
اسی سے فتنوں کی ابتدا ہے۔ اسی سے جنگوں کا شاخسانہ

اسی نے بوجہل بن کے احمدؐ کو وقفِ رنج و بلا کیا تھا
اسی سے طوقِ ابوحنیفہ۔ اسی سے یوسفؑ کا قید خانہ

اسی سے پامال نسلِ آدم۔ اسی سے یزداں کی آنکھ نادم
اسی سے ہے بزمِ سیزرانہ۔ اسی سے رزمِ ہلاکوانہ

اسی سے انساں کا خون ارزاں۔ اسی سے مادر کی روح لرزاں
اسی سے قوموں کی ملک گیری۔ اسی سے اقدام جارحانہ

فسادِ مغرب کا ترجماں تو بسکونِ مشرق کا رازداں وہ　　　تری محبت منافقانہ ۔ پیام اُس کا بہیرانہ

تو فخرِ ہندوستاں نہیں ہے ۔ تو شاعرِ ایشیا نہیں ہے
تو فرقہ پرور ہے ۔ فتنہ زا ہے ۔ برنگِ اعجاز شاعرانہ

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہی جانتا ہوں　　　مگر ہے گنگا کی سرزمیں سے سلوک تیرا مخاصمانہ
اسی نے پالا اسی نے پوسا ۔ اسی نے بخشی تجھے جوانی　　　تو دل کی آنکھوں سے دیکھ انکو یہ کارنامے ہیں مخلصانہ
اگر یہ جنت ہے جنتی تو اگر یہ دوزخ ہے دوزخی تو　　　یہ قول ہے ۔ قولِ عاشقانہ ۔ یہ راز ہے رازِ محرمانہ
وطن اسیر و غلام تیرا ۔ کلام ہے بے پیام تیرا　　　گرہ غلامی کی کون کھولے تری خموشی ہے مجرمانہ
زبان کھولے کہ چپ رہے تو ۔ جو کام ہونا ہے ہو رہیگا　　　وطن پرستوں میں یہ خموشی بنیگی نفرت کا تازیانہ
مثالِ فکرِ فرنگ تونے دلوں کو درسِ ہوس دیا ہے　　　تجھے فقیری سے واسطہ کیا ۔ کہ روح تیری ہے قیصرانہ
وہ برقِ بیباک جو فضائے دماغ روما میں کوندتی ہے　　　اسی کی جانسوز وادیوں میں بنا لیا تونے آشیانہ
وہ خون آشام تیرا شاہیں ۔ کبوتروں کی ہوس ہے جسکو　　　وہ خون رکھنے کا گرم جسکو ملا ہے ۔ کیا خوب اک بہانہ
بنائے قوت ہے تیری حکمت جسے تلاش شکار ہر دم　　　کبھی بمشربِ نپولین ہے کبھی بظرفِ سکندرانہ

کمال تیری فلاسفی کا ، مآل تیری فلاسفی کا
یہ ظالمانہ ہے ظالمانہ ۔ یہ کافرانہ ہے کافرانہ

حسینؓ پیدا ہوں اس چمن میں تری نوا سے یہ غیر ممکن　　　کہ لے حجازی ہے تیری بیشک مگر بطرزِ "معاویانہ"
اسی نے آئینِ مہر و الفت کو اس جہاں سے مٹا دیا ہے　　　اسی سے فتنوں کی ابتدا ہے ۔ اسی سے جنگوں کا شاخسانہ
اسی نے بوجہل بن کے احمدؐ کو وقفِ رنج و بلا کیا تھا　　　اسی سے طوقِ ابو حنیفہ ۔ اسی سے یوسف کا قید خانہ
اسی سے پامال نسلِ آدم اسی سے یزداں کی آنکھ نادم　　　اسی سے ہے بزمِ سیزرانہ ۔ اسی سے رزمِ ہلاکوانہ

اسی سے انساں کا خون ارزاں ۔ اسی سے ماٹر کی روح لرزاں
اسی سے قوموں کی ملک گیری ۔ اسی سے اقدام جارحانہ

افسانہ

بیوہ کا راز

(افسانہ)

از:- اختر شیرانی

ایک دن سہ پہر کے وقت میں ہاکمنز ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھا ہؤا لکھنؤ کی زندگی کی عظمت و شوکت اور عسرت و فلاکت کے دوگونہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ورمتھ کے گلاس پر سے گذرتی ہوئی میری نظریں امارت و ثروت اور غریبی و ذلت کے ان عجیب و غریب اور متضاد و متخالف نظاروں کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جو حضرت گنج کی وسیع و مصفا سڑک پر میرے سامنے سے گذر رہے تھے۔ گذرتے چلے جا رہے تھے کہ اتنے میں کسی نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو نواب کیوان قادر سامنے کھڑا نظر آیا۔

ہمیں کالج چھوڑے کم و بیش دس سال گزر چکے تھے اور اُس وقت سے لے کر اب تک ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اسکو دوبارہ دیکھ کر مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ اور ہم نے نہایت گرمجوشی سے معانقہ کیا۔ جب ہم علی گڑھ میں تھے تو دونوں میں بہت دوستی رہ چکی تھی۔ وہ اتنا خوبصورت ایسا جوانمرد اور اس درجہ معزز تھا کہ میں اسے بیحد پسند کرتا تھا۔ طلبہ میں عام طور پر اُس کی بابت چہ میگوئیاں ہؤا کرتی تھیں کہ اگر وہ ہمیشہ سچ بولنے کا عادی نہ ہو تو بہترین ساتھی ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اس کی صاف گوئی ہی کی وجہ سے اس کی تعریف کرتے تھے۔

میں نے اسے کافی سے زیادہ بدلا ہوا پایا۔ وہ کچھ بے چین، پریشان اور کسی معاملے کی بابت کچھ متشکک سا دکھائی دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی بیتابی زمانۂ حال کے کفر و الحاد کے اثرات کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کیوان قدر حکومت پسند طبقے کا کٹر رکن تھا۔ اور اپنے خاندان کی دیرینہ مذہبی روایات پر ایسا ہی اعتقاد رکھتا تھا جیسا کونسل آف سٹیٹ پر۔ بنا بریں میں نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو اس کی پریشانیوں کی تہہ میں کسی عورت کی زلفیں الجھ رہی ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے اس سے اس کی شادی کے متعلق دریافت کیا۔

"یار! میں ان عورتوں کو کچھ اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیوان!" میں نے کہا: "عورتیں محبت کئے جانے کے لئے ہیں۔ سمجھنے کے لئے نہیں!"

"مگر میں اُس عورت سے محبت نہیں کر سکتا
جس پر مجھے اعتبار نہ ہو۔" اُس نے جواب دیا۔
"کیوان! مجھے یقین ہے کہ تم اپنی زندگی میں
کسی نہ کسی راز سے دوچار ہوئے ہو؟" میں نے
کہا۔ "مجھے اس کے متعلق کچھ بتاؤ!"
"آؤ، گاڑی پر ہوا خوری کریں۔" اُس نے کہا
"یہاں تو بہت ہنگامہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں
نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زرد رنگ کی گاڑی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
نہیں کوئی اور رنگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ
گہرے سبز رنگ والی ۔ ۔ ۔ ۔ بس بس وہ ٹھیک
رہے گی۔"

چند لمحوں میں ہم قیصر باغ سے گزرتے ہوئے
امین آباد پارک کی طرف جا رہے تھے۔
"کہاں چلنا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"جہاں جی چاہے چلو۔" اُس نے جواب دیا۔
"قیصر کے ریسٹوران سہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہیں کھانا بھی
کھالیں گے۔ اور تم اپنے متعلق مجھے تمام باتیں بھی
بتا سکو گے۔"
"مگر مجھے پہلے تمہارا حال سننے کا شوق ہے۔"
میں نے کہا۔ "مجھے اپنا وہ راز بتاؤ!"

اُس نے اپنی جیب سے روپہلی بکسوئے
کا ایک مراکو کیس نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں
نے اُسے کھولا تو اندر ایک عورت کی تصویر نظر آئی۔
وہ نازک اور سرو قامت تھی۔ اور اس کی بڑی
بڑی مبہم آنکھوں اور بے ترتیب و بے پروا بالوں
سے، ایک عجیب دلاویزی کی شان ٹپک رہی تھی۔
وہ ایک غیب داں کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اور نہایت
قیمتی اور لطیف سموروں میں لپٹی ہوئی تھی۔
"اس چہرے کے متعلق تمہاری کیا رائے
ہے؟ کیا اس سے صداقت ٹپکتی ہے؟"

میں نے تصویر کا غور سے معائنہ کیا۔ اس عورت کا چہرہ مجھے اُس
شخص کا سا دکھائی دیا جو کوئی راز رکھتا ہو۔ لیکن یہ مسئلہ کہ
وہ راز برائی کا پہلو لئے ہوئے تھا یا بھلائی کا ۔۔ میں اسکا
فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُسکا حسن ایسا حسن تھا۔ جو بیسیوں
بھیدوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ وہ حسن جو حقیقت
میں نفسیاتی ہوتا ہے جمالیاتی نہیں، انفرادی ہوتا ہے
تصوراتی نہیں۔ پھر وہ کھلائی ہوئی مسکراہٹ جو اس کے
ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ حقیقتاً شیریں ہونے کی بہ نسبت
کہیں زیادہ فریب آرایانہ تھی۔
"کیا خیال ہے تمہارا؟" اُس نے بے صبری سے پوچھا۔
"سموروں میں لپٹا ہوا ایک مرمری بت۔" میں
نے جواب دیا۔ "مجھے اس کے متعلق کچھ بتاؤ!"
"ذرا ٹھہر کر" اُس نے جواب دیا۔ "کھانے کے
بعد۔" اور دوسری باتیں چھیڑ دیں۔

جب ویٹر ہمارے لئے قہوہ اور سگریٹ لا چکا تو
میں نے کیوان قدر کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔ وہ اپنی جگہ
سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اور پھر
اپنے آپ کو ایک آرام کرسی پر گرا کے اُس نے
مجھے یہ کہانی سنائی:۔
"ایک دن شام کو" اُس نے کہا "پانچ بجے

کے قریب میں چاندنی چوک کی طرف جا رہا تھا۔ چاؤڑی بازار میں گاڑیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ آمد و رفت بالکل رُک گئی تھی۔ چلتے چلتے سامنے جو نظر پڑی تو زرد رنگ کی ایک فٹن نظر آئی۔ جس نے کسی نہ کسی وجہ سے میری توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ جیسے ہی میں اُس کے پاس سے گذرا اس میں وہ چہرہ نظر آیا جو کچھ دیر پہلے میں نے تمہیں دکھایا تھا۔ اس نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ اور میں اُس روز تمام رات اُسی کے تصوّر میں کھویا رہا۔ دوسرا دن میں نے اس ذلیل بازار میں گذارا اور ہر ایک گاڑی کو غور سے دیکھتا ہوا اور زرد فٹن کا انتظار کرتا ہوا میں شام تک اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا رہا۔ مگر اس گاڑی کی جھلک نہ دکھائی دی ۔

آنکھوں نے ذرّہ ذرّہ پہ سجدے لٹائے ہیں
کیا جانے جا چھپا مرا پردہ نشیں کہاں؟

بالآخر میں نے سوچا کہ وہ عورت نرا سپنا ہی سپنا تھی ع

وہ اس سنسار میں اک آسمانی خواب تھی گویا!

تقریباً ایک ہفتے کے بعد میں مسز گنگولی کے ہاں کھانے پر مدعو تھا۔ ڈنر کا وقت آٹھ بجے مقرر تھا۔ مگر ہم ساڑھے آٹھ تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے۔ بالآخر خادم نے دروازہ کھولا اور لیڈی شجاع کی آمد کی اطلاع دی ـــــ یہ وہ عورت تھی جس کی تلاش میں میں پریشان تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر آئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے چاند کی ایک نازک کرن بھوری لیس میں خراماں ہو۔ میری انتہائی مسرّت کہ مجھے اس کو ڈنر تک لے جانے کے لئے کہا گیا۔

جب ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے بالکل بے خبری اور سادگی سے کہا " لیڈی شجاع: میرا خیال ہے کہ کچھ دن ہوئے میں نے آپکو چاؤڑی بازار میں دیکھا تھا" اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور اُس نے بہت ہی آہستہ آواز میں مجھ سے کہا " خدا کے لئے اتنی اونچی آواز میں بات نہ کیجئے۔ ایسا نہ ہو کوئی سُن لے"

مجھے اس بُری طرح آغاز پر افسوس ہوا۔ اور میں نے جلدی سے اردو فلموں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اُس نے بہت کم گفتگو کی اور جو کچھ کی اُسی آہستہ موسیقیانہ آواز میں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے دھڑکا ہے کہ کوئی اور سُن لیگا۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ میں دل و جان سے مگر ساتھ ہی نادانی و حماقت سے اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ گو مبہم رازوں کی اُس فضا نے جو اُس کی خاموش شخصیت کو محیط تھی میری انتہائی نزاکت حس و خیال کو پریشان کر دیا۔ جب وہ جانے لگی اور یہ ڈنر کے فوراً ہی بعد بروئے کار آیا تو میں نے اس سے درخواست کی کہ آیا میں اُس سے ملنے آ سکتا ہوں۔ یہ سُنکر وہ ایک لمحے کے لئے گھبرا سی گئی۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اور تو ہمارے قریب نہیں۔ پھر بولی " بہت اچھا کل پانچ بجے" میں نے اپنی میزبان مسز گنگولی سے درخواست کی کہ مجھے اس کے متعلق کچھ بتلائے۔ مگر میں اُس سے جو کچھ معلوم کر سکا یہ تھا کہ وہ

ایک بیوہ ہے۔ اور نئی دہلی میں اس کا خوبصورت
اور شاندار مکان ہے۔ اس کے بعد چونکہ بیواؤں کے
متعلق سائنس اور فلسفے کی بحثوں کی طرح خشک اور
تھکا دینے والی تقریریں شروع ہوگئی تھیں۔ اس لئے
میں وہاں سے رخصت ہوکر اپنے مکان کی طرف روانہ
ہوا۔

"دوسرے روز میں مقررہ وقت پر نئی دہلی پہنچا
لیکن بٹلر کی زبانی معلوم ہوا کہ لیڈی شجاع ابھی ابھی
باہر گئی ہے۔ میں انتہائی مایوسی اور پریشانی کے عالم
میں اپنی کلب کی طرف چلا گیا۔

"طویل غور و فکر کے بعد میں نے اُسے خط لکھا
جس میں اُس سے درخواست کی گئی تھی کہ آیا میں
کسی اور دن دوپہر کے وقت اُس سے ملاقات
کرسکتا ہوں؟ کئی روز تک جواب نہیں آیا۔ آخر
اُس کا ایک رقعہ ملا جس میں لکھا تھا کہ وہ اتوار کو چار
بجے گھر پر مل سکیگی۔ رقعہ اس غیر معمولی "مگر آنکہ" پر
ختم ہوتا تھا کہ "مہربانی کرکے مجھے آئندہ اس پتے
سے خط نہ لکھئے۔ ملاقات پر اس کی وجہ بتادی جائیگی"
اتوار کو وہ اپنی کوٹھی پر موجود تھی۔ اُس نے
مجھے اندر بلا لیا۔ وہ بدستور دلفریب نظر آتی تھی۔
چلتے وقت اُس نے کہا کہ اگر میں آئندہ کبھی اُسے
خط لکھنا چاہوں تو "مسز بھارتی بمعرفت زنانہ
لائبریری کوچۂ چیلاں" کے پتہ سے لکھوں۔ "چند
وجوہ سے میں" اُس نے کہا "اپنے مکان کے پتے
سے خطوط نہیں منگوا سکتی۔"

اس ملاقات کے بعد جو زمانہ گذرا اس کے دوران
میں میں نے اس کا کافی مطالعہ کیا۔ مگر اسرار کی وہ
فضا جو اُس کی شخصیت کے گرد چھائی ہوئی تھی۔ کبھی
اس سے دور نہ ہوئی۔ کبھی میں سوچتا کہ وہ کسی شخص
کے بس میں ہے۔ مگر مجھے وہ اس درجہ ناقابل گرفت
نظر آتی تھی کہ میں اس پر یقین نہ کرسکتا تھا۔ میرے
لئے حقیقتاً کسی نتیجے پر پہنچنا بیحد دشوار تھا۔ کیونکہ
وہ ان عجیب بلوروں کے مانند تھی جو عجائب گھروں
میں نظر آتے ہیں اور جو ایک لمحے میں صاف دکھائی
دیتے اور دوسرے لمحے پھیکے پڑجاتے ہیں۔ آخرکار
میں نے اُس سے شادی کی درخواست کرنیکا فیصلہ
کرلیا۔ میں اُس کی اس لگاتار پُراسراریت سے
اُکتا گیا تھا جو وہ میری ملاقاتوں اور خطوط کے
سلسلے میں عائد کرتی تھی۔

"میں نے لائبریری کے پتے سے لکھا کہ آیا
وہ مجھ سے پیر کو چھ بجے مل سکیگی؟ اُس نے اثبات میں
جواب دیا اور میرا دماغ خوشی کے مارے ساتویں آسمان
پر پہنچ گیا۔ سچ یہ ہے کہ میں اس کی محبت میں دیوانہ
ہوگیا تھا۔ باوجود اُس اسراریت کے ـــــ جیسا کہ
میرا اس وقت خیال تھا ـــــ اور اُس کے نتیجے
کے طور پر ـــــ جیسا کہ میں اب محسوس کرتا ہوں۔
ـــــ حقیقت یہ ہے کہ مجھے خود اس عورت سے محبت
تھی۔ البتہ اس کی خوے "راز" نے مجھے اذیت
پہنچائی، دیوانہ کردیا۔ ... آہ! قسمت نے اسے کیوں
میرے راستے پر لا کھڑا کیا تھا؟

"تو تم نے اس کے راز کا پتہ لگا لیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"شاید" کیوان قدر نے جواب دیا "تم خود اندازہ کر لو گے۔۔۔۔ پیر کے دن مجھے صبح کا کھانا چچا جان کے ہاں کھانا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب میں نے اپنے آپ کو اجمیری دروازہ کے قریب پایا۔ تم جانتے ہو میرے چچا بلیماران میں رہتے ہیں۔ مجھے چاوڑی پہنچنا اور مسافت سے بچنے کے لئے ایک دو مختصر اور غلیظ گلیوں سے گزرنا تھا۔ ابھی میں پہلی گلی میں داخل نہ ہوا تھا کہ میں نے لیڈی شجاع کو برقعہ پہنے اُسی زرد رنگ کی فلٹن سے اُتر کر گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی گلی کے آخری مکان کے قریب پہنچی اور سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ اوپر پہنچکر اُس نے دروازہ کا دستہ گھمایا اور اندر داخل ہوگئی۔ "اب راز معلوم ہوا چاہتا ہے" میں نے اپنے دل میں کہا۔ اور میں تیزی سے آگے بڑھ کر تجسس نظروں سے عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ عمارت ایسی دکھائی دیتی تھی جیسی آجکل کرایہ پر دینے کے لئے بنوائی جاتی ہیں۔ دروازے کی سیڑھی پر مجھے اُس کا رومال نظر آیا۔ جو شاید جلدی میں گر پڑا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا لیا اور جھٹ سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے اس کی جاسوسی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ فیصلہ کر کے میں آہستہ آہستہ اپنی کلب کی طرف چل دیا۔

"چھ بجے میں اُس کے مکان پر پہنچا۔ وہ ایک صوفے پر دراز تھی۔ اُس نے بادلے کا گون پہن رکھا تھا۔ جس کے تکمے بعض عجیب قسم کے حجر القمر کے تھے۔ یہ گون وہ عام طور پر پہنا کرتی تھی۔

"وہ بدستور حسین نظر آتی تھی "آپ کی تشریف آوری سے بیحد مسرت ہوئی" اُس نے کہا۔ "میں تمام دن باہر نہیں گئی"

میں حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ اور جیب سے اُس کا رومال نکال کر اُس کی طرف بڑھایا "لیڈی صاحبہ! آپ نے اسے آج دوپہر کو کوچہ قاسم جان میں گرا دیا تھا" میں نے سکون کے ساتھ کہا۔

اُس نے میری طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔ لیکن رومال لینے کے لئے مطلقاً کوئی اشارہ ظاہر نہیں کیا

"آپ وہاں کیوں گئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو مجھ سے ایسے سوال کرنے کا کیا حق ہے؟" اُس نے جواب دیا۔

"وہ حق جو ایک محبت کرنے والے کو ہوتا ہے" میں نے جواب دیا "میں آپ کی خدمت میں شادی کی درخواست کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور زار و قطار رونے لگی "تمہیں بتانا پڑیگا" میں کہے گیا۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ اور میرا منہ تکتے ہوئے بولی "نواب صاحب کوئی ایسی بات نہیں جو آپکو بتلانے کے قابل ہو"

"آپ وہاں کسی شخص سے ملنے گئی تھیں" جیسے

چلا کر کہا "یہ آپ کا راز ہے"۔ اُس کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا۔ اور وہ بولی۔ "میں کسی شخص سے ملنے نہیں گئی"۔

"کیا آپ سچ سچ نہیں بتا سکتیں؟" میں نے غصے سے کہا۔

"بیں بتا چکی ہوں"۔ اُس نے جواب دیا۔

"میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ مغلوب الغضب ہو گیا تھا۔ اس عالم میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گذرا۔ لیکن جو کچھ بھی میں نے کہا وہ اُس کے لئے حد درجہ خوفناک تھا اسیطرح بکتے جھکتے میں تیزی سے اُس کے مکان سے باہر نکل گیا۔ دوسرے دن مجھے اُس کا خط ملا۔ لیکن میرا غصہ ع ایسا نشہ نہ تھا جسے ترشی اُتار دے میں نے خط بغیر کھولے واپس کر دیا۔ اور رشید جاوید کے ساتھ افغانستان روانہ ہو گیا۔

"ایک ماہ کے بعد میں واپس آیا تو پہلی چیز جو میں نے "ہمدرد" میں پڑھی وہ لیڈی شجاع کے انتقال کی خبر تھی۔ اُسے سینما میں سردی لگ گئی تھی چنانچہ پانچ روز تک پھیپھڑوں کے انجماد خون کے بعد اُس نے اس سرائے فانی کو الوداع کہا۔ اس صدمے کی وجہ سے میں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ہر قسم کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند کر دیا۔ میں اس سے اس درجہ محبت کرتا تھا! میں اُس سے اس دیوانگی کے ساتھ محبت کرتا تھا! اللہ میں اُس عورت سے کس درجہ محبت کرتا تھا"۔

"تم پھر بھی کبھی اُس گلی میں گئے؟ اُس مکان پر جو اُس گلی میں تھا"۔ میں نے دریافت کیا۔

"ہاں" اُس نے جواب دیا

"ایک روز میں کوچہ قاسم جان کی طرف گیا۔ میں وہاں جائے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔ میرے دل کو شک شبہ کے نشتر ہلاک کئے دیتے تھے۔ میں نے اسی مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک معزز صورت بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نے اُس سے پوچھا کچھ کمرے کرایہ کے لئے خالی ہیں یا نہیں؟

"جی ہاں حضور!" اُس نے جواب دیا۔ "دو تین کمرے خالی ہونے والے ہیں جن بیگم صاحبہ نے ان کمروں کو کرایہ پر لے رکھا تھا۔ وہ کوئی تین مہینے سے نہیں آئیں۔ ناحق بن ناحق کو کرایہ چڑھ رہا ہے۔ اس لئے آپ ان کو لے سکتے ہیں"۔

"وہ بیگم صاحبہ یہ تو نہیں؟" میں نے تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"وہی ہیں حضور! عین مین وہی!" اُس نے چلا کر کہا۔ "اور کیوں حضور وہ کب تک آئیں گی؟"

"اب نہیں آئینگی۔ ان کا انتقال ہو گیا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"اللہ نہ کرے"۔ اس عورت نے کہا۔ وہ بچاری میری سب سے زیادہ شریف اور نیک کرایہ دار تھی تیس روپے مہینہ کرایہ دیتی تھی۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ یہاں رہتی نہ تھی۔ صرف ذرا کی ذرا کبھی ان کمروں میں آ بیٹھتی تھی"۔

"بڑی بی! کیا وہ یہاں کسی مرد سے ملنے آتی تھی؟"

بالآخر میں نے دریافت کیا لیکن مالک مکان نے مجھے یقین دلایا کہ یہ بات نہ تھی۔ وہ بالکل تنہا آتی تھی۔ اور مرد چھوڑ اس جگہ کسی عورت سے بھی نہیں ملی۔

خدا کے لئے، پھر وہ یہاں کیا کرنے آتی تھی؟ میں چلایا۔

"جناب وہ صرف کمرے میں بیٹھتی تھی۔ کتابیں پڑھتی تھی۔ یا کبھی کبھی چائے پی لیا کرتی تھی" اس عورت نے جواب دیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب میں اس عورت کو کیا کہوں۔ میں نے اسے پانچ روپے دیئے اور چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔ اب تم بتاؤ! میرے دوست! ان تمام باتوں کے کیا معنی ہیں؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ مالک مکان نے مجھ سے سچ بولا؟"

"بے شک مجھے یقین ہے۔"

"تو پھر لیڈی شجاع وہاں کیوں جایا کرتی تھی؟"

"کیونکہ! میرے دوست" میں نے جواب دیا۔ "لیڈی شجاع ان عورتوں میں سے تھی جن کو پُراسرار اور پُر راز بننے کا خبط ہوتا ہے۔ اس نے ان کمروں کو محض اس غرض سے کرایہ پر لیا تھا کہ وہ وہاں برقعہ پہن کر جائے اور اپنے تئیں ایک ہیروئن محسوس کرنے کی لذت حاصل کرے۔ وہ اسرار نیت کا جذبہ رکھتی تھی لیکن بذات خود ایک ایسا ابوالہول تھی جس کا کوئی راز نہ ہو۔"

"کیا واقعی تمہارا یہ خیال ہے؟"

"خیال ہی نہیں مجھے اس پر یقین ہے" میں نے جواب دیا۔

کیوان قدر نے اپنا مراکو کیس نکالا۔ اسے کھولا۔ پھر فوٹو کو دوبارہ غور سے دیکھا "کیسی عجیب بات ہے" آخر میں اس نے صرف اتنا کہا۔

(آسکر وائلڈ)

انقلاب!

وہ آنکھیں اب روتی ہیں جو پہلے مسکرایا کرتی تھیں!!

ان لبوں پر اب مہرِ سکوت لگ گئی ہے جو کبھی مجبورِ تکلم ہو کر لرزتے تھے!!

ان آنسوؤں سے، جو کبھی خاک میں مل جاتے تھے، اب میں اپنے دامنِ حیات کو بھگو لیتا ہوں کہ وہ بہت قیمتی ہیں۔ اس لئے کہ پہلے ذرے تھے اب تارے ہیں۔ اور وہ آنسو تھے یہ موتی ہیں ——— محبت کی ایک تنہا یادگار...!! لیکن

اس عجیب تبدیلی اس انقلاب عجز زا کے لئے مجھے کون الزام دے۔ (دیوانہ مصطفیٰ آبادی)

وقت کی قدر

دعوت (نظم)

از:- اختر شیرانی

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ! چمن کی گود میں آ کر سما بھی جا سلمیٰ!
کلی کلی میں بہاریں بسا بھی جا سلمیٰ! مجھے جنوں کا سبق پھر پڑھا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

"ملینگے حشر میں" مت کہہ یہ بار بار مجھے! ہو کیسے حشر کے وعدے پہ اعتبار مجھے؟
خدا کے دل پہ نہیں کوئی اختیار مجھے! خدا کو مان نہیں حشر اُٹھا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

نشاطِ عمرِ نو امید پر نثار نہ کر! وصالِ صبح قیامت کا انتظار نہ کر!
ریاضِ خلد کی باتوں کا اعتبار نہ کر! فریبِ وعدۂ فردا اٹھا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

کسے خبر ہے قیامت میں ہم ملیں نہ ملیں؟ فضائے روضۂ جنت میں ہم ملیں نہ ملیں؟
کشاکشِ ابدیت میں ہم ملیں نہ ملیں! کشاکشِ ابدیت بھلا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں! نہ ہات آئینگی پھر ماہتاب کی راتیں!
یہ نکہتوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں فضا یہ خواب کی مانند چھا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

خبر لے جلد کہ عمرِ عزیز فانی ہے! سرائے دہر کی ہر چیز آنی جانی ہے!
برنگِ ابرِ رواں فصلِ نوجوانی ہے! چھلکنے والا ہے ساغر پلا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

کسے خبر یہ گھٹائیں رہیں رہیں نہ رہیں! یہ نکہتیں یہ ہوائیں رہیں رہیں نہ رہیں!
یہ مستیاں یہ فضائیں رہیں رہیں نہ رہیں! شرابِ وصل کا ساغر پلا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

ثباتِ عہد زمانے میں کس نے پایا ہے؟ زمانہ رنگ بدلنے کو رنگ لایا ہے!
بہارِ عمرِ رواں بادلوں کا سایہ ہے! بہارِ عمر کی خوشیاں منا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

ترے خیال کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں! خدائی ہو کہ خدا ہو بھلائے بیٹھے ہیں!
سرورِ عہدِ جوانی لٹائے بیٹھے ہیں! تو آ کے قدرِ جوانی سکھا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

یہ فصل اور یہ بہاریں نظر نہ آئینگی پھر! یہ بادلوں کی قطاریں نظر نہ آئینگی پھر!
یہ ننھی ننھی پھواریں نظر نہ آئینگی پھر! شرابِ عیش و مسرت لنڈھا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

بتا تو کیا یہ نظارے اُجڑ نہ جائیں گے؟ یہ ندیاں یہ کنارے اُجڑ نہ جائیں گے؟
یہ چاند اور یہ ستارے اُجڑ نہ جائیں گے؟ ستارہ وار شعاعیں لٹا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے! خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے!
گزار دی ہیں یونہی زندگانیاں ہم نے! دمِ اخیر تو غم سے چھڑا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

فنا نصیب ہیں یہ سبزہ زار کے منظر! یہ کوہسار و لبِ جوئبار کے منظر!
نظر نہ آئیں گے پھر یہ بہار کے منظر! ابھی سماں ہے بہاریں دکھا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

خبر لے جلد کہ بہکی ہوئی بہار ہے آج! نشاطِ خلد سے معمور سبزہ زار ہے آج!
اجل پہ بھی مری مستی کو اختیار ہے آج! غرورِ عشق کی ہمت بڑھا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

تو حکم دے تو ستاروں کو چھین لاؤں میں! فلک سے اُسکے نظاروں کو چھین لاؤں میں!
ارم کی مست بہاروں کو چھین لاؤں میں! خدائی کو یہ تماشا دکھا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

تو سامنے ہو تو کون و مکاں کو گم کردوں! خمِ طرب میں خمِ آسماں کو گم کردوں!
دوئی ہو فرد تو دونوں جہاں کو گم کردوں! بسانِ روح بدن میں سما بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

تاریخی خطوط

امیر تیمور کی دھمکیاں

تیمور کا ایک دلچسپ پیام ایک یہودی حکمران کے نام

ترجمہ از:-
"عکاس زمیندار"

فخر یہود ملک اردشیر لہراسپ کو معلوم ہو کہ معتمد الخواص ملک اسفندیار نے عرضی بھیجی ہے کہ تم نے چالیس ہزار فوج لے کر اُس پر چھاپہ مارا اور اُس کے ملک کو تباہ اور رعایا کو اسیر کر لیا ہے۔ تمہیں پہلے سے معلوم ہے کہ مشارٌ الیہ ابد دولت کے گماشتوں اور متعلقین میں سے ہے۔ پھر تم نے اس خیال محال کو اپنے دماغ میں جگہ دے کر اور ہماری درگاہ سے سرتابی کر کے ہماری بساطِ خلافت کے فرزین کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کیونکر جرأت کی۔ اب تمہیں لازم ہے کہ مشارٌ الیہ کا تمام مال واسباب جو تم نے لوٹا ہے اس کے مالک کو واپس کر دو اور جن افراد کو گرفتار کیا ہے ان کو رہا کر کے ان کے وطن مالوف جانے کی اجازت دیدو۔ ورنہ قسم ہے اُس ذات بے چون وچگونہ کی جو مار و مور کا پیدا کرنے والا ہے۔ کہ میں غیاث الدین علیکیائی کو کلانتر کو حکم دونگا۔ کہ وہ شہر ہرموز وقندھار و کابل و زابل و غور و غرجستان و ہزارجات و صحرجات و طوکات و اور جاقات کے لشکر لے کر تمہارے ملک پر جائے اور تمہیں اور تمہارے لشکر کو وہاں سے نکال باہر کرے اگر تم اس پر بھی باز نہ آؤ تو میں حکم دونگا [illegible] شاہ منصور والی کردستان امرائے توشیش و امرائے تامین و امرائے آذربائیجان اور قراولوں [illegible] اور ترخانیوں کے ساتھ تمہارے ملک میں داخل ہو اور تمہیں اور تمہارے فوجیوں کو قتل و ہلاک کر دے۔ اگر تم اس پر بھی متنبہ نہ ہو تو میں حکم دونگا فرزند ارجمند معز السلطنۃ القاہرہ جلال الدین محمد جوکی بہادر [illegible] کو کہ

چونکہ تیر از کماں نمیں آورد سر دشمناں بر زمیں آورد

کہ وہ ملک خراسان و مازندران و رستمدار و شیروان دشتانی دربند و قپچاق و ترکستان کے لشکر لے کر تمہارے ملک پر حملہ کرے اور تمہیں اور تمہارے ملک کو خاک و خون میں ملا دے۔ اگر تم اس پر بھی متنبہ نہ ہو تو میں حکم دونگا فرزند ارجمند نور دیدۂ معز السلطنۃ والدین ابوالقاسم

ابراہیم سلطان کو کہ وہ ملک عرب و عجم و عراق و آذربائیجان و فارس و بوستان و احمد آباد و گجرات و روم و شام و مصر کے عظیم لشکروں کو ساتھ لے کر تمہارے ملک میں جائے اور تمہیں اور تمہاری فوجوں کو خاک تیرہ کے برابر کردے۔ اگر تم اس پر بھی باز نہ آؤ تو ہمارا حکم قضا جریان نافذ الامر واجب الاتباع صادر ہوگا کہ شاہ سلطنت، قہرمان الماء والطین، ایلخان روئے زمین معز السلطنۃ والدنیا والدین الغ بیگ گورکان بہادر ملک سمرقند و بخارا و اوزبکیہ و آب مویہ و شہر خلخال و شہر سبز و حصار شادمان و شاہرخیہ و چین و ماچین و شہر ختور و ختا کے عظیم الشان لشکروں کے ساتھ تمہارے ملک میں جائے اور تمہیں انتہائی سختی و صعوبت سے، بدنصیبی کی زنجیروں میں جکڑ کر پایہ تخت دار السلطنت ہرات میں، [جو ہمارے آباو اجداد کرام کا مستقر ہے] لیجائے اور باغ زاغان میں اس طرح کی سزا دے کہ دوسروں کی عبرت و نفرت کا سبب ہو۔

الغرض تم کو لازم ہے کہ کسی حالت میں بھی، نقد و جنس میں سے ایک دینار اور ایک من بار کا بھی، لالچ نہ کرو اور تمام مال و اسباب اور قیدیوں کو اُن کے مالک کے پاس پہنچادو اور ایک محضر تیار کرکے اس پر وہاں کے ارباب و اہالی کے دستخط کرا کے ایک عرضداشت کے ساتھ ہماری خدمت میں ارسال کرو۔ والسّلام

باہیں (نظم)

از:- میاں تصدق حسین خالد ایم۔اے۔ بیرسٹرایٹ لا

سحر کی عنبریں اُجلی فضا ہے
مرے پہلو میں کوئی سو رہا ہے
طلسمِ معنیٔ حسن لطافت
شبابِ نازکی رنگیں حکایت
وہ اُس کی ٹھنڈی ٹھنڈی گوری باہیں
نہ پوچھو مجھ سے ان کیفیتوں کو
چنبیلی کی نشیلی پتّیوں پر
کبھی دیکھی ہیں بوندیں شبنموں کی

(لندن۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۳۴ء)

موت کا وقت

(ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

(از: حضرت علامہ حافظ محمود خان صاحب شیرانی لیکچرر پنجاب یونیورسٹی)

درختوں نے معین وقت پر کی برگ افشانی — اُڑا بادِ خزاں سے رنگ گلہائے گلستانی
نمودِ صبح نے انجم کو دی تعلیم بطلانی — مگر اے موت ہر موسم میں ہے تیری فراوانی!

سحر دروازہ ہے انساں کے اسبابِ معیشت کا — ہوئی ہے شام اک عشرتکدہ بزمِ مسرت کا
بنا دامانِ شب گہوارہ اُسکے خوابِ راحت کا — تسلط ہے مگر ان سب پہ تیری دستِ قدرت کا

ہمیں ہے علم اوقاتِ زوالِ ماہ تاباں سے — پرندے گرمیوں میں آئیں جس دم بحرِ عماں سے
لباسِ زرد کھیتوں کو ملے فصلِ زمستاں سے — نہیں ہم باخبر لیکن تری آمد کے طوفاں سے

ترا وہ وقت ہے کیا فصلِ گل کا جب کوئی جھونکا — کرے سرگوشیاں آ کر بنفشہ سے جہاں پھولا
نہیں یہ بھی تو پھر وہ زرد ہو پھولونکا جب تختہ — معین ہے فنا انکی ہمیں بھی ہے فنا ہونا

وہی نا جبکہ طغیانی پر آئے موجِ دریائی — تموج میں ہوا کو لائے جب آواز نغمے کی
نہیں خالی رہے تجھ سے ہمارے عیش خانے بھی — رکھا دنیا میں جب ہمنے قدم تب بھی وہاں تو تھی

ملا ہے آشنا سے آشنا جس دم وہاں تو ہے — ہوا یا جب کوئی دشمن مقابل اپنے دشمن کے
فضائے باد گونج اُٹھی ہے جب آوازِ قرنا سے — ملا دی خاک میں شاہانہ کلغی تیغِ قاتل نے!

(لندن ۱۹۰۶ء)

ادبیات اور زندگی

از:- سیّد امتیاز علی صاحب تاج بی اے -

کسی قوم کی صحت و توانائی جسقدر یقینی طور پر اُس کے ادبیات سے ظاہر ہوسکتی ہے اسقدر کسی اور چیز سے ظاہر نہیں ہوسکتی! ایسا کوئی اور آئینہ نہیں ہے جسمیں کسی عہد کی سیرتیں اور خواہشیں ایسی درستی سے منعکس ہوتی ہوں - سوچنا چاہئے کہ قوم کے گیت کیا ہیں؟ وہ اُس کی روح کے لطیف اجزا ہیں جو اس کے مشتعل ہونے سے اُٹھے اور راگوں کی شکل میں منجمد ہوکر جواہر ریزے بن گئے - وہ قوم کے آتشکدے کے مقدس شعلے ہیں کامیابی کا تاج یا شجر قوم کی روح سیال کے پھول ہیں جو زمین پر بوئے اور آسمانی شبنم میں بھگوئے گئے ہیں -

ادبیات اور روزمرہ کی زندگی میں تضاد پیدا کرنا یعنی شعر کو عمل سے جدا کرنا ویسا ہی ناممکن ہے - جس طرح تقریر اور تخیل میں تفریق کرنا کیونکہ ادبیات کیا ہیں یہی کوائف زندگی اور کوائف بھی اس حالت کے جب زندگی اپنی حقیقی صورت میں متکیف ہو اور کشمکش کی بے انتہا شدت ہو - شاعر جو خلاق اور نمیۃ الرحمٰن کہلاتا ہے - معاملات زندگی میں سب سے اعلیٰ انسان ہوتا ہے - اور جب وہ قوم کے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے تو وہ اُس کے قوائے عقلیہ کو جمع کرکے اُن سے کام لیتا ہے - اور قوائے عقلیہ کا اجتماع ایک ایسا ضروری امر ہے کہ اگر کوئی عامل اس کے بغیر کام کرے تو وہ بے سود ہوگا - بلکہ وجود ہی میں نہ آسکے گا - ادب کے جس حصے میں قوم کی مستعدی اور اُس کی اُمنگیں ظاہر نہیں کی جاتیں وہ محدود، تنگ، تاریک اور نادرست رہتا ہے -

زندگی کی جن اُمنگوں اور افعال کو صنعت کا مہر درخشاں اپنے نور سے پاک نہ کرے اور وہ فکر شاعر کے کنار عاطفت میں آرام نہ پائے - وہ روح قوم کے لئے تاریک تہ خانے ہونگے - جہاں موذی حشرات الارض بستے اور طماع حریص اپنے دفائر سیم و زر سینت سینت کر رکھتے ہیں - جس شاعری کی جڑ سویدائے قلب میں ہے اس نے ہمارے لئے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں - اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم شاد و شیریں کام رہیں - اور ہمارے قلوب صحیح و با اطمینان تو شعر اور بھی زیادہ ہمارے ورد زبان ہونا چاہئے - لیکن شعر وہ ہو جو دل سے نکلے اور دل ہی میں گھر کرے -

(ایتھینیم)

غزل

حُسنِ بیان

اثر:- پروفیسر شیخ عبد اللطیف تپشؔ ایم اے ایم او ایل ایمرسن گورنمنٹ کالج ملتان

جنازے کو مرے ٹھکرا کے آخر آپ کیا لیں گے
یہی نا چلتے چلتے اور اک فتنہ اُٹھا لیں گے

لحد پر دل جلوں کی شمع کا گل بھی نہ خنداں ہو
ہوائے تند کے جھونکے گل بازی بنا لیں گے

یہ پیش و پس ہے کیا جب بندگی بیچارگی ٹھہری
سرِ تسلیم تیغِ ناز کے آگے جھکا لیں گے

کریں گے سجدہ ہر پتھر کو بت خانے کے رستے میں
کھرا کھوٹا نصیبا چلتے چلتے آزما لیں گے

غریبوں کا یونہی ماتم رہے گا خاکساروں میں
کہ نقشِ پا قدم اُٹھتے ہی سر پر خاک ڈالیں گے

غبارِ ناتواں ہیں کارواں نظروں سے غائب ہے
سہارا موجۂ ریگِ رواں دیگا تو جا لیں گے

جو کندھا دیدیا آ کر تپشؔ اُس دشمنِ جاں نے
تو بار اپنے جنازے کا ہمیں سر پر اٹھا لیں گے

اقوال و افکار

موت

از :-
عاشق بٹالوی - بی اے - ایل - ایل - بی

(۱) دنیا میں صرف ایک ہی چیز یقینی ہے - موت -

(۲) ایک فقیر سے کسی نے پوچھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے - اُس نے جواب دیا " مرنا سچ اور جینا جھوٹ "!

(۳) ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ موت کی خواہش کرتا ہے - بعض من چلے تو اُس گھڑی جان پر کھیل جاتے ہیں اور بعض نا معلوم عواقب کے خوف سے زندہ در گور زندگی بسر کرنے پر ہی قناعت کرتے ہیں -

(۴) خودکشی پر دو مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے :-

ا - یہ سراسر بزدلی ہے کہ تکالیف سے گھبرا کر موت کی پناہ ڈھونڈی جائے - ہمت و مردانگی کا تقاضا ہے کہ مصائب و حوادث کا مقابلہ کر کے مخالف قوتوں کو زیر کیا جائے -

ب - اس سے بڑھ کر اور کیا دلیری ہو سکتی ہے کہ انسان اپنی جانِ شیریں کا خاتمہ خود اپنے ہاتھ سے کر دے - بے وقار زندگی سے مرجانا بہتر ہے -

(۵) موت مرنے والے کے لئے پیغام راحت ہے - اور پسماندگان کے واسطے نزول بلا - ہم اس لئے نہیں روتے کہ مرنے والا جان سے گذر گیا - ہم تو اُن نقصانات پر روتے ہیں جو اس کی موت سے ہمیں برداشت کرنے پڑیں گے - آہ خود غرض و ظاہر دار انسان !!!

(۶) اگر ہماری زندگی دنیا ہی میں ختم ہو جاتی اور مصائب کا کلی خاتمہ موت کے ہاتھوں ہو سکتا تو نوّے فی صدی لوگ موت کی ہم آغوشی پر آمادہ ہو جاتے مگر پہلی بات یقینی نہیں -

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(۷) فلسفیوں میں بھی اختلاف ہے - بعض کہتے ہیں کہ یہ جہانِ آب و گل سراسر دھوکا اور فریب ہے اس کے دام میں آجانا جہالت ہے - دوسرا گروہ کہتا ہے یہی سب کچھ ہے - لہٰذا لذّیات سے خوب جی بھر کر متمتع ہو لو - کیسی حماقت ہے کہ موہوم چیز کی امید پر جس کا سرے سے وجود ہی نہیں، ہم دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش

ہو جائیں۔ اُس شخص سے زیادہ بیوقوف کون ہوگا جو دریا سے پیاسا واپس آجائے۔

بعض نے میانہ روی اختیار کی۔ وہ کہتے ہیں نہ یہ دھوکا ہے نہ وہ جھوٹ۔ یہ چندروزہ زندگی تیاری ہے اُس حیات جاوداں کے لئے جہاں نہ موت ہے نہ اختتام۔ زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک سمندر ہے جس کا کنارہ نہ ہو۔ ایک تسلسل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ تکمیل حیات کے لئے موت کے دروازہ سے گذرنا ضروری ہے ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یا

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

(۸) انسان دنیا میں آتا ہے تو سینکڑوں کو ہنساتا ہے۔ یہاں سے جاتا ہے تو سینکڑوں کو رلاتا ہے۔

(۹) ہم دنیا میں آتے ہوئے بھی روتے ہیں اور دنیا سے جاتے ہوئے بھی۔

(۱۰) جس چیز سے مفر نہ ہو اس سے ڈرنا حماقت ہے۔ موت سب کے لئے یقینی ہے۔

(۱۱) موت کے سامنے شاہ و گدا برابر ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جس کی آخری گھڑیاں اطمینان سے گذریں۔

(۱۲) تم قبر کے عذاب سے ڈرتے ہو اور وہ جنہیں زندگی میں عذاب قبر سے واسطہ پڑ گیا۔ کہاں جائیں۔

(۱۳) موت کا ایک وقت مقرر ہے لیکن کون جانتا ہے کب آجائے۔

(۱۴) ہر شے کی ابتدا و انتہا ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَان

(۱۵) لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

غزل

از:- اختر شیرانی

سما کر دل میں نظروں سے نہاں ہے　　مجھے یاد آنیوالے تو کہاں ہے
خدائی کہکشاں کہتی ہے جسکو　　وہ عذرا کا خرامِ رائگاں ہے
اندھیرے بادلوں سے پوچھ زاہد!　　مری کھوئی ہوئی توبہ کہاں ہے
یہ کس نے پیار کی نظروں سے دیکھا　　کہ میرے دل کی دنیا پھر جواں ہے
جوانی رائگاں جائے تو اچھا　　جوانی ایک خوابِ رائگاں ہے

غالبیات

غالب کا ایک گمنام مخاطب

از:- اختر شیرانی

یہ بیان کرتے ہوئے کہ غالب نے کبھی ہجو نہیں لکھی مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں:-

"باوجودیکہ مرزا کی تمام عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری اور اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مدح وستائش کا صلہ اُن کو کچھ نہیں ملا۔ اور جو محنت و کاوش ان کو قصیدوں کی ترتیب میں کرنی پڑی وہ سب رائگاں گئی۔ مگر انہوں نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ کبھی نہیں لکھا۔ صرف ایک قطعہ جو مرزا کے مطبوعہ کلیات میں درج نہیں ہے۔ ہم کو ان کے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے۔ جو میرے دوست اور مرزا صاحب کے عزیز شاگرد لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی نے اس کتاب کے لکھتے وقت میرے پاس بھیجے ہیں۔ اس قطعے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا ہے۔ اور اس کا جواب مدت دراز تک مرزا کو نہیں ملا۔ تب مرزا نے بطور تقاضے کے یہ قطعہ بھیجا ہے جسکو مشکل سے ہجو ملیح کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس قطعے کا مضمون لطف سے خالی نہیں ہے۔ ہم اول اسکا خلاصہ اردو زبان میں لکھتے ہیں۔ اس کے بعد قطعہ بجنسہٖ نقل کیا جائیگا۔

قطعے کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے عقل سے پوچھا کہ میں نے ایسا اور ایسا قصیدہ نواب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اور اس کے ساتھ عرضداشت بھی گزرانی تھی۔ پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟ کیا نواب مجھ سے آزردہ ہو گیا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی۔ خدا جانے میں نے کیا لکھ دیا ہو گا۔ جس پر نواب کو آزردگی ہوئی عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے؟ نواب جس ساز و سامان کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہو سکتا۔ اُس نے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس کان سے سونا۔ دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی۔ نیشاپور سے فیروزہ بدخشاں سے یاقوت۔ بغداد سے سانڈنی، اصفہان

سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت یہ سب چیزیں فراہم کر کے لائیں تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جبکہ یہ ساری ڈھیل اس وجہ سے ہے۔ تو اس کو نواب کی آزردگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہئے۔ جب عقل نے مجھ کو دم دیا تو میری تمام یاس و ناامیدی امید کے ساتھ بدل گئی میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لئے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اُس کے لئے آئینہ اور تاج سکندر سے، انگشتری اور تخت سلیمان سے، جام جمشید عالمِ غیب سے، آب حیواں چشمۂ خضر سے، عمر ابد، نشاط جاوید دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ اپنے ممدوح سے کیوں نہ مانگوں۔

قطعہ

گفتم بخرد بخلوت انس — کاے شمع و چراغ ہفت ایواں

آیا ز چہ رو بود کہ نواب — ننوشت جواب نامہ ام ہاں!

آں گونہ عریضۂ کہ دانی — درویش نوشتہ سوئے سلطاں

آں گونہ قصیدۂ کہ گوئی — از صفحہ دمیدہ سنبلستاں

ایں ہر دو رسید و نیست پیدا — زاں سو اثرے بہیچ عنواں

رنجیدہ مگر ز مدح نواب — اے کاش نگفتمے ثنا خواں

ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم — از گفتۂ خویشتن پشیماں

عقلم بجواب گفت "غالب! — زنہار مخور فریب شیطاں

نواب بفکر ارمغان است — تا نامہ فرستدت بساماں

وانہا کہ بخاطرش گزشتہ است — زود آں ہمہ جمع کرد نتواں

زود است کہ جمع نیز گردد — دیر است کہ دادہ است فرماں

تا راہ رواں بجرہ و بر گرد — آرند بکوششِ فراواں

دیبا ز دمشق و مخمل از روم — الماس ز معدن و زر از کاں

فیل از دکن و زمرد از کوہ — توسن ز عراق و دُر ز عماں

فیروزہ نغز از نشاپور — یاقوت گزیدہ از بدخشاں

جمازۂ تیز رو ز بغداد — شمشیر برندہ از صفاہاں

پشمینۂ قیمتی ز کشمیر — زربفت گراں بہا ز ایراں
بالجملہ درنگ چوں ازیں دوست — بر رنج و ملال نیست برہاں
چوں پیر خرد بدلفریبی — گفت ایں ہمہ رازہائے پنہاں
گشتم بدم امیدواری — مرہم نہ زخم یاس وحرماں
گفتم کہ چو بامن ایں کرم کرد — آں قبلہ و قبلہ گاہ اعیاں
ناچار زراہ حق گزاری — تا کردہ شود تلافئ آں
من نیز طلب کنم برائش — ایں خواہش اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر — انگشتر و تخت از سلیماں
از عالم غیب جام جمشید — از چشمۂ خضر آب حیواں
عمر ابد و نشاط جاوید — نیروے دل و ثبات ایماں
توفیق جواب نامۂ خویش — توقیع عطا و بذل واحساں"

(یادگار غالب صفحہ ۸۴)

مولانا حالی کے مندرجہ بالا بیان پر سطور ذیل کا اضافہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:-

(۱) اس قطعے کے "گمنام" مخاطب وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خاں بہادر نصرت جنگ والی ریاست ٹونک (راجپوتانہ) ہیں۔

(۲) مرزا نے جو فارسی قصیدہ اس قطعے سے پہلے نواب مذکور کو بھیجا ہے اس کی تلاش میں کلیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم دو قصیدوں سے دوچار ہوتے ہیں

اوّل وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را
وے بر شرف ذات تو اجماع امم را

اس قصیدے میں ممدوح کا نام نہیں ملتا۔ لیکن دو تین شعر ایسے ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ یہ نواب وزیر الدولہ ہی کی مدح میں لکھا گیا ہے ؎

معذورم اگر نام تو در بحر نگنجد — در کوزہ چساں جائے دہم دجلہ و یم را

تا چرخ کشد محمل برجیس بقا باد — نواب فلک محمل برجیس شیم را

حقا کہ زاسم تو عیانست کہ در شرع — فرزانہ وزیری شہ بطحا و حرم را

دوسرا قصیدہ وہ ہے جس کا مطلع ہے

عید اضحیٰ بسر آغاز زمستاں آمد — وقت آراستن حجرہ و ایواں آمد

ذیل کے شعر میں ممدوح کا نام ملتا ہے ؎

صورت معنئ اسلام وزیر الدولہ
کہ دلش آئینۂ صورت ایماں آمد

وثوق سے یہ کہنا دشوار ہے کہ ان دو قصیدوں میں سے

کونسا قصیدہ ہے، جو قطعہ کا پیشرو ہے۔ لیکن دونوں کا سرسری مطالعہ کرنے سے ایسے آثار ضرور نظر آتے ہیں کہ اوّل الذکر کو قطعہ کا "محرک" قصیدہ تسلیم کیا جا سکے چنانچہ ذیل کا شعر؎

دربزم تو گویند سخن میرود از من
از بلبل شیدا که خبر کردارم را

بتاتا ہے کہ مرزا کو یہ سن کر کہ نواب سے کسی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ پہلی مرتبہ قصیدہ لکھنے اور بھیجنے کا موقع ملا ہے۔ اس قصیدے کی اوّلیت کی تائید دوسرے قصیدے کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے؎

غالب از دیر ہم از دور نوا سنج دعاست
بلبل باغ ولائے تو خوش الحان آمد

"دیر" کا لفظ مداحی کی رسم کو کہنہ ثابت کر رہا ہے۔

(۳) یہ معلوم کرنے کے بعد کہ قطعہ میں جس "قصیدہ کا تذکرہ آیا ہے وہ اوّل الذکر قصیدہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس قطعہ کے سن ترقیم کی جستجو ہوئی ہے۔ یہ سن ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء ہے۔ جیسا کہ تاریخ ٹونک کے ۱۲۷۸ھ کے ماتحت بیان سے معلوم ہوتا ہے:۔

"اسی سال میں نجم الدولہ دبیر الملک حضرت مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے ایک قصیدہ بزبان فارسی حضرت نواب وزیر الدولہ بہادر بالقابہ کی مدحت میں ترقیم فرما کر بذریعہ عرضداشت بھیجا۔ پیشگاہ حضور والا سے جو اس کے جواب اور صلے میں کچھ تامل ہوا تو مرزائے موصوف نے پھر ایک قطعہ بطور عرضداشت بخدمت حضرت نواب وزیر الدولہ بہادر روانہ کیا"، صفحہ ۵۳۔

(۴) مندرجہ بالا بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ اور قطعہ کی ترسیل دونوں ایک ہی سال (۱۸۶۱ء) کے واقعے ہیں۔ اور اگر ایک ہی سال کے دو واقعوں کی درمیانی مدت کو "مدت دراز" کہنا صحیح نہیں ہے۔ تو مولانا حالی مرحوم "مدت دراز" کے الفاظ استعمال کرنے میں لاعلمی سے دوچار ہوئے ہیں۔

(۵) قطعہ پہنچنے پر نواب وزیر الدولہ کی جانب سے مرزا کو صلہ بھیجدیا گیا تھا جیسا کہ تاریخ ٹونک کا مولف کہتا ہے:۔

سرکار والا سے صلۂ قصیدہ حسب دلخواہ مرزائے موصوف عطا ہوا۔

لیکن یہ صلہ مرزا کے "حسب دلخواہ" تھا یا نہیں۔ اس کے اندازہ کا بار مولف تاریخ ٹونک کے سر ہے۔

(۶) مولانا حالی نے قطعہ کے لب ولہجے کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے "بمشکل ہجو ملیح کہا جا سکتا ہے"۔ ہمارے نزدیک قطعہ مذکور کو "ہجو ملیح" کے بجائے اگر "حسن طلب" یا "حسن یاددہانی" کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔

(۷) ناظرین شاید یہ بیان سنکر کسقدر حیران ہوں گے کہ قطعہ میں حسن طلب کا جو کامیاب اور دلکش انداز نظر آتا ۴

۴ ہے اس کی مثال اردو فارسی قصائد کے دفتر بے پایاں میں مشکل ہی سے ملیگی۔

"صدائے شکست"

(غزل)

از:- حکیم عبدالکریم صاحب ثمر

ثمر صاحب پنجابی زبان کے مشہور اور ہر دلعزیز شاعر ہیں۔ انکی پنجابی نظمیں ان کے دلنشیں ترنم کے ساتھ ملکر محافل شعر و ادب میں "دو آتشہ" قیامت برپا کر دیتی ہیں۔ ہمارے اصرار پر آپنے اردو شاعری کی طرف توجہ کی ہے۔ اور ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

کی حقیقت کو باطل کر کے آپ واقعی "مسلمان" ہو گئے ہیں۔ ہم اردو کی طرف سے انکا نہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں (ادارہ)

ترے حضور میں دل کو سکوں نصیب نہیں — حریفِ ذوقِ تماشا کوئی غریب نہیں

نشانِ جادۂ ہجر و وصال دھوکا ہے — مقامِ عشق بہت دور ہے قریب نہیں

مینار و مسجد و محراب و منبر و دیوار — وہی ہیں، پر وہ مؤذن نہیں خطیب نہیں

تری بہار سے بیخود ہیں سرو و لالہ و گل — یہ وہ مقام ہے جسمیں کوئی رقیب نہیں

عجیب چیز ہیں دیر و حرم جہاں میں ثمر
نگار خانۂ دل سے مگر عجیب نہیں

مکتوبات

مکتوبات نیاز

از

حضرت مولانا نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ

لکھنؤ۔ ۱۱-۸-۲۸۔ ایک زمانے کے بعد آپنے "اثبات وجود" کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ شباب کی دشمنی اتنی خطرناک نہیں جتنی اُس کی دوستی ایذا بخش ہے۔ مرسلہ نظم ستمبر کے "نگار" میں درج ہوگی۔۔۔ نیاز

۲۱/۲۔ اب آپ کی نظمیں دیکھ کر مجھے معلوم ہُوا کہ اردو شاعری کا مخاطب مرد کیوں ہوگیا؟ یہ سرزمین گجرات کو آپ آخر کیوں نجد کا ہمسر بنائے دیتے ہیں؟ "اے عشق کہیں لے چل" بھیجدیجئے۔ نیاز

لکھنؤ۔ ۱۳/۲۔ جی ہاں تو اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ آپ میرے خریدار نہیں ہیں۔ آپ اگر یہ سمجھ رہے ہیں تو ——— (اس خلا کو خود پُر کر لیجئے) فروری میں ڈائری کا ورق نہیں دیکھا؟ جاوید کے سلسلے میں بعض فقرے نہیں پڑھے؟ چنگاری نہیں دیکھی؟ آپ کیا مقصود یہ ہے کہ بالکل برہنہ ہو کر ناچنے لگوں۔ میں باز آیا ایسی جوانی سے۔ نظم خوب ہے۔ ترانہ رقص اچھا عنوان ہے۔ لاہور میں کیا کوئی ترکی جاننے والا نہیں؟ "بوسہ بہ پیام" کی ایک کمی۔ آج آپکا خط دکھا کر اجازت لیلوں تو۔۔۔۔ بھیجوں۔ آپسے بدگمانی کیسی پیدا تو ہو۔ ن

اللہ رے غرور۔۔۔۔۔! یہاں تو سکوت صرف اس خوف سے ہے کہ ؎

شایان دست و بازوے قاتل نہیں رہا

اور وہاں یہ عالم کہ نوازش کا جو بہانہ ہاتھ آگیا ہے تو اس میں بھی سو تکلف! ؎

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہوجانا

آخر میں بھی سنوں، اس برہمی کا سبب کیا ہے۔۔۔ اگر مجھے اس کا علم ہوتا۔ تو شاید میں اس سے بہت قبل منانے کی کوشش کرتا۔ بہرحال شکوہ شکایت برطرف، اب من جائیے اور اس کے جواب میں لکھئے کہ ہاں من گئے۔

نیاز

لکھنؤ۔ ۲/۶۔ نیاز نوازا۔ بیگم کی علالت جاری ہے اور میری اُلجھنیں بدستور قایم۔ حقیقت یہ ہے کہ بیوی فردوس بھی ہے اور جہنم بھی۔ "شاعر کا انجام" ختم ہوگیا۔ دوبارہ چھپ رہا ہے۔ شروع جولائی تک تیار ہو جائے گا۔ ان پریشانیوں میں "بہارستان" کے لئے کیا لکھوں بُری چیز بھیجنے کو جی نہیں چاہتا۔

نیاز

"لارڈ بائرن آف راجستان"
کے پردے میں ایک ایسی
شعر و شباب پیشہ، اور
رنگ و بو طراز ہستی پنہاں ہے
کہ اگر آج دنیا کو اس کی ادبی
رنگینیوں اور شاعرانہ شوخیوں
کا علم ہو جائے تو شاید ادب و
شعر کی فضاؤں میں ہلاکتوں
اور جراحتوں کے سوا کوئی چیز
باقی نہ رہے۔

گزری ہوئی راتیں

(نظم)

از:۔

لارڈ بائرن آف راجستان

دربار ہائی سکول (ٹونک راجپوتانہ) کا وہ کھلاڑی اکثر دیرینہ دوستوں کو یاد ہوگا۔ جو فٹ بال میں ہمیشہ "فل بیک" کھیلا کرتا تھا اور جس کے کھیل کے لئے جس طرح مدرسے کی فضا موزوں تھی۔ اسی طرح دریائے بناس کی چاندنی راتیں بھی ہنگامہ افروز نظر آتی تھیں۔

انقلاب زمانہ کی یہ عجیب سی مثال ہے۔ کہ فٹ بال اور کرکٹ کا یہ نامور کھلاڑی آج نبرد گاہ محبت کا مرد میدان بن کر نمودار ہوتا ہے ؎ ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ ہمارے عشوہ طراز دوست نے جو فی الحال اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ عمر بھر میں پہلی مرتبہ شعر کے علمی میدان میں قدم رکھا ہے اور ذیل کی حسین و جمیل نظم پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کی کوشش کامیاب نہیں۔ ہم اس حیرت انگیز کامیابی پر انکو مبارکباد دیتے ہیں۔ توقع ہے کہ "رومان" آئندہ بھی اُن کی "رومانی" زندگی کے مظاہر سے آشنا ہوتا رہیگا۔

؎ "بازگو از نجد و از یاران نجد" (ادارہ)

نہ بھولے گا ترا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا!

رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

رُخِ روشن کے جلوؤں سے سحر کا نور بن بن کر
اندھیری رات کے پردوں کو سرکاتے ہوئے آنا
روپہلی چاندنی میں اپنی آہستہ خرامی سے
بہار و خواب کے سائے سے برساتے ہوئے آنا
محبت کے فرشتے کی طرح خاموش راتوں میں
فضا کو نکہتِ گیسو سے مہکاتے ہوئے آنا
ترے پازیب کی جھنکار کا آہستہ آہستہ
وہ دھیمی دھیمی لَے میں گیت برساتے ہوئے آنا
ترے ابریشمی ملبوس کا صرصر کے جھونکوں سے
سحابِ رنگ و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا
بدن اپنا چرا لینا، کبھی نظریں جھکا لینا
ہم آغوشی کے اندیشے سے گھبراتے ہوئے آنا
شبِ تاریک کے خاموش نظاروں کی بستی کو
شراب نور کی موجوں سے نہلاتے ہوئے آنا
نگاہوں میں حیا، آنکھوں میں مستی، چال میں لغزش
مصوّر کے قلم کا خواب برساتے ہوئے آنا
ہواؤں کا مہک اُٹھنا فضاؤں کا بہک اُٹھنا
وہ مہکاتے ہوئے آنا، وہ بہکاتے ہوئے آنا
محل کے پاسباں خوابیدہ، شمعیں خواب در دیدہ
اور اے ملکہ ترے سائے کا شرماتے ہوئے آنا

طیورِ آوارہ

ریزۂ مینا

مترجمہ :-

جناب شاہد احمد صاحب دہلوی بی اے اڈیٹر "ساقی"

پیغام

یہاں آ ! اے ننھی بچّی !

تو جسے تیری ماں اکثر کھیلتا دیکھتی ہے۔

چہرے پر زردی اور بال ایسے جیسے کوئی خواب

بیداری میں دیکھے ———

چمکدار جیسے ستاروں کی روشنی نے ان میں نور

بھر دیا ہو۔

آ ننھی بچّی ۔ گلابی لبوں والی ۔

بڑی بڑی نیلی آنکھوں والی

اور لمبے لمبے سنہری بالوں والی ۔

میں ان پر بے شمار بوسے ثبت کرونگا ۔

یہ ایک شیریں تحفہ ہے جسے تو اس تک پہنچادے ۔

تاکہ جب شام کا دھندلکا پھیلے اور تو اس کے قریب ہو

اس طرح کہ وہ تجھے اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہو

اور تیرے لبوں اور بالوں کو چوم رہی ہو،

اس وقت وہ ضرور محسوس کریگی اس محبّت بھرے پیغام کو

جو ایک ایسے شخص نے بھیجا ہے جو اس سے محبّت کرتا ہے

اور اس سے محبّت کئے جانیکی آرزو رکھتا ہے ۔

اور جس وقت وہ تیرے سنہری گھونگر والے بالوں پر

ہاتھ پھیر کر تیری پیشانی کو بوسہ دیگی تو

اُسے تعجب ہوگا کہ اس عجیب نئے احساس کا سبب کیا ہے

کہ سنہرے بالوں کو لبوں کو چھونے کی وجہ سے

اُس کے جسم میں لرزش پیدا ہوجاتی ہے ۔ (موپاساں)

———

لڑکیوں سے

جب تک ہوسکے گلاب کی کلیاں جمع کرو ۔

بوڑھا وقت تیزی سے اُڑ رہا ہے ۔

اور یہی پھول جو آج مسکرا رہا ہے

کل دم توڑ رہا ہوگا ۔

آسمان کا شاندار چراغ سورج

جیسے جیسے بلند ہوتا جائیگا

اُس کی زندگی کی دوڑ جلدی ختم ہوتی جائیگی ۔

اور وہ غروب سے قریب تر ہوتا جائے گا ۔

ابتدائی عمر سب سے اچھی ہوتی ہے،

جب جوانی اور خون میں گرمی ہوتی ہے ۔

مگر اس کے ختم ہوجانے پر

بد سے بدتر اوقات رونما ہوتے ہیں ۔

اس لئے شرماؤ نہیں بلکہ اپنا وقت اچھی طرح صرف کرو ۔

اور جب تک تمہارے لئے مواقع ہیں اپنی شادی رچاؤ ۔

کیونکہ ایک دفعہ اپنی جوانی کھو دینے کے بعد

تمہیں ہمیشہ ہمیشہ انتظار ہی کرنا پڑیگا ۔ (ہیرک)

اشعار منثور

از:-
جناب عظیم قریشی بی۔ اے

(۱)

شاعر اور جوپیٹر!!

ایک شاعر نے دیوتا جوپیٹر سے دعا مانگی :-
"اے روحوں کے تاجدار! مجھے صرف عبادت کی
ضرورت ہے عورت کی نہیں!"
جوپیٹر نے شاعر کی دعا قبول کر لی . . . . اور
کہتے ہیں وہ شاعر کبھی جوان ہی نہیں ہُوا!!

(۲)

عبادت!!

حسن و نکہت کا ایک دلآویز مجسمہ!
کیفیات پرستش سے لبریز،
خدائی نہیں، انسانی پاکیزگی کا مظہر
کاش یہ ایک بھٹکی ہوئی روح کی ہمیشہ
کے لئے عبادت گاہ بن جائے!!

(۳)

گناہ!!

میں نے تمہارے حسن کا نغمہ سُنا
میرے نوجوان دل کا یہ اوّلین گناہ تھا۔
مگر آہ کتنا رنگین گناہ!!
شروع محبت کے امتحانی لمحوں میں
کیا تنہا صرف عشق ہی اس قسم کے گناہ کرتا ہے
حسن نہیں؟!!!

(۴)

شرط!!

جوانی نے زندگی سے الگ رہنے کی آرزو
ظاہر کی۔ زندگی نے جوانی کی آرزو پوری کر دی مگر
اس شرط پر کہ وہ حسن سے ہمیشہ دُور رہے!!
جوانی نے شرط مان لی
مگر حسن کی شرکت سے نہ بچ سکی!!
اب زندگی جوانی سے ہمیشہ کے لئے خفا ہے!!!

(۵)

اہرمن

اہرمن خدا سے منکر ہو کر جب لوٹا
تو جنت کے دروازے پر اُسے ایک عورت نظر
آئی۔ اُس کی خوبصورتی کا اعتراف کرتے ہوئے بولا
یہ تو خدا سے بھی زیادہ حسین ہے!!
لیکن میں اس کے آگے بھی سجدۂ نیاز نہ کرونگا۔
کیونکہ یہ آدم کی محبوبہ ہے۔ اور میں بنی نوع انسان کا
دُشمن!!

(طبعزاد)

فکاھی

ایک کلچڑی سے خطاب

از جناب سید حسن جعفری صاحب ایم۔ اے۔ ایم او ایل۔ ایچ اے
ایچ۔ بی۔ ایل ایل بی۔ پلیڈر۔ لاہور

تعارف

ایک صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ ماضی قریب میں آپ پر ایک نہایت موذی دماغی مرض کا ایک شدید حملہ ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب نظم کرنے بیٹھتے ہیں۔ تو قلم سے نثر نکل جاتی ہے۔ اور جب نثر کا ارادہ کرتے ہیں تو شعر صادر ہو جاتا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۳۵ء کی صبح کا ذکر ہے کہ جب آپ سے فرمائش کی گئی کہ رسالہ "رومان" کے لئے ایک مضمون لکھ دو تو آپ نے غسل فرمایا اور قلم دوات اور کاغذ لے کر بیٹھے لیکن جب آنکھیں بند کر کے نیت کی کہ "فلاں رسالہ کے لئے ایک عدد مضمون فی سبیل الشہرت بلا معاوضہ رقمے تحریر کرتا ہوں واجب قربتہً الی اللہ" تو آپ نے دفعتہً ایک پھریری لی اور یکایک یہ محسوس کیا کہ آپ سے خودبخود شعر صادر ہو رہے ہیں۔ اور نثر کا مضمون دماغ سے بالکل محو ہو گیا ہے۔

جب سے مستورات ہند نے مکشوفات ہونا شروع کیا ہے ہمارے ممدوح الصدر دوست نے تضاد صنفی اور تقابل جنسی کی حرمت کو قائم اور برقرار رکھنے کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ تمام ڈاڑھی مونچھوں والے مرد جہاں جہاں دستیاب ہو سکیں اُن کو چاہئے کہ اُن سُونے اور اُداس گھروں کی حفاظت اور رونق کے لئے جن میں سے مکشوفاتِ متنوّرات کشف المحجوب کر کے برسات کی بیر بہوٹیوں کی طرح نکل پڑی ہیں مرد بن کر گھر و نہیں جمے رہیں اور سر دیدیں لیکن وہاں سے نہ ٹلیں۔ چنانچہ آپ نے مس میو کی مدر انڈیا کو ہاتھ میں لے کر یہ حلف اُٹھایا ہے (اور ہم نے تحقیق کر لی ہے کہ ان معاملات میں مدر انڈیا اور تعزیرات ہند و قانون شہادت ایسی کتابوں کا حلف اُٹھانا اس وقت تک شرعاً اور قانوناً جائز اور قابلِ تسلیم رہیگا جس وقت تک کہ میونسپلٹیوں کے سامان امیدوار انتخابی معاملات میں اپنی حسب ضرورت قرآن مجید ایسی متبرک کتاب کا حلف اُٹھاتے اور اُٹھواتے رہینگے کیونکہ ہماری فہم میں یہ بات کسیطرح نہیں آتی ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا قانون تو قسم کھانے کے کام آسکے۔ اور انگریزی حکومت (جسکی ہم اتنی عزت کرتے ہیں اور جس سے اتنا ڈرتے ہیں کہ خدا سے نہیں ڈرتے ہیں) کا بنایا ہوا قانون عمل کرنے کے لئے ہو اور حلف اُٹھانے کے کام نہ آسکے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ان دوست نے یہ حلف اُٹھایا ہے)

کہ اس وقت تک صاحب موصوف پردہ سے باہر نہ نکلیں گے جبتک کہ مس میو دوبارہ جنم لے کر اور بالغ و راشد ہو کر اس حقیقت کا یقین اور اعتراف نہ کرلے کہ ہم ہندوستانی واقعی مرد ہیں۔ یہ وہ کے اس عہد کو نبھانے کے لئے آپ نے مجھے تاکید فرمادی ہے اور قانون شہادت ہند کی دفعہ ۱۰۶ کی قسم دیدی ہے کہ "ہمارا نام نہ بتانا"

لہٰذا اب ناظرین کرام آگاہ رہیں۔ کہ آیندہ جب کبھی یہ فرض ناگزیر عاید کیا جائے گا کر جناب موصوف کے واردات و مصدرات کو محض رفاہ عام کے لئے میں (ادبی رسالوں کے نمونوں کے پرچوں کی طرح) خلق اللہ میں سے بے استطاعت مستحقین میں مفت تقسیم کردوں۔ تو میں صاحب موصوف کی تقریب ہمیشہ "تلمیذ الرحمٰن" کے نام سے کیا کروں گا۔ کیونکہ یہی وہ فرضی نام ہے جو مشارٌ الیہ اپنی تحریر کے (حتیٰ کہ تقریر کے بھی) ابتدا میں نقاب کے طور پر اسی التزام کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح قانونی دستاویزات میں "منمقر" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ذیل کی تضمین جناب تلمیذ الرحمٰن صاحب کا نتیجہ فکر ہے۔ اس کی اشاعت کا اجازہ مجھے باضابطہ حاصل ہے۔ تلمیذ الرحمٰن صاحب کا مصدقہ حلفی بیان میرے پاس موجود ہے (اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس حلفی بیان کو صحیح تسلیم نہ کریں۔ جبکہ ہم اُس کو صحیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بعض عدالتہائے ہند قانون کے ڈر کے مارے حلفی بیان کو صحیح تسلیم کرلیتی ہیں چاہے دل میں یہ سمجھ رہی ہوں کہ محلف صریحاً غلط کہہ رہا ہے) اس بیان میں تلمیذ الرحمٰن صاحب خدا کو حاضر و ناظر جان کر (سمجھ کر نہیں) یہ اعلان کرتے ہیں کہ اس تضمین کی اصلی غرض خودستائی نہیں ہے۔ بلکہ ایک خود بین ہمہ دانی کی تنبیہ ہے۔ مشارٌ الیہا کا وطن دہلی ہے۔ لیکن آپ اپنے آپ کو ہندوستان کی ہر زبان کی ماہر سمجھتی ہیں اور خصوصاً پنجابی میں اردو کو پیوست کرکے جب ہندوستانی پنجابی بولتی ہیں تو اگرچہ اپنے دل میں یہ سمجھتی ہیں کہ ٹھیٹھ جھنگ اور ملتان کی زبان بول رہی ہوں۔ لیکن وہ فی الحقیقت بیک تیر ہر دو زبانوں کو یعنی پنجابی اور اردو کو زخمی کرتی ہیں۔

ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں (اور میں یہ راز کی بات عرض کردوں کہ) دراصل تلمیذ صاحب نے ایک بے ادب لڑکی کی روز کی ادبی نکتہ چینی سے تنگ آکر یہ خطاب پُرعتاب فرمایا ہے۔ ان اشعار کا شان نزول اس سے زیادہ بیان کرنا جتنا اشعار کے پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ ارباب فکر کے تخیل کی توہین کا مترادف ہوگا "یہی یقیناً ایک فرضی نام ہے۔ لیکن اگر قارئین کرام میں سے کسی صاحب کو آل انڈیا نمائش میں یا ہالی ڈے پارک میں یا کسی اور جگہ برقع پہنے نقاب اُلٹے کوئی لڑکی ایسی نظر آجائے جس کا نام اور حلیہ اور تجنّر مشارٌ الیہا سے ملتا جلتا ہو تو اس واقعہ کو محض قضیہ اتفاقیہ اور شاعر کو تلمیذ الرحمٰن سمجھ لیں کیونکہ (میں آنکھ بند کرکے کہتا ہوں کہ) "یہ سب اُدھر ہی کا فیضان ہے"

معروضہ بالا تمہید کے بعد (جو کہ اصل تضمین کے تناسب سے اس طرح زیادہ بڑھ گئی ہے جس طرح کہ ساہوکار کا سود اصل زر سے بڑھ جاتا ہے) تلمیذ الرحمٰن صاحب کی تضمین ذیل میں پیش کرتا ہوں:۔

(۱)

اے میرے تاش کے پتوں میں حکم کی نہچی!
اے میری کوئل لاہور رشکِ افرنجی!
جو اپنے گھر میں ہو کہتی پلنگ کو منجی
بنے وہ ماہرِ اصواتِ مصری و زنجی
خدا کی شان ہے یہ۔ ہو کے کلچڑی گنجی
حضور بلبلِ بستاں کرے نوا سنجی

(۲)

اے میری طوطی مینا صفت تری چونچیں
وہ چاہے کتنا ہی سیب کلام کو کھونچیں
مگر محال ہے مغزِ سخن تلک پہنچیں
لہذا کیجئے نہ محمول بر شکر رنجی
خدا کی شان ہے یہ۔ ہو کے کلچڑی گنجی
حضور بلبلِ بستاں کرے نوا سنجی

(۳)

میں تیرے جہل فضیلت وقار کے صدقے
میں آبنوس پہ فولادی دھار کے صدقے
میں تیری کند زباں کی کٹار کے صدقے
برائیوں کو جو بے ساختہ کہے جنجی
خدا کی شان ہے یہ۔ ہو کے کلچڑی گنجی
حضور بلبلِ بستاں کرے نوا سنجی

(۴)

تمہیں بھی دعوٰی ہوا اب زباندانی کا
نصیبہ کھل گیا گاڑھے کی جامدانی کا
بساطِ اردو پہ ہے قصد کامدانی[۱] کا
اٹھاؤ بوریا بچھواؤ کوئی شطرنجی
خدا کی شان ہے یہ ہو کے کلچڑی گنجی
حضور بلبلِ بستاں کرے نوا سنجی

(۵)

ہے شوق لیلیٰ کو گر میری ہمزبانی کا
تو پہلے ترک کرے شیوہ لن ترانی کا
نمونہ دیکھے پھر اشعار کی روانی کا
لگائے سرمہ حیا کا جو آنکھ ہے کنجی
خدا کی شان ہے یہ۔ ہو کے کلچڑی گنجی
حضور بلبلِ بستاں کرے نوا سنجی

حسن جعفری

---

[۱] جامدانی فارسی لفظ ہے کامدانی فارسی نہیں ہے۔ لہذا قافیہ میں کوئی اختلال پیدا نہیں ہوتا۔ ناظرین زباندانی کی وجہ سے دھوکا نہ کھائیں

ہماری موجودہ زندگی کے طور طریق اور عصر حاضرہ کے افکار و حوادث جسم انسانی علی الخصوص اعصاب پر نہایت تباہ کن اثر ڈالتے ہیں۔ اسی وجہ سے اعصابی امراض جنسی ضعف نیورستھینیا اور دیگر انواع و اقسام کی تکالیف نوع بشر کے تمام طبقوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ان تکالیف سے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو اعضائے رئیسہ پر اثر ڈالتے ہیں جسم میں بالعموم تھکن محسوس ہوتی ہے۔ ایام ماہواری میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض مرتبہ اس کا نتیجہ بانجھ پن اور نسلی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ ایک امر واضح ہے اور اس لئے تشریح طلب نہیں کہ تند و تیز منشیات ان شکایات کو ہرگز رفع نہیں کر سکتی ہیں۔ ان ادویہ کا انسانی غدود پر وہی اثر ہوتا ہے جو "سمند ناز" کے لئے تازیانہ حکم رکھتا ہے۔ اگر ایک مستقل علاج اور دوامی صحت درکار ہے تو ان عارضی علامات کا دور کرنا اور تلخ و تند دواؤں کا استعمال بالکل بے محل ہوگا۔ علم طب اور فن جراحی کے بڑے بڑے جلیل القدر علماء مثلاً پروفیسر "اسٹی ناخ" "وورونافٹ" اور "براؤن سیکوارڈ" کا یہ نظریہ ہے کہ جنسی کمزوری کی تہ میں غدود کے عمل کا نقص ہے۔ اعادۂ حیات جنسی صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جبکہ وہ قدرتی اجزا استعمال میں لائے جائیں جو ان غدود کو صحیح عمل کرنے کی طرف آمادہ اور مائل کر سکیں۔ فن طب عرصہ سے اس سعی و تلاش میں مصروف تھا کہ "ہارمونز" کا کوئی ایسا صحیح اور کارگر مرکب تیار ہو جائے جس کے اثرات دوامی ہوں اور تھوڑی سی مدت میں صحت کامل میسر ہو سکے۔ "ڈومی سیکس" میں یہ تمام شرائط جمع ہیں۔ اس لئے تمام دنیا میں اسکی مانگ زیادہ ہے۔ ڈومی سیکس علی الخصوص اعضائے جنسی پر اثر ڈالتا ہے اور بالعموم مرکزی نظام اعصابی کی تعمیر اس لئے کرتا ہے کہ دماغ میں اور اعضائے جنسی کے افعال میں گہرا باہمی تعلق ہے۔ اطبا کی یہ رائے ہے کہ ڈومی سیکس مرد اور عورت دونوں کی اعصابی اور جنسی بدنظمیوں کو نہایت باثر طریق پر رفع کر دیتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے کہ "ڈومی سیکس" ضایع شدہ طاقت کو پھر بحال کر دیتی ہے۔ اور

۳ - باوجودیکہ خوراکیں بہت قلیل ہوتی ہیں۔ لیکن جسم کے ان حصوں کو بے حس کرنے میں جہاں شدید درد ہورہا ہو اور سکون بخشنے میں اور پیشاب کو بسرعت صاف کرنے میں اور دیگر الائشوں کے برطرف کرنے میں بےمثیل ہے سخت اور چھیل ڈالنے والی الائشوں کو بننے سے روک دیتی ہے اور یہ زیادہ خارج ہوکر اعضا کو زخمی نہیں ہونے دیتی ہیں۔ اعضائے رئیسہ میں جلن اور سوزش کو رفع کردیتی ہے۔

۴ - پیشاب کی بدبو کم کرنے میں تیر بہدف ہے۔ ڈومی گونو بالکل بے مزہ ہے۔ اور چونکہ چھوٹی چھوٹی گولیوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس لئے بآسانی کھائی جاسکتی ہے

۵ - نہایت کم قیمت ہے۔ (دوسری ادویہ کے مقابلہ میں پچاس فیصدی ارزاں ہے)

خوراک - ہر روز دن میں تین مرتبہ دو دو گولیاں غذا کے بعد پانی کے ساتھ کھائیں۔

نمونہ - ڈاکٹروں اور طبیبوں کے آزمانے کے لئے دوا نمونہ کے طور پر مہیا کی جاتی ہے۔

لٹریچر

شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر اسمتھ فرماتے ہیں:-

ادارے کے اس حصہ میں کام کرنے سے جہاں جلدی امراض کا علاج ہوتا ہے مجھے جو تجربہ ڈومی گونو کے متعلق حاصل ہوا میں بوثوق کہہ سکتا ہوں کہ سوزاک اور سوزاک سے متعلق دیگر شدید تکالیف میں یہ دوا نہایت نافع ثابت ہوتی ہے۔ آنتوں اور معدے پر دوا کے استعمال کے بعد کسی قسم کے ناخوشگوار اثرات مشاہدے میں نہیں آئے۔

بیونوس ایریز کی یونیورسٹی کے پروفیسر "زبالہ" فرماتے ہیں:-

ڈومی گونو خاص طور پر اس وجہ سے قابل قدر و قیمتی ہے کہ جلدی سوزشوں میں اسکا اثر نہایت سکون بخش ہوتا ہے۔ علی الخصوص زحمت رساں خیزیوں پر اور اس کی صفات کی خوبیوں کو اس وقت دیکھا جاسکتا ہے جب اسکو پیشاب کے اعضا پر آزمایا جائے۔ اس کے کھانے کے بعد ڈکاریں نہیں آتیں اور نہ قے ہوتی ہے۔ اور گردوں پر بھی کسی قسم کی سوزش ظاہر نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔

تیار کرنیوالے کیمسٹس

ڈاکٹر مائر کیسٹنر اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ہمبرگ۔ سووسی ہوس (جرمنی)

ہندوستان کیلئے سول ایجنٹس

مائر اینڈ کمپنی 3/5 لنڈسے اسٹریٹ۔ کلکتہ

عورتوں کیلئے دلچسپ مشغلہ
نئی ایجاد
سوزن کاری کا آسان طریقہ
نئی ایجاد
ٹرانسفر پیپر
میز پوشوں۔ چادروں۔ تکیوں۔ قمیضوں وغیرہ پر مختلف نمونوں کے پھول بنانے کیلئے ٹرانسفر پیپر
استعمال کیجئے۔ آپ نقل سے ڈیزائن بنوانے کی زحمت سے بچ جائیں گی۔ ٹرانسفر پیپر کپڑے
پر رکھکر گرم استری پھیرنے سے پورا نقشہ اتر آتا ہے۔ اور اُسکے مطابق بیل بوٹے آسانی سے
کاڑھے جاسکتے ہیں یونائیٹڈ ایمپائر اگزی بیشن آف انڈیا منعقدہ آگرہ نے اسکو بہترین تسلیم کرتے ہوئے
طلائی تمغہ مرحمت فرمایا ہے۔ چھوٹا سائز فی درجن ۶ر بڑا سائز فی درجن ۱۲ر۔ ایک کاغذ تین دفعہ چھپ سکتا ہے
اگر آپ نمونہ دیکھنا چاہتی ہوں تو ۹ پیسے کے ٹکٹ لفافہ میں بند کرکے بھیجدیجئے ہم آپکو دو ٹرانسفر پیپر خورد و کلاں
بک پوسٹ بھیج دینگے یہ ضرور لکھئے گا کہ کس مطلب کیلئے ڈیزائن درکار ہے۔
نوٹ ضروری۔ ایک روپیہ سے کم قیمت کا مال بذریعہ۔ وی۔ پی ہرگز نہیں بھیجا جاویگا
بیوپاریوں کے لئے
خاص رعایت
رائل
ایمبرائڈری مشین
خواتین کیلئے کارآمد مشغلہ۔ اس مشین سے کوئی گھر خالی نہ رہنا چاہیئے۔ ہر قسم
کے کپڑے پر اپنے مذاق کے مطابق خوشنما پھول بیل بوٹے حروف بناکر اپنے
لباس میں زیبائش پیدا کرسکتی ہیں قیمت ایکروپیہ چار آنے بذریعہ وی پی
ایک روپیہ دس آنے
ملنے کا پتہ
گلزار آرٹ ایمپوریم نزد ڈاکخانہ بیرون موچی دروازہ لاہور

اختر شیرانی   عاشق بٹالوی

۱۸۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخیل اخترؔ میں ! (آغا حشر)

رومان

اردو کے نوجوان اہل قلم کا ادبی و فنی ماہنامہ

نگارندگانِ خصوصی

سید امتیاز علی تاج بی۔اے — سید حسن جعفری ایم۔اے۔ایل ایل۔بی

جوش ملیح آبادی

منیجر رسالہ "رومان" ۱۸۔ فلیمنگ روڈ لاہور

چندہ سالانہ مع سالنامہ پانچ روپے (صہ) — طلبہ سے چار روپے (للعہ) — فی پرچہ چھ آنہ

(شیخ محمد نواب پرنٹر پبلشر نے گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع کرا کے ۱۸ فلیمنگ روڈ لاہور سے شائع کیا)

اختر شیرانی

عاشق بٹالوی

۱۵۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

کہو زاہد سے کیوں ہے اسقدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنّتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں ! (آغا حشر)

رُومان

اُردو کے نوجوان اہلِ قلم کا ادبی و فنّی ماہنامہ

نگارندگانِ خصوصی

سیّد امتیاز علی تاج بی۔ اے　　سیّد حسن جعفری ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

جوشؔ ملیح آبادی

منیجر رسالہ "رومان" ۱۸۔ فلیمنگ روڈ لاہور

چندہ سالانہ مع سالنامہ پانچ روپے (صہ)　　طلبہ سے چار روپے (للعہ)　　فی پرچہ چھ آنہ

(شیخ محمد نواب پرنٹر پبلشر نے گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع کرا کے ۱۸ فلیمنگ روڈ لاہور سے شایع کیا)

غریب طلبہ توجہ کریں

رسالہ ”رومان“ مفت جاری کیا جائیگا

عطائے دولتانہ | محترمی خان بہادر نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ

ممبر پنجاب لیجسلیٹو کونسل نے جو اپنی علم دوستی کے لحاظ سے ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں۔ ازراہ ادب نوازی رسالہ ”رومان“ کو چالیس روپے کا عطیہ مرحمت فرمایا ہے۔ گو یہ رقم محض ”رومان“ کی پسندیدگی کا انعام ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ نواب صاحب ممدوح کی اس علمی قدر افزائی کے اثرات کو عام اور ان کی فیض بخشی کو وسیع کر دیں۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس رقم میں دس پرچے غریب طلبہ کے نام جاری کر دیئے جائیں۔ لہذا ہم غریب طلبہ کو مطلع کرتے ہیں کہ وہ اپنے اساتذہ کی تصدیق کیساتھ فوراً درخواستیں ارسال کریں۔ صوبہ وار درخواستوں کے لحاظ سے حسب ذیل تعداد قابل قبول ہوگی :-

مدراس ۲۔ سندھ ۲۔ سرحد ۲۔ بہار ۱۔ سی پی ۱۔ بنگال ۱۔

دوسرے صوبوں کے طلبہ کی کوئی درخواست قابل پذیرائی نہوگی۔

عطائے ناظر | خان بہادر چودھری خوشی محمد خاں ناظر بی۔اے (علیگ) سابق گورنر و منسٹر جموں و کشمیر نے پانچ روپے عنایت فرمائے ہیں کہ کسی غریب طالب علم کے نام پرچہ جاری کر دیا جائے۔ یہ پرچہ صرف دیسی ریاستوں کے کسی طالب علم کے نام جاری کیا جائیگا۔

عطائے خیال | مولانا سیّد عبدالسّلام صاحب خیال ایم۔اے (علیگ) سب جج ریاست جے پور نے بھی پانچ روپے مرحمت فرمائے ہیں۔ کہ کسی غریب طالب علم کے نام سال بھر کے لئے پرچہ جاری کر دیا جائے۔ طالب علم مولانا کے پرانے اور محبوب علیگڑھ کے سکول کا ہونا چاہئے۔

مینجر رسالہ ”رومان“ - ۱۸ - فلیمنگ روڈ - لاہور

رنگون میں رومان کے سول ایجنٹ

منشی عبدالرزاق خاں نظامی فیض آبادی (پوسٹ بکس ۳۲ مکان ۲۰ بارا اسٹریٹ) ہیں۔ ان کے ہاں سے ہمیشہ ”رومان“ کا تازہ پرچہ ۶ر میں مل سکتا ہے۔

مینجر ”رومان“ لاہور

شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی مرحوم

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

تمام ہندوستان کے علمی حلقوں میں یہ حسرتناک خبر رنج و افسوس کیساتھ سُنی جائیگی کہ شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی صاحب نے اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرمائی۔

مرحوم کی تمام زندگی اُردو داں خواتین اور بچوں کی تہذیبی و علمی خدمت میں بسر ہوئی۔ بچوں کے لئے ایک بہترین ہفتہ وار اخبار "پھول" اور خواتین کے لئے ایک بہترین ہفتہ وار اخبار "تہذیب نسواں" مرحوم نے جاری کئے تھے۔ جو ابتدا سے لے کر آج تک نہایت حسن و خوبی کیساتھ جاری ہیں۔ اور عالمِ نسواں و دنیائے صبیاں کی حد درجہ مفید اور بیش بہا خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔

مرحوم شمس العلما کا شمار اُردو کے محسنوں میں ہوتا ہے۔ وہ سر سیّد اور حالیؔ و شبلیؔ کے احباب میں سے تھے۔ جس کا علم اُن خطوط سے ہوگا جو ہم مسلسل شایع کر رہے ہیں۔ مذہبی خدمات کے سلسلے میں بھی بعض چیزیں اُن کی یادگار ہیں۔

ہمیں اس افسوسناک حادثے میں مرحوم کے جواں سال فرزندوں سیّد حمید علی و سیّد امتیاز علی تاجؔ سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا ان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (ادارہ)

حشر نمبر کے متعلق اعتذار

جیسا کہ ہم نے پچھلے نمبر میں اعلان کیا تھا اس نمبر کو "حشر نمبر" کے نام سے شایع کرنا مقصود تھا۔ اور اسکی ادارت کے فرائض تن تنہا سیّد امتیاز علی صاحب تاجؔ کے ذمّے عائد کئے گئے تھے۔ لیکن اُن کے فاضل و محترم والد ماجد شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی صاحب قبلہ کی ناگہانی وفات کے حادثے نے اس ارادے کی تکمیل نہ ہونے دی تاجؔ صاحب ان سطور کے ذریعے "ناظرین رومان" سے معذرت خواہ ہیں + (ادارہ)

(۴۸۶)

فہرست

جلد ۱ | مضامین بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۵ء | شمارہ ۳

ادارہ کا اپنے مضمون نگاروں کی ہر ایک رائے سے متفق ہونا کسی حالت میں بھی ضروری نہیں۔

خلوتیانِ رومان

بازگو از نجد و از یاران نجد!

مولانا شاکر صدیقی اپنے ایک عنایت نامے میں لکھتے ہیں
"اختر اور "رومان" کیسی عجیب نسبت ہے۔
میرے خیال میں تو "رومان" بھی اختر ہی ہوگا۔ میری
چشم تصور اس نسبت میں ایک نرالی دنیائے ادب دیکھ
رہی ہے۔ کیسا سنہرا خواب ہے جو میں بیداری کی
حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ کیسے اسکی تعبیر کیا ہوگی ؎

اختر اور "رومان" ہے واللہ یکہ شربت
کسقدر ہے شوخ فکر نکتہ رس اختر ترا!"

ہم اسیقدر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شاکر صاحب جس نرالی
ادبی یا "رومانی" دنیا کے منتظر ہیں اس کی بے حجابی بھی
کسیقدر اور سکوت کی طلبگار ہے ؎

گو ہم غم دل بمصرع چند — زنہار بیگانہ بیگانہ نگوئیم!

دعا کیجئے کہ یہ طلسم سکوت جلد ٹوٹے ؎

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا!

محترمہ شگوفہ خانم اپنے ایک نہایت دلچسپ خط میں
تحریر فرماتی ہیں:-
"رومان" کا انتظار سخت بیتابی سے کر رہی ہوں
ع اے آتش فرقت دلہا کباب کردہ! ہر شام میرے
خیالات اور تصورات دنیا بھر کے رسائل سے زیادہ حسین
اور شاندار ایک رسالہ مرتب کرتے ہیں اور اسے "رومان"
سے موسوم کرکے ہر صبح مجھے دور سے دکھا دیتے ہیں۔ مگر
ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ آپ بھی اگر دیکھنا چاہیں تو
آئیے میں دکھادوں۔ میرا "رومان"۔

"رومان" کی "ترتیب" میں خانم موصوف جو "تکلیف" فرماتی
ہیں۔ اس کے لئے دفتر ان کا شکرگزار ہے۔ لیکن
"رومان" کے منتظمین بڑے وہمی واقع ہوئے ہیں۔
ان کو اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں محترمہ موصوف آگے چل کر
"تنخواہ" کا مطالبہ نہ کرنے لگیں۔ ہم نے اپنے منیجر کو یقین
دلایا ہے کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں۔ رسالے کی ترتیب
چونکہ خیالی ہے لہذا تنخواہ بھی "خیالی" ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ امر قابل غور ہے۔ کہ "شگوفہ" بھی
ایک "خیالی" نام اور محض ہماری "ترتیب خیال" کا نتیجہ ہے
واقعہ یہ ہے کہ خانم موصوف اپنے خط میں نام پتہ لکھنے کی
عادی نہیں۔ اور اس لحاظ سے جس حد تک انکی شخصیت
کا تعلق ہے ع پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے
نہ بنے! بالفاظ دیگران کا دعوٰی ہے کہ ع ہر کہ دیدن
میل دارد در سخن بیند مرا۔ ان کی خوئے پردہ داری کی
یہ ادا یقیناً "رومانی" ہے۔ اور ہم اسکا احترام کرتے ہیں

لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ "گمنامی" ہمیں ہر قسم کے "حوالہ اور" اشارہ" سے محروم کر رہی ہے ۔ درحالیکہ اکثر معاملات میں نام کے حوالے اور اشارے کی ضرورت ہوتی ہے اخباری دنیا میں خریداری نمبر کو نام کا قایم مقام سمجھا جاتا ہے ۔لیکن قارئین کو یہ معلوم کر کے ہماری بے بسی پر یقیناً رحم آئے گا کہ خانم موصوف کی عشوہ طرازی نے ان کو خریداری نمبر کی "برائے نام" بے پردگی سے بھی محفوظ رکھا ہے ۔یعنی کہ سرے سے کوئی خریداری نمبر ہی موجود نہیں ۔ ع آپ ہی کہئے کہ اب ہم کیا کریں؟ سوائے اس کے کہ ضرورتاً اپنی ان محترم خاتون کے لئے خود ہی ایک نام تجویز کر لیں ۔

اگر یہ سطور ان کی نظروں سے گذریں تو اُن پر واضح ہو کہ اُن کے ارسال کردہ "متعدد خریداروں کے پتے" ہم تک نہیں پہنچے ہیں ۔ ہمیں ابتک صرف دو کارڈ ملے ہیں جن میں ایک ایک پتہ درج تھا ۔ اس لئے اگر خانم موصوف مکرر توجہ فرمائیں تو شکر گذاری کا باعث ہوگا ۔ ساتھ ہی اپنے اس نئے نام کی پذیرائی سے بھی اطلاع بخشیں ع ہمکو بھی ہزاروں طرح تری تصویر بنانی آتی ہے!

عم محترم مولانا سید عبد السّلام صاحب خیال ایم اے (علیگ) کا کرمت نامہ مدتوں کے بعد موصول ہوا ۔ آپ کے غائبانہ عقیدتمند یہ سن کر ہماری طرح مسرور ہونگے کہ ریاست جے پور کے ارباب بست و کشاد نے آپکی قانونی خدمات کی قدر کرتے ہوئے آپکو ۱۸ اپریل ۱۹۳۵ء سے سب ججی کے عہدے پر فائز کیا ہے ۔ اس حسن انتخاب کے لئے کارپردازان ریاست اور اہالیان جے پور دونوں یکساں مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ اس سلسلے میں مولانا کے یہ دلچسپ فقرے ملاحظہ ہوں :۔

"چونکہ میں خود وکالت کی "مشتبہ" روزی کو زیادہ پسند نہیں کرتا تھا ۔ اس لئے میں نے اس جگہ کو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا ہے"!

اس مکرمت نامہ کیساتھ ایک فارسی غزل عنایت کی گئی ہے جسے ہم فخر و مسرت کیساتھ اس نمبر میں درج کر رہے ہیں ۔ غزل کے چھٹے شعر میں عربی لفظ "شراب" کے ساتھ خود مولانا کے قول کے مطابق جو "زبردستی" آپ نے کی ہے وہ قابل دید ہے ؎

شرارہ زادۂ آتش پروریدۂ شعلہ برخوردہ
ہزاراں شرر ہا ماں آب ساغر را تماشا کن!

عاشق صاحب کے اُس افسانہ کے متعلق جو "حیات تازہ" کے عنوان سے مئی نمبر میں شایع ہوا تھا سید محمود طرزی صاحب کلکتہ سے ارقام فرماتے ہیں :۔

"یہ اصلاحی افسانہ میری دانست میں عاشق صاحب کی زندگی کا شاہکار ہے ۔ اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتے ہوئے زندگی کی پچاس منزلیں طے کیں ۔ لیکن سادہ اور عام فہم زبان میں ایسا نادر افسانہ میری نگاہ سے آجتک نہیں گزرا ۔ افسانہ کیا ہے ۔ مکمل انسانیت کے لئے خودداری کا سبق دیا ہے ۔

جسمیں سے اگر صرف ۵۰ فیصدی نکات آجکل کے
لوگ قبول کرلیں تو انکی زندگی کامیاب کہی جاسکتی ہے۔"

طرزی صاحب کی اس رائے کے مقابلے میں ہمارے اُن ظاہر پرست اور سطحی نظر رکھنے والے احباب کی "تحسین" ملاحظہ ہو جنہوں نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کی تھی کہ "بہت طویل ہے" ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا؟

استاذ الشعرا صاحبزادہ احمد سعید خانصاحب عاشق ٹونکی جانشین حضرت داغ دہلوی مندرجہ ذیل دلچسپ رباعیوں کے ذریعہ سے تصویر کی رسید ارسال فرماتے ہیں:-

بیشک ہے یہ لاجواب پیاری تصویر   بہتیں ہے، بے عیب ہے، ساری تصویر
دشمن سے کرے بات نہ ہمسے نفرت   تم سے بھی تو اچھی ہو تمہاری تصویر

تصویر پر آپکا نام لکھتے ہوئے غلطی سے تخلص لکھنا یاد نہ رہا تھا اسکی شکایت یوں کی گئی ہے ؎

تصویر مجھے بھیج کے ممنون کیا   ہے ثبت مرا نام تخلص نہ لکھا
"عاشق" بھی جو لکھدیتے تو کیا ہو جاتا   کیا اسکو کہوں "نیک گمانی" کے سوا؟

پچھلے دو نمبروں میں "رومان" کے اندرونی سرورق پر ہمارا یہ شعر "ہمزلمے" کی حیثیت سے شائع ہوتا رہا ہے ؎

ذرہ ذرہ کا دل اک محشر نظارہ ہے   ساری دنیا مرے "رومان" کا گہوارہ ہے

بعض احباب کے اصرار پر اس شعر کی بجائے حضرت آغا حشر کاشمیری مرحوم کا یہ شعر درج کیا جا رہا ہے ؎

کہو زاہد سے کیوں ہو اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں!

ناظرین میں سے وہ حضرات جو اسے "خود نمائی" خیال فرمائیں ہمارے بجائے ہمارے احباب کو ہدف "مطاعن" بنائیں کیونکہ "یہ سب اُدھر ہی کا فیضان ہے۔"

ہمارے کالج کے پرانے ساتھی اور عزیز دوست عبدالعزیز خاں (تحصیلدار بھوپال) ذیل کے شیریں طراز اشعار کے وسیلے سے "رومان" کے ساتھ اپنی محبت و خلوص کا اظہار کرتے ہیں ؎

چو داری سیر دیدہ رومانیاں   نگر جلوۂ فر رومانیاں
رباید ز خورشید فرتاب را   دہد خیرگی چشم مہتاب را
ز پنجاب بر کش تو نا زور را   روان آب کن آب لاہور را
ز مستی ہمہ معنی ہوش و ہنگ   ز ہنگ آوری معنی مست رنگ
باقلیم معنی ہمہ اختیار   سزد گر بگویم ترا شہریار
ز آہن چہ موم آورد انگبیں   سر پنجۂ فر اختر ببیں
لب شاہد رخش زلف مستی کند   چو گبرے کہ آذر پرستی کند
ز اختر سوئے سر ز من ہوش را   ز نجم برد خواب خرگوش را
کیائی دہ نامۂ خسروی   سر خامہ ات فرۂ پہلوی
چم بندہ آزاد برمید ہد   بآزادگی بندہ سرمید ہد
نریمان و گودرز و گیو و پشن   بایں شاہکار تو خواب کہن
نہ فردوسی و پور سبکتگیں   چو فردوس رومان محمود بیں

ہمارے عزیز و محترم دوست میر نور بخش ماثر سیالکوٹی تحریر فرماتے ہیں:-

"آپکی نظم "بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ" نے میرے دوستوں کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ پچھلے اتوار کو ہم سب اسی نظم کو گاتے رہے۔ بہت سے دوست رو پڑے۔ بھلا! اتنی دردناک نظم نہ لکھا کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجسم درد ہیں

برادرم بشیر احمد تبشیر گجراتی کو جب معلوم ہوا کہ سلمٰی کا تعلق گجرات سے ہے تو تڑپ اٹھے اور فخریہ کہنے لگے کہ ماثر صاحب اب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ گجرات سے سیالکوٹ زیادہ مردم خیز خطہ ہے۔ اگر سیالکوٹ اقبال پیدا کرتا ہے تو گجرات سلمٰی۔ اس پر بڑے قہقہے رہے۔"

برادرم حضرت جوش ملیح آبادی موسم گرما کو ان الفاظ میں کوستے ہیں :-

"گرمی اس وقت اتنی شدید ہے کہ بھیجا پگھلا جا رہا ہے۔ سچ ہے کوئی موسم اس درجہ بے مروت نہیں ہے جتنا یہ گرمی کا بے مہر، تندخو، چڑچڑا اور سود خوار موسم! ؎

جمتا نہیں تصور جاناں پہ بھی خیال
بے چینیوں کا دل میں وہ طوفاں ہے آجکل"

جوش صاحب کو شاید خیال نہ رہا کہ "تصور جاناں کا "درجۂ حرارت" بھی بہت تیز ہوا کرتا ہے۔ پھر یہ "دو آتشہ" کیونکر برداشت ہو؟ کسی فلسفی عاشق کا قول ہے کہ از روئے طب "تصور جاناں" کے لئے بہترین موسم "موسم سرما" ہے۔ کیونکہ اس موسم میں کسی "آتشیں رخسار" کا خیال مفلس عاشقوں کو آتشدان کا کام دیتا ہے۔

ا۔ش

فرمودۂ حسرت

از:- حضرۃ مولانا حسرت موہانی بی اے (علیگ)

مجھ سے اے دل اُنہیں گلا نہ رہے
تو رہے برقرار یا نہ رہے

شوق کو دل میں بربنائے ہجوم
ڈر یہی ہے کہ راستا نہ رہے

آپ ہی کو کرم کی خو نہ رہی!
یا ہمیں درخور عطا نہ رہے؟

وصل میں بوئے جسم یار کو آج
شوق سے پردۂ قبا نہ رہے!

اُن سے کیا تم نے کہہ دیا حسرت
کہ وہ اب مائل جفا نہ رہے

پروازِ خیال

از:-
مولانا سید عبدالسلام صاحب خیالؔ ایم اے (علیگ)

زطرزِ دلبری بیگانہ دلبر را تماشا کن
ستم کردن نمی داند ستمگر را تماشا کن

بزن باز خمۂ سوزِ محبت سازِ ہستی را
نوائے دل گدازِ درد پرور را تماشا کن

مبادا۔ جامِ کوثر۔ واعظا۔ باشد نصیب تو
بیا درمیکدہ آدابِ ساغر را تماشا کن

چہ شر انگیخت چشمِ فتنہ زایت درجہانِ دل
دلِ شور افگنِ ہنگامِ محشر را تماشا کن

بسے دیدی شکست رنگہا اندر چمن اینک،
نظر کن در قفس بشکستنِ پر را تماشا کن

شرارہ زادہ۔ آتش پروریدہ شعلہ بجو رُو
ہزاراں شر بداماں۔ آب ساغر را تماشا کن

زخونِ اہلِ ایماں قشقہ ساز دبرجبینِ خویش
نوازشہائے آں جلاد کافر را تماشا کن

سرم دست وگریبانست باسنگ درِ جاناں
بیا۔ جوشِ جنونِ سجدہ پرور را تماشا کن

خیالؔ از لامکاں بگزشت در شوق ہوائے تو
فلک پروازیٔ ایں مرغِ بے پر را تماشا کن

مقالات

یزیدی یا شیطان پرست گروہ

ذاتی تجربات ومشاہدات

(گذشتہ سے پیوستہ)

از:۔
سیّد عبدالرزّاق حسنی (مصر)

موت اور عزاداری

موت کے باب میں یزیدیوں کا عقیدہ "تناسخ ارواح" کا ہے۔ جب کوئی یزیدی مرجاتا ہے تو کسی شیخ کا آنا واجب ہوتا ہے۔ اس کے بعد طبل اور نفیری بجنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف عورتیں دوہتڑ پیٹنے اور مرد رونے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ اب موت کا غلغلہ آتا ہے۔ ہر ایک کے پاس دائرہ ہوتا ہے۔ یہ سب کے سب جنازے کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ باقی لوگ سکوت کے عالم میں دائرہ کی آواز سنتے ہیں حتیٰ کہ زیارت گاہ کے قبرستان تک پہنچ جاتے ہیں۔ مردے کو قبر میں دفناتے ہی اس کے عزیز واقارب لوٹ جاتے ہیں۔ عورتیں تین روز تک، اور ہر روز طبل و نے کے ساتھ مردے کی قبر پر آتی اور رو دھوکر دوہتڑ مارتی ہوئی واپس ہوجاتی ہیں۔ تیسرے دن کے آخری لمحہ میں (غروب کے وقت) اپنے ساتھ کھانا لاتی اور قبر پر رکھ کر چلی جاتی ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مردہ کو بھوک لگتی ہے۔ اور وہ خوراک کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کھانا جانوروں کے معدے کو "ثواب" پہنچاتا ہے۔

بعض عجیب عادات

اپنے قیام کے دوران میں ایک عجیب بات میں نے یہ دیکھی کہ تمام یزیدیوں پر لکھنا پڑھنا حرام ہے۔ اور ہر ایک آبادی میں ایک سے زیادہ لکھے پڑھے شخص کا وجود ناجائز ہے۔ یہ شخص تمام اہالی کی ضروریات نوشت وخواند رفع کرتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کی حرمت کا بڑا سبب یہ ہے کہ یزیدی سردار یا مشائخ ڈرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو اُن کے ہم مذہب تاریخ، فلسفہ، اور دوسرے مذاہب سے واقف ہوکر اپنے عقائد میں کمزور اور سست ہوجائیں یا ان کے معتقدات میں اختلافات رونما ہوں۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے اس جماعت کے کسی فرد کو کبھی صبح کے وقت منہ دھوتے نہیں دیکھا میں نے اس کی علت دریافت کرنی چاہی تو معلوم ہُوا کہ وہ اپنی مذہبی شست وشو کو کافی سمجھتے ہیں اور

یہ شست وشو اُس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی کسی زیارت گاہ پر حج کرنے جاتے ہیں۔ اِس شست وشو کا مقصد جسم کی صفائی نہیں ہوتا۔

یزیدیوں پر مونچھیں منڈانا یا قینچی سے کٹانا حرام ہے۔ برخلاف اس کے ڈاڑھی کٹانا جائز ہے۔ صاحب "معجم الادیان" کا بیان ہے کہ "ڈاڑھی کتروانا اور مونچھیں چھانٹنا اُن کے نزدیک حرام ہے۔" (صفحہ ۱۲۵۱) مگر بہ حقیقت ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مونچھوں کی تخفیف اور ڈاڑھی کتروانا اُن کے نزدیک جائز ہے۔ آجکل یہ عادت ہے کہ عامۃ الناس ڈاڑھی کٹاتے ہیں اور مونچھوں کو قینچی سے کترواتے ہیں۔ لیکن مشائخ کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔ اور حتمی طور پر لازم ہے کہ اُن کی ڈاڑھی اور مونچھیں لانبی ہوں۔

یزیدیوں کے سردار

یزیدیوں میں مشائخ ہیں اور ہر ایک شیخ کے بیشمار "محب و مرید" ہوتے ہیں۔ مگر تمام قوم کا ایک رئیس اعلیٰ ہوتا ہے جسے "امیر شیخان" کہتے ہیں۔ آجکل یہ "امیر شیخان" سعید بک بن علی بن حسین بک ہے۔ اس رئیس کا تمام رعایا، تمام رؤسا اور تمام مشائخ پر تسلط مطلق ہوتا ہے۔ امور دینی اور قضایائے شرعی کا فیصلہ بھی وہی کرتا ہے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ جب چاہے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دے۔ عام معنی میں وہ اپنی قوم کا پیغمبر محسوب ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ رئیس شیخ عدی[۵] کا وکیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے احکام کی اطاعت و متابعت ہم پر اس حد تک فرض ہے کہ الفاظ اُس کی تشریح نہیں کر سکتے۔ رئیس کا عہدہ خاندانی ہے۔ اور ایک سے دوسرے بزرگ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

رئیس کے بعد فقیر کا مرتبہ ہے جو نائب امیر ہوتا ہے اور دوسرے رؤسا کے وسیلے سے، لوگوں میں رئیس کے احکام کی تبلیغ کرتا ہے۔ فقیر کے بعد کوچک کا درجہ ہے۔ اس کے بعد پیر کا۔ اس کے بعد شیخ۔ اس کے بعد قوال اور پھر رعیت۔

عجیب بات یہ ہے کہ قوال الشیخ کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا خواہ وہ علم و اجتہاد ہی کیوں نہ حاصل کرے۔ اسی طرح شیخ، پیر کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ علوم و معارف میں کامل ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تمام مقامات و مراتب، خاندانوں میں محدود و مختص ہیں جو سلف سے خلف تک پہنچتے رہتے ہیں ان رؤسا و مشائخ کے مخصوص فرائض ہیں جن کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے:-

(۱) شیخ۔ شیخ عدی کی قبر کا خادم ہے۔ اس کے لئے شرط ہے کہ خود ان کے امام حسن بصری کے خاندان سے ہو اس کے لئے سینہ پر زنار (سیارہ) نصب کرنا اور ایک علامت ہاتھ میں رکھنا لازمی ہے تاکہ جو شخص بھی اسے دیکھے سر بسجود ہو جائے۔

(۲) اُمرا۔ وہ گروہ ہے جو اپنے آبا و اجداد سے شجرۂ منشور اور نسب نامے کا حامل چلا آتا ہے۔ تمام لوگوں کے لئے اس کی جسمانی و روحی کمالات کی تصدیق کرنا اور اس کے

---

[۵] ابن خلکان اپنی کتاب "وفیات الاعیان" میں عدی بن مسافر کے حال میں (جس سے یہ گروہ اپنے آپکو منسوب (بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

تمام احکام کا مطیع ہونا لازمی ہے۔

(۳) قوال ۔ ان کا فرض دف بجانا اور خداؤں اور ملائکہ کی تعریف کرنا ہے۔

(۴) پیر۔ جن کے ذمے روزے اور ان کے افطار کی ترتیب کا فرض ہے۔

(۵) کوچک۔ ان کے فرائض میں ارواح کے مکاشفات اور مردوں کی تکفین و تلقین داخل ہے۔

(۶) فقیر۔ اس کا فرض لڑکوں اور لڑکیوں کو جمع کرنا اور ان کو دف اور رقص کی تعلیم دینا ہے۔

(۷) امام۔ جو بچوں کو مذہبی امور، دینی مسائل، مقدس کتاب اور دوسری ضروری باتیں حفظ کراتا ہے۔

یہ ہے مشائخ یزیدیہ کے فرائض کا خلاصہ۔ شاید کچھ اور فرائض بھی ہوں جن کا مجھے علم نہ ہو سکا ہو۔ کیونکہ وہ اپنے مذہبی امور کو اصرار کے ساتھ پوشیدہ راز بنائے رکھتے ہیں۔

یزیدیوں کے مصائب

پچھلے تذکروں، یزیدیوں کی مذہبیت اور ان کے عجیب و غریب عقائد پر نظر کرتے ہوئے ہم دیکھیں گے کہ ان کے عقائد نہایت بیہودہ ہیں اور کسی منطقی قاعدے سے مستند نہیں کہلا سکتے۔ شاید انہی وجوہ سے یہ جماعت ہمیشہ ترکی والیوں (گورنروں) اور موصل کے حاکموں کے مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی ہے۔ اور جو اکثر ان پر حملے کرتے اور انہیں غارت کرتے رہے ہیں۔ بالخصوص ۱۲۶۰ھ اور اس کے ایک سال بعد تو ان پر اتنے مظالم ہوئے۔ کہ بقول مسٹر لایرڈ یزیدیوں کا تین چوتھائی حصہ نیست و نابود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) کرتا ہے) لکھتا ہے "شیخ عدی بن مسافر اسمٰعیل بن موسیٰ بن مروان بن حسن بن مروان (اس کے بعض مریدوں نے اس کے نسب کو اسی طرح لکھا ہے) جس کا مسکن ہکاری تھا۔ "عبد صالح" مشہور ہے۔ اور گروہ عدیہ اس سے منسوب ہے۔ اس کا تذکرہ شہرۂ آفاق ہے۔ اور ایک کثیر مخلوق اس کے تابع ہے۔ جس نے اپنے حسن اعتقاد کو اسقدر وسیع کر دیا ہے کہ اسے دنیا میں اپنی نماز کا قبلہ اور آخرت میں وسیلۂ آخرت سمجھتی ہے۔ شیخ مزبور نے بہت سے مشائخ علی الخصوص شیخ عبدالقادر جیلانی کی مصاحبت کا فخر حاصل کیا اور بالآخر طریق انقطاع اختیار کر کے کوہستان ہکاریہ میں (جو موصل کے توابع میں واقع ہے) گوشہ نشین ہو گیا۔ اور ایک صومعہ بنایا۔ اس نواح کے باشندے اس کے اس درجہ معتقد تھے کہ کسی اور گوشہ نشین اور عامل ترک و انقطاع کو یہ منزلت نصیب نہیں ہوئی۔ شیخ عدی کا مولد بعلبک کے نواح میں ایک گاؤں "بیلت فار" ہے۔ جس گھر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ ابھی تک زیارتگاہ بنا ہوا ہے۔ اس نے ۵۵۸ھ میں ہکاریہ میں وفات پائی اور وہیں اپنے مسکن عزلت میں دفن ہوا۔ اس کی قبر نہایت اہم مزار شمار ہوتی ہے۔ اس کی اولاد اب تک اسی مقام پر اس کے شعائر کو زندہ کئے ہوئے ہے۔ اور لوگ اس کی بھی شیخ کے برابر تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ابو برکات بن مستوفی نے تاریخ اربل میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اسے موصل و اربل کے واردین میں شمار کیا ہے۔

ہو گیا۔ یزیدی آج تک ان مصائب و مظالم کو یاد کرتے اور مرثیے پڑھتے ہیں۔ ان کے اس قسم کے منظوم مراثی سے مذکورہ وقائع و حوادث کا بہت کچھ علم ہو سکتا ہے۔

یزیدی اور جنگ روس و ٹرکی

۱۳۱۱ھ میں جب ٹرکی روس سے جنگ آزما ہوا۔ تو ایک ترک افسر طاہر بک کو موصل بھیجا گیا کہ اس کے توابع سے سپاہی بھرتی کرے۔ اس موقع پر یزیدیوں نے سپاہی بھرتی کرنے اور ہونے سے انکار کیا۔ جو وجوہ انہوں نے اپنی معذوریوں کے سلسلے میں پیش کئے اور ایک عرضی کی صورت میں سپہ سالار اعظم ٹرکی کے نام روانہ کئے تھے ان کو ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

(۱) ہر ایک یزیدی مرد و عورت پر لازم ہے کہ سال بھر میں تین مرتبہ طاؤس ملک کے مجسّمے کی زیارت کرے۔

(۲) ۱۵۔ ماہ ایلول (یعنی ستمبر) سے لے کر ۲۰ تک کے دوران میں اس پر شیخ عدی کی قبر کی زیارت واجب ہے۔

(۳) طلوع خورشید کے نظارے کو ہر روز صبح کے وقت اس طرح دیکھے کہ کوئی مسلمان یا غیر مسلمان اسے نہ دیکھ سکے۔

(۴) ہر روز صبح اٹھ کر اس رئیس کے ہاتھ چومے جو اس کے نزدیک ہو۔

(۵) مسلمان کی نماز سننا اس کے لئے حرام ہے۔ اگر غلطی سے سن لے تو وہ ان میں سے ایک بات کے لئے مجبور ہوگا۔ یا مسلمان کو قتل کر دے یا خودکشی کر لے۔ اگر ان میں سے کسی پر بھی قادر نہ ہو تو اسے چاہئے کہ ایک ہفتے تک روزے رکھے۔ اور طاؤس ملک کو قربانی دے۔ یزیدیوں کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کی نماز میں بعض ایسی عبارتیں ہیں، جو اُن کے نزدیک کفر ہیں۔

(۶) یزیدی کے مرنے پر اُس کے رئیس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جو نماز پڑھ کر اُس کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے اور اُسے یہ عبارت سنائے "اگر کوئی تیرے پاس آکر کہے کہ مذہب اسلام یا دین یہود پر مر تو اس کی بات نہ مان کیونکہ تو کافر ہو جائے گا"!

(۷) ہر ایک یزیدی پر واجب ہے کہ ہر روز اپنے رئیس کے دسترخوان موسوم بہ "دکان شیخ" پر حاضر ہو کر کچھ کھائے۔

(۸) ہر ایک یزیدی پر فرض ہے کہ وقت مقررہ پر روزے رکھے اور جو کچھ اُس کے اہل و عیال کھاتے پیتے ہیں وہی کھائے پیئے۔ صبح کے وقت اپنے رئیس کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس کے پیچھے کھڑا رہے۔ اسیطرح افطار کے وقت اس کے سامنے جا کے افطار کرے۔ تاکہ اُس کے روزے کا ثبوت مل سکے۔

(۹) اگر کوئی عیالدار یزیدی اپنے شہر سے باہر رہے تو اُس کی بیوی اُس پر حرام ہو جاتی ہے۔

(۱۰) جو شخص نیا لباس پہنے اُس پر لازم ہے کہ پہلے شیخ عدی کی قبر کے "چاہ زمزم" کے مقدس پانی سے پاک کرے۔

(۱۱) یزیدوں پر جائز نہیں کہ سلائی سے سرمہ لگائیں۔ یا یہودیوں اور نصرانیوں کے شانے سے بال سنواریں۔ یا اُسترے سے سر کے بال مونڈیں۔ اگر کوئی ایسا کرے۔ تو اُسے چاہ زمزم میں غسل کرنا لازم ہے۔

(۱۲) یزیدی کے لئے جائز نہیں کہ پاخانے میں داخل ہو

یا حمام میں غسل کرے۔

(۱۳) یزیدیوں کے لئے سبزی کھانا جائز نہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں پر مچھلی کھانا حرام ہے۔ جو شخص ان شرطوں کے خلاف کرے گا خواہ قہراً و جبراً خواہ برضاد رغبت دین سے خارج ہو جائے گا۔

جب ترک گورنروں کو ان وجوہ کا علم ہوا اور انہوں نے دیکھا کہ عرضی کے ساتھ یزیدیوں نے بہت سا روپیہ بھی نذر کیا ہے۔ تو انہوں نے یہ عذرات قبول کر لئے۔ اور ان کو سپاہی بھرتی دینے سے معاف کر دیا۔ جس دن یہ عرضیہ قبول ہوا ہے۔ اُس دن کو یزیدی آج تک مقدس سمجھتے ہیں۔ اور اس کا احترام کرتے ہیں۔

بچپن کی یاد

از:- محترمہ شبیر خالدہ "ادیب فاضل" اڈیٹر رسالہ "زیب النساء" (لاہور)

بچپن کا زمانہ بھی کیسا دلچسپ زمانہ ہوتا ہے۔ ..... جس کی یاد بسا اوقات کلیجہ میں چٹکیاں لے کر بے چین کر دیتی ہے۔ جب کبھی خیال آتا ہے۔ .... کہ اب وہ بے فکری اور خوش نصیبی کا زمانہ نصیب نہ ہوگا۔ تو مایوسی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ مجھے وہ دن کس حسرت سے یاد آتے ہیں۔ جب ..... میں صحنِ چمن میں پھول چُننے جایا کرتی تھی۔ .... اور غمگین نرگس میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتی تھی۔ .... میرے کمزور ہاتھوں سے گر کر پھول زمین پر ڈھیر ہو جاتے تھے۔ اور میں حیران و پریشان کھڑی پھولوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہ جاتی تھی۔ پھر بہ صحن چمن میں ہمسن لڑکیوں سے آنکھ مچولی کھیلنا میرے دل کو۔ آہ میری زخم خوردہ دل کو تڑپا دیتا ہے! شاخ گل پر دل گرفتہ بلبل اپنی دلسوز آواز سے نغمہ صحرائی میں محو ہوتی تھی۔ ..... اُسکی آواز کسقدر پیاری معلوم ہوتی تھی۔ .... نرم و نازک اور سبز پتیاں فطرت کی نقاشیاں دکھا دکھا کر اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ .... میں والہانہ انداز کے ساتھ گل چینی میں محو ہو جاتی تھی۔ ..... اب اس بیفکر اور معصوم زمانہ کی یاد گھنٹوں خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ اور رہ رہ کر یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے ؎

اسیر پنجۂ عہد شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

انسانی زندگی کے تین دور ہیں۔ بچپن۔ شباب اور بڑھاپا۔ انمیں سے صرف بچپن ہی کے زمانے کو کشمکش غم سے آزاد اور افکار دنیا کے احساس کے بغیر ملے ہوتے دیکھا؟ .... اکثر جوانی کی دلکش بہار کو خزاں رسیدہ درختوں کی طرح غم کا زعفرانی لباس پہنے دیکھا۔ بڑھاپے کے دامن پر پرہیزگاری اور دستار فضیلت پر بھی ریاکاری کے دھبے پائے لیکن طفلی کا معصوم و مسرور چہرہ عصیاں کے دھبوں سے پاک صاف نظر آیا۔ اسوقت تمام کائنات پر معصومیت کا طلائی ورق چڑھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ زمانہ خواب و خیال ہو گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے الوداع کہہ گیا۔ .. لے دیکر صرف یہ تمنا باقی رہ گئی ہے کہ ؏ دو دن کو اے جوانی دیدی اُدھار بچپن۔

منظومات

غزل

از:- مصورِ جذبات حضرت جوش ملیح آبادی

طالع ہوئی ہے صبح دل افروز ناز کر
اے فتنۂ زمانہ درِ فتنہ باز کر

اُٹھ اور شکستِ ظلمتِ شب کی خوشی منا
آ، اور بساطِ فتح پہ راز و نیاز کر

اُٹھ اور بلند و پست کو دے رخصتِ سجود
آ، اور کائنات کو پامالِ ناز کر

رُخ کو انیسِ عشق و حریفِ خرد بنا
عشوے کو دوست پرور و دشمن گداز کر

اے فتنہ خیز شاہدِ رعنائے میکشاں
تائید بادہ نوشئ اہلِ نیاز کر

اے چشم آہوانۂ زاہد فریب اُٹھ
اہلِ حرم کو مائلِ ترکِ نماز کر

اے فاتحِ تبسمِ گل مسکرا کے دیکھ
اے خالقِ خرامِ صبا مشقِ ناز کر

قلبِ گدا میں وسوسۂ مدعا نہیں
اے شاہ اب تو عشوۂ مسکیں نواز کر

آ، موت کی جبیں پہ لگا مہرِ خوشی
ہر سانس کو مسیح کی عمرِ دراز کر

کلیوں میں پڑ چکی ہے شکن، آنکھ کھول دے
سرخی اُفق پہ ہے درِ میخانہ باز کر

ہاں اے چمن حدیثِ رُخِ آتشیں سنا
ہاں اے صبا حکایتِ زلفِ دراز کر

قدموں پہ تیرے جوش سا سرکش ہے سرنگوں
اے خواجہ اپنے رتبۂ عالی پہ ناز کر

افسانہ

دھمکی
(افسانہ)

از:-
عاشق بٹالوی بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔

لاہور میں نمائش تھی۔ میرے دوست افتخار حسین بیدؔل ایم۔ اے بھی یہیں تھے۔ ہم نے ارادہ کیا تھا کہ آج نمائش کی ایک ایک چیز دیکھیں گے۔ چنانچہ دوپہر سے ہم نمائش گاہ کا چپہ چپہ چھاننے میں مصروف تھے۔ منٹو پارک کا وسیع احاطہ اپنے طول و عرض کی وسعت کے باوجود تماشائیوں کی کثرت سے تنگ ثابت ہو رہا تھا۔ اتوار کا روز چھٹی کا دن۔ دفتر، کچہری، کالج سب بند۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کی تمام آبادی اسی طرف اُلٹ پڑی ہے۔ بیدؔل صاحب میرے اُن چند دوستوں میں ہیں جن کے ساتھ سالہا سال کے مراسم کی وجہ سے حد درجہ بے تکلفی پیدا ہو گئی ہے اور اس بے تکلفی کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ذاتی و خانگی حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں۔ کالج میں جملہ تعلیمی مراحل ہم دونوں نے پہلو بہ پہلو طے کئے۔ اس کے بعد کسب معاش کی وجہ سے میں نے لاہور ہی میں اقامت اختیار کر لی۔ اور بیدؔل صاحب چونکہ غم روزگار سے بالکل آزاد تھے۔ اس لئے وہ کبھی اپنے وطن چلے جاتے اور کبھی لاہور آ جاتے۔ بیدؔل کے والد ملتان کے چوٹی کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ اور بیدؔل چونکہ اُن کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لئے تمام شفقتِ پدری کا مرکز ہونے کے علاوہ اُن کی ساری جائداد کا تنہا مالک بھی وہی تھا۔ بایں ہمہ بیدؔل کے والد اولاد کی پرورش میں خاص اصولوں کے پابند تھے وہ بچوں کو صرف اتنا روپیہ دیتے تھے۔ جو ان کی جائز ضروریات کی کفالت کر سکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ بیدؔل لاکھوں کی جائداد کا مالک ہونے کے باوجود زمانہ طالبعلمی میں ہمیشہ کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا رہا۔ اور اب فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی اُنکے طرز بود و ماند میں اسراف کا شائبہ تک نہ تھا۔ لاہور میں بیدؔل کے والد نے چند مکانات اور بنگلے خرید رکھے تھے۔ اور انہیں میں سے ایک مختصر سا لیکن اچھا خوش وضع مکان بیدؔل کے لئے مخصوص تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا خواہ ایک ہفتہ ٹھیرنا ہو یا مہینوں قیام منظور ہو، اسی مکان میں ٹھیرتا تھا۔ رہنے کے کمرے اُس نے اپنے مذاق کے مطابق خوب آراستہ کر رکھے تھے۔ اور اس کے قیام لاہور کے دوران میں مجلسِ احباب اکثر انہی کمروں میں گرم ہوتی تھی۔ والدین کا اکلوتا فرزند ہونے کی وجہ سے اُسے اپنے اوقات پر وہ بے محابانہ اختیار حاصل نہ تھا جس سے ہم مالا مال تھے۔ گھر سے باہر اگر اُسے ایک ہفتے سے زیادہ مدت گزر جاتی۔ تو فوراً اُس کی طلبی کے خطوط آنا شروع

ہو جاتے تھے۔ اُس کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ مستقل
طور پر لاہور میں بود و باش اختیار کر لے۔ لیکن اُدھر
والدین کی محبت کا تقاضا تھا کہ اُن کا نورِ نظر گھڑی بھر کے
لئے اُن کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ وہ کبھی کبھی ان
مجبوریوں سے تنگ آ کر کہہ اُٹھتا تھا کہ ماں باپ کا
اکلوتا لڑکا ہونا بھی ایک مصیبت ہے۔ بہرحال جہانتک
مصلحت و واقعات اجازت دے سکتے تھے۔ وہ اپنے
اوقات کا بیشتر حصّہ لاہور میں بسر کرنے کے عذر تلاش لیا
کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بیدؔل نے ڈرتے ڈرتے انگلستان جانے
کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن بیدؔل کے والد اس تحریک
کے شدید مخالف تھے۔ وہ پُرانی وضع کے بزرگ تھے۔
جن کا خیال تھا کہ جب گھر میں کھانے کو بہت ہے تو کیوں
ملک ملک کا پانی پیا جائے۔ علاوہ ازیں وہ سمجھتے تھے
کہ ولایت جا کر ہندوستانی نوجوانوں کے اخلاق بگڑ جاتے
ہیں جس سے قوم کی قوم میں بُرائی کے جراثیم سرایت کر
جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔

نمائش میں گھومتے گھومتے جب ہم اُس حصّے میں
داخل ہوئے جو تفریحات کے لئے وقف تھا تو ہنڈولے
جادو کے کھیل، ورزش کے کرتب اور متعدد دیگر دلچسپ
تماشے دیکھنے کے لئے خلقت کا ایک جمِ غفیر موجود تھا۔
کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور ہجوم کے ریلے سے ایک
جگہ پاؤں جمنے مشکل ہو گئے تھے۔ ایک طرف ہٹ کر
کچھ فاصلے پر خواتین کھڑی تھیں۔ شاندار ساڑھیوں،
حسین و جمیل چہروں اور زرق برق ملبوسات کی چمک کے
ساتھ خوشبو کی لپٹیں اور لوچدار قہقہے ملکر اس منظر کو ایک
ایسی رومانی کیفیت بخش رہے تھے کہ اکثر و بیشتر تماشائیوں
کی نظریں صرف اس "جنت نگاہ" کے لئے وقف ہو چکی
تھیں۔ بیدؔل بھی غالباً انہیں میں سے تھا۔ کیونکہ یکایک
اُس نے میرا بازو ہلایا اور کہا "وہ دیکھو شمسہ کھڑی ہے"
میں نے آنکھیں پھرائیں تو اُس نے اشارے سے بتایا۔
عورتوں کے مجمع میں قدرے نمایاں جگہ پر مس شمسہ
بدرالدین کھڑی تھیں۔ اس کے بعد جبتک ہجوم وہاں سے
منتشر نہیں ہو گیا۔ بیدؔل کھیلوں کی طرف کم اور مس
شمسہ کی طرف زیادہ متوجہ رہا اور آخر جب نہ رہا گیا تو شکوہ
آمیز لہجے میں کہنے لگا "میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مس
شمسہ سے میرا بھی تعارف کرا دو لیکن تم اس معاملہ میں
ہمیشہ سُنی اَن سُنی ایک کر دیتے ہو"

میں نے ہنس کر کہا "لیکن تعارف پیدا کرانے کی
اسقدر بے تابی کیوں ہے؟"

"بیتابی؟ بیتابی تو کسی کو نہیں۔ یونہی ایک تعلیم یافتہ
مہذب خاتون کے ساتھ ملاقات کی خواہش ہر پڑھے
لکھے آدمی کو ہوتی ہے۔ ہماری معاشرت میں چونکہ پردے
کی قید شدت سے رائج ہے اس لئے ابھی تک سوسائٹی
میں اس قسم کی عورتوں کا وجود آٹے میں نمک کی حد تک
بھی نہیں پہنچا"

"تو بھائی مس شمسہ کے ساتھ واقفیت پیدا کرانا کونسا
جان جوکھوں کا کام ہے۔ کہ آپ اس بارِ عظیم کو میری شرکت
کے بغیر اُٹھا ہی نہیں سکتے"

اس پر بیدؔل کسی قدر جھلا کر بولا "یہ تو میں جانتا ہوں
کہ تم اس معاملے میں سخت خودغرض واقع ہوئے ہو"

میں نے ہنس کر کہا "اچھا طعن و تشنیع کو چھوڑو۔ تو
آج ہی میں تمہیں اُس سے متعارف کئے دیتا ہوں۔"
ہم نے دور ہی سے دیکھا کہ مس شمسہ نمائش کے
ریسٹوران میں داخل ہو رہی ہیں۔ میں نے بیدل سے
کہا کہ اب ذرا عجلت سے کام لو تاکہ چائے پینے کے
بہانے سے ہم بھی عین موقع پر وہاں پہنچ جائیں۔ چنانچہ
ہم ریسٹوران کے دروازے سے داخل ہوئے ہی
تھے کہ مس شمسہ سامنے صوفے پر بیٹھی نظر آئیں ہمیں
دیکھ کر پُر تپاک انداز میں کھڑی ہو گئیں۔ اور آگے بڑھکر
بڑی گرمجوشی سے اُنہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا۔
ہم بھی اُن کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نمائش
کی چہل پہل اور سودیشی مصنوعات پر ایک مختصر سا تبصرہ
ہُوا۔ اتنے میں چاء آ گئی۔ اور گفتگو کا پہلو بدلنے کے لئے
میں نے بیدل کی طرف اشارہ کر کے مس شمسہ سے پوچھا
"میرے دوست بیدل صاحب سے تو شاید
آپ کا تعارف نہیں ہے؟"
"جی نہیں ——— مجھے افسوس ہے۔"
"آپ میرے نہایت عزیز دوست افتخار حسین
صاحب بیدل ہیں۔ ہم دونوں کالج میں ایک ساتھ
پڑھتے رہے ہیں۔ آپ تاریخ کے ایم۔اے اور پنجاب
کے ایک ذہین و خوش فکر شاعر ہیں۔"
مس شمسہ اور بیدل نے متبسم ہو کر ایک دوسرے
سے ہاتھ ملایا۔ اور شمسہ نے نہایت ملاطفت کے ساتھ
پوچھا۔ "آپ لاہور ہی کے رہنے والے ہیں؟"
بیدل نے جواب دیا "جی نہیں میرا اصلی وطن
ملتان ہے۔"
"ملتان! گویا پنجاب کی سرحد کہئے نا؟"
اس پر ایک فرمائشی سا قہقہہ لگا۔ اور ہم چائے میں
مصروف ہو گئے۔ چند منٹ کے بعد مس شمسہ پھر بیدل
سے مخاطب ہوئیں:۔
"بیدل صاحب، آپ کے مشاغل کیا ہیں؟"
بیدل نے جواب میں قدرے توقف کیا تو میں
دخل در معقولات کی پروا نہ کرتے ہوئے بول اُٹھا۔
"بیدل صاحب کے مشاغل نہ پوچھئے۔ جو شخص
ملتان کے سب سے بڑے رئیس کا ایک اکلوتا لڑکا اور
لاکھوں کی جائداد کا واحد مالک ہو اُس کے مشاغل ہو ہی
کیا سکتے ہیں۔ مولٰنا محمد حسین آزاد مرحوم کے الفاظ میں ایک
رئیس زادے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ دو وقت کا
کھانا ہضم کرے۔"
مس شمسہ اس لطیفے سے بہت محظوظ ہوئیں اور
بیدل کھسیانا سا ہو گیا۔ میں نے اُس کی دلجوئی کے لئے کہا
"مس شمسہ، بیدل صاحب صد درجہ خوش قسمت انسان
ہیں۔ کہ اس کشمکش کے زمانے میں قدرت نے اُنہیں
فکرِ معاش سے محفوظ رکھا ہے۔ خدا کا خاص احسان ہے
کہ آجکل جبکہ روزگار کی پریشانیوں نے تمام دنیا کے
چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ یہ ہر پہلو سے مطمئن زندگی بسر کر رہے
ہیں۔ کبھی آپ کو ملتان جانے کا اتفاق ہو تو دیکھئے گا کہ
بیدل صاحب کے خاندان کی دنیوی حیثیت ہمارے
صوبے کے والیانِ ریاست سے کم نہیں ہے۔ پھر جب
تموّل و فارغ البالی کا یہ عالم ہو تو بیدل صاحب کو کیا مصیبت

پڑی ہے کہ ہماری طرح مزدوروں کی زندگی بسر کرتے پھریں"۔

مس شمسہ نے مرعوب ہو کر بیدل کی طرف غور سے دیکھا اور پھر ایک خاص انداز میں کہنے لگیں:۔

"کس قدر خوشی کی بات ہے کہ بیدل صاحب نے ان حالات میں رہکر اپنے آپکو اعلیٰ تعلیم سے فیضیاب کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ورنہ بالعموم آجکل کے رئیس زادے جنہیں گھر سے کھانے کو مل جائے پڑھنے لکھنے کا نام نہیں لیتے"۔

میں نے آہستہ سے بیدل کا شانہ دبایا اور پھر اس کی مزید ہوا باندھنے کے لئے کہا:۔

"آپ دیکھیں گی کہ بیدل صاحب صرف درسی کتابیں رٹ کر کامیاب ہونے والے ایم اے ہی نہیں۔ بلکہ بیحد پاکیزہ مذاق اور وسیع معلومات کے انسان ہیں۔ تہذیب و معاشرت اور اور ادب و سیاست کا کوئی پہلو نہیں جس پر بیدل صاحب نے سینکڑوں کتابیں نہ پڑھ ڈالی ہوں۔ اعلیٰ مطالعہ اور فطری ذہانت نے ان کے دل و دماغ کو ایسی جلا بخشی ہے کہ ان کا وجود تعلیم یافتہ طبقے کے لئے مغتنمات سے ہے"۔

بیدل اپنی تعریف سن سن کر شاید گھبرا گیا تھا۔ کیونکہ میں نے ابھی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ "ارے بھئی چھوڑو بھی اس قصے کو، مس شمسہ! معاف فرمایئے گا۔ ان حضرت کی تو عادت ہے۔ کہ دنیا بھر کے تفنن اور مذاق کا مرکز اپنے دوستوں ہی کو بناتے ہیں۔ میں کیا اور میری لیاقت کیا۔ آجکل تو گلی گلی کوچے کوچے میں چھوکرے گاتے پھرتے ہیں:۔ "ایم اے بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی"۔ پھر اگر میں نے ایم۔ اے کر لیا تو کونسا سرخاب کا پر مجھے لگ گیا۔ بہر حال اگر آپ کو میرے اندر کوئی چیز قابلِ تعریف نظر آتی ہے۔ تو اسے آپ جیسے (میری طرف اشارہ کرکے) فاضل دوستوں کی صحبت و ہم نشینی کا اثر کہئے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم"۔

مس شمسہ بدر الدین ایک عیسائی لڑکی تھی جس کی عمر کا اندازہ بیس اور پچیس سال کے درمیان کیا جاسکتا تھا وہ کب سے لاہور میں تھی، اس کا صحیح علم کسی کو نہ تھا۔ خود اُس کی زبانی جو کچھ وقتاً فوقتاً معلوم ہوسکا اُس کا ملخص یہ تھا کہ وہ دراصل کانپور کی رہنے والی ہے۔ اُسکا والد پہلے مسلمان تھا۔ لیکن مذہب عیسوی اختیار کرنے کے بعد اُس نے ایک عیسائی عورت سے شادی کرلی تھی اور شمسہ اُسی کے بطن سے تھی۔ شمسہ کے والد کے انتقال کے بعد اُس کی ماں چند در چند مصائب میں گرفتار ہوگئی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ بدر الدین آنجہانی کے رشتہ داروں کی بدسلوکی تھی۔ چونکہ بدر الدین مرحوم اپنے پیچھے کافی روپیہ چھوڑ گئے تھے۔ اس لئے شمسہ کی ماں نے یہی مناسب سمجھا کہ آئے دن کی جھنجھٹ سے نجات پانے کے لئے نقل مکانی کر کے کسی اور شہر میں سکونت اختیار کرلی جائے چنانچہ ماں بیٹی لاہور آگئیں نکلسن روڈ پر اچھے متوسط درجے کے لوگوں کی آبادی میں انہوں نے ایک خوبصورت سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ مکان کے دروازے پر "مس شمسہ بدر الدین" کے نام کی ایک چھوٹی سی برنجی تختی آویزاں تھی۔ جس سے بجز مکین کے نام کے اُس کے دیگر

حالات و مشاغل کے متعلق کوئی بات ظاہر نہ ہوتی تھی۔ شمسہ کو اردو اور انگریزی میں اتنی دسترس تھی کہ وہ دونوں زبانوں میں روانی سے تحریر و تقریر کا کام کر سکتی تھی۔ مس شمسہ کی سب سے بڑی خوبی جس نے اُسے لاہور کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مشہور کر رکھا تھا۔ اُس کی آواز تھی۔ وہ موسیقی سے خوب واقف تھی لیکن مہارت فن کے علاوہ جس چیز نے اُسے ایک ساحرہ کا درجہ عطا کر دیا تھا اُس کی آواز تھی۔ میں نے اکثر عورتوں کو گاتے سنا ہے۔ لیکن جو جادو شمسہ کے گلے میں تھا اور کہیں نہیں دیکھا۔ کسی مرغزار میں آہستہ آہستہ بہنے والی ندی کے کنارے فضا کی خاموشی میں بنسری کی حزین و ملول لے بلند ہو کر روح میں جو رقت پیدا کرتی ہے۔ وہی سوز و گداز شمسہ کی آواز میں تھا۔ میں نے جب بھی اُس کا گانا سنا یہی محسوس ہوا کہ محبت کی نامرادی اور عشق کی حرماں نصیبی موسیقی کی زبان میں بیان کی جا رہی ہے۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں روپیہ جمع کرنے کے لئے لاہور میں گاہے گاہے ہنگامی جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور اس طرح جتنا روپیہ اکٹھا ہو کسی کار خیر میں صرف کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے جلسے بالعموم شہر کے علمی و ادبی یا اصلاحی و رفاہی اداروں کے زیر اہتمام ہوتے ہیں اور عوام کی کشش کے لئے اُن جلسوں میں دلچسپی کے مختلف سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ موسیقی کا انتظام ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ڈرامہ کھیلا جاتا ہے۔ بعض اوقات مسمریزم کے کرتب تماش کے کھیل اور جمناسٹک کے نمونے دکھائے جاتے ہیں۔

غرضکہ لوگوں کی دلبستگی کے بہترین لوازم تہذیب شائستگی کے ساتھ مجتمع کر کے روپیہ فراہم کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ان مجامع کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ موسیقی ڈراما یا اور کھیلوں میں حصّہ لینے والے لوگ عموماً پیشہ ور طبقے کے افراد نہیں ہوتے۔ بلکہ زیادہ تر کالجوں کے طلبا اور معلم یا سرکاری و غیر سرکاری شعبوں کے معزز اراکین ہوتے ہیں جو ایسے موقعوں پر بلا معاوضہ رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں شمسہ نے اوّل اوّل اسی قسم کے جلسوں میں شریک ہو کر سامعین کو مبہوت بنایا۔ اور جوں جوں اُس کی شہرت پھیلتی گئی۔ لاہور کی مہذب آبادی میں اس "نووارد" کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد لوگوں کا یہ تفحص و تجسّس بھی کم ہو گیا۔ اور شمسہ ایک "تسلیم شدہ حقیقت" کی حیثیت سے لاہور کی ایک جانی پہچانی ہستی بن گئی۔ اُس نے اپنے مکان کے دروازے پر "زنانہ میوزک سکول" کے نام کی تختی آویزاں کر لی۔ جس سے مراد تھی کہ اس جگہ خواتین کو موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود شمسہ بہت رکھ رکھاؤ کی عورت تھی۔ وہ بظاہر کسی سے بے تکلف ہونا نہ جانتی تھی۔ اور غالباً اس کے اس محتاط طرز عمل کا نتیجہ تھا کہ اُس کی سنجیدگی و نیک چلنی کی شہرت لاہور میں قایم ہو گئی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت زیادہ حسین نہ تھی تاہم اُس کے چہرے کا نقشہ عام عورتوں کا سا نہ تھا۔ اُس کی رنگت صاف تھی۔ ناک اور ہونٹ بے عیب تھے لیکن آنکھوں کے اندر ایک ایسی دلکشی تھی کہ جب وہ اپنی لمبی لمبی

پلکیں اُٹھا کر مخاطب کو پوری توجہ سے دیکھتی تو ناپاک
ضمیر بھی اس سحر کے سامنے کانپ کانپ جاتا تھا۔
ساڑھی کے اندر لپٹی ہوئی نگاہیں زمین پر جمائے جب
وہ تیزی کے ساتھ سامنے سے گذر جاتی تو اُس کے
قامت کی رعنائیاں اُس کے پہلوؤں کے دلاویز
خم کے ساتھ ملکر دیکھنے والے کے دل میں ایک کھلبلی
سی مچادیتی تھیں۔

بیدل نے شمسہ سے متعارف ہونے کے بعد
ایسے طریقے سے میل ملاقات بڑھانا شروع کی دنیا
پر یہی ظاہر ہو کہ سب کچھ گویا اتفاقیہ ہو رہا ہے۔ علی الصبح
سیر کے لئے وہی سڑک اختیار کی جس طرف شمسہ
جانے کی عادی تھی۔ شام کی تفریح کے لئے بظاہر
بلا ارادہ لیکن فی الحقیقت بالارادہ وہی سنیما منتخب
کیا جس میں عام طور پر شمسہ جاتی تھی۔ اس طرح سر
راہے گاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی مصافحہ
بھی۔ ایک روز ایسی ہی رواروی کی ملاقات ہوئی۔
تو بیدل نے شمسہ کو اپنے ہاں کھانے میں شرکت کی
دعوت دی۔ شمسہ نے معذرت کی کہ اُسی شام خود اس
کے ہاں چند مہمان آرہے تھے۔ اور ساتھ ہی اُس نے
بیدل سے فرمایش کردی۔ کہ "آج شام آپ غریب خانہ
پر ماحضر تناول فرمائیے۔ پھر فرصت کے کسی موقع پر
میں حاضر ہو جاؤں گی۔" بیدل نے بہ طیب خاطر دعوت
قبول کرلی۔ اور اس طرح پہلی مرتبہ وہ شمسہ کے مکان
میں ایک مہمان یا ایک دوست کی حیثیت سے داخل
ہوا۔ اور شمسہ نے جس حسن سلوک و مدارات کا مظاہرہ
کیا۔ اُس نے بیدل کو اسقدر جرأت دلادی کہ اب اُس
نے تقریباً روزانہ شمسہ کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ چند
ہی روز میں مراسم اسقدر بڑھ گئے کہ آج شمسہ بیدل کے
ہاں مدعو ہے تو کل بیدل کو شمسہ کے ہاں سے دعوت
آئی ہے۔ دونوں اکھٹے کبھی لاہور کے کسی بہترین ریسٹوران
میں چائے پیتے کبھی کسی شاندار ہوٹل میں کھانا کھاتے
اور ظاہر ہے کہ مصارف کا بوجھ بیدل ہی کو اُٹھانا
پڑتا تھا۔ اس دوران میں بیدل سے میری ملاقات
بتدریج کم ہوتی گئی۔ کچہری کے دھندوں سے صرف
اتوار کے روز فرصت ملتی تھی۔ اور فراغت کا یہ ایک
دن بھی ہفتے بھر کے رُکے ہوئے کاموں کی نذر
ہو جاتا تھا۔ بیدل میرے مکان پر بہت کم آتا تھا
اور میں قلت فرصت کی وجہ سے اُس کے ہاں بار بار
جانے سے معذور تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیدل کے متعلق بیشتر
اطلاعات مجھ تک چند دیگر اشخاص کی زبانی پہنچتی تھیں
ایک روز کچہری سے واپسی پر وہ مجھے راستے میں مل گیا
اور میں اُسے کشاں کشاں اپنے ہمراہ کھینچ لایا۔ علیک
سلیک کے بعد جب ہم ایک دوسرے کی رسمی خیریت
دریافت کر چکے۔ تو میں نے پوچھا "مس شمسہ بدرالدین
تو اچھی ہیں؟"

بیدل نے کسیقدر جھینپ کر جواب دیا۔ "ہاں
بالکل اچھی ہیں۔ کہو، اُن سے کوئی کام ہے؟"

"تم اپنے کاموں سے نپٹ لو تو میں بھی کچھ عرض
کروں۔"

گفتگو آہستہ آہستہ فقرہ بازی پر اُتر آئی اور ہم نے

مذاق کے رنگ میں ایک دوسرے سے خوب
نوک جھونک کی۔

بیدل نے شمسہ کی مدح وستائش میں کوئی
کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اُس کے ذوقِ سلیم اور اُسکی سنجیدہ ظرافت
کی تعریف کی۔ شرافت واخلاق کے لحاظ سے اُسے
انسانیت کا معیار قرار دیا۔ عادات واطوار کے اعتبار
سے اُسے بے عیب بتایا۔ غرضکہ انسانی سیرت وصورت
کی کوئی خوبی نہ تھی جس سے شمسہ محروم ہو۔ اور آخر
بیدل نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ تمام ظاہری وباطنی
محاسن جن سے ایک عورت متصف ہوسکتی ہے شمسہ
میں بدرجۂ کمال موجود ہیں۔

کم وبیش ایک سال گذر گیا۔ بیدل شمسہ پر بیدریغ
روپیہ خرچ کرتا رہا۔ اُس نے ہر ممکن کوشش کی کہ اپنی
جملہ کارروائیوں کو پردۂ خفا میں رکھ سکے اور وہ شاید مطمئن
تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے دوسروں کی آنکھ سے اوجھل ہے
لیکن لاہور میں بے شمار لوگ ایسے بھی ہیں جو دیکھ
بھال کر انجان بنے رہتے ہیں۔ بیدل نے بالا بالا
اپنے والد کے کارندوں سے ملکر کسی بہانے سے
ایک بہت بڑی رقم حاصل کر لی۔ جو اُس کے روز افزوں
اخراجات کی کفالت کرتی رہی۔ اب اُس کے حالات
میں کچھ تغیر سا آگیا۔ وہ ملتان چلا گیا اور زیادہ وقت
وہیں گذارنے لگا۔ کبھی کبھی لاہور آتا، دو چار روز ٹھہرتا
اور واپس چلا جاتا تھا۔ مجھ سے عمداً کنارہ کشی کرنے لگا۔
اور میں بھی خواہ مخواہ بارِ خاطر بننے سے احتراز کرتا تھا۔ میں
نے اُڑتی اُڑتی خبر سنی کہ بیدل لاہور کے ایک مشہور
ساہوکار سے بہت سا روپیہ قرض لے رہا ہے۔ یہ خبر
میرے لئے یقیناً رنجدہ تھی۔ کیونکہ بیدل کی حیثیت و
وجاہت کے انسان کا ان باتوں پر اُتر آنا اُس کی اور
اُس کے خاندان کی رُسوائی کا باعث تھا۔ میں نے اُسے
ایک ضروری خط لکھ کر لاہور بلایا لیکن وہ یہاں آکر بھی
مجھ سے ملنے سے پہلوتہی کرتا رہا۔ شاید اُس کے دل میں
خیال ہوگا کہ میں اُس کے اور شمسہ کے تعلقات پر معترض
ہونگا۔ ایک روز خلاف توقع صبح صبح بیدل میرے
ہاں آگیا۔ وہ کچھ نادم، پریشان اور کھویا کھویا سا تھا۔
آتے ہی بغیر کسی تمہید کے اُس نے اپنے گذشتہ طرزِ
عمل پر اظہارِ افسوس شروع کر دیا۔ کہنے لگا۔ "اگرچہ
میں نے مملکتِ دوستی میں بظاہر کوئی غداری نہیں کی۔
لیکن میں شرمسار ہوں کہ تم سے ملنے میں کوتاہی برتتا
رہا ہوں۔ مجھے ندامت سے اپنی اس غلطی کا اعتراف
کرنا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے اُمید ہے کہ تم ہمیشہ کی طرح
اب بھی مجھے اپنی محبت وشفقت سے نوازنے میں
بخل نہیں کروگے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں اور
تم اب بھی مجھے ویسے ہی عزیز ہو۔ لیکن اُن دیرینہ
مخلصانہ مراسم کے پیشِ نظر جو ہمارے درمیان قائم ہیں
میں یہ توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ کہ تم مجھے رازداری
کے ناقابل خیال کرکے اپنے اہم معاملات میں بعض ادنیٰ
قماش کے لوگوں پر اعتماد کرتے پھرو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ
تمہارے متعلق جو افواہیں گشت لگا رہی ہیں۔ میں اُن سے
ابتک بے خبر ہوں؟"

بیدل نے گھبرا کر کہا "کون سی افواہیں؟"

"کونسی افواہیں! یہی کہ تم نے والد سے چوری اپنے کارندوں سے پانچ ہزار کی رقم ایک اڑائی اور پھر مولراج ساہوکار سے چھ ہزار کی رقم الگ لی اور اس تمام روپے کو تم نے عیاشی میں خراب کیا۔ کیا ایک تعلیم یافتہ شریف زادے کے یہی لچھن ہونے چاہئیں؟"

بیدل نے اٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور نہایت لجاجت سے کہنے لگا "خدا کے لئے اس علم کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا۔ لیکن تمہیں کیا معلوم کہ میں کس مخمصے میں گرفتار ہوں۔ اگر تم میری نادانیوں کی تفصیل سنو تو مجھ سے ہمدردی کرنے لگو گے۔ میں اسی لئے یہاں آیا ہوں کہ تم سے کوئی نجات کی راہ دریافت کروں۔"

میں نے کہا "بتاؤ وہ کونسی مصیبت ہے جس نے تمہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے؟"

"ذرا غور سے سنتے جاؤ۔ میں تمام واقعات اختصاراً سے بیان کئے دیتا ہوں۔ پہلی پانچ ہزار کی رقم سے جس کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے دو ہزار میں نے شروع شروع میں شمسہ پر خرچ کئے۔ اسے میں نے اپنی خاندانی جائداد اور آمدنی کے متعلق تمام حالات بتادیئے تھے۔ تھوڑا ہی عرصہ گذرنے پایا تھا کہ ہمارے درمیان محبت آمیز خطوط کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ اور میں نے اس سے شادی کی فرمائش کر دی۔ جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا۔ تم جانتے ہی ہو ہمارے کنبے میں شادی بیاہ کے معاملات ابھی تک ذات پات کے دقیانوسی اصولوں کے ماتحت طے ہوتے ہیں۔ اور ہماری برادری کا کوئی شخص دوسری قوم کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی اس تجویز کا والدہ سے ذکر کیا۔ تو وہ اسقدر خوفزدہ ہوئیں۔ کہ ان کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے رو کر مجھ سے کہا کہ اگر تم نے ایسی حرکت کی تو ہمارے خاندان کی پشتوں کی عزت خاک میں مل جائے گی اور شرم و ندامت کی وجہ سے ہمیں خانہ بدوش بنکر وطن چھوڑ دینا پڑے گا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ تم اپنے والد کے اکلوتے لڑکے ہو لیکن یاد رکھو تمہارا باپ تمہاری موت کا صدمہ برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن اس بات کی تاب نہیں لا سکتا کہ ایک بے ننگ و نام عیسائی لڑکی بہو بنکر اس کے مکان میں داخل ہو۔ ادھر شمسہ کا اصرار بڑھ رہا تھا کہ شادی کی رسوم جلد ادا ہونی چاہئیں۔ جب لاچار ہو کر میں نے معذوری کا اظہار کیا۔ تو وہ غصے سے بھڑک اٹھی۔ اس نے مجھے خط لکھا کہ وہ عنقریب عدالت میں میرے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے والی ہے۔ میرے بہت سے ایسے خطوط اس کے پاس موجود تھے۔ جو مجھے مجرم بنانے کے لئے کافی تھے۔ میں فوراً لاہور پہنچا اور شمسہ کو تین ہزار روپیہ دیکر بمشکل راضی کیا کہ وہ سر دست عدالت میں جانے سے توقف کرے۔ زیادہ مدت گذرنے نہ پائی تھی کہ پھر اسی قسم کے تہدید آمیز خطوط آنا شروع ہو گئے۔ اور میں نے مجبور ہو کر اسے تین ہزار کی اور رقم دیکر خاموش کیا ابھی ایک مہینہ نہیں ہوا کہ پھر اس کا مطالبہ شروع ہو گیا تھا۔ اور میں تین ہزار پھر نذر کر کے آرہا ہوں۔ اب حالت

یہ ہے۔ کہ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں۔ مقروض حد سے زیادہ ہو چکا ہوں۔ صبح و شام کی پریشانی علیحدہ لاحق ہے ادھر شمسہ کی طرف سے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر اُس نے دعویٰ کر کے مجھے عدالت میں بُلا لیا۔ تو عمر بھر کی عزت تباہ ہو جائے گی۔ اور اگر دعویٰ نہ کیا تو شاید مجھ سے اَور روپے کا مطالبہ کرے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں میں کیا کروں ؟"

اُس کی یہ داستان سُن کر میں نے جواب دیا "نہیں چاہئے تھا۔ کہ جونہی اُس نے تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ تم فوراً میرے پاس آتے اور میں معاملہ وہیں کا وہیں سنبھال لیتا۔ اس کے بعد سب سے بڑی غلطی تم نے یہ کی کہ اُسے روپیہ دیکر خاموش کرنا چاہا۔ ظاہر ہے کہ شمسہ کا ارادہ شروع ہی سے یہ تھا کہ وہ دھمکی دے کر تم سے روپیہ وصول کرے۔ ایک سیدھا سادا نوجوان رئیس زادہ جب ایسی عورت کے ہتے چڑھ جائے۔ تو اُس نادان کا یہی حشر ہوتا ہے۔ بہرحال اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ شمسہ کے ساتھ تمام تعلقات منقطع کر لو گے تو میں اس ناگوار قضیہ کو ختم کرنے کی کوشش کرنے پر آمادہ ہوں"

بیدل نے بلند آواز سے کہا "میں حتمی وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا"

میں جانتا تھا کہ شمسہ ایسی عورتوں میں مقدمہ بازی کی ہمت نہیں ہوتی۔ اور جہاں وہ دیکھتی ہیں کہ پانسہ پلٹ جانے کا احتمال ہو گیا ہے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے اُسی روز مس شمسہ بدرالدین کے نام ایک نوٹس بذریعہ ڈاک بھجوا دیا۔ نوٹس میں لکھا تھا کہ آپ نے میرے دوست افتخار حسین بیدل سے دغا و فریب اور تہدید و تخویف کے ذریعے جو نو ہزار روپیہ وصول کیا ہے وہ فوراً واپس کر دیجئے۔ ورنہ آپ کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اگر آپ کو بیدل صاحب کے خلاف کوئی شکایت ہے تو بخوشی عدالت میں آکر قانون سے استمداد کیجئے"۔

اس دھمکی کا اثر عین میری خواہش اور توقع کے مطابق ہُوا۔ تیسرے ہی دن مس شمسہ بدرالدین بھاگی بھاگی میرے مکان پر آئیں اور تاجرانہ رنگ میں مجھ سے سودا کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ ان کا اصرار تھا کہ اُن کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے احتراز کیا جائے اور اس رعایت کے معاوضہ میں وہ بیدل کے تمام خطوط واپس کرنے پر تیار تھیں۔ بیدل نے یہ شرط منظور کر لی اور یوں وہ "عشق و محبت کی داستانوں سے لبریز خطوط" بیدل صاحب کی جیب میں جا پہنچے۔ جنہیں غالباً بعد میں اُنہوں نے نذرِ آتش کر دیا ہو گا۔ اس واقعہ کے بعد ایک مہینے کے اندر مس شمسہ لاہور سے غائب ہو گئیں۔ اور لاہور کے زندہ دل لوگوں کے لئے اپنی دلچسپ شخصیت کے متعلق سوائے قیاس آرائیوں کے کوئی یاد باقی نہ چھوڑ گئیں +

غزل

کلامِ حشرؔ

(فی البدیہہ)

از:-
حضرت آغا حشرؔ کاشمیری مرحوم

ذیل کی غزل "رومان" کے لئے فی البدیہہ کہی گئی تھی جسے ہماری درخواست پر ہمارے عزیز دوست تاج (زرّیں رقم) سے لکھتے گئے تھے۔ اُنکے نوشتے سے یہاں بجنسہٖ نقل کیجاتی ہے۔

(ادارہ)

نہ ذوقِ تماشا، نہ شوق جوانی!
لئے جارہی ہے کدھر، عمرِ فانی!

وفاؤں کے دشمن! جفاؤں کے بانی!
تجھے کیا سنائیں ہم اپنی کہانی؟

نہ چھیڑ آہ اے موجِ بادِ بہاری!
بہت بڑھ چلی ہے مری ناتوانی!

رقابت نہ ہو کیوں زمانے کو پیدا
کہانی تری اور میری زبانی!!

یونہی کھو چکے تجھ کو اے عمرِ رفتہ!
نجانی تری قدر ہم نے نجانی!

کرم کی توقع ستمگر سے کیا ہو
کہ نادر سے مشکل ہے نوشیروانی!

مے و جام و معشوق کا ساتھ چھوٹا
بہت حشرؔ یاد آئی ہمکو جوانی

فکاہی

میری بغاوت!

از:- جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی اے (علیگ)

میں نے بغاوت پر کمر باندھلی ہے، جیسے میں باغی ہوں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ میری دلائل سنیں اور میری طرح باغی نہ ہو جائیں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ بغاوت کسقدر دہشتناک لفظ ہے۔ شاید اڈیٹر صاحب کو فکر دامنگیر ہو گی کہ کمبخت باغی کہیں ہمارا اخبار ضبط کرانے پر تو نہیں تلا ہوا ہے آپ کو کیا معلوم کہ میں علم سے باغی ہو رہا ہوں۔ تعلیم سے ترک موالات کی ٹھان لی ہے ؎

اگلے روز جو بازار سے میرا گزر ہوا۔ شومئی قسمت کہئے یا تقاضائے طبیعت کہ چھ ماہ سے کوٹ پہن رہا ہوں اور بٹن ابھی تک نہیں دیکھے۔ روشناس درزی سے دوچار ہو گیا۔ میں نے کہا بھئی بٹن تو ٹانک دیجو! جیب میں بٹن کے لئے ہاتھ ڈالا تو گرتے گرتے چھ میں سے تین ہی رہ گئے تھے۔ خیر "ایں ہم غنیمت است"۔ اگر وہ بھی گر جاتے تو اُن کا کیا بگاڑ لیتا، بٹن لگاتے ہی درزی نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں سمجھا کہ شاید تاگا کاٹنے کو قینچی مانگتا ہے۔

میں نے کہا "بھئی میرے پاس نہیں ہے"۔ یہ الفاظ منہ سے نکلنا تھا کہ وہ سیخ پا ہو گیا۔ اور کہنے لگا "اجی صاحب پیسے جیب میں نہیں تھے۔ تو بٹن ٹکوانے کی کیا ضرورت تھی؟ چار مہینے بے بٹنوں کے گزارے تھے دو اور گزر جاتے۔ لائیے میرے تین آنے کے پیسے ورنہ کوٹ رکھ جائیے"۔ میں سخت پریشان ہوا اور کہا۔ کہ "بھائی پیسے تو میری جیب میں موجود ہیں تم ناحق بگڑتے ہو! تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ کام معمولی سا تھا اور اُجرت زیادہ ہے اس پر وہ زیر لب یوں بڑبڑایا کہ "واہ جی واہ یہی تو ہم لوگوں کی محنت ہے۔ اور اگر ایسے کاموں کے دام کم ملیں گے۔ تو پھر ہم مٹی کھود کر لائیں گے؟" میں نے چپکے سے پیسے نکال اُس کی ہتیلی پر رکھدیئے ؎

کل اتفاقاً اُسی درزی کے کوچے کی طرف جا نکلا۔ درزی کی عورت اپنے گھر سے نکل کر میری طرف لپکی۔ میں سہم گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر کہیں یہ عورت غلطی سے یہ سمجھ رہی ہو کہ میں نے ابھی اس کے خاوند کے بٹن ٹانکنے کے پیسے ادا نہیں کئے۔ تو غضب ہی ہو جائے گا۔ اور لرزہ تو مجھ پر اس لئے چھا رہا تھا کہ پرانے ملنے والوں میں سے ایک آشنا میرے ہمراہ تھے، اور وہ اس وقت بھی میرے ہمرکاب تھے۔ میں نے کہا کہ یوں! کیئے دو کیلے اگر دو چار سر پر بھی پڑ جائیں تو مضائقہ نہیں۔ اور شریف آدمی کھایا ہی کرتے ہیں۔ لیکن آپ لوگ خود دانا ہیں۔ ذرا غور فرمایئے

کہ ایک باہر سے آئے ہوئے دوست کے سامنے ایک بڑھیا کا گزرتے ہوئے دامن پکڑ لینا اور کہنا کہ "موئے اتنے روز سے تین آنے پیسے ادا نہیں کئے! لاؤ دام نہیں تو اُتارتی ہوں کوٹ"! کسقدر خوفناک ہے۔ میں تو جب کبھی اس امر پر غور کرتا ہوں، بدن کانپنے لگتا ہے۔ چنانچہ میں پسینے پسینے ہوگیا۔ اور دوست کا ہاتھ زور سے جھٹک کر اس بلائے ناگہانی سے بچنے کے لئے پچھلے پاؤں لوٹا اور دوست سے عذر کیا کہ "یار میں اپنا انڈی پینڈنٹ گھر بھول آیا ہوں۔ ذرا واپس چلیں۔ لیتے آئیں"۔ اُنہوں نے کہا "کیا ضرور ہے۔ اتنی دیر کے لئے میرا رکھے رہو۔ اسی کھینچ تان میں بڑھیا بھی آ ہی نکلی۔ میں سمجھا کہ بس اب عزت کا خاتمہ ہے اور کبوتر کی طرح بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ مگر لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار تیرا کہ لاج رکھ لی۔ ہاں بھئی بے عزتی کی بھی کوئی زندگی ہے۔ بڑھیا نے میری طرف ایک لفافہ بڑھایا اور کہا کہ "بابوجی ذرا خط تو سناتے جائیو۔ نگوڑے پڑھے ہوئے یہاں کتنے ہیں۔ مارے مارے پھرتے ہیں نوکریوں کی تلاش میں۔ آج صبح سے راہ دیکھ دیکھ کر آنکھیں پتھرا گئیں۔ نگوڑا ایک بھی نہیں گذرا۔ لوجی بابوجی سُنا دو خط۔ پڑھو بابوجی خط۔ میں ذرا کم سنتی ہوں۔ اونچے پڑھیو۔ لیکن اتنا خیال رہے۔ ساتھ والے گھر میں میری نند رہتی ہے۔ وہ نہ آہٹ پالے۔ اس نے جو کہیں سُن لیا تو آفت آجائیگی"۔ میں نے ہچکولے کھا کھا کر ٹھوکریں لے لے کر خط پڑھ دیا۔ اور جب والدہ کریمن کو سلام اور چھوٹی نذیرن کو پیار" پر پہنچا تو جان میں جان آئی۔ اور ایک پُرتسکین سانس لے کر کہا "کیوں بڑی بی بس!" لیکن بڑی بی اتنی آسانی کے ساتھ اتفاق سے ہاتھ لگے ہوئے بابو کو چھوڑنے والی نہیں۔ کیا معلوم شام تک کوئی اور نگوڑا بابو آئے نہ آئے تو ہاتھ لگا ہوا کیوں جائے۔ فرمانے لگیں۔ "اس کا جواب بھی احسان کرکے لکھ دو"۔ اب میں نے بھی دل میں کچھ سوچا اور کہا "بی احسان کا ہے کا۔ ہمارا تو کام ہی یہ ہے"۔ وہ شاید نہ سمجھ سکی۔ دل میں آیا ہوگا کہ ان لکھے پڑھے بابوؤں کا یہی لکھنا پڑھنا تو کام ہے۔ پڑھ دیا اب لکھ بھی دیگا ✦

میں نے خط لکھنا شروع کیا۔ کہنے لگی "لکھو"۔ اب میں اس انتظار میں ہوں کہ کچھ ارشاد فرمائیں تو لکھوں۔ اور وہ زور دیئے جاتی ہیں کہ "تم لکھو تو لکھواؤں"۔ میرے دوست بہت دانا آدمی ہیں۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ اُنہوں نے مجھے انگریزی میں سمجھایا کہ یونہی سوکھے قلم کو کاغذ پر چلانا شروع کردو۔ پھر یہ منہ سے کچھ بکے گی۔ تب لکھدینا۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی ✦

غرضیکہ کیا عرض کروں کہ اس خط کی لکھائی نے میرا کتنا وقت ضایع کیا۔ اور اخیر میں وہ بڑھیا بولی "یہ لفافہ بند مت کیجو۔ مجھے کسی اور سے پڑھوانا ہے ذرا تسلّی کرلوں۔ ٹھیک تو لکھا ہے"۔ مجھ کو غصّہ آیا۔ لفافہ ہاتھ میں لے کر کہا۔ "لاؤ بڑی بی آٹھ آنے کے پیسے میری اُجرت"۔ پہلے تو وہ عورت بہت ششدر

ہوئی۔ لیکن جونہی اپنے خاوند درزی کو گلی کے کونے پر آتے دیکھا۔ تو لگی مجھے کوسنے۔ جب خاوند آیا تو وہ بھی شور مچانے لگا "اجی واہ بابوجی یہ بھی کوئی کام تھا۔ دو حرف پڑھ دیئے اور دو لکھ دیئے۔ تم نے کونسا یہاں پر تاگا خرچ کیا ہے جو اُجرت مانگتے ہو؟" میں نے نرمی سے جواب دیا "بھئی یہی تو ہمارا کام ہے۔ اور نہیں تو ہم لکڑیاں تھوڑے ہی پھاڑا کرتے ہیں کہ وہاں سے کچھ آجائے گا" لیکن ہمارے فلسفے کو وہاں کون سنتا ہے۔ اسی تکرار میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور سب مجھ ہی کو ملامت کرنے لگے۔ جب میں نے انہیں تین آنے کا قصہ سنایا تو سب یکزبان ہو کر کہنے لگے "اجی ان بیچاروں کا کیا ہے۔ یہ ہوئے مزدوری دار۔ انہوں نے تو پیسے لینے ہی تھے۔ تب تو مجھے طیش آیا۔ "ارے بھئی وہ مزدوری دار ہیں تو ہم کون سے کسی ریاست میں ریزیڈنٹ ہیں۔ اور جو ریزیڈنٹ ہیں وہ بھی مزدوری دار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ درزی نے صرف ہاتھ سے کام کیا۔ اور ہم نے ہاتھ اور دماغ دونوں سے کام کیا ہے۔ اس نے تاگا خرچ کیا ہے۔ تو ہم نے بہا ہی خرچ کی ہے" لیکن صاحب ان دلائل کو وہ سُنتے کہ جس نے فلسفے کا امتحان دیا ہو۔ انہیں کیا پڑی تھی۔ آخر ہمیں ناکام ہی آنا پڑا ۔

ہاں تو اب میں عجیب معمے میں پھنسا ہُوا ہوں کہ ایک درزی جس نے ایک سال کی محنت کے بعد کام سیکھ لیا تین منٹ میں تین آنے لے گیا اور میں پندرہ سولہ سال تحصیل علوم میں مغز مارنے کے باوجود بھی اس قابل نہ ہو سکا کہ پورا گھنٹہ ضایع کرنے کے بعد آٹھ آنے کا حقدار رہوتا۔ اب آپ لوگ ہی انصاف کریں کہ ایسی تعلیم سے بغاوت کی جائے یا نہ کی جائے ؟

مقصودِ زندگی

از:۔ قاضی نذرالاسلام

دوسروں کو نقصان پہنچانے میں کوئی نفع نہیں حقیقی راحت دوسروں کو آرام پہنچانے سے حاصل ہوتی ہے ۔ اگر تم تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہو تو اپنی انتہائی طاقت سے ایسی روشنی پیدا کرو جس سے تمام دنیا میں اُجالا ہو جائے ۔

ہمیں خواب راحت میں زندگی بسر نہیں کرنا چاہئے بستر استراحت، سامان آرائش، نیز تھوڑی سی محنت سے حاصل ہونے والی شہرت ہمیں نہیں چاہئے کیونکہ ہم تپسوی ہیں ۔ اور ہمیں اپنے مقصود اعظم کو حاصل کرنا ہے ۔

منظومات

چودھویں سالگرہ کا تحفہ! (نظم)

از:- اختر شیرانی

ستارے نذر کروں آفتاب نذر کروں! کلی کا حسن، گلوں کا شباب نذر کروں!

ریاضِ خلد کی شادابیاں کروں حاضر! نگاہِ حور کا رنگیں حجاب نذر کروں!

صباحتِ رُخِ شیریں کو ارمغاں بھیجوں! خمارِ چشمِ زلیخا کا خواب نذر کروں!

غزالِ دیدۂ لیلائے نجد بھجوا دوں! لبِ سلیمیٰ کا لعلِ خوش آب نذر کروں!

"کھلونا" چاہئے گر کوئی کھیلنے کیلئے! چرا کے زہرہ کا زریں رباب نذر کروں!

یہ سن ہے وہ کہ ستارو کسی بھی ہو پردہ ضرور شعاعِ مہر کا رنگیں نقاب نذر کروں!

مطالعے کی تمنا ہو گر نگاہوں کو! تو کہکشاں کی طلائی کتاب نذر کروں!

مذاقِ شعر کی لازم اگر رعایت ہو تو شاعرانِ جہاں کا جواب نذر کروں!

زبسکہ سالگرہ چودھویں ہے، حسرت ہے، کہ میں بھی چودھویں کا ماہتاب نذر کروں!

قبول نہ ہوں نہ یہ تحفے تو کیا کروں آخر ؟

کہو تو میں "دلِ خانہ خراب" نذر کروں ؟!

ڈاکٹر ٹیگور کی ایک نظم

کہاں ہے ہندوستان؟

(مترجمہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی)

تیری صدائے دعوت دنیا کے تمام ممالک میں پھیل گئی ہے
اور لوگ تیری نشست کے ارد گرد جمع ہو گئے ہیں۔
وہ دن آپہنچا ہے۔ مگر کہاں ہے ہندوستان؟
کیا ابتک وہ پوشیدہ اور پسماندہ ہے؟
اب اس کو اپنا بوجھ اُٹھا کر سب کے ساتھ برابر چلنا چاہئے۔
اے توانا و قادر خدا، تو اس کو اپنا پیغام ظفر بھیج،
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!
وہ لوگ جنہوں نے ہمت سے مصائب کا مقابلہ کیا
اُنہوں نے صحرائے اجل کو طے کر لیا۔
اور اپنی خیالی قیود کو توڑ ڈالا
وہ دن آپہنچا ہے۔ مگر کہاں ہے ہندوستان؟
اس کے غافل و بے پروا ہاتھ سست و منفعل ہیں
اور اس کی راتیں اور دن فضول و بیکار،
(اور) مسرت زندگی کی محتاج۔
(اس لئے) تو اپنے زندہ تنفس کے ساتھ اُسے چھو لے،
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!
عہد جدید کا آفتاب سحر طلوع ہو چکا ہے۔
تیرے معبد کا سارا ہال زائرین سے بھر گیا ہے۔

(اور) دن نکل آیا ہے ۔ مگر کہاں ہے ہندوستان ؟
وہ بے عزتی کے ساتھ خاک پر پڑا ہُوا ہے،
اپنی نشست سے معزول،
اس کی شرم کو دور کر دے،
اور اس کو خاص اپنے آدمی (حکمراں) کے مسکن میں جگہ دے،
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!
دُنیا کے تمام بڑے بڑے راستے (جن پر بھیڑ لگی ہوئی ہے)،
تیرے رتھ کے پہیوں کی آواز سے گونج رہے ہیں۔
آسمان رہروؤں کے نغمات سے مرتعش ہے،
دن نکل آیا ہے مگر کہاں ہے ہندوستان ؟
اس کے قدامت زدہ مکان کے دروازے بند ہیں،
اس کی امید کمزور، اور اس کا دل خاموشی میں ڈوبا ہوا ہے۔
تو اُس کے فرزندوں کو جو بے زبان ہیں اپنی آواز عنایت کر،
اے آقا تو ہمیشہ بیدار ہے!
ایسے بھی لوگ یہاں ہیں جنہوں نے اپنے دست و بازو میں تیری قوۃ محسوس کی
اور وفاء زندگی کو حاصل کیا،
خوف پر غالب آ کر۔
وہ دن آپہنچا ہے۔ مگر کہاں ہے ہندوستان ؟
اس کی حرماں نصیبی اور خود اشتباہی پر اپنے حربہ کی چوٹ لگا!
اور اس کو اپنے تعاقب کرنے والے سایہ کے ڈر سے محفوظ و مصئون کر دے،
اے آقا تو جو ہمیشہ بیدار ہے!

شب دلارام سے گزرتی ہے صبح آٹھ جام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو آرام سے گزرتی ہے

آغا حشر بحیثیت ڈرامانویس کے

از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے۔

آغا صاحب مرحوم کے ڈراموں پر کسی کا تفصیل سے کچھ لکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ آغا صاحب کے مطبوعہ ڈراموں میں سے ایک بھی ایسا نہیں۔ جسے مستند کہا جا سکے۔ جتنے ڈرامے بازار سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ وہ بیحد غلط سلط اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ عام طور سے وہ یوں شایع ہوئے۔ کہ کسی پبلشر نے کسی ایکٹر کو چند روپے دئے۔ اور جو ڈراما اُسے جس طرح یاد تھا۔ اُس سے لکھوا لیا۔ اور بغیر آغا صاحب کو دکھائے اور اُنکی اجازت لئے شایع کر دیا۔ آغا صاحب کی عالی ظرفی نے اُنہیں کبھی ایسے غیر ذمہ دار پبلشروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ کرنے دی۔ حالانکہ ایک مرتبہ اُن کے قانونی مشیر نے اُنہیں بتایا۔ کہ خود ان پبلشروں نے ہر ڈراما پر اُس کے ایڈیشنوں کی اور ہر ایڈیشن کی جو تعداد درج کی ہے۔ اگر اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ تو آپ ان سے کم از کم تیس چالیس ہزار روپے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ آغا صاحب کے کئی ڈرامے مختلف کمپنیوں میں مختلف صورتوں سے سٹیج ہوتے رہے۔ ہر کمپنی کی اپنی مخصوص ضروریات ہوتی تھیں۔ اور مالکان کمپنی ان ضروریات کے مطابق ڈراما میں آغا صاحب سے ترمیم کروا لیتے تھے۔ یا خود کر لیتے تھے۔ جن اصحاب نے نیو البرٹ اور نیو الفریڈ کا سلور کنگ دیکھا ہے۔ یا جن اصحاب کو نیو البرٹ اور آغا صاحب کی اپنی کمپنی کا یہودی کی لڑکی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُنہیں بخوبی احساس ہوگا۔ کہ دونوں جگہ کی تفاصیل میں کس قدر نمایاں فرق تھا۔ اس صورت میں ظاہر ہے۔ کہ مطبوعہ ڈرامے کو ئی بھی غیر مستند ہیں۔ نہ معلوم نہیں آغا صاحب نے آزادانہ کس صورت میں لکھا اور کس صورت میں شایع کرنا چاہتے تھے۔ آغا صاحب نے اپنے ڈرامے جس طرح خود لکھے تھے۔ یا یوں کہئے۔ کہ جس طرح وہ اُنہیں شایع کرانا چاہتے تھے۔ اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ مجھے صرف چند مسودات سرسری نظر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ جس صورت میں وہ ڈرامے کمپنیوں میں کئے جاتے ہیں یہ اُس سے نمایاں طور پر مختلف تھے۔ انہیں دیکھ کر میں نے آغا صاحب سے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ انہیں پریس میں دے ڈالیں۔ لیکن افسوس اُن کی دوسری مصروفیات نے انہیں اس طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ دی۔

۱۹۲۵ء میں مجھے چند روز کے لئے الہ آباد میں آغا صاحب کا مہمان بننے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس موقع پر آغا صاحب کے جو ڈرامے اُن کے پاس موجود تھے۔ ان میں سے چند کو میں سرسری دیکھ سکا۔ اور میں نے ان کے متعلق نوٹس لے لئے۔ آغا صاحب کے بہت سے ڈرامے مختلف کمپنیوں میں مجھے کئی کئی بار سٹیج پر دیکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اور ان کے متعلق بہت سے قابل توجہ امور میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ اس معلومات کی بنا پر میں نے مندرجہ ذیل مضمون ۱۹۲۶ء میں لکھا تھا۔ افسوس نو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں اس مضمون میں بہت کم ترمیم کر سکتا ہوں۔ اس دوران میں ان کا کوئی ڈراما طبع ہو کر میرے سامنے نہیں آیا۔ جو معلومات اُس وقت میرے سامنے تھیں۔ وہی آج بھی ہیں۔ چنانچہ مضمون بیشتر تو وہی ہے۔ البتہ بعض باتیں جن پر مجھے بعد میں زیادہ غور کرنے کا موقع ملا۔ ان کا میں نے اضافہ کر دیا ہے۔

یہ مضمون نہ جامع ہے اور نہ مکمل لیکن ایسی حالت میں کہ اب تک اُردو میں آغا صاحب پر اس سے مفصل اور کوئی مضمون نہیں لکھا گیا۔ غالباً اس کا مطالعہ اس عظیم شخصیت کی ڈراما نگاری کے کمال فن کے متعلق ایک دھندلا سا خاکہ پیش کرنے میں ناکام نہ رہے گا۔ (تاج)

جو کہانی اس خیال سے تیار کی جاتی ہے کہ ایکٹروں کی امداد سے اسٹیج پر بطور واقعہ لوگوں کے سامنے پیش کی جا سکے۔ وہ ڈراما کہلاتی ہے۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر زمانے کا ڈراما اپنے ارتقا اور نشوونما میں تین چیزوں سے متاثر ہوتا آیا ہے۔ ایکٹروں کی طبع و خصائل سے جو ڈراما کو پیش کرتے ہیں اسٹیج اور تھیئٹر ہال کی کیفیت سے جہاں ڈراما کیا جاتا ہے۔ اور لوگوں کی ذہنی حالت سے جو ڈراما کو دیکھتے ہیں۔ یہی تینوں چیزیں مل کر ڈراما میں خصوصیتیں پیدا کرتی اور ڈراما کے مذاق اور روش کو بتدریج تبدیل کرتی رہتی ہیں۔

ایکٹروں کی طبائع و خصائل ڈراما کے نشوونما میں یوں کام کرتی ہیں۔ کہ ڈراما نویس کسی کیرکٹر کو پیش کرتے ہوئے ناول نویس کی طرح اطمینان سے بیٹھ کر اس کو رفتہ رفتہ اپنی رنگین بیانی سے لوگوں میں واضح نہیں کر سکتا۔

اگر ڈرامے میں ایک کیرکٹر دوسرے کیرکٹر کی عادات خصائل اور اوضاع و اطوار تقریر کے ذریعے لوگوں کو بتانے لگے۔ تو تماشا اچھا خاصا لکچر بن جائے۔ اور دیکھنے والے پریشان ہو جائیں۔ پھر ڈرامے کو صرف تین چار گھنٹوں کی مختصر مدت میں تمام ہو جانا ہوتا ہے۔ اس لئے ڈراما نویس ایک خاص کیرکٹر سوچ کر اس کی زندگی میں سے چند ایسے خاص معروف لمحے چن لیتا ہے۔ جن میں کیرکٹر اپنے عمل اور الفاظ کے ذریعے کم سے کم وقت میں اپنی شخصیت خود لوگوں کے ذہن نشین کرا سکے۔

ناول نویس کے لئے ایک دنیا کھلی ہے۔ وہ جس

کیرکٹر کو چاہیے چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے
اور کیرکٹر کے احساسات وجذبات خود بیان کر کے پیش
کرسکتا ہے۔ لیکن ڈراما میں صرف اسی قسم کے کیرکٹر
کامیاب ہوتے ہیں۔ جن کی فطرت اور ذہنیت کو صرف
اُن کا عمل لوگوں پر نمایاں کرسکتا ہے ٭

یہ کیرکٹر ڈراما نویس کے دماغ سے نکل کر ایکٹر کی
شخصیت میں گوشت پوست۔ ذہن اور زبان پاتے ہیں
اور ایکٹر ان کی خصوصیات کو اپنے میں جذب کر کے
اور پھر اظہار جذبات کے متعلق اپنی قابلیت سے کام
لے کر نئے سرے سے پیدا کرتا اور لوگوں کے سامنے لاتا
ہے ٭ جب تک ایکٹر میں کیرکٹر کے کما حقہ سمجھنے اور پھر اُسے
مناسب حرکات و انداز سے لوگوں کو سمجھانے کی صلاحیت
نہ ہوگی۔ ڈراما نویس کا طرح طرح کے کیرکٹر لکھتے رہنا
بے سود ہے۔ چنانچہ ڈراما نویس کو اسٹیج پر کامیابی حاصل
کرنے کے لئے کیرکٹر لکھتے وقت ایکٹری کے عام معیار
کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اور ایکٹروں کی استعداد کبھی
اس کے زاویہ نظر کو محدود کر دیتی ہے۔ اور کبھی وسیع ٭

دوسرے اسٹیج اور تھیئٹر ہال کا طول و عرض اور وضع
ڈراما کے رنگ ڈھنگ پر بہت اثر ڈالتی ہے۔ مثلاً
یونانیوں کے اسٹیج کی سطح موجودہ تھیئٹروں کی طرح لوگوں
کے بیٹھنے کی جگہ کی نسبت زیادہ بلند نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ
یونانی ڈراما نویس اس خیال سے قتل و خون کے واقعات
کو اسٹیج پر نہ لاتے تھے۔ کہ جو شخص قتل ہو کر نیچے گر پڑیگا۔
لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ اور اس کے
موجود ہوتے ہوئے اوجھل رہنے سے لوگوں پر کوئی
خاص اثر نہ ڈالا جا سکے گا ٭

اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ اگر تھیئٹر ہال طول میں کم
اور عرض میں زیادہ ہے۔ تو ایکٹر آہستہ آہستہ بول کر
بھی اپنی آواز لوگوں تک پہنچا سکیں گے۔ آہستہ بولنے
اور بلند آواز سے بولنے کے فقرے بہت مختلف انداز
سے لکھے جاتے ہیں۔ اگر بلند آواز سے بولنے کے
لئے لکھنا پڑتا ہے۔ "آج میری بات کو ٹھٹھوں
میں اُڑا دو۔ مگر کل تم آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ مجھے
یاد کرو گے"۔ تو آہستہ آواز میں بولنے کے لئے اس
کی بجائے صرف "تم جانو" کام دے سکتا ہے ٭

اس طرح اسٹیج کے بڑے یا چھوٹے ہونے سے خاص
خاص قسم کے مناظر زیادہ خوبی سے پیش کئے جاتے ہیں۔
اور حالات کو مدنظر رکھ کر خاص ڈھنگ سے لکھنے پڑتے ہیں ٭

تیسرے نفس ڈراما میں یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا
ضروری ہے۔ کہ اسے جدا جدا ہر شخص کو نہیں بلکہ ایک اجتماع
کو متاثر کرنا ہوتا ہے ٭ ناول نویس اپنا افسانہ مجمع کے لئے
نہیں لکھتا ہے۔ اسے ہر شخص اکیلا بیٹھ کر پڑھتا ہے۔ اور
یوں ایک ایک کر کے ہزاروں پڑھنے والوں کی نظر سے
ناول گزر جاتا ہے ٭ لیکن ڈراما کو ہزاروں آدمی یک جا ہو کر
دیکھتے ہیں۔ مجمع افراد کی شخصی ہیئتوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ
مختلف مذاق اور مختلف قابلیتوں کے لوگوں کے باہم ملنے سے ایک
عجیب قسم کی معجون بن جاتی ہے ٭ ہر شخص اجتماع ہی کی طرح
محسوس کرتا اور سوچتا ہے۔ اور اس تمام مجمع کی ایک خاص
اپنی ذاتی شخصیت بن جاتی ہے ٭

ڈراما نویس خاص خاص لوگوں کے خاص شوق پورے

نہیں کرتا۔ بلکہ تماشا دیکھنے والوں کو بہ حیثیت مجموعی ایک شخصیت سمجھ کر ان کی پسندیدگی کی چیز پیش کرتا ہے۔ چونکہ اجتماع کو کشمکش بہت پسند ہے۔ اس لئے ہر ڈراما میں اس کی موجودگی اتنی ضروری سمجھی جانے لگی۔ کہ انگریزی فن تنقید میں "کشمکش بغیر ڈراما نہیں" ایک بہت ہی عام فقرہ بن گیا تھا۔ اسی طرح اجتماع جذبہ پرست بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈراما نویس کو موثر موقعوں پر اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہ وہ کشمکش کا کیرکٹروں کے جذبات سے تعلق ہو۔ اسی طرح ڈراما نویس اجتماع کو متاثر کرنے کے لئے دیگر ضروریات ولوازم کا خیال رکھتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان باتوں کا خیال ڈراما نویس کے سر پر جنون بن کر ہر وقت سوار نہیں رہتا لیکن وہ جب کبھی کچھ لکھنے بیٹھتا ہے۔ ان ہی تینوں چیزوں کے باعث اسے جو تجربات حاصل ہو چکے ہوتے ہیں خاموشی سے بے معلوم اپنا کام کرتے رہتے اور ڈراما نویس کو اپنا بے نیاز نہیں ہوتے دیتے۔

ہندوستان میں انگریزی تعلیم رائج ہو جانے سے تمام یورپ کا ترقی یافتہ ڈراما ہندوستانیوں کی نظروں کے سامنے آگیا ہے۔ ہر شخص لاہبریریوں میں موجود انگریزی ڈراما پڑھتا۔ اُن کے محاسن کی داد دیتا اور چاہتا ہے۔ کہ اسی قسم کے ڈرامے۔ کامیڈیاں اور فارسیں اردو اسٹیج پر بھی نظر آئیں۔ اور جب ان سے بہت مختلف چیزیں دیکھتا ہے۔ تو ہندوستانی تھیٹر سے متنفر ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ ڈرامے کے شائقین اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ ڈراما نویس کسقدر پابند اور دوسری اصناف ادب کے مصنفین کی نسبت کسقدر معذور ہوتا ہے۔

ایک ناولسٹ یا شاعر جب چاہے ایک نئی قسم کا ناول یا نئے ڈھنگ اور خیالات کی نظم بلاتکلف لکھ کر چھاپ سکتا ہے۔ ممکن ہے۔ بہت سے لوگ اسے ناپسند کریں۔ اور معدودے چند اس کی داد دے سکیں۔ مگر ناولسٹ اور شاعر کے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال نہیں۔ وہ معدودے چند لوگ ہی ان کی تصانیف خریدلیں گے۔ اور اگر آج کسی نے نہ خریدا۔ تو کل کے انتظار میں جب لوگوں کا مذاق تبدیل ہو جائیگا۔ تصانیف کی جلدیں رکھی رہینگی۔ لیکن جو ڈراماٹسٹ آج ایک ڈراما لکھنا چاہتا ہے۔ اُسے اس قسم کی سہولت یہ آزادی نصیب نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے ڈراما کو ایکٹروں کی استعداد۔ تھیٹرہال کی وضع اور لوگوں کے مذاق سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے مذاق اور خیالات کے مطابق لکھے۔ اور یہ توقع رکھے کہ چند لوگ تو ضرور ایسے ہونگے۔ جو اُسے داد دے سکیں گے۔ تو اس کو مایوسی ہوگی۔ یہ چند لوگ اجتماع میں جذب ہو کر اس کے ڈراما کو کامیاب نہ بنا سکیں گے۔ ڈراما ناکام رہیگا۔ اور اس کی تیاری میں جو محنت۔ وقت اور روپیہ صرف ہوا۔ سب اکارت جائے گا۔

تھیٹروں کے مالکوں کو تجارت کا خیال ہے اور پیشہ ور ڈراما نویس کو مانگ کا۔ اور جو امور شروع میں بیان کئے گئے۔ وہ رفتہ رفتہ اور بتدریج تبدیل ہوتے

ہیں۔ ہندوستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد انگریزی سے ناواقف ہے۔ اور ایسی سریع السیر نہیں کہ چھلانگیں مار کر یورپین ڈراما کا مذاق حاصل کرلے۔ جب تک عوام میں تعلیم عام نہ ہوجائے اور ان کا مذاق سدھر جائے۔ ڈراما کے متعلق یک لخت تبدیلی کی کوشش کرنا پیشہ ور ڈراما نویس اور کمپنیوں کے مالکوں کے لئے خودکشی کے مترادف ہے۔

اور پھر یورپ کے جن ڈراموں کو ہم آج پڑھ رہے ہیں۔ یہ کتنی صدیوں اور کیسی کچھ محنتوں کا حاصل ہیں۔ اور یورپ کتنے عرصے تک اردو کے پست ترین ڈراموں سے بھی پست اور کمزور ڈراما پیدا کرتا رہا ہے۔ کبھی یورپ میں بھی "مورلیٹی پلے" اور "مریکل پلے" ہوتے تھے۔ اور شکسپئیر سے پہلے اور شکسپئیر کے بعد بھی سینکڑوں ایسے ڈراما نویس ہوئے جن کے ڈرامے آج اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے کہ کبھی لکھے گئے تھے۔

اردو ڈراما ابھی بہت کم عمر ہے۔ ہماری زبان میں ابھی بندرہ بیس ڈراما نویس بھی پیدا نہ ہوئے ہونگے پھر بھی اردو ڈراما جس رفتار سے ترقی کر رہا ہے۔ اور اپنا رنگ روپ بدلتا جارہا ہے حیرت انگیز ہے۔ جو لوگ اعتراض کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اس ترقی کو قابلِ قدر نہیں سمجھتے۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ڈراما کی رفتار ترقی یورپ کی گذشتہ رفتار ترقی سے تیز تر ہونی چاہئے اس لئے کہ ہمارے سامنے ایک ترقی یافتہ زبان کا لٹریچر اور تاریخ موجود ہے جس سے ہم بہت سے اہم معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے شاید اس امر کا بالکل خیال نہیں کیا۔ کہ اردو ڈراما اور اسٹیج میں جتنی بھی عملی ترقی ہوئی۔ اس میں ابھی تک انگریزی تعلیم یافتہ جماعت کی کوششوں کا کوئی دخل نہیں۔ اس جماعت نے ابتک کچھ کیا ہے تو اردو ڈراما پر اعتراض ہی کئے ہیں۔ خود کوئی اعلیٰ خدمت سرانجام دے کر نہیں دکھائی۔ اردو ڈراما کی ترقی صرف اردو داں حضرات کی ممنونِ احسان ہے۔ اور ان میں سب سے پیش پیش آغا محمد شاہ حشر کاشمیری مرحوم ہیں۔

آغا حشر ۱۸۸۱ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں ابھی تھیئٹر اور ڈراما کا شوق ہندوستان میں نیا نیا تھا۔ صرف ایک دو کمپنیاں تھیں۔ اور ان کے پاس گنتی کے چند ڈرامے تھے۔ اخلاقی تنزل اور قومی انحطاط کا زمانہ تھا۔ نہ ابھی تعلیم کا شوق عام ہوا تھا۔ نہ روشن خیالی پھیلی تھی۔ طلسم کشا شاہزادوں اور پریوں کی محیّر العقول داستانوں کا بہت چرچا تھا۔ لوگ انہیں شوق سے پڑھتے اور سنتے تھے۔ چنانچہ وہی کثرت سے چھپتی اور فروخت ہوتی تھیں۔ ان کی مقبولیت کی وجہ سے کمپنیوں کے مالکوں نے بھی ان ہی کی طرف توجہ کی۔ ناٹکوں میں معمولی درجہ کے شاعر اس غرض سے رکھ لئے جاتے تھے۔ کہ ان داستانوں کو حسب ہدایت مکالمہ کی شکل میں ڈھال دیں۔

شعر اشعار کا اس زمانہ میں اس قدر چرچا تھا کہ شعر کہنے کی مشق تعلیم کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ سادہ نثر لکھنے کا رواج عام نہ ہوا تھا۔ مقفیٰ مسجع عبارت بہت پسند کیجاتی تھی۔ اور اکثر کتابیں اسی انداز میں لکھی جایا کرتی تھیں۔

کچھ تو لوگوں کے اس رجحان طبع کا خیال۔ کچھ اس امر کا خیال تھا کہ ایکٹر تعلیم یافتہ نہ تھے۔ اور سادہ عبارت کی بجائے مقفٰی عبارت کو نسبتاً آسانی سے بول سکتے تھے۔ اس طرح ان کے لہجے کے عیوب چھپے رہتے تھے۔ اور قافیہ سے قافیہ مل کر تقریر میں چاشنی سی پیدا ہو جاتی تھی۔ ڈراما اشعار اور مقفٰی عبارت میں لکھا جاتا۔ اور جہاں جذبے کی شدت کا موقع آتا۔ ڈراما نویس کے لئے تحریر اور ایکٹر کے لئے اظہار جذبات دشوار ہو جاتا۔ وہاں گانا مشکل آسان کر دیتا تھا۔

عام طور پر محل۔ پرستان جنگل۔ دریا اور راستے کے سین ہوتے تھے۔ پانچ پانچ دس دس منٹ سے زیادہ وقت کسی سین میں صرف نہ ہوتا تھا۔ کیرکٹر پلاٹ کی گاڑی کے فرمانبردار گھوڑے تھے۔ کوچوان کے اشارے پر کام کرتے تھے۔ جدھر مصنف اور پلاٹ کی ضروریات لے جانا چاہتیں بلا پس و پیش چل دیتے تھے۔ اصل کیرکٹروں کے ساتھ ایک آدھ دوست یا ملازم کا کیرکٹر تفنن پیدا کرنے کے لئے چپکا دیا جاتا تھا۔ جو موقع موقع پر آتا اور اپنی ظرافت سے لوگوں کو محظوظ کرتا تھا۔

مگر یہ کچھ انوکھی بات نہیں شروع میں ہر چیز یوں ہی کمزور اور بھدی ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ وقت اور مذاق کی ترقی اسے کچھ کا کچھ بنا دیتی ہے۔ اس زمانہ میں لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہی ڈراما بہت تھا۔ وہ جب پریوں اور بادشاہوں کی داستان کے محبوب کیرکٹروں کو زرق برق لباسوں اور عالی شان محلوں میں جیتا جاگتا دیکھتے تو انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔

اور ان کیرکٹروں کا یہ حال تھا۔ کہ اگر کوئی شہزادہ عاشق ہے۔ تو بس اتنا ہی کہنا ضروری ہے۔ کہ وہ شہزادہ ہے۔ اور عاشق ہے۔ وہ کیوں عاشق ہوا۔ اس کا عشق کس طرح کا ہے۔ ایسے سوالات کا جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر شہزادہ ہے تو بے مثال اور عاشق ہے تو لاجواب۔ اس کا کوئی دشمن ہے۔ تو اس کی دشمنی کا درجہ بھی انتہائی درجہ۔ پس اس طرح سے ہر ایک کیرکٹر کی صرف ایک خصوصیت بیان کر دی جاتی تھی۔ اور اس میں حد درجہ کے مبالغہ سے کام لیا جاتا تھا۔ کسی کیرکٹر میں کہیں بھی کوئی نشیب و فراز دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ نہ کوئی تفصیل داستانوں میں ملتی تھی۔ اور نہ ڈرامہ میں آ کر اس کی کوئی کمی محسوس ہوتی تھی۔

ہندوستان کے ڈراما کی یہ حالت تھی۔ کہ آغا حشر نے اس میدان میں قدم رکھا۔

اس زمانے میں ڈراما کچھ قدر و وقعت کی نظروں سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ عام طور پر ڈراما میں کسی قسم کا حصہ یا دلچسپی لینا اخلاقی پستی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ تاہم کمپنیوں کے چند تماشوں نے حشر کی ڈراما آفریں طبیعت کو بے انتہا متاثر کیا۔ اور انہیں اپنے مزاج اور ڈراما میں ایک خاص مناسبت سی نظر آئی۔ ڈراما نویسی کی ایسی لو لگی کہ گو والدین کی ناراضگی اور عام بدنامی کا ڈر تھا پھر بھی اشتیاق دبائے نہ دب سکا۔ آغا صاحب کے والد پرانی وضع کے بزرگ تھے اور نہ معلوم کن کن امیدوں اور توقعات میں بیٹے کو عربی۔ فارسی اور مروجہ علوم کی تعلیم دلا رہے تھے۔ کہ یہ گھر سے چپ چپاتے نکل بمبئی جا پہنچے۔ اور وہاں پارسی کمپنی

میں ملازم ہوگئے ۔

آغا حشر عربی اور فارسی کے فارغ التحصیل تھے۔ اردو اور فارسی کے مشاق شاعر اور ادیب بن چکے تھے علم عروض میں مہارت پیدا کرلی تھی۔ اور دوسرے علوم مروجہ پر بھی بخوبی حاوی ہوچکے تھے۔ لیکن ڈرامانویسی کے متعلق ان کی نہ کوئی تعلیم تھی نہ تجربہ۔ لے دے کر بس اپنا ذاتی ذوق و شوق ہی تھا۔ لیکن ایک بڑے ڈرامالسٹ میں ڈرامیت کے اس ذوق ہی کی موجودگی بہت ضروری ہوتی ہے۔ یہی ذوق اسے دوسرے عام شعرا سے متمیز کرتا ہے۔ اور اس ذوق کے بغیر جو جبلی ہوتا ہے بہتر سے بہتر شاعر ڈراما لکھ کر اسٹیج پر کامیاب نہیں بنا سکتا ۔

آغا حشر نے اپنے ابتدائی ڈراموں کے خیال انگریزی ڈراما سے لئے۔ مرید شک۔ شہید ناز۔ سفید خون اور صید ہوس کے ماخذ شکسپیر کے کھیل ہیں۔ اور اسیر حرص کا خیال شیرڈین کے کھیل پزیرو نامی سے لیا گیا ہے ۔

یہ ڈرامے انگریزی ادب میں جو رتبہ رکھتے ہیں اور انگلستان کے اسٹیج پر جس قدر شہرت و کامیابی حاصل کرچکے ہیں محتاج بیان نہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا بجنسہ اردو میں منتقل ہوکر ہندوستانی اسٹیج پر بھی کامیاب ہوجانا ویسا ہی یقینی تھا۔ آج سے دس پندرہ برس پہلے کا تو کیا ذکر اگر آج بھی صحیح معنوں میں ان کا ترجمہ ہندوستان کی اسٹیج کو دیا جائے تو ان کی کامیابی کی کچھ امید نہیں ہوسکتی۔

آغا حشر نے بعض انگریزی داں دوستوں سے ان ڈراموں کی کہانیاں سنیں، دیکھا جس ڈھنگ سے یہ کھیل انگریزی میں موجود ہیں۔ اگر اسی طرح اردو میں لائے گئے۔ تو عوام لطف اندوز نہ ہوسکیں گے۔ اور کھیل ناکام رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے نہ ان کھیلوں کا پورا پلاٹ انگریزی سے لیا۔ اور نہ ان کی دوسری خصوصیات کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ صرف مرکزی خیال لے کر از سر نو پلاٹ کھڑا کرلیا۔ مناظر کو خود ترتیب دیا۔ خود ان کے لئے کیرکٹر بنائے۔ اور لوگوں کے مذاق کے مطابق مناسب رنگ آمیزی کرکے خود ایک نیا ڈرامہ لکھ دیا۔ چنانچہ اب اردو میں یہ کھیل اسی حد تک شکسپیر کی "ونٹرس ٹیل" گرین کی "رومنیس آف پنڈوسٹو" سے۔ یا "آتھیلو" جی بی گیرالڈی سنتھیو کی "ہیکاٹومیتھی" سے ماخوذ ہے ۔

حشر نے ان کھیلوں کو ہندوستانی مذاق میں ڈھال کر اس طرح اسٹیج پر پیش کیا۔ کہ دیکھنے والے ان کی جدت اور انوکھے پن پر فریفتہ ہوگئے۔ اور تھیٹر کی دنیا حشر کے نام سے گونج اٹھی ۔

ان ڈراموں کو ہندوستانی کمپنیوں نے اس کثرت سے کیا ہے۔ کہ ڈراما سے کسی قسم کی دلچسپی رکھنے والا کوئی ہی ایسا شخص ہوگا۔ جس کی نظر سے یہ نہ گزرے ہوں چنانچہ ان سب کی کہانیاں یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہ ضرورت۔ صرف اسقدر بتا دینا کافی ہے۔ کہ ان ڈراموں میں اجتماع کو متاثر کرنے کی قابلیت یہاں کے پہلے ڈراموں سے بہت زیادہ تھی کشمکش نمایاں اور مسلسل تھی۔ موضوع

کشمکش طاقتور اور موثر تھا۔ کیرکٹروں کے جذبات کی
آویزش سے پیدا ہوتا اور دیکھنے والوں کے جذبات پر اثر ڈالتا تھا۔

شہید ناز میں سعیدہ اپنے گنہگار بھائی کو پھانسی
کی سزا سے بچانے کے لئے انصاف کے مقابلے میں
عفو و رحم کی التجائیں لے کر آتی ہے۔ لیکن اس کشمکش
میں انصاف کا پتھر دل ذرا نہیں پسیجتا۔ لیکن رفتہ رفتہ
التجاؤں کے ساتھ جو حُسن ہے۔ اور انصاف کے ساتھ جو
انسانی کمزوریاں ہیں اپنا کام کر جاتی ہیں۔ سعیدہ کے
حسن سے انصاف کی آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں۔ اور
منصف کے دل میں انصاف اور ہوس کے درمیان ایک
اور چھوٹی سی کشمکش جاری ہو جاتی ہے۔ وہ سعیدہ سے سعیدہ کو
مانگتا ہے اور اب سعیدہ کے دل میں ناموس اور بھائی کی محبت
کے درمیان ایک دوسری چھوٹی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔
ڈرامے میں پہلی چھوٹی کشمکش میں ہوس غالب آ رہی ہے۔ اور
دوسری میں ناموس۔ کہ سعیدہ اپنے مجرم بھائی سے ملنے قید خانے
میں جاتی ہے۔ اور وہ سعیدہ سے التجا کرتا ہے۔ کہ عصمت
بیچ کے بچاؤ۔ سعیدہ بھڑک اُٹھتی ہے۔ مگر بھائی کی دکھ
بھری یاد اس کشمکش پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی۔
اور یوں یہ دونوں چھوٹی چھوٹی کشمکشیں اپنی انتہا پر
پہنچ جانے کے بعد پھر پہلی بڑی کشمکش کا حصّہ بن جاتی
ہیں۔ اور سعیدہ اپنے آپ کو فروخت کر ڈالنے کے لئے
منصف کی بارگاہ میں آتی ہے۔ وہاں منصف کی بیوی
آڑے آ جاتی ہے۔ اور اس کی امداد سے سعیدہ ایک
داؤ کے ذریعے منصف کو بدمست کر کے خود چلی جاتی ہے
اور منصف نشہ میں اپنی بیوی کو سعیدہ سمجھ بیٹھتا ہے۔
اس کے بعد بادشاہ کے دخل دینے سے یہ معاملہ بخیر و خوبی ختم ہو جاتا ہے۔

اس تجربے سے ظاہر ہے۔ کہ بمقابلہ پہلے ڈراموں
کے اس ڈرامے میں کشمکش کتنی مسلسل۔ موثر۔ طاقتور تعجب انگیز
میں گندھی ہوئی اور جذبات کو بھڑکانے والی ہے۔ چنانچہ
اس زمانہ میں کہ لوگ ابھی داستانوں کے سیدھے سادے
اور اس قسم کے کیرکٹر دیکھنے کے عادی تھے۔ جن میں اوّل
تو کشمکش ہوتی ہی نہ تھی۔ اور اگر ہوتی تھی تو برائے نام
حشر کے ڈراموں پر فدا ہو گئے۔

اس کے علاوہ پلاٹ اپنی پیچیدگی میں اسقدر سادہ
تھے کہ دل میں اُترتے چلے جاتے تھے۔ کہانی میں جن مناظر
کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی ضرورت تھی۔ باوجود مشکلات
کے نمایاں ہونے شروع ہو گئے۔ کسی جگہ کہانی کو سمجھنے
کے لئے ڈراما شروع ہونے سے پہلے کے واقعات کیرکٹروں
اور تقریروں کے ذریعے آتے تھے۔ جو کچھ ہوتا نظروں کے
سامنے اچھی خاصی وجوہات کی بنا پر ہوتا۔ اور ان میں کیرکٹر
کے دل و دماغ کو بھی دخل ہوتا۔ چنانچہ پہلی مرتبہ تماشوں
میں ایک سماں سا بندھنے لگا۔ اور تماشائیوں نے اپنے
انہماک میں یہ بھولنا شروع کر دیا۔ کہ وہ تماشہ دیکھ رہے
ہیں۔

سماں پیدا کرنے کے لئے حشر نے ایک دوسری بڑی
بات یہ کی۔ کہ سین بڑے بڑے اور بھرے بھرے لکھنے
شروع کر دیئے۔ اگر تماشے میں ذرا ذرا سی دیر کے بعد مناظر
تبدیل ہوتے رہیں۔ کیرکٹر آئیں۔ چند باتیں کریں اور چل
دیں اور پھر پردہ بدل جائے تو تماشے کا لطف قائم نہیں
ہونے پاتا۔ بار بار دماغ کو ایک جھٹکا سا لگتا رہتا ہے۔

اردو اسٹیج پر حشر سے پہلے عام طور پر دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے سین ہُوا کرتے تھے۔ حشر نے ڈراما نویسی شروع کرتے ہی آدھے آدھے گھنٹے تک کے سین لکھنے شروع کر دیئے۔ لمبے مناظر میں صرف یہی نہیں کرنا ہوتا کہ کیرکٹر دیر تک باتیں کرتے رہیں اس طرح تو ان کی گفتگو بہت جلد بار بن جائے ۔ اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے۔ کہ ایک ہی مقام پر کئی کیرکٹر مناسب وجوہات کی بنا پر آ جا سکیں۔ اور ان کی آمد و رفت سے کھیل کا پلاٹ بھی ترقی پاتا رہے۔ اور خوشگوار تنوع بھی پیدا ہوتا جائے ۔ صید ہوس کا پہلا سین اس کی کامیاب مثال ہے ۔

نادر نے اپنے بھائی شاہ دارا کو اپنے ہاں مہمان بلا رکھا ہے۔ ایک آراستہ ایوان میں مہمان جمع ہیں۔ راگ رنگ اور مے نوشی ہو رہی ہے۔ کہ قزل داخل ہو کر مہمانوں کو شاہ کی پیشوائی کے لئے بھیج دیتا ہے۔ اور یوں تنہائی پیدا کر کے اپنے آپ سے گفتگو کرتا ہے۔ جس سے لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ یہ دعوت حقیقت میں عداوت ہے۔ نادر داخل ہوتا ہے۔ اور قزل کو اکیلا دیکھ کر مختصر مگر پر معنی الفاظ میں شاہ دارا کی جان پر حملہ کرنے کے انتظامات کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ قزل اس کا اطمینان کر دیتا ہے تو دونوں مہمان کے استقبال کو آگے بڑھتے ہیں۔ شاہ دارا۔ ملکہ۔ بڑا شہزادہ۔ سنجر اور دوسرے شہزادے شہزادیاں داخل ہوتے ہیں۔ کچھ دیر رسمی گفتگو ہوتی ہے۔ تہنیت کے گیت گائے جاتے ہیں۔ اور پھر اطلاع آجاتی ہے کہ خاصہ تیار ہے۔ مہمان رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور قزل اور نادر ایک لمحے کا توقف کر کے اور حملہ کے متعلق ایک دوسرے کا اطمینان کر کے چلے جاتے ہیں ۔

اب میدان صاف دیکھ کر نادر کی بیٹی اقبال اپنی کنیزوں کے ہمراہ آجاتی ہے۔ اور ان میں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ سنجر اقبال کو چاہتا ہے اور اُس سے ملنے کے شوق میں چپکے سے دعوت سے یہاں اُٹھ آتا ہے۔ اقبال اور سنجر میں محبت کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہ اچانک پستول چلنے کی آواز آتی ہے۔ اور دارا کا افسر شیر جنگ پریشانی کے عالم میں داخل ہوتا اور شاہ دارا کی جان پر حملہ ہونے اور اُس کے مرنے کی خبر سناتا ہے۔ سنجر اس صدمے سے سنبھلنے نہیں پایا۔ کہ ایک سپاہی دوڑا ہوا آتا ہے۔ اور اس خیال سے سنجر کو بھاگ جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ کہ شاہ کو قتل کرنے کا الزام اُسی پر لگایا گیا ہے۔ سنجر ابھی پوری طرح معاملہ سمجھنے بھی نہیں پاتا۔ کہ نادر اور قزل آتے ہیں۔ اور سنجر کو شاہ کے قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ اور دعوے کے ثبوت میں اُس کی ایک جعلی تحریر پیش کرتے ہیں۔ اقبال سنجر کی حمایت کرتی ہے۔ مگر نادر کے حکم سے سپاہی سنجر کو زنداں میں لیجاتے ہیں۔ شاہ دارا کی نعش آتی ہے۔ ساتھ ملکہ اور اُس کے بچے ہیں۔ وہ نعش پر بین کرتے ہیں۔ اور آخر ملکہ غم و غصے کی حالت میں اپنے شوہر کی جان کے سلئے نادر کی گریباں

ہوجاتی ہے +

یہاں پہلا سین ختم ہوجاتا ہے۔ اور دوسرا پردہ شروع ہوتا ہے + اس طویل سین میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کتنے بہت سے واقعات ایک ہی مقام اور پردے کے سامنے کس سہولت سے دکھا دیئے گئے ہیں؟ کیرکٹروں کی آمدورفت کسی طرح نامناسب نہیں معلوم ہوتی۔ کسی جگہ یہ ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ کہ پلاٹ کو سمجھانے یا کسی پیچیدگی کو ظاہر کرنے کی ضرورت کے لئے کوئی کیرکٹر بلاوجہ آ جا رہا ہے۔ جو کوئی آتا ہے اپنے آنے کا معقول سبب رکھتا ہے۔ اور اس کی آمدورفت سے سین کے رنگ و روپ میں ایسی مناسب تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کہ تسلسل لوگوں کے لئے بار نہیں بننے پاتا۔ بلکہ تماشائی گوناگوں دلچسپیوں میں محو ہو کر یہ بھول بیٹھتے ہیں کہ وہ تماشہ دیکھ رہے ہیں +

پھر ڈرامے کا لطف دوبالا کرنے کو اُنہوں نے پہلی مرتبہ سسپنس پیدا کرنا شروع کیا۔ یعنی وہ مختلف مناظر کی صورت حالات میں یک لخت اس قسم کی تبدیلیاں پیدا کرنے لگے جس سے لوگوں کے دل دھڑکنے سے لگتے تھے۔ اور وہ یہ سوچنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کہ اب کیا ہوگا؟ نہ صرف اس قسم کی کیفیت پیدا کرنا۔ بلکہ پیدا کرنے کے بعد بوجہ احسن اسے سلجھانا۔ یہ دونوں مشکل باتیں ہیں۔ اور کمال ڈراما کہی جاتی ہیں +

اسیر حرص میں چنگیز ہوس زر و ملک کی خاطر اپنے چچازاد بھائی ناصر پر حملہ کرکے اُسے گرفتار کر لیتا ہے۔ اور مار ڈالنا چاہتا ہے + چنگیز کی بیوی نوشابہ جو اکثر اس کے شیوۂ ظلم سے اُلجھتی آئی ہے۔ ناصر کو چھڑانا چاہتی ہے۔ اور باہمی بحث ایسی ناگوار صورت اختیار کر جاتی ہے کہ چنگیز بیوی سے قطع تعلق کر لیتا ہے +

چنگیز اپنی خوابگاہ میں غافل پڑا سو رہا ہے۔ کہ نوشابہ چھری لئے اس کا کام تمام کرنے کو آتی ہے + اُدھر ناصر کا وفادار افسر رستم ناصر کو قید سے رہا کروانے کے لئے چنگیز کے پاس پہنچتا ہے۔ اور رات کی تنہائی میں چنگیز سے نمٹنا چاہتا ہے + نوشابہ اور رستم دونوں ایک ہی وقت میں خوابگاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ نوشابہ وار کرنا چاہتی ہے کہ رستم کے آجانے سے چونک اُٹھتی ہے + رستم کو پہچان کر وہ چنگیز کے قتل کرنے کا کام اُسی کے سپرد کر دیتی ہے۔ اور خود چلی جاتی ہے + رستم سوئے ہوئے دشمن پر وار نہیں کرنا چاہتا۔ چنگیز کو جگا دیتا ہے + اور نصیحتوں سے اُسے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے + مگر چنگیز پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ذرا دیر بعد نوشابہ اس خیال سے واپس آتی ہے۔ کہ دیکھے کام تمام ہو چکا یا نہیں۔ اور چنگیز کو سامنے زندہ کھڑا دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے + اس کی قتل کی کوشش کا حال کھل جاتا ہے۔ اور چنگیز اُسے اپنی خوابگاہ سے نکلوا دیتا ہے اور رستم کو احسان کے بدلے میں اپنی تلوار انعام دیتا ہے + ذرا دیر کے بعد چنگیز کے سپاہی ناصر کے بیٹے قمر کو گرفتار کرکے لاتے ہیں۔ اور چنگیز اُسے دوپارہ کروانا چاہتا ہے۔ کہ نہتے چنگیز کے مقابلے میں رستم اُسی کی دی ہوئی تلوار کی مدد سے قمر کی جان بچا کر بھاگ جاتا ہے +

اس سین میں نوشابہ اور رستم کا بیک وقت چنگیز کی

خوابگاہ میں پہنچنا۔ رستم کا چنگیز کو جگادینا۔ نوشابہ کا واپس
آنا۔ چنگیز کا رستم کو تلوار دینا۔ اسی تلوار سے چنگیز کا مقتول
ہونا ایسی کیفیتیں ہیں۔ جو تماشہ دیکھنے والے کو تمام
وقت امید و بیم میں گرفتار رکھتی ہیں۔ اور اسے ہر وقت
یہ خیال گھیرے رکھتا ہے۔ کہ اب کیا ہونے والا ہے +

پلاٹ اور ترتیب مناظر کے سلسلے میں ایک
بات آغا صاحب نے نئی کی کہ ڈراموں کا کامک نفس
ڈراما سے بالکل جدا رکھنا شروع کر دیا۔ یہ تبدیلی ایک اعتبار
سے قابلِ اعتراض ہے۔ اور ایک اعتبار سے قابلِ
تعریف۔ قابلِ اعتراض تو اس خیال سے۔ کہ ڈراما میں
دو پلاٹ چلنے شروع ہو گئے۔ جسے ڈراما کے اصول و
قواعد کسی طرح جائز قرار نہیں دیتے۔ اور قابلِ تعریف
اس لئے کہ پہلے ڈراموں میں گو کامک اصل پلاٹ
کے ساتھ ہوتا تھا۔ مگر پلاٹ سے اس کا کوئی خاص تعلق
نہ قائم رہتا تھا۔ کامک کو زبردستی پلاٹ میں ٹھونس دیا جاتا۔
کسی کیرکٹر کا نوکر یا دوست اپنی بیوی یا آشنا سے مذاق
کرتا ہوا نظر آجاتا۔ مگر ان کے اس تفنن سے نفس ڈراما
کو کسی طرح کا کوئی فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ اور اس قسم کے سین اصل
ڈراما سے اس قدر جدا رہتے تھے۔ کہ ان کو کاٹ ڈالنے
سے پلاٹ میں کسی طرح کا فرق نہ پڑ سکتا تھا۔ تماشائی
اور کمپنیوں کے مالک ڈراما میں کامک کی بہت ضرورت
محسوس کرتے تھے۔ اور اس کے بغیر کسی ڈراما کا کامیاب
ہونا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ کامک ساتھ رکھ کر اصل
پلاٹ کو بھی مسخ کر ڈالنے سے یہ بہتر معلوم ہوتا تھا کہ کامک
سرے سے علیحدہ ہی رکھ دیا جائے۔ تاکہ اس زمانے کے
لوگ اس صورت میں اس سے لطف اندوز ہو لیں۔ اور
جب مذاق تبدیل ہو جائے۔ تو ڈرامے کے دونوں حصے
بآسانی جدا کر کے علیحدہ علیحدہ دکھائے جا سکیں +

آغا حشر نے ڈراموں کی زبان میں بھی نمایاں تبدیلیاں
کیں۔ ان کے مکالمات میں پہلی مرتبہ قابلِ قدر ادبی
محاسن نظر آئے۔ فقرے چھوٹے چھوٹے سلیس۔ رواں
دل میں اترتے چلے جانے والے تھے۔ اور ان میں ایکٹروں کو
ایکٹ کرنے کی گنجائش بھی ملتی تھی۔ بعض بعض موقعوں
پر تو اس قسم کی گفتگو ڈراما میں آتی۔ جو ایکٹر کو آواز کے
اتار چڑھاؤ سے کام لینے اور ایکٹ کرنے پر مجبور کر دیتی
تھی +

نادر اپنے معتمد ملازم قزل پر قیصر کے قتل کر ڈالنے
کے متعلق اپنا عندیہ ظاہر کر رہا ہے +

نادر۔ قزل!

قزل۔ حضور۔

نادر۔ میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر ذرا اور ٹھہر۔ ابھی
دن کو شام کی گود میں جانے کو ایک گھنٹہ باقی ہے۔ سورج
کی روشنی ہر گھر میں جاسوسوں کی طرح گھسی ہوئی ہے۔
جب آدھی رات کا گھڑیال اپنے کانسے کے منہ سے لوہے
کی زبان نکال کر ایک چلاتا۔ یہ جگہ جہاں ہم تم دونوں
کھڑے ہیں قبرستان ہوتی۔ ہر طرف موت کا سناٹا نظر
آتا۔ اور دنیا نے تمام ناپاکیوں کو تیری روح میں بھر دیا ہوتا
خوف و دہشت کے بھوت نے تیرے خون کو جلا کر راکھ
کر دیا ہوتا ——

قزل۔ اس وقت؟

نادر۔ اُس وقت میں تجھے بغیر آنکھوں کے دیکھ سکتا
بغیر کانوں کے تیری آواز سُن سکتا۔ اور تو آنکھ
اور کان کے بغیر خیال ہی خیال میں مجھے جواب دے
جاتا۔ تو اس وقت قزل میں تجھ سے اپنے دکھ
کا علاج مانگتا +

قزل۔ خداوندا وہ کیسا بھیانک کام ہوگا جس کی
ایسی ہولناک تمہید ہے!

نادر۔ میں پھر کہتا ہوں کہ بات ناقابل شنید ہے +

قزل۔ کسی سے دغابازی کرنا؟

نادر۔ نہیں۔

قزل۔ ملک میں فتنہ پردازی کرنا؟

نادر۔ نہیں۔

قزل۔ ڈاکہ؟

نادر۔ نہیں۔

قزل۔ جبر؟

نادر۔ نہیں۔

قزل۔ پھر کیا مضمون —— ہاں ہاں!

نادر۔ قزل قزل!

قزل۔ او خدا۔ او خدا حضور کی آنکھوں میں آگ کے
شعلے نظر آتے ہیں +

نادر۔ وفادار دوست۔ اس محل میں ایک چھوٹا
سا سانپ ہے۔ جو ہمیشہ میرے راستے میں
آتا ہے۔ تو اسے جانتا ہے؟

قزل۔ میں؟

نادر —— نہیں۔

قزل —— قیصر؟

نادر۔ بیشک۔

قزل —— موت؟

نادر۔ چُپ!

(صید ہوس۔ ایکٹ ۲ سین ۲)

ایسی گفتگو جہاں پُر زور اور شاعرانہ تھی۔ وہاں
اس میں یہ خوبی بھی تھی۔ کہ اس کے معنے لوگوں کے
ذہن نشین کرانے کے لئے اس امر کی ضرورت تھی۔
کہ ایکٹر اپنی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے کام لے اور فقروں
کا ربط قایم رکھنے کے لئے ایکٹنگ کی جو گنجائشیں سطروں
کے درمیان تھیں۔ اُنہیں اپنے کام سے دیکھنے والوں
پر واضح کردے + مثال کے طور پر جبتک نادر کی آنکھوں
میں آگ کے شعلے نہ ہوں۔ قزل کا "او خدا او خدا۔۔۔؟
کہنا بے کار ہے +

اس کے علاوہ زبان میں یہ خوبی بھی پیدا ہونی
شروع ہوگئی۔ کہ مختلف موقعوں اور مختلف جذبات
کے اظہار کے لئے ایک ہی روش کے فقرے لکھے
جانے بند ہوگئے۔ اور ہر جگہ ضرورت کے مطابق نثر کے
خاص طول اور نپے تلے زور کے فقرے استعمال میں
آنے لگے۔ اگر ایک سین شروع اس قسم کے ہلکے
پھلکے اور آہستہ بولنے کے فقروں سے ہوتا ہے:۔

"کیا جہان ہے"!

"کیا انسان ہے"!

"واللہ اس واقعے نے تو پتھروں کو بھی رُلا دیا ہوگا"!

تو سین کی بلندی تک پہنچنے پر عبارت کا انداز بھی تبدیل

ہوگیا ہے۔ اور فقرے چھوٹے اور پُرزور بن گئے ہیں:

"صبر۔ بیہودہ صبر۔ میں کیونکر صبر کروں۔ صاحبو دیکھو یہ تمہارا بادشاہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے قدموں پر پڑا ہے۔ اپنے کفن کے لئے تمہاری خیرات کا محتاج ہے۔ ۔ ۔ ۔"

میرے ایک دوست نے تجربے کے طور پر آغا صاحب کا ایک کھیل تھیئٹر ہال کے سب سے پچھلے درجے میں سے دیکھا۔ اور بتایا کہ بعض فقرے اور اشعار جو اگلے درجے سے کسیقدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتے تھے۔ اگر جوش و خروش میں کم ہوتے تو پچھلے درجے والوں کو ان میں ذرا لطف نہ آسکتا۔ اور یہی درجہ ہمارے تھیئٹروں کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے +

آخری سات آٹھ کھیلوں کے سوا آغا صاحب کے باقی کھیلوں کو اُن کی ڈراما نویسی کا دوسرا دَور سمجھنا چاہیئے۔ اور خوبصورت بلا کو پہلے اور دوسرے دَور کے درمیان ایک واسطہ + جو چیزیں خوبصورت بلا میں شروع ہوتی نظر آئیں۔ وہ ان اگلے ڈراموں میں اپنے پورے عروج پر پہنچ گئیں۔ اور اُنہوں نے اردو ڈراما پر طرح طرح کے اثر ڈالے +

جو باتیں ابتدائی ڈراموں میں بیان کی گئیں۔ ان کے علاوہ خوبصورت بلا میں دو خصوصیات بہت نمایاں ہیں + ایک تو یہ کہ اس میں اشعار بلند آہنگ اور ہنگامہ خیز ہو گئے۔ اور دوسرے یہ کہ ایک اس قسم کا کیرکٹر اسٹیج پر آیا۔ جو اپنے ہی زمانے کی ایک خاص طبع و خصلت کی جماعت کا نمائندہ تھا۔ میری مراد خیر سلّا سے ہے +

آغا صاحب کی ڈراما نویسی کے دَوران میں ادب کے متعلق لوگوں کا مذاق بتدریج تبدیل ہو رہا تھا۔ حقیقت کا رنگ غالب آتا جا رہا تھا۔ داستانوں کی جگہ نئی قسم کا ناول لے رہا تھا جس میں ہندوستانی زندگی لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ اور عام زندگی میں سے کیرکٹر چن کر اُن کے متعلق ناول لکھے جاتے تھے۔ لوگوں کے اس رجحان کا ڈراما پر اثر پڑنا بھی ضروری تھا۔ لیکن ڈراما کو یکلخت اپنی زرق برق دنیا سے نکال کر عام اور سادہ زندگی میں لے آنا ایک پیشہ ور ڈراما نویس کے لئے خطرے سے خالی نہ تھا +

چنانچہ آغا صاحب نے لوگوں کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے کامک کا میدان تجویز کر لیا۔ اور اس میں پہلی مرتبہ ایک اس قسم کا کیرکٹر اسٹیج پر دکھایا۔ جو نئے فیشن کا دیوانہ اور گویا ٹھیک اُسی زمانہ کی پیداوار تھا +

انگریزی فیشن نے ابھی تک ہندوستانیوں کو زیادہ متاثر نہ کیا تھا۔ اور ہندوستان کی ایک بہت بڑی جماعت فیشن پرستی پر اُنگلیاں اُٹھاتی تھی + خیر سلّا میں وہ سب کمزوریاں تھیں۔ جن پر وضع داروں میں قہقہے اُڑتے تھے۔ چنانچہ یہ کیرکٹر اسقدر پسند کیا گیا۔ کہ برسوں لوگ اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ بلکہ دوسرے ڈراماٹسٹ اپنے ڈراموں کی کامیابی کے لئے ایک نئی روشنی کے دیوانے کو اسٹیج پر لانا ضروری سمجھنے لگے۔ حشر اس کیرکٹر کو لکھ کر بھول بھی گئے۔ مگر خیر سلّا کی اولاد ایسی پھولی پھلی کہ قسمت

سے کوئی ہی ڈراما اس سے محفوظ نظر آتا تھا۔

آغا صاحب کے دوسرے دور کے کھیلوں نے ہندوستانی ڈراما کو بے انتہا متاثر کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ڈراما گویا ایک نظیر تھی جس کو سامنے رکھ کر دوسرے ڈراما نویسوں نے کثرت سے ڈراما لکھے۔ خواب ہستی اور سلور کنگ ہماری اسٹیج پر سنادہ اور عام زندگی کے کھیلوں کی ابتدا تھی۔ چنانچہ ان کے نکلنے کے بعد در جگر اور موہنی بی۔ اے اور اسی رنگ کے اور کھیل بہت کثرت سے ہندوستانی اسٹیج پر آچکے ہیں۔ مشرقی ستارہ اگرچہ کوئی تاریخی کھیل نہ تھا۔ تاہم رومیوں کی عظیم قوم کے متعلق ایک کھیل اسٹیج پر آجانے سے تاریخی کھیل لکھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ اور نیرو اور تیغ ستم وغیرہ کھیل سٹیج پر آگئے۔ اگرچہ ہندوؤں کے مذہبی کھیل ہرلشچندرا ور مہابھارت وغیرہ پہلے سے اسٹیج پر آچکے تھے لیکن اس رنگ کی طرف بھی زیادہ توجہ تبھی ہوئی جب آغا صاحب کے سورداس اور بن دیوی نے داد تحسین حاصل کر لی۔

آغا صاحب کے دوسرے دور کے ڈراموں میں سورداس۔ بن دیوی اور کئی دوسرے ڈرامے ہندی میں ہیں جن کے متعلق نہایت غلط طور پر یہ شبہ کیا جاتا ہے۔ کہ وہ کسی پنڈت کی امداد کے ممنون احسان ہیں۔ نہ معلوم یہ شبہ کیونکر پیدا ہوا۔ غالباً ہندی میں آغا صاحب کی قابلیت پر کوئی شخص متحیر ہوا۔ اور باوجود کوشش کے یہ یقین نہ کر سکا کہ ایک مسلمان اس بے تکلفی سے ایک اجنبی زبان میں اتنے حسنِ مذاق سے کوئی تصنیف کر سکتا ہے۔ اور اس نے اپنے اطمینان کے لئے یہ توجیہ بنالی۔ کہ آغا صاحب نے ان ڈراموں میں کسی پنڈت سے امداد لی ہوگی۔ یہ خیال دوسرے لوگوں کو بھی قرین قیاس معلوم ہوا۔ اور عام طور پر مشہور ہو گیا۔

لیکن حیرت ہے۔ کہ ہندی سی زبان کو جو اُردو سے اتنی قریب ہے۔ اتنا عسیر الحصول کیوں سمجھ لیا گیا۔ کہ اس کے متعلق طرح طرح کی توجیہات کے اختراع کی ضرورت پڑی! مسلمانوں کے ہندی نہ پڑھنے کے متعلق علماء کا تو کوئی فتویٰ موجود نہیں۔ پدماوت کا مصنف ایک مسلمان ہی تھا۔ تو پھر اس زمانے میں کہ زبان سیکھنے کے متعلق پرانے زمانے کی نسبت بہت زیادہ سہولتیں بہم پہنچ گئی ہیں۔ حشر کے اعلیٰ ہندی لکھنے پر کیوں شبہ کیا جائے؟

اوّل تو یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کہ آغا صاحب اوائل شباب میں عیسائی اور ہندو علما سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مذہبی معلومات حاصل کرنے کے لئے انہیں ہندوؤں کی مذہبی کتب کا مطالعہ کرنا ہوتا ہوگا۔ اور یہ بغیر ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کے دشوار ہے۔ پھر لوگ اس خیال سے کہ آغا صاحب کے ڈراموں جیسے ہندی ڈرامے اور کوئی نہیں لکھ سکا۔ یہ تو مان لیتے ہیں۔ کہ یہ ڈرامے تصنیف آغا صاحب ہی کے ہیں۔ مگر ان کا ترجمہ کسی پنڈت نے کیا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم۔ کہ مختلف زبانوں میں سوچنے کے ڈھنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اور جب تک مصنف اس زبان کے خاص طرزِ تخیّل کو سمجھ کر اس کے مطابق نہ سوچے۔ اس کی تصنیف باوجود اس زبان میں ترجمہ ہو جانے کے بھی اعلیٰ درجہ کی نہیں ہو سکتی۔ ایک انگریز اگر ہندوستانیوں

کی معاشرت کے متعلق انگریزی ہی کے تخیل سے کام لے کر کوئی تصنیف کرتا ہے۔ اور اسے اردو میں ترجمہ کرکے یہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ کہ اس نے کوئی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ تو اُسے اپنی تصنیف کے متعلق ہندوستانیوں کی رائے سُن کر مایوسی ہوگی +

کسی زبان کا طرزِ تخیل سمجھنا محض زبان کا علم حاصل کرنے سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ اور بغیر غور و خوض سے مطالعہ کرنے کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ حشر ہندی زبان میں کامل عبور کا ثبوت ایک تو اپنی مختلف تقریروں میں دے چکے ہیں۔ جن میں عربی اور فارسی کا ایک لفظ اُنہوں نے استعمال نہیں کیا۔ اور اس کے علاوہ سب سے بڑی بات اُن کی تصانیف میں یہ ہے۔ کہ وہ خیالات تشبیہوں۔ استعاروں اور مذہبی حوالوں کے لحاظ سے ٹھیٹھ ہندی چیزیں ہیں۔ اور ان ہی کی وجہ سے ہندی کے نامور ادیبوں۔ عالموں اور اخبار نویسوں نے اُن کے ڈراموں کے محاسن کا اعتراف کیا ہے +

بلوا منگل میں سری کرشن مہاراج کی پہلی تقریر ہے:-

"برہم پتر! اس مایہ روپی سنسار میں دُکھ کا کارن نش کی منو کامنائیں۔ اچھائیں رسی کے کرن ہیں۔ جیسے مکڑی اپنے اندر سے نکالے ہوئے جالے میں آپ ہی پھنس جاتی ہے۔ اور جب تک اس کے چاروں طرف تنے ہوئے جال کو نہ توڑا جائے چھٹکارا نہیں پاتی۔ ویسے ہی جب تک یہ سنسار موہ۔ لوبھ اور تیرا میرا کے بندھنوں کو توڑ کر برہم نشٹ ہونے کا یتن نہیں کریگا۔ وہاں تک برابر کشٹ اُٹھاتا رہے گا۔ جیسے چھوٹی بڑی ہزاروں پرکار کی لہروں سے بنی ہوئی کرن دھارا نش کام ہو کر چیت روپی سمندر میں شانت نہ رہے گی۔ وہاں تک جیون کا جہاز انت کال تک دکھ کے بھنور میں ڈگمگاتا رہے گا" +

یہ تقریر آغا صاحب کے ہندی کے سب سے پہلے ڈرامے میں سے ہے۔ بھیشم اور سیتا بن باس۔ اور دوسرے ہندی ڈرامے جو آغا صاحب نے بعد میں لکھے۔ اور جن کے محاسن نے ہندی ادب میں ایک سنسنی پیدا کردی۔ میرے سامنے نہیں۔ لیکن اسی ڈراما کی یہ تقریر کم از کم ایک بات بخوبی ظاہر کرتی ہے۔ کہ یہ تقریر ہندی ہی میں سوچی ہوئی ہے۔ اور جس اعتقاد سے لکھی گئی ہے وہ اعتقاد ہندو ادب۔ تہذیب اور مذہب پر عبور ہوئے بغیر پیدا نہ ہوسکتا تھا۔ فی الحقیقت آغا صاحب نے ہندوؤں پر اور اُن کے ادب پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ مسلمان اپنے باکمالوں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ لیکن یقین ہے۔ کہ ہندو قوم آغا صاحب کی ان خدمات کو ہمیشہ گہرے احترام کی نظر سے دیکھتی رہے گی +

آغا صاحب کے دوسرے دور کے ڈراموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ حقیقت سے قریب تر ہوگئے اور اسٹیج پر واقعات ڈراما کی دنیا زیادہ واضح نظر آنے لگی۔ پہلے ڈراموں کے کیرکٹروں میں انسانی صفات تو نمایاں ہوتی تھیں۔ تاہم دیکھنے والوں کو ان کے متعلق اس سے زیادہ واقفیت حاصل نہ ہوتی تھی کہ وہ انسان ہیں۔ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ نیکی اور

اخلاق کے عام اصولوں کے پابند ہونے کے علاوہ۔ ان کا وطن۔ مذہب اور ان کی طرزِ معاشرت کیا ہے۔ اس قسم کی باتیں ڈراما میں ظاہر نہ کی جاتی تھیں۔ بس آغا صاحب کا زورِ قلم تماشائی کے تخیل کو گھسیٹ کر اپنے ڈراما کی فضا میں لے جاتا۔ اور اس دنیا کی دلچسپیوں میں چھوڑ دیتا تھا۔ ماہ پارا اور دلآرا کی سنگدلی۔ ماہجبین کی دیوانگی۔ طغرل کی شقاوت وغیرہ گو بہت مؤثر چیزیں تھیں۔ تاہم اجنبی تھیں۔ اور تماشائی کو ان پر متوجہ رکھنے کا کام مصنف کا زورِ قلم کرتا تھا۔

لیکن دوسرے دور میں عام زندگی کے واقعات اسٹیج پر آنا شروع ہو گئے۔ خوابِ ہستی میں گو ایک نواب کے خاندان کے حالات ہیں۔ تاہم واقعات میں اجنبیت نہیں۔ عیاش نوجوان کا بدکاری کی وجہ سے گھر سے نکال دیا جانا۔ باپ کا اُسے عاق کر دینا۔ اُس کا ایک سیدھی سادی لڑکی کو (جو اس پر فریفتہ ہے) جھوٹی محبت کا یقین دلا کر باپ کے ہاں چوری کروانا موجودہ زندگی سے بہت قریب کی باتیں ہیں۔

سلور کنگ ایک متوسط حیثیت کے گھرانے کا کھیل ہے۔ افضل کے چند دوست جو دل میں اس سے کینہ رکھتے ہیں۔ ایک قتل اس صفائی سے کرتے ہیں۔ کہ صورتِ حالات پکار پکار کر افضل کو قاتل قرار دیتی ہے۔ اور سزا سے بچنے کے لئے اُسے وطن سے فرار ہونا پڑتا ہے۔ آسٹریلیا میں بے شمار دولت کما کر وہ ایسے وقت گھر واپس آتا ہے۔ کہ اُس کی بیوی۔ بچی اور بوڑھا خادم افلاس کے ہاتھوں انتہائی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ افضل اپنی بے گناہی کے ثبوت بہم پہنچا کر اصل قاتلوں کو سزا دلواتا ہے۔

سلور کنگ کے بعد جتنے بھی کھیل لکھے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کسی خاص ملک۔ خاص معاشرت۔ یا خاص زمانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور دیکھنے والے کے تخیل کو (جو اب رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ زیادہ باریک بین بن گیا تھا) ان سے کماحقہ لطف اندوز ہونے میں کسی قسم کی اُلجھن نہ ہوتی تھی۔

یہاں آغا صاحب کے ڈراموں کے کیرکٹروں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ دوسرے دور کے تمام ہونے تک ان کے تمام کھیلوں کے کیرکٹروں میں میلوڈراما کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مجھے ذرا وضاحت سے بیان کرنا ہوگا۔ شکسپیئر اور کئی دوسرے بڑے مصنفین کی تصانیف میں یہ ایک نمایاں اصول نظر آتا ہے۔ کہ قدرت کو اعتدال پسند ہے۔ اور انتہا سے نفرت ہے۔ خداوند تعالیٰ نے دنیا کے لوگوں کو مختلف خصوصیات کی جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان جماعتوں کے افراد جب تک اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ اور اپنی جماعتی خصوصیات کی مقررہ حدود سے باہر نہیں نکلتے۔ قدرت خود ان کی حفاظت کرتی اور انہیں آفات و مصائب سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن جب یہ افراد کسی امر میں انتہا پر اتر آئیں تو تو خود قدرت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ انہیں تمام کر ڈالے۔ ٹریجیڈی کے ہیرو یہ انتہا پسند افراد ہوتے ہیں۔

شکسپیئر کی تمام ٹریجیڈیوں کے ہیرو انتہا پسند

ہیں۔ میکبتھ میں رتبے اور جاہ کی ہوس انتہا درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔ اتھیلو انتہا درجے کا غیر تمند ہے۔ جو بات بات میں شبہ کرتا ہے۔ ہملٹ میں غور و خوض اور تحمل کی انتہا ہے۔ اور ان کیرکٹروں کی شخصیت کا یہی انوکھا پن اُن کی بربادی کی وجہ بن جاتا ہے +

ٹریجیڈی کا مصنف جب ڈراما لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ پہلے ڈراما کے پلاٹ کو نہیں سوچتا۔ وہ صرف کھیل کے کیرکٹروں کو دماغ میں لا کر ان کی شخصیت کے انوکھے پن پر غور کرتا ہے۔ اور پھر ان کی سیرت کو ذہن میں رکھ کر ایک ایسا پلاٹ بناتا ہے۔ جس میں مختلف سین کیرکٹر کی خصوصیات کو ظاہر کریں۔ یا اس کے کیرکٹر کی تبدیلیوں کو نمایاں کر سکیں۔ اور اس طرح کیرکٹروں میں ان جراثیم کی موجودگی تماشائیوں پر واضح ہوتی جائے۔ جو ان کی بربادی کا باعث بن جاتی ہے +

برخلاف اس کے میلو ڈراما کا مصنف پہلے کیرکٹر نہیں بناتا۔ وہ پہلے نہایت دلچسپ اور انگیز واقعات کو ایک کہانی کی لڑی میں پروتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد اس قسم کے کیرکٹر سوچتا ہے۔ جو اس کے تجویز کردہ راستے پر با آسانی چل کر منزلِ مقصود پہ پہنچ سکیں۔ اور پھر حسب ضرورت پلاٹ کی صورت اور کیرکٹر کی خصوصیات میں مناسب تغیر و تبدل کر لیتا ہے +

آغا صاحب نے اپنے دوسرے دور ٹریجیڈی کے کیرکٹر نہیں لکھے۔ ان کے ڈراموں کے مطالعہ سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ وہ پہلے دلچسپ واقعات کی ایک کہانی سوچتے تھے۔ اور پھر اس کی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر کیرکٹر پیدا کرتے تھے +

بن دیوی پر (جسے اب بھارت رمنی کے نام سے آغا صاحب نے دوبارہ لکھا ہے) اس خیال سے نظر ڈالی جائے۔ تو ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اس کے کیرکٹر اپنے مستقبل کے لئے خود اپنے الفاظ و اعمال سے کوئی راستہ نہیں بنا رہے۔ بلکہ مصنف نے اُن کے لئے جن واقعات کو تجویز کر دیا ہے۔ اس میں سے سنبھلتے سنبھلتے حسن و خوبصورتی سے گذرتے چلے جا رہے ہیں +

جب راج کشور رشی پتری بن دیوی سے شادی کر لیتا ہے۔ تو پردھان کی بیٹی پربھاوتی جسے راجکمار سے اپنی شادی ہونے کی اُمید تھی۔ بہت مایوس ہوتی ہے۔ یہ شبہ ہو جانے کے بعد کہ بن دیوی نے کسی منتر سے راج کمار کے دل کو موہ لیا ہے۔ سکھیاں اُسے مشورہ دیتی ہیں۔ کہ تانترک مہاراج سے مدد لینی چاہئے۔ جو جوتش اور منتر ودیا میں بے مثال قابلیت رکھتے ہیں + تانترک پربھاوتی کے ایما سے راجکمار کو بن دیوی سے جدا کروانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ چال چلتا ہے۔ کہ ہر روز شہر کے بچوں کا خون خود کر کے ان کے سر بن دیوی کی خوابگاہ میں پہنچا دیتا ہے + آخر اُس پر خون کا جرم ثابت کر کے اُسے موت کی سزا دلواتا ہے + ایک قاتل رحم کھا کر بن دیوی کو چپ چپاتے چھوڑ دیتا ہے۔ اور وہ مردانہ لباس پہن کر راجکمار کی خدمت میں حاضر ہو جاتی ہے + راجکمار بہت مجبور کئے جانے پر پربھاوتی سے شادی تو کر لیتا ہے۔ مگر ملول رہتا ہے۔ اُدھر تانترک کے سر پر معصوم بچوں کا خون سوار ہے

ادھر پربھاوتی اپنے آپ کو بن دیوی کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہی ہے۔ دونوں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو دربار میں جاتے ہیں اور اعتراف جرم کر لیتے ہیں۔ مگر بن دیوی کے اپنے آپ کو ظاہر کر دینے سے سب بچ جاتے ہیں۔

اس قصے میں واقعات کی دلچسپی اسقدر نمایاں ہے، کہ ظاہر ہے۔ پہلے کہانی بنائی گئی ہے۔ اور پھر اس کے مناسب حال کیرکٹر سوچے گئے ہیں۔ کیرکٹر بنا کر ان کی شخصیت کے مطابق کہانی نہیں سوچی گئی۔

عوام کو غم انجام ڈرامے بہت کم مرغوب ہوتے ہیں۔ وہ ڈراما کو کشمکش میں تو انتہائی درجہ پر پہنچا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی کشمکش کے دوران میں انہیں جس کیرکٹر سے اُلفت ہو جائے۔ اور جس کے مستقبل کے ساتھ کسی طرح ان کی ہمدردیاں وابستہ ہو جائیں۔ اُسے ہلاک ہوتے دیکھنا کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ایسی صورت حالات میں پیشہ ور ڈراما نویس کے لئے میلوڈراما سے محفوظ کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ ہندوستان کا تو کیا ذکر مدتوں انگلستان میں تھیئٹروں کے مالک اس قسم کے ڈرامے اسٹیج پر لانے میں متامل رہے۔ جن کا انجام عوام کی رائے کے مطابق خوشگوار اور منطق کی رو سے ٹریجیڈی ہونا چاہئے تھا۔ تھیئٹروں کے مالکوں کو اس بات کا کہاں تک خیال تھا۔ اس امر سے بخوبی ظاہر ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں کنگ لیر اور رومیو جولیٹ شکسپیئر کی دونوں مشہور ٹریجیڈیاں یوں انگریزی اسٹیج پر آتی تھیں کہ ان کے آخری حصّے کو از سرِ نو لکھ کر خوش انجام بنایا گیا تھا۔

چنانچہ اگر اسی قسم کی ضروریات سے مجبور ہو کر آغا صاحب خوابِ ہستی کے آخر میں آوارہ صولت کو سدھر جانے پر آمادہ دکھا دیں تو وہ قابلِ الزام نہیں۔ خوابِ ہستی میں لوگوں کی محبوب کیرکٹر حسنیٰ جو صولت کو دیوانہ وار چاہتی ہے۔ نامراد رہی جاتی ہے۔ صولت کے بغیر اُس کی خوشی نامکمل ہے۔ اور حسنیٰ کی کامرانی کے بغیر تماشائیوں کی خوشی نامکمل۔

آغا صاحب کے دوسرے دور کے ڈراموں میں اشعار کا استعمال معراج کمال پر پہنچا ہوا ہے بعض لوگ ڈراموں میں اشعار کو پسند کرتے ہیں اور بعض ناپسند۔ یہ موضوع ایک جدا بحث کا محتاج ہے۔ یہاں صرف اسقدر کہنا کافی ہے۔ کہ ڈراما کو پُرزور اور کامیاب بنانے کے لئے مناسب موقعوں پر اشعار کا استعمال ناجائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہندوستان سے باہر بھی اس طریق پر عمل ہوتا آیا ہے۔ شکسپیئر کے ڈراموں میں ایسی مثالیں بھی اکثر جگہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ کہ ڈراما کے جاہل کیرکٹر نہ صرف نظم میں بلکہ شاعری میں گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ ٹولفتھ نائٹ میں جاہل بحری کپتان کی تقریر اسی قسم کا نمونہ ہے۔

اشعار کا استعمال محض اس بناء پر قابلِ اعتراض قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کہ انسانی فطرت کے مطابق نہیں ڈراما کی کوئی گفتگو بھی فطرت کے عین مطابق نہیں ہوتی اس کا راستہ ہی جدا اور مقصد ایک خاص قسم کا اثر پیدا

کرنا ہوتا ہے ۔ جو نازک طبع اردو ڈراما کی شاعرانہ گفتگو سے پریشان ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ برناڈشا وغیرہ کے کھیلوں میں بھی جو نثر کیرکٹروں کی زبان سے نکلتی ہے ۔ وہ عام گفتگو سے اتنی ہی مختلف ہوتی ہے جتنے شعر ۔ حقیقی زندگی میں کوئی شخص ایسی نثر نہیں بول سکتا ۔ اور نہ اس تواتر سے بول سکتا ہے +

اور پھر اشعار کا استعمال جائز یا ناجائز ہونا اسقدر بحث کا محتاج نہیں جسقدر اس امر کا محتاج ہے کہ استعمال کا موقع اور شعر فی ذاتہ کیسا ہے ۔ اگر شعر اوق ۔ موقع کے اعتبار سے پھیکا ۔ اور اس قسم کا ہے کہ ایکٹر اُسے لطف سے ادا نہیں کر سکتا ۔ تو اُس کا استعمال قطعی ناجائز ہے ۔ لیکن اگر ایک سیدھا سادا خیال ہے ۔ جذبے کو بخوبی ظاہر کر سکتا ہے ۔ تعقید کی اُلجھن سے پاک ہے ۔ اور اثر بہت بڑھ جاتا ہے تو اس کا استعمال کسی طرح ناجائز نہیں قرار دیا جا سکتا +

حسنیٰ اور صولت کے درمیان خواب آہن کے سین اشعار کے جائز استعمال کی نہایت عمدہ مثال ہیں +

یتیم و لاوارث حسنیٰ نواب اعظم کے گھر میں بچپن سے جوانی کو پہنچنے پر اُس کے آوارہ بیٹے صولت کو دیوانہ وار چاہنے لگتی ہے ۔ لیکن ان ہی دنوں نواب اعظم صولت کی آوارگی سے تنگ آکر اُسے عاق کر کے اُسے گھر سے نکال دیتا ہے ۔ اور اپنی جائداد اپنی بھتیجی رضیہ کے نام لکھ دیتا ہے +

بیتابیٔ شوق حسنیٰ کو صولت کے پاس کھینچ کر لے جاتی ہے ۔ صولت کو علم ہے کہ حسنیٰ اس پر مٹی ہوئی ہے وہ اس کی محبت سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے ۔ اور اس فکر میں ہے کہ اصل وصیت نامہ نکلوا کر اُس کی جگہ چپکے سے ایک جعلی وصیت نامہ باپ کی تجوری میں رکھوا دے چنانچہ وہ پہلے حسنیٰ کو اپنے باپ کے ظلم و ستم کا حال سنا کر اپنے مقصد کی ہمدرد بنانا چاہتا ہے ۔ لیکن جب حسنیٰ اُسے ماں باپ کا درجہ خدا کے بعد سمجھنے کی نصیحت کرتی ہے ۔ اور اُس کے دلائل سے کسی طرح قائل نہیں ہوتی ۔ تو وہ عاجز آکر یوں اُس کی محبت کو متاثر کرنا چاہتا ہے ؎

جس کو دوا سمجھتے تھے وہ درد ہو گیا
بس جاؤ جاؤ تم سے بھی دل سرد ہو گیا

اور جب اس عتاب سے سہم کر حسنیٰ پوچھتی ہے "میری تقصیر" ؟ تو اُسے اَور بیتاب بنانے کو کہتا ہے "میری تقدیر" ؎

سب ہیں ستانے والے غم کے بڑھانیوالے
دل کے جلانیوالے ۔ چرکے لگانے والے
قسمت کے زخمیوں کا ہمدم نہیں ہے کوئی
نشتر تو سیکڑوں ہیں مرہم نہیں ہے کوئی

حسنیٰ اپنے محبوب کے شکوۂ بے وفائی سے پگھل کر یوں پھوٹ پڑتی ہے ؎

جان و جہان پھینکدوں تم پر سے وار کے
قدموں کے آگے ڈال دوں یہ سر اُتار کے
آنکھیں نکال دوں میں اشارہ اگر ملے
پی جاؤں زہر حکم تمہارا اگر ملے

صولت اُسے اور اُکساتا جاتا ہے ۔ اور جب حسنیٰ کا جوش

محبت بڑھتا بڑھتا اُس سے یہ کہلوالیتا ہے۔ "میں پھر کہتی ہوں۔ مجھے محبت ثابت کرنے کا موقع دو"۔ تو صولت لوہے کو سرخ دیکھ کر ضرب لگاتا ہے۔ جعلی وصیت نامہ حسنیٰ کو دے کر اصلی وصیت نامہ چرالانے کو کہتا ہے۔ اور اُس کے ایمان کے احتجاج کو عشق کی اس دھمکی سے دبانا چاہتا ہے ؎

کسوٹی اب بتادیگی کہ کیا کیا تم سے ہونا ہے
یہ چمکیلا سنہرا عشق پیتل ہے کہ سونا ہے

حسنیٰ چوری کے خیال سے کھوئی سی جاتی ہے۔ اور آخر چونک کر جب انکار کرتی ہے۔ تو صولت کے طعنے کو نثر کے ساتھ نظم کیسے پہ سے لگادیتی ہے +

صولت:۔ سرد ہوگئیں؟ زرد ہوگئیں؟ عشق کا بخار اُتر گیا؟ محبت کا جوش مرگیا ؎

راہِ وفا میں دو ہی قدم چل کے گر گئی
کیا جان دے گی تو جو زباں دیکے پھر گئی

محبت کے ہاتھوں ایمان کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ اور حسنیٰ چوری پر آمادہ ہوجاتی ہے +

صولت کا دل امید و بیم کی کشمکش گاہ بنا ہُوا ہے کہ محبت کی ماری حسنیٰ وصیت نامہ چرا کر لے آتی ہے۔ اس موقع پر بھی صولت کی بیتابی جس زور سے اشعار میں ظاہر ہوگئی اور اشعار نے ہندوستان کے معمولی قابلیت کے ایکٹر کے لئے جو آسانی بہم پہنچادی نثر میں پیدا ہونی دشوار تھی +

صولت (حسنیٰ کو دیکھتے ہی)

تریاق لائی زہر ہلاہل کیواسطے
کیا وار[1] مل گیا دمِ قاتل کیواسطے (؟)

حسنیٰ ۔ جنت تھی اس طرف کو جہنم تھا اُس طرف
نیکی بدی میں جنگ ہوئی دل کیواسطے
خوبی۔ امانت۔ آبرو۔ حق فرض اعتبار
سب قتل ہوگئے ترے لبسمل کیواسطے

صولت۔ تو بیشک تو آبِ بقا لے کے آئی
ہے مرہم مرے زخم کا لے کے آئی
مسیحا بنی تھی شفا لے کے آئی
مرے دردِ دل کی دوا لے کے آئی

سیوں چاک قسمت وہ رشتہ مجھے دے
فرشتے فرشتے نوشتہ مجھے دے

جوشیلی بحثوں کے موقعوں پر آغا صاحب اشعار میں قافیے اس قسم کے استعمال کرتے ہیں کہ ضرب کی طرح آ آ کر پڑتے ہیں۔ اور ان سے اسٹیج پر رونق اور ایک کیفیت سی پیدا ہوجاتی ہے۔ مثلاً پہلا پیار میں عذرا یہودی کے یہ اشعار ؎

مہمل نہیں اگرچہ کلامِ ادق ہوں میں
میری سنو زمانہ کی آواز حق ہوں میں
لکھے ہیں جس پہ رازِ جہاں وہ ورق ہوں میں
مجھ کو پڑھو کتاب فنا کا سبق ہوں میں

عبرت کدہ بنا ہوں عروج و زوال کا
آئینہ ہوں زمانہ ماضی و حال کا

ڈراما حقیقت میں نظم یا نثر کی شاعری اور فلسفیانہ خیالات کا محتاج نہیں۔ ڈراما کا تعلق سب سے زیادہ عمل سے ہے چنانچہ دنیا میں کئی ڈرامے ایسے بھی لکھے گئے ہیں۔ جو

[1] یہ مصرعہ بظاہر بے معنی ہے صحیح کہیں سے دستیاب نہ ہوسکا۔

الفاظ تک کے شرمندۂ احسان نہیں۔ اور خاموشی
میں صرف عمل کی امداد سے کئے جاتے ہیں۔ سینما نے
اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا تھا +

ایک ڈراما جس میں شاعرانہ خوبیاں کثرت سے
موجود ہوں مگر عمل مفقود ہو۔ ڈراما نہیں۔ لیکن وہ ڈراما
جس میں عمل نمایاں اور شاعری سرے سے موجود
نہ ہو۔ قطعی ڈراما کہلانے کا مستحق ہے۔ ہاں اعلیٰ ڈراموں
میں عمل کے ساتھ شاعرانہ محاسن بھی موجود ہوتے ہیں
اور یہی خوبی ان کی حیات جاوداں کی ذمہ وار ہوتی
ہے +

یورپ کے موجودہ ڈراموں کی تحریر میں شاعری
بہت کم ہے۔ البتہ مکالمات نہایت خوبی و عمدگی سے
لکھے جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جچے تلے الفاظ
کے فقرے ہوتے ہیں جن میں جذبات نہایت
احتیاط اور روک تھام سے مناسب حد کے اندر اندر
ظاہر کئے جاتے ہیں۔ ڈراما نویس کیرکٹر کے منہ سے
اس کی دماغی کیفیات بیان نہیں کرواتا۔ بلکہ چند
ایسے مناسب الفاظ کہلوا دیتا ہے۔ جو تمام ضروریات
پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ کئی جگہ جواب میں کسی کیرکٹر
کی خاموشی الفاظ سے بھی زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔ یہ
سب کچھ اس لئے ہے کہ انہوں نے اسٹیج پر عمل کی
آواز کو الفاظ سے زیادہ بلند کر دیا ہے +

مغربی اسٹیج پر روشنی کے انتظام میں ایسی قابل
قدر ترقی ہوئی ہے۔ اور دوسرے فنون لطیفہ اسٹیج
کو اسقدر امداد پہنچاتے ہیں۔ کہ تماشے کا ایک ایک
لمحہ تماشائی کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے کانوں
اور آنکھوں سے داد وصول کرتا ہے +

لیکن ہمارا اسٹیج اپنی مختلف معذوریوں کی وجہ
سے کانوں ہی کو زیادہ متاثر کر سکتا ہے۔ چنانچہ
اس لحاظ سے آغا صاحب کے ڈراموں میں نظم کی شاعری
بھی ہوتی ہے۔ اور نثر کی شاعری بھی۔ ان کا سحر آفریں
قلم ڈرامے میں جابجا خوبصورت اور موثر فقروں کے
پھول بکھیرتا چلا جاتا ہے +

اس دور کے آغاز میں آغا صاحب کا مکالمہ
لکھنے کا انداز یہ تھا۔ کہ کیرکٹر پہلے نثر بولتے تھے۔
اور اس کے بعد نظم۔ کہیں صرف نثر۔ اور کہیں صرف
نظم۔ ان سے پہلے یہی انداز بھدے اور کمزور
طریق پر عام طور سے رائج تھا۔ اور کمپنیوں کے ضرورت
سے زیادہ محتاط مالکوں کے لئے ڈراما کو موثر اور
کامیاب بنانے کے لئے لازمی تھا۔ آغا صاحب
نے یہ انداز اختیار کر کے اپنے دوسرے دور کے ابتدائی
ڈراموں سے سٹیج کو گرمایا اور اپنی قادر الکلامی کی خوب
خوب داد لی۔ لیکن اس دور کے آخری زمانہ میں جبکہ
تھیئٹر کی دنیا حشر کے نام سے گونج اٹھی تھی۔ اور بڑے
شہروں میں ہر تماشہ دیکھنے والے کے لئے حشر کا نام
ڈراما کی خوبی کا ضامن بن چکا تھا۔ نیز اپنی ذاتی کمپنی
چلا کر مالکوں کی فرعونانہ فرمائشوں سے نجات مل گئی
تھی۔ انہوں نے ڈراما میں اپنے ذوق اور اپنی رائے
کے مطابق آزادانہ تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں۔ اور
بن دیوی کا تمام ڈراما اشعار کے بغیر سادہ اور سلیس

زبان میں پیش کر کے تھیٹر کی دنیا میں ایک سنسنی سی پیدا
کردی۔ مجھے یاد ہے۔ کہ اس زمانہ میں کئی ایکٹر اور تھیٹر
سے دلچسپی رکھنے والے انداز تحریر کی اس تبدیلی کا ذکر
یوں کرتے تھے۔ گویا ایک محیّر العقول واقعہ گذر گیا ہے
آج یہ بات کتنی ہی معمولی معلوم ہو۔ لیکن اُس زمانہ کے
لوگ جو مقفیٰ عبارتوں کے پُر تکلف اور وزنی مکالموں کو
بھولے نہیں تھے۔ اور اشعار کا استعمال ڈراما کی زبان
کی ایک لازمی خصوصیت جانتے تھے۔ اُنہوں نے
جب سادہ نثر میں پہلی بار رنگین خیالوں کو دیکھا تو یہ بات
ایک معجزہ معلوم ہوتی تھی۔ ہمارے اسٹیج کے لئے
اس قسم کا مکالمہ اُس زمانہ میں ایک عجوبہ تھا +

کشور۔ سندری ٹھیرو۔ کیا تم اس مندر میں روز شوجی
کی پوجا کرنے آتی ہو؟

بن دیوی۔ پتا کی سیوا اور شو کی پوجا ہی میرا پرم
دھرم ہے +

کشور۔ بھلا تم نے جٹا دھاری شو سے کبھی یہ بھی پوچھا
کہ ہے شو جب تم یوگیشور ہو۔ تب تمہارا
اردھانگ روپ کیوں ہے؟ کیا آدھے شریر
سے یوگ کرتے ہو۔ اور آدھے سے پاربتی
ہوئے ہو؟

بن دیوی۔ یہ شو کی لیلا ہے اور شو ہی سمجھ سکتے ہیں +

کشور۔ نہیں اگر چاہو۔ تو شو کے اردھانگ ہونے
کی لیلا تم بھی سمجھ سکتی ہو + سندری پریم اور گیان
دونوں اس سنگت کو چلانے والی شکتیاں ہیں۔
جو ایک ہو کر اس سنسار کو پوتر کرتی اور آنند دھام
بناتی ہیں + جب سورج کی کرنیں کلیوں کی رنگت
میں ملتی ہیں۔ تب کلیاں پھول بن کر چاروں
طرف مدھر سگندھ پھیلاتی ہیں۔ پریم مورت۔
کچھ سمجھیں؟ ہیں چلی کہاں؟

بن دیوی۔ آپ شو کے درشن کرنے آئے ہیں۔ تو
مندر میں جائیے۔ مجھے کیوں روکتے ہیں؟

کشور۔ سندری جس طرح ستار کا شانت تار اپنے
آس پاس کے تاروں کے بجنے سے کانپ
کر جھنکارنے لگتا ہے۔ پانی کی چادر پر سویا
ہوا چاند ہوا کے جھونکوں سے ناچتا ہوا چمک
اُٹھتا ہے۔ اسیطرح تونے میرے اندھیرے
میں پڑے ہوئے جیون کو اپنی جھلک دکھا کر
جگمگا دیا۔ اس من کے تاروں کو ہلا کر آتما کو پریم
کی پکار اور جھنکار سے گونجا دیا +

بن دیوی۔ آپ کرپا کر کے مجھے جانے دیجیئے۔ میرے
پتا اور میری بہن میرا راستہ دیکھتے ہونگے +

اس دور میں آغا صاحب نے گانوں کو بھی ڈراما
میں سے بہت کم کرنا شروع کر دیا۔ اُردو کے ابتدائی کھیل
تو شروع سے آخر تک گانے ہی میں ہوتے تھے۔ بعد میں
جب تحت اللفظ اشعار اور نثر کا رواج ہوا۔ تو بھی گانوں
کی تعداد ستر ستر اسی اسی ہوتی تھی۔ احسن اور طالب کے
کھیلوں میں بھی چالیس چالیس پچاس پچاس گانے ہوتے
تھے۔ لیکن حشر نے ان کی تعداد بہت ہی گھٹا دی۔ ان کے
ابتدائی زمانہ کے ہر ڈراما میں پچیس کے قریب گانے ہیں۔
ان کی تعداد بعد کے ڈراموں میں رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ اور

آخری ڈراموں میں تو پندرہ سولہ سے زیادہ گانے نہیں۔ اور ان میں سے بھی اکثر ایسے ہیں۔ جو رسماً نہیں۔ بلکہ ضرورت کی وجہ سے جائز طور پہلائے گئے ہیں۔ مثلاً ایک طوائف کے ہاں اُس سے فرمائش کی جاتی ہے۔ کہ وہ گانا سنائے۔ اور وہ گاتی ہے۔ ہندوستان میں موسیقی سے جو غیر معمولی دلچسپی ہے۔ اُسے دیکھتے ہوئے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ ہمارے ڈراما کا آغاز اور پیراسے ہوا۔ اور اسے بھی ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں ہونے پایا۔ ایک پیشہ ور ڈرامانویس کے لئے ان کی تعداد اس سے زیادہ گھٹانا کسی طرح خطرے سے خالی نہ تھا +

(باقی)

غزل

از:-
جناب خواجہ محمد محمود اختر۔ بی، اے (آنرز)

وہ مرے دل کا حال کیا جانے　　سوز رنج و ملال کیا جانے

ہر قدم فتنہ ہے قیامت ہے　　آسماں تیری چال کیا جانے

صبر کو سب کمال کہتے ہیں　　عاشقی یہ کمال کیا جانے

خون ہوتا ہے کس کی حسرت کا　　میرا رنگیں جمال کیا جانے

وہ غریبوں کا حال کیوں پوچھے　　وہ غریبوں کا حال کیا جانے

کھو گیا ہو جو دل تصوّر میں　　وہ فراق و وصال کیا جانے

سیلِ خوں کیوں رواں ہے آنکھوں سے　　موسمِ برشگال کیا جانے

مر رہے ہیں فراق میں اختر
وہ مگر اپنا حال کیا جانے

غزل

از:-
نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی مرحوم

جلوہ گر تندیٔ صہبا ہو گئی موج' برق طور سینا ہو گئی

جب زبانِ حال گویا ہو گئی بات خاموشی میں پیدا ہو گئی

دلمیں اٹھی تھی ابھی اک لہر سی آنکھ تک پہنچی تو دریا ہو گئی

عیش کی رات اسقدر کوتاہ تھی شام امشب صبح فردا ہو گئی

دب گیا گرد کدورت میں جو دل دفن ساتھ اُسکے تمنّا ہو گئی

ضبط گریہ مجھکو راس آتا نہیں پھر کھٹک آنکھوں میں پیدا ہو گئی

کچھ نشاں تجھکو ملا اے خاکِ جم تیری دولت کس کے لی کیا ہو گئی؟

پھر کچھ انساں کو نظر آتا نہیں آنکھ جب محو تماشا ہو گئی

دلمیں چپکے سے ذرا آیا خیال اور خبر عالم میں افشا ہو گئی

پیرزن کے کلبۂ تاریک سے
روشنیٔ طاقِ کسریٰ ہو گئی

آغا صاحب کے دیرینہ دوست

"شفاء الملک" حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی لاہور

"اگر میں سکندر نہ ہوتا تو یقیناً
یہ چاہتا کہ دیو جانس ہوتا"
(اسکندر اعظم)

دیو جانس کلبی

اور
افلاطون کی خم نشینی کا افسانہ

از :-
آقائی ادیب میرزا حسین کاظم زادہ
ایرانشہر - مدیر "ایران شہر" (برلن)

مشرقی ممالک میں عام طور پر مشہور ہے کہ افلاطون [۴۲۷ ق م - ۳۴۷ ق م] خم نشین تھا - اور اسی خم میں زندگی بسر کیا کرتا تھا - چنانچہ خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

جز فلاطون خم نشین شراب
سر حکمت بما گوید باز

عوام میں مشہور ہے کہ چونکہ افلاطون نے اواخر عمر میں اپنے آپ کو تیزاب کے مٹکے میں گرا کر ہلاک کر لیا تھا - اس لئے اُسے "خم نشین" کہتے ہیں +

اس افسانہ کی حقیقت اسی قدر ہے کہ یہ خم نشین حکیم افلاطون نہیں بلکہ ایک اور یونانی فلسفی دیو جانس کلبی تھا جس کے متعلق ہم ذیل میں خامہ فرسائی کرنا چاہتے ہیں + -

دیو جانس ۴۱۲ ق م - میں دریائے سیاہ کے ساحلی شہر سینوپ میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ ق م میں شہر کارنتھ میں وفات پائی - اخلاق، طبیعت اور طرز زندگی [illegible] اپنے عہد میں اپنی قسم کا تنہا 'متمائز' اور عجیب و خارق العادۃ انسان تھا - افلاطون اس کو "سقراط دیوانہ" کے خطاب سے یاد کرنے کا عادی تھا - چونکہ خارق الفطرۃ اور خارج العقل حرکتوں کا حامل تھا اس لئے لوگ اسے دیوانہ کہا کرتے تھے - مگر اس دیوانگی کے باوجود اُسے عزیز رکھتے اور فلسفی مانتے تھے چنانچہ اس کے مرنے کے بعد قدر افزائی کے لئے اس کے مجسمے بھی بنائے اور قائم کئے گئے +

دیو جانس نے کوئی مستقل تالیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی - یعنی نہ تو اس نے کبھی کچھ لکھا - اور نہ دوسرے یونانی حکما کی طرح مجلس درس قائم کی - اسے جہاں کہیں جو کچھ نظر آتا اور سوجھتا وہ اُسے موقع، مقام اور حاضرین کا لحاظ کئے بغیر آزادانہ و بے باکانہ ظاہر کر دیتا تھا +

اس کے عقیدے میں اپنے آپ کو لوگوں سے بے نیاز بنانا معمولہ رسوم و عادات کی قید سے چھڑانا اور کمال استقلال و آزادی سے زندگی بسر کرنا [illegible]

دنیا اور فضیلت کی اہم شرط تھی۔ اس کے فلسفے کا یہ
مفاد تھا اور اسی کی بدولت اُس نے اپنے عصر کے تمام
فوائد رسمیہ کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اور مکمل طور پر
آزادانہ زندگی گذارا کرتا تھا ✦

وہ اپنے عہد کے ظاہر پرست زاہدوں اور
عابدوں کا مضحکہ اُڑاتا۔ خطیبوں۔ مقرروں اور مدرسوں
پر طعنہ زنی کرتا۔ اور عام طور پر کہا کرتا تھا کہ یہ بیوقوف
صرف گفتگو کرنے کو فضیلت سمجھتے ہیں۔ اور اپنی لچر
اور پوچ باتوں سے نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے
آپ کو بھی بے وقوف بناتے ہیں ✦

دیوجانس چونکہ بے نیازی اور بے ہمروی
کو ایک فطری اور خدائی طریقہ سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس
نے اپنے لئے سادہ ترین طرز زندگی کا انتخاب کیا تھا۔
چنانچہ ایک چادر ایک آبخورے اور ایک عصا کے سوا
دنیا کی کوئی چیز اپنے ساتھ نہ رکھتا تھا۔ جہاں رات ہوتی
وہیں پڑ رہتا اور جو کچھ اور جیسا کچھ میسر آتا کھا پی لیتا تھا۔
ان چیزوں پر اگر کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے تو وہ ایک
مشکا اور ایک کتا تھا۔ مشکا اُس کی دائمی اقامتگاہ اور
کتا اُس کا دائمی یار غار تھا ✦

دیوجانس کی متانت و استقامت حیرت انگیز
تھی۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ یونانی حکیم انٹیستھن
کے پاس گیا۔ اور اُس کی مجلس درس میں داخل ہونے
کی اجازت چاہی۔ انٹیستھن نے انکار کردیا۔ مگر دیوجانس
وہاں سے نہ ٹلا۔ انٹیستھن نے خفا ہو کر اپنی گرہ دار
لکڑی اُٹھائی اور کہا۔ "اگر تو یہاں سے نہ ٹلا تو تیرا
سر توڑدوں گا" دیوجانس حقارت سے ہنسا اور
بولا۔ "کیا تیرا خیال ہے کہ تیرا عصا میری متانت و
عزم سے زیادہ مضبوط ہے؟ اچھا یونہی سہی! تیرا عصا
اور میرا سر! اگر تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کردیگا
تب بھی میں یہاں سے نہیں جاؤنگا"

انٹیستھن یہ استقامت دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اور اسے
چپ چاپ اپنے شاگردوں کے حلقے میں شریک کرلیا ✦

جن زمانے میں دیوجانس نے اگینا کا سفر کیا۔
ملاحی قزاقوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اور کریٹ کے بازار میں
غلام کی حیثیت میں فروخت کردیا۔ کورنٹ کے ایک
باشندے اکسنیادیس نے اُسے خرید لیا تھا اور
اپنا متصدی اور اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کردیا ✦

جس وقت سکندر اعظم نے کورنٹ کو فتح کیا۔ اس
نے دیوجانس سے بھی ملاقات کی اور اُس کی صحبت سے
فیض اندوز ہوا۔ اور جیسا کہ مشہور ہے اس کی آزادانہ
حالت پر رشک کرتے ہوئے کہا "اگر میں سکندر نہ ہوتا
تو یقیناً یہ چاہتا کہ دیوجانس ہوتا" ✦

دیوجانس اہل زمانہ سے تکلیف زدہ اور بیزار
تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ "مجھے کوئی انسان نہیں ملتا"
اس لئے مردم گریز اور گوشہ نشین تھا۔ اس کو اپنے کتے
سے بیحد محبت تھی۔ اسی لئے لوگ اُسے اور اس کے
پیرووں کو کتا کہا کرتے تھے۔ چنانچہ دیوجانس کے ساتھ
"کلبی" کا لفظ جو ہم میں مشہور ہے۔ عرب مورخین کا عطا
کردہ لقب ہے ✦

دیوجانس کتے کو انسانوں پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ

کتے کی عادات و خصائل کا حد سے زیادہ مداح تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ آدمزادوں کو چاہئے کہ وہ بھی کتوں کی طرح نیک خصائل کے مالک بنیں اور اپنے دوستوں اور خیرخواہوں سے باوفا اور دشمنوں اور بدخواہوں سے سخت گیر اور جنگ آزما ہوں +

باوجود اس کے کہ دیوجانس نے وصیت کی تھی۔ کہ اس کی لاش مزبلہ پر پھینکدی جائے۔ اس کے دوستوں اور معتقدمندوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اس کا مقبرہ بنایا۔ اور یونانی صناعی نے اس پھکڑ کا ایک مرمری مجسمہ نصب کردیا +

دیوجانس سے منسوب بعض دلچسپ حکایات

ایک دن دیوجانس افلاطون کی مجلس درس میں گیا اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر درس سننے لگا۔ افلاطون اپنے شاگردوں کو انسان کی تعریف بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "انسان بغیر پروں کا ایک حیوان ہے جو دو پیروں سے چلتا ہے" دیوجانس نے اس تعریف کو ذہن میں رکھا۔ دوسرے دن ایک مرغ لے کر اس کے پر نوچ ڈالے اپنی قبا میں چھپا کر افلاطون کی مجلس میں پہنچا۔ اور مرغ کو شاگردوں کے سامنے پھینک کر بولا "میرے دوستو! دیکھو! یہ وہ انسان ہے جس کی کل تمہارا اُستاد تعریف کر رہا تھا"

ایک دن دیوجانس افلاطون کے باغ کے پاس سے گذر رہا تھا۔ انجیر کا ایک درخت نظر آیا جو میوے سے لدا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور مالی سے کہا "اس درخت سے دو انجیر مجھے توڑ کر لادو" مالی پلٹ کر اندر گیا۔ اور افلاطون سے واقعہ بیان کیا۔ افلاطون نے حکم دیا۔ کہ انجیروں کا ایک ٹوکرا لے جا کر اُسے دیدو۔ جب دیوجانس نے پورا ٹوکرہ دیکھا تو بولا "دوست! کودنی اور حماقت میں تو بھی اپنے مالک سے کم نہیں ہے۔ اُس کے شاگرد اُس سے ایک سوال کرتے ہیں اور وہ ہزار جواب دیتا ہے۔ میں نے صرف دو انجیر تجھ سے مانگے تھے۔ تو ایک ٹوکرا بھر کر لے آیا" یہ کہکر اُس نے دو انجیر اُٹھالئے اور اپنی راہ لی۔

ایک روز دن کے وقت مشعل ہاتھ میں لئے شہر میں پھرنے لگا۔ لوگوں نے کہا "کیا تو بالکل ہی دیوانہ ہو گیا ہے؟ آخر روز روشن میں چراغ لئے کیا ڈھونڈھ رہا ہے" دیوجانس نے جواب دیا "انسان کو ڈھونڈھ رہا ہوں"

(حاشیہ صفحہ ۵۸) ؎۱ کہ ذرتشتی مذہب میں بھی پاک اور مقدس شمار کیا جاتا تھا۔ یہانتک کہ جب کسی شخص کا انتقال ہوتا تو موت سے کچھ عرصہ پہلے اس کے کمرے میں ایک کتے کو بند کر دیا جاتا تھا جو مردے کے گرد پھرتا اور اُسے سونگھتا تھا۔ اس طرح ان کے عقیدے میں مردے سے ارواح خبیثہ دور ہو جاتی تھیں۔ اس رسم کو "سگ دید" کہا جاتا تھا۔ پروفیسر براون جیکسن کہا کرتے تھے کہ ان چیزوں میں جو اجداد میں محبوب اور آخر میں منسوب ہو گئیں ایرانی کتے بھی ہیں۔ جو قدیم مذہب میں پاک اور عزیز تھے اور اب ناپاک اور ذلیل ہو گئے ہیں +

اسی مضمون کو مولانا رومی نے کیا خوب ادا کیا ہے۔

دے شیخ با چراغ ہمی گشت دور شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزو است

ایک دن دیو جانس ایک کوچے سے گذر رہا تھا۔ اُس کے ایک ہم وطن نے اُس کے ہاتھ پر لکڑی رسید کی اور چل دیا۔ دیو جانس نے جا کر قاضی سے شکایت کی۔ قاضی نے اُس شخص پر ایک درہم نقد جرمانہ کر دیا۔ دوسرے روز دیو جانس لکڑی لئے ایک میدان میں پہنچا جہاں لوگ اکھٹے ہو رہے تھے اور اُس شخص کو تلاش کر کے پوری قوت سے تین لکڑیاں اُس کی پشت پر رسید کیں۔ اور فوراً تین درہم اُس کے ہاتھ میں رکھ کر بولا "برادر! قاضی کے پاس جانے کی تکلیف نہ کرنا۔ یہ تین درہم جرمانے کے حاضر ہیں"!

ایک مرتبہ سکندر اعظم نے کسی کھنڈر میں دیو جانس کی زیارت کی۔ اور دیر تک گفتگو کرنے کے بعد کہا "مجھ سے کچھ مانگ"! دیو جانس نے جواب دیا "حکم دے کہ یہ مچھر مجھ سے دور ہو جائیں"! اسکندر بولا "میں ان مچھروں کو کیونکر حکم دے سکتا ہوں"؟ دیو جانس نے کہا "جو شخص ان حقیر مچھروں کو حکم نہیں دے سکتا۔ وہ تمام دنیا پر کیونکر حکمرانی کر سکتا ہے"؟

یہ بھی مشہور ہے کہ دیو جانس نے مچھروں کو دور کرنے کی درخواست کے بجائے یہ کہا تھا کہ "سوائے اس کے کہ تو دھوپ چھوڑ دے میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتا"!

مشرقی ادبیات میں یہ حکایت دونوں صورتوں میں ملتی ہے۔ مگر وہاں دیو جانس کے نام سے منسوب نہیں +

کتاب "ابواب الجنان" میں اسکندر کی ایک "پیر خرابہ نشیں" سے جو گفتگو نظم کی گئی ہے۔ اسی دیو جانس سے راجع ہے۔ اس کتاب میں یہ کہانی اس شکل میں ملتی ہے کہ "وہ پیر نورانی اسکندر کی تعظیم بجا نہ لایا۔ اور اُسے سلام تک نہ کیا۔ اس پر اسکندر نے خفا ہو کر کہا۔

ہر چہ نہ کردی احترامم
آخر نہ سکندر زمانم

پیر خرابہ نشیں نے جواب دیا۔

دو بندۂ من کہ حرص و آزند
بر تو ہمہ عمر سر فرازند
با من چہ برابری کنی تو
چوں بندۂ بندۂ منی تو"

ایک دن دیو جانس کسی کوچے میں روٹی کا ٹکڑا ہات میں لئے کھا رہا تھا۔ اتفاق سے اُس کا ایک دوست آنکلا۔ اور بولا "میرے دوست! کیا تجھے معلوم نہیں کہ کوچہ و بازار میں کچھ کھانا معیوب ہے۔ اسے

چھپالے اور گھر لے جاکر کھا"! دیوجانس نے جواب دیا "صرف چوری کا مال چھپایا اور چھپا کر کھایا جاتا ہے بخدا میں نے یہ روٹی چرائی نہیں خریدی ہے۔ پھر اسے چھپا کر کیوں کھاؤں ؟"

دیوجانس کی زیادہ تر عمر سیر و سیاحت میں گزری تھی۔ مٹی کا آبخورہ ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن ایک نہر کے کنارے کنارے چلا جارہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک لڑکی نہر کے کنارے بیٹھی چلو سے پانی پی رہی ہے۔ دیوجانس نے فوراً اپنا آبخورہ زمین پر دے مارا۔ اور اپنے آپ سے کہا۔" دیوجانس! تجھ پر حیف ہے کہ تجھ میں ایک بچی کے برابر بھی عقل نہیں۔ آج تک تو اس آبخورے کو اپنے ساتھ لئے پھرا۔ اور نہ سمجھا کہ پانی ہات سے بھی پیا جاسکتا ہے"۔

....

غزل

از:- مولانا سید شرف الدین صاحب یاس ٹونکی پروفیسر جامعہ ملیہ (دہلی)

کروں کیوں نہ آہ و نالہ کہ مجھے تو کل نہ آئے
ترے خواب ناز میں بھی شب غم خلل نہ آئے

اثر فغاں تو جب ہے وہ کہے کہ اب تو دم لے
کہیں سینہ پھٹ نہ جائے کہیں دم نکل نہ آئے

وہ ہماری آرزو تھی یہ خوشی تھی اپنے جی کی
کہ عزا میں آج آئے دم نزع کل نہ آئے

رہے بیکسی سلامت مجھے کیا کسی کی حاجت
شب وعدہ تم نہ آؤ شب غم اجل نہ آئے

پھلے پھولے یاس لاکھوں شجر خزاں رسیدہ
مرے نخل آرزو میں کبھی پھول پھل نہ آئے

یادِ رفتگاں

ہندوستان آج سے ایک صدی پہلے

راجہ شیو پرشاد آنجہانی کی یادداشتیں

راجہ شیو پرشاد سی۔ ایس۔ آئی۔ فیلو یونیورسٹی کلکتہ و الہ آباد انیسویں صدی کے وسط کی ایک ایسی شخصیت تھے جس نے ملکی سیاست، کمپنی کی خدمت۔ سکھوں کی جنگوں اور تعلیمات میں کافی حصہ لیا تھا۔ راجہ آنجہانی کی خود نوشتہ سوانح عمری ۱۸۹۴ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ میں طبع ہوئی تھی۔ صرف تین سو جلدیں چھپی تھیں۔ شاید اس لئے کہ ایسی کتابوں کی کھپت بہت کم ہوتی ہے۔ کتاب کے شروع میں مصنف کا یہ التماس نظر آتا ہے۔ "یہ اوراق میں نے صرف دوستوں کے اصرار سے لکھے ہیں۔ ورنہ میرا حافظہ اب بالکل جاتا رہا۔ جو کچھ میں بچشم دید بھی لکھتا ہوں۔ آپ لوگ یہی سمجھئے کہ سرتاپا بھول ہے۔ گویا خواب و خیال لکھتا ہوں۔" اس میں شاید کچھ مبالغہ ہو۔ کیونکہ چشم دید واقعات کے تذکرے میں سن و سال اور ماہ و تاریخ کی غلطی تو ممکن ہے لیکن واقعات کی غلطی نہیں ہوسکتی۔ اسی زاویہ نظر سے ہم ذیل میں اس کتاب کے بعض ایسے دلچسپ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جو یقیناً ہمارے زمانہ میں دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ (ادارہ)

۱۔ بنارس میں جہاز کی آمد

"وہ دن میری آنکھوں کے آگے گھومتا ہے اور کل کا سا معلوم ہوتا ہے۔ شاید ۱۸۲۹ء یا قریب اس کے تھا۔ کہ پہلی دخانی کشتی جس کا نام شاید ڈائنا تھا کلکتے سے بنارس آئی۔ شہر میں شور مچا کہ فرنگی اب آگ سے ناؤ چلائیگا۔ گنگا کنارے تماشائیوں کی ایسی بھیڑ ہوئی کہ کھڑے رہنے کو بھی جگہ نہ ملتی تھی۔ لوگ گلے تک پانی میں اتر گئے۔ میرے باپ جو اس وقت یہاں ٹکسال تھی اُس کے ماسٹر مشہور جیمس پرنسپ کے بڑے دوست تھے۔ انہیں کے ساتھ مجھے لیکر دیکھنے گئے۔ جب چندروتی کے قریب کہ سات کوس کے فاصلے پر ہوگی کشتی پہنچی اور دھواں دکھلائی دینے سے مادھو رائے کے دھرہرے یعنی عالمگیری مسجد کے منار پر پھریرا ہلایا گیا بڑا ہل چل مچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دخانی کشتی بھی آن پہنچی۔ اور منکرنکا گھاٹ کے سامنے لنگر انداز ہوئی۔ چونکہ پورے زور سے آئی۔ اس کی لہر ہتھیروں کے

سر پر جو گلے تک پانی میں کھڑے تھے، پھر گئی۔ بہہ گئے اور ڈوب گئے۔ پتہ نہ لگا۔ میں اپنے باپ کے ساتھ کشتی پر گیا۔ اور کشتی بان یعنی کپتان نے جو کچھ اس میں دیکھنے کے لائق تھا سب دکھلا دیا۔ اس وقت کس کو خیال تھا کہ یہ فرنگی گاڑی بھی آگ سے چلاویں گے"۔

۲۔ کشتی کا شوق اور چوبونکی پہلوانی

"مہاراج (بھرتپور)

کو کشتی کا شوق ہوا۔ چوبے لوگوں سے جیٹھی کچھ بڑھ کر تھے۔ دھیرا، فقیرا، کھنکھن وغیرہ سب نامی پہلوان تھے۔ ایک منگل کو اکھاڑے میں شامیانے کے تلے مہاراج کے سامنے کشتی ہو رہی تھی۔ کابل کا میوہ بیچتا بیچتا ایک افغان بھی وہاں آنکلا۔ پوچھا یہ کیا تماشا ہے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ دونوں میں سے جو داؤ پیچ کر رہے ہیں اور موقع ڈھونڈھتے ہیں جو جس کو پچھاڑ یگا انعام پاویگا۔ وہ افغان کرتہ عمامہ اتار۔ پاجامہ چڑھا دھم سے اکھاڑے میں کود پڑا۔ لوگ ہنسے۔ چوبے حیران ہوئے۔ وہ تو جھک جھک کر داؤ پیچ کرنے لگے۔ اور یہ سونٹے کی طرح سیدھے کھڑے رہے۔ اس عرصے میں چوبے جی نے چاہا کہ اس افغان کو پیر پکڑ کر انٹا چت کریں۔ جوں ہی ہاتھ بڑھایا۔ اس افغان نے چوبے جی کا ٹینٹوا پکڑ کر معلق اٹھالیا۔ جب شور مچا "برہمن مرا برہمن مرا" اس نے چھوڑ دیا۔ لیکن قہقہے سے آسمان گونجا۔ جب چوبے جی مہاراج کو اپنی پیٹھ دکھانے لگے کہ مٹی نہیں لگی ہے۔ افغان جی مستعد ہوئے کہ اگر کچھ باقی رہا ہو تو پھر سہی"۔

۳۔ باجی راؤ پیشوا اور گھڑ بونکا باجا

جب میں بھرت پور

یعنی دہلی سے پالکی کی ڈاک پر بنارس آتا تھا اور کانپور پہنچا۔ بے اختیار جی چاہا کہ بٹھور میں باجی راؤ پیشوا کو دیکھتا چلوں۔ زباں زد خلائق تھا کہ وہ کسی وقت میں تین لاکھ گھوڑی کا مالک تھا۔ اور بھوسلا و گائیکواڑ و ہولکر و سندھیا یعنی مہاراجگان ناگپور، بروڈا، اندور و گوالیار چاروں گویا اس کے تخت کے چار پائے سمجھے جاتے تھے۔ بٹھور تیرتھ کی جگہ ہے۔ گنگا میں اشنان کیا برہمن دکشنا مانگنے لگا۔ میں نے کہا اگر باجی راؤ پیشوا کا درشن کرادو تو میں پانچ روپے دکشنا دوں۔ وہ مجکو اس کے دیوان کے پاس لے گیا۔ کہ جو اس برہمن کا ججمان تھا۔ دیوان جی ٹوکرا بھر پھول لے کر اس وقت مہادیو کی پوجا کر رہے تھے۔ مکان پیشوا کا ملا ہوا تھا۔ دیوان جی نے مرہٹی (اصل مہاراشٹری سنسکرت ہے۔ لیکن عوام نے اس معنی میں کہ مارا اور ہٹ گئے اسکو مرہٹی بنالیا) میں اپنے نوکر سے کچھ کہا وہ بات کی بات میں جواب لے آیا۔ کہ اگر پاؤ گھڑی کے اندر میں پہنچوں تو البتہ درشن ہوسکتا ہے۔ پیشوا مہورت کے بہت پابند تھے۔ میں نے دیوان جی سے پوچھا کہ بغیر مہورت دیکھے کوئی کام نہیں کرتے ہیں۔ فرمایا کہ مہاراج کہتے ہیں۔ صرف انگریزوں سے بغیر مہورت دیکھے لڑے تھے۔ ورنہ کوئی کام بغیر مہورت دیکھے نہیں کرتے ہیں۔ میں فوراً چلنے کو کھڑا ہوا۔

مگر دیوان جی نے روکا اور کہا کہ پیشوا کے سامنے پاجامہ پہن کر جو مسلمانوں کا پہناوا ہے کوئی نہیں جانے پاتا ہے۔ میں گھبرایا۔ اسی دم پانچ روپے دیوان جی کے سامنے رکھے۔ کہ کسی سے ایک دھوتی دلوا دیں۔ بارے خود دیوان جی نے اپنی ایک دھوتی عنایت فرمائی۔ جب میں باجی راؤ کے سامنے کہ نابینا تھا پہنچا اور سامنے تخت پر بیٹھ جانے کی اجازت پائی۔ دیکھا کہ وہ ریشم کے رسّوں میں لٹکتے ہوئے ایک تختے پر کہ جس پر کوئی ہاتھ بھر موٹا گدا بچھا ہوگا بیٹھا ہے۔ جس میں کوئی دوسرا شخص چھو نہ جاوے۔ اور سامنے بیس پچیس بجتی ہوئی گھڑیاں ہزارہا روپیوں کی جو وقتاً فوقتاً حکام تحفتاً دیتے رہے۔ رکھی ہوئی ہیں۔ مگر کسی میں ایک بجتا ہے۔ کسی میں دو کسی میں تین کسی میں چار وقس علیٰ ہذا۔ اور اسی عرصے میں گھنٹا پانڈے نے قریب آکر چلا کر عرض کیا مہاراج پہر پر دو بجے۔ میں نے وہاں والوں سے آہستگی دریافت کیا کہ اگر پانی یا بالو ہی کی گھڑی سے کام لیا جاتا ہے۔ تو اتنی انگریزی گھڑیاں کیوں سامنے رکھی ہیں۔ جواب پایا کہ باجا سننے کے لئے۔

غزل

از:-
جناب محمد بشیر برق سیالکوٹی

دل کو آزادِ غمِ گردشِ دوراں کردے
اے غمِ عشق مجھے اور پریشاں کردے

ہم پہ دُوری کا ستم کب تلک اے رشکِ قمر
آ کے دنیائے محبت کو درخشاں کردے

آ دکھا دے مجھے پھر جلوۂ عارض کی بہار
آ شبِ ہجر کو پھر صبحِ گلستاں کردے

پھر نگاہوں سے گرا جائے کوئی برقِ ستم
پھر کوئی دل کو مرے شعلہ بداماں کردے

پھر کوئی لوٹ کے لیجائے مرا صبر و قرار
پھر کوئی دوش پہ لفونکو پریشاں کردے

محفل دل ہے ترے ہجر میں ظلمت بردوش
جلوۂ عارضِ رنگیں سے فروزاں کردے

دل کی پژمردہ فضاؤں میں بہار آجائے
آ کے تو پھر لبِ لعلیں کو گل افشاں کردے

برقِ ناکامیٔ قسمت کے گلے مٹ جائیں
نگہ لطف اگر وہ نشہ خوباں کردے

سوئزرستان میں عربی نسل

ایک ہندوستانی سیاح کے تاثرات

از:- دبیر اندلسی ایم۔ اے۔

تاریخ

"اگر قارلہ نہ ہوتا تو آکسفورڈ یونیورسٹی میں قرآن کریم کا درس جاری ہوگیا ہوتا"

(مغربی تاریخ)
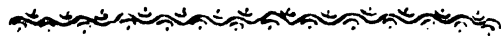
میدان بلاط الشہدا میں جبکہ نصف فرانس تسخیر کرنے کے بعد پیرس صرف سوا سو میل کے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ مُضر اور حمیری عربوں کی خانہ جنگی اور زناتی۔ غماری کتامی و صناجی بربروں کی حرص و ہوا نے فتح و نصرت پر قابو پاکر اُس کو ہاتھ سے نکل جانے دیا۔ کیونکہ بدقسمتی سے عرب میں ثمرہ فتح سے بہرہ اندوز ہونے کا مادہ بہت کم ہے۔ وہ مغلوب الغضب فطرت لے کر آیا ہے۔ جس طرح خفیف سی چاپلوسی اور محبت پر وہ زرخرید غلام بن جاتا ہے۔ اُسی طرح ذرا سی سختی پر طیش سے غضب آلود ہوجاتا ہے۔ تاریخ عرب ایسے صدہا واقعات سے پُر ہے جہاں وہ غنیم کو فرار کا موقع دیتے ہوئے دکھائی دیگا۔ اور جہاں تعاقب کے بجائے مال غنیمت کی لوٹ میں گم ہوکر دشمن کو آرام وسکون کے ساتھ دوسرے امن میں پناہگزین ہوجانے دیتا ہے۔ ایران و شام۔ مصر و افریقیہ۔ مغرب اقصیٰ و اندلس میں اسی سہل انگاری نے انکی فتوحات کو استقلال و استحکام سے محروم رکھا۔ چنانچہ میدان طور میں نوروز تک مسلسل شمشیر آزمائی کے بعد جب کیا دشمن نے تاریکی شب کے بہانہ سے التوائے جنگ کا قرنہ بجایا تو سادہ لوح عرب دربدر بجائے اس کے کہ حرامی النسل قارلہ اور اُس کے گرگ نما وحشی غول کو دریائے لوار میں غرق فنا کردیتے۔ اپنی فرودگاہ کو واپس لوٹ گئے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن قبائلی انبوہ نے جن کی تنظیم کے لئے ایک شیخ کی ہستی بہت ضروری و لازمی متصور کی جاتی ہے۔ اپنے سالار اعظم عبدالرحمٰن غافقی کی شہادت سے جو ایک زخم کھانے کے بعد واقع ہوئی ایسا پراگندہ ہوگیا کہ میانی کی تجاویز پر لحاظ کرنے کی بجائے اپنا مال غنیمت سمیٹ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف رُخ کیا۔ بعض منچلے نوجوان بشکنش کے کوہستانی علاقہ میں رُک گئے۔ اور بعض نے سوئزرلینڈ کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ پہلا مستقل کارواں تھا جس نے وصال رسول صلعم سے ۱۰۶ سال اور فتح اندلس سے ۲۶ سال بعد مراجعت بلاط الشہدا پر سوئزرستان کو اپنا ارض بوم بنا کر وہاں کی مستورات سے ازدواجی تعلقات قایم کر لئے +

یہی وہ مراجعت ہے جس پر یوربی مورخ لین انی

لیتا ہے کہ اگر فارلہ نہ ہوتا تو کلیسائے ام الامم میں نعرۂ
توحید اور جامع اکسفورڈ میں درس کلام اللہ جاری ہو گیا
ہوتا۔ یورپی فسانہ نویس جنگ تلور کو فتح عظیم تصور کرتا ہے
لیکن عرب کا بے لوث مورخ اس کو ایک معمولی کارزار
سمجھ کر چند سطروں میں ختم کر دیتا ہے +

اس فاتحانہ مراجعت کے بعد خلافت دمشق کچھ
ایسی نرغہ میں پھنس گئی کہ بلاد یورپ کا تحفظ درکنار خود
اس کی اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ
اس جنگ کے ۱۶ سال بعد سفاح نے بغداد اور عبدالرحمن
نے قرطبہ میں اپنی اپنی سلطنت کی بساط الگ الگ بچھا لی
اگر ان ہر دو سلطنتوں میں اتفاق و اتحاد ہوتا تو دنیا کا
نقشہ دوسرا ہو گیا ہوتا۔ لیکن دونوں تا قیامت ایک
دوسرے کے درپے آزار رہیں اور مسلمانوں ہی کی مانند
واغوا پر یورپ کے اعظم ترین تاجدار شارلیمین نے جس
کی شہرت و جبروت اس کی لڑکیوں کی آوارگی اور بر سر
بازار عصمت فروشی کے ساتھ ساتھ تمام ملک میں پھیلی
ہوئی تھی۔ واقعہ تلور سے ۴۷ سال بعد اندلس پر دھاوا
بول دیا۔ لیکن اسی شکست کے سبب خلافت باب الشاذری
میں اس کی قرار واقعی مرمت کر کے مراجعت بلا طائل
کا ایسا بر تا انتقام لیا کہ نصرانی دل بادل لشکر کا بیشتر حصہ
کھیت رہا حتی کہ تین بیرون کے تہور رولینڈ جیسے
سب عربی نرغہ سے بچنے کے لئے اپنا سکو بچا نہ سکے
مغرور نصرانی کو مسلمانوں کی طرف آنے کی ہمت نہ ہوئی
لیکن اموی خلافت اندلس نے پھر بھی تیغ ہاتھ سے نکل
جانے دیا اور اپنی سلطنت کے حدود اسپانیہ ہی میں محدود

رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنا سارا خزانہ
سارا وقت سارا زور اشاعت علوم و فنون کے لئے
وقف کر کے ہر شہر کو ایک یونیورسٹی اور ہر گھر کو ایک
درس گاہ بنا دیا۔ اور قرطبہ۔ طلیطلہ۔ اشبیلیہ۔ بطلیوس
سرقسطہ۔ مدور۔ ماردہ۔ جیان۔ غرناطہ۔ مرسیہ۔ مریہ
کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ لیکن براعظم یورپ حلقہ
بگوشی اسلام میں جانے سے بچی رک گیا +

دوسرا اسلامی کاروان سوزستان میں اس
وقت گیا جب شمال افریقہ کے بنی اغلب ریاستہائے
اطالیہ سے شمشیر آزمائی پر مجبور ہوئے۔ اور بربری اقوام
نے عربی قیادت میں جنوبی حصہ یورپ پر خروج شروع
کیا۔ اس مرتبہ اطالیہ و فرانس کے بیشتر دیار و امصار
(برنڈزی۔ نیپل۔ روما۔ وینس۔ فلارنس۔ جنیوا۔ تورین
مارسیلز۔ تولون۔ نیس۔ منٹ کارلو وغیرہ) ان کی
دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ عربوں نے براہ مارسیلز
کو جنوا و نیز نیس سوزستان پر پرچم ہلالی نصب کر دیا۔
جنوا۔ تورین۔ برن۔ سینٹ برنارڈ و زرمٹ عربی بستیاں
بن گئیں۔ سوزستان کے ساتھ ساتھ اطالیہ کا بیشتر
حصہ بھی ان کے دست قدرت میں آ گیا۔ تنبرہ کے
دشت ان کی کاشت سے لہرانے لگے۔ سالرنو کا
مدرسۃ الطب عربی حکما کی بدولت یورپ کا دار الشفا بن
گیا۔ تورین کے حصار ان کے عساکر سے معمور اور پاپائے
روما کا محل کوئی نقش و نگار اور عربی آرائش سے بوستان
بن گیا۔ عرب مجاہدین کے خد و خال۔ وضع۔ لباس اور
فوجی آن بان کے نمونہ پر اسقف اعظم نے اپنا دستہ

جاں نثار یہ تیار کرایا۔ اُمرا میں عربی طغرا۔ عربی لباس عربی زبان رائج ہوئی۔ غرضکہ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں ساحل فرانس اور ملک سوزستان کا بیشتر حصہ عربی تسلط میں تھا لیکن قبائلی حسد اور خانہ جنگی کہ جس کی اولین جھلک سقیفہ بنی ساعدہ میں ۱۱ھ میں نظر پڑی تھی۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مستحکم و استوار ہوتی گئی۔ تا آنکہ خود مسلمانوں نے نصاریٰ کی امداد کر کے مسلمانوں کو سوزستان و اطالیہ و فرانس سے ملک بدر کرا دیا۔ عیسوی تعصب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ عربی آثار مٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اس وقت یورپ میں وہی آثار باقی رہ گئے ہیں جو اُن کے مٹائے نہ مٹ سکے تھے۔ شہر سینس کا "عربی محلہ" اس وقت تک مسلمانوں پر اشک فشاں ہے کن اور نوتون کے بندرگاہ اور حصاران کا ماتم کر رہے ہیں۔ ساس اور زرمت کی چوٹیاں (قلّہ اعلیٰ۔ قلّہ الف ب۔ قلّہ میکائیل) عربوں کا نام بلند کر رہی ہیں۔ اوین شس کا حصار ابھی تک "عربی قلعہ" کے نام سے مشہور ہے۔ مضافات جنیوا اور لوزان میں جا بجا عربی ساخت کی گدھیاں اور کوشکیں دکھائی دیتی ہیں جن کے نام "عربی قصور" اس وقت تک زبان زد خاص و عام ہیں۔ جنیوا کا ایک بیدانہ انگور اس وقت تک "عنب عربی" کے نام سے موسوم ہے +

راقم الحروف کو ۱۹۱۱ء میں سب سے پہلی مرتبہ سوزستان میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ لیکن میرے لئے یہ زمانہ جاہلیت تھا۔ البتہ دوسری بار جب ۱۹۲۴ء میں تاریخ اندلس کی ترتیب و مطالعہ کے سلسلہ میں پوتیر اور طور کا چکر لگایا اور قریہ "لا بیتیل" کے متبرک میدان کارزار پر اشک فشانی کی تو وہاں کے باشندوں نے بتایا کہ اہلِ عرب کی معقول آبادی جنیوا کے قرب و نواح میں اس وقت بھی موجود ہے۔ چنانچہ میں ٹرین سے لوزان اور جنیوا کے ہوٹل میں سامان رکھ کر قصبہ سیون پہنچا۔ جو اس وقت بھی اس لحاظ سے عربی معمورہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہاں کے بیشتر قدیم باشندے عربی نژاد ہیں۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۰ء میں دوسری اور تیسری بار جانے کا بھی اتفاق ہُوا۔ تو وہاں کے اکثر باشندوں نے میرے استفسار پر جواب دیا کہ ہم یہاں کے باشندے تو ہیں۔ لیکن عربی النسل۔ ہمارے آبا و اجداد عرب تھے۔ مال ملکی تھی۔ ہماری شادی بیاہ ہماری کفو سے باہر نہیں ہوتے۔ ملکی باشندہ خود غرض۔ حریص اور طامع ہے۔ مگر ہم خدا کے فضل سے اپنے اسلاف کے قدم پر چل رہے ہیں۔ آپ ہمارے برابر کسی کو مہمان نواز اور قانع نہ پائیں گے +

عربی آبادی کا سلسلہ اس علاقہ میں ۵۰-۶۰ میل کے حلقہ میں ہے۔ منتانہ کا مشہور دار الشفا عربی آبادی میں ہے۔ اگرچہ اب یہ قصبہ بین الاقوامی ہو گیا ہے۔ اور ہر شخص سے علیک سلیک آشنا دکھائی دیتا۔ لیکن چند خاندان یہاں بھی عربوں کے نام لیوا مل جائیں گے۔ سب کا لباس بدل گیا۔ زبان بدل گئی۔ معاشرت بدل گئی۔ رسوم بدل گئے۔ لیکن کون [illegible] میں عربی خلق۔ [illegible] عربی [illegible] اور مزاج میں عربی خو بوسی ہوئی ہے۔ [illegible] کے باشندے سے زیادہ تر

تجارت پیشہ ہیں۔ گھڑی سازی کے علاوہ تسبیح۔ چوڑیاں، جانمازیں۔ قالین وغیرہ بنا کر مشرق بعیدہ بالخصوص حجاز و یمن کو بھیجتے ہیں +

مضمون مندرجہ بالا کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل حوادث کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے :۔

۱۱۶ھ —— واقعہ بلاط الشہدا یا کارزار طور

۱۶۱ھ —— واقعہ باب الشاذری یا کارزار راسنے وو

۱۹۷ھ تسخیر ISCHIA و PONTINE بعہد ابوالعباس دولمی امیر خاندان اغلب

۱۹۸ھ فتح CIVITA VECCHIA و NICE و SARDINIA و CORSICA و REGGIO

۲۱۲ھ فتح سسلی

۲۲۹ھ حملہ بر رومہ، فتح گیٹا نواح رومہ

۲۳۳ھ فتح نیپل NAPLE و برنڈزی BRINDISI

۲۳۵ھ فتح صوبہ تلبریہ (جنوبی حصہ اطالیہ) و پیشقدمی صوبہ اطالیہ APULIA ۔ دوسرا حملہ بر رومہ

۲۳۶ھ تسخیر TARANTO و پیشقدمی بر ساحل بحر اڈریاٹک و تسخیر اسیرو OSSERO و فتح ANCONA

۲۳۷ھ فتح وینس و باری VENICE + BARI و سرکوبی صوبہ تلبریہ زیر قیادت عباس ابن فضل

۲۳۸ھ فتح صوبہ PROVENCE و SWITZERLAND

۲۵۴ھ سوئم حملہ بر رومہ زیر قیادت محمد بن خفاجہ و تسخیر گیٹا نواح رومہ۔

غزل

از:- جناب قمر جمالی دربھنگوی

مجھے دیکھ کر مسکرا دینے والے
مٹا لے جہاں تک مٹانا ہے مجھ کو
ترے در پہ لائی ہے اُمید مجھ کو
مرض کام اپنا کئے جا رہا ہے
ترے در سے اُٹھ کر کہیں کا رہونگا
مری زندگی تیرے دم سے ہے قائم
جفا پر جفا ہے۔ ستم پر ستم ہے
ترے آگے کس منہ سے کھولوں زباں میں
قیامت اُٹھائینگے کیا بیٹھے بیٹھے

ہنسا کر ہیں گو یا رُلا دینے والے
جفا کرنے والے سزا دینے والے
میں قربان لا انتہا دینے والے
دوا دے رہے ہیں دوا دینے والے
ارے اپنے در سے اُٹھا دینے والے
میں صدقے مجھے آسرا دینے والے
سزا کی بھی حد ہے سزا دینے والے
مری خواہشوں نے سوا دینے والے
قمر کو نظر سے گرا دینے والے

نقد و نظر

ماثر کا خطاب پُر عتاب

اور

اقبال کا جواب

(نظم)

از:- "فکری"

اسلام کا جہاں میں کوئی وطن نہیں ہے! — یہ شمع پائے بندِ یک انجمن نہیں ہے!

سیلِ ہوا نہیں ہے رہنِ فضائے صحرا — موجِ بہار اسیرِ صحنِ چمن نہیں ہے!

ذرّوں کی ہمتوں کی پستی؟ وطن پرستی!! — سورج کی روشنی کا کوئی وطن نہیں ہے!!

نکہت کا آشیانہ، شاخِ سمن ہے لیکن — نکہت کبھی اسیرِ شاخِ سمن نہیں ہے!

اسلام لامکاں ہے کیوں ہو مکاں کا خوگر؟ — طوفاں رہینِ سطحِ گنگ و جمن نہیں ہے!

روحِ وطن ہے اسلام اسلامیوں کا، یعنی — غیروں کی طرح ان کا خاکی وطن نہیں ہے!

محدود کیوں ہو وسعت اسلام کی فضا کی — شاہیں ہم نگاہِ زاغ و زغن نہیں ہے!

اسلام کی نظر میں یکساں ہیں ہند و ایراں — ہر ملک ہے وطن اور کوئی وطن نہیں ہے!

قوم و وطن کے بت ہیں دنیا میں روز افزوں — افسوس ہے کہ کوئی اب بت شکن نہیں ہے!

جو دل کہ آسمانِ اسلام کے مکیں ہیں — ان کو دماغِ فکرِ خاکِ وطن نہیں ہے!

اسلام کا وطن کیا ہے کہہ دینگے ہم یہاں تک — کوئی زباں نہیں ہے کچھ پیرہن نہیں ہے!

قومیں ہیں طفلِ ناداں، ان کے وطن کھلونے! — پر "طارقانِ" دیں کا ایسا چلن نہیں ہے!

ماثر سے کوئی کہہ دے اقبال کی طرف سے — اک "بحر" کی پرستش حسنِ سخن نہیں ہے!

"چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!"

اگر آغا حشر کو کسی سے محبت تھی!

از:- دیوانہ مصطفیٰ آبادی

تو اُن کے نام یہ اُس کا پیام ہے!

درمیانی شب میں اسوقت جب ستارے تیری جدائی کا احساس کرکے روتے ہیں۔ میں اس سنسان وادی میں بھاگ جاتی ہوں۔ جس سے ہمیں محبت تھی۔ جب ہمارا عہد محبت شباب پر تھا جب طلاقاتوں کی دنیا جوان تھی۔ وہاں میں اکثر خیال کرتی ہوں۔ کہ اگر روحیں آسمانی فضاؤں سے مسرت و شادمانی کے گذشتہ نظارے دیکھنے آتی ہیں تو تیری محبت سے معمور روح بھی یہ بتانے کے لئے میرے پاس آئیگی کہ "ہماری محبت کی دنیا آباد ہے۔ ذرہ ذرہ بس کے للانہ زاروں میں! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں' آسمان پر رہتے ہوئے!!'

ایسے میں' میں وہی پرسوز راگ گاتی ہوں جس کا سننا کبھی باعث انبساط تھا جب ہماری آوازیں ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر بلند ہوتی تھیں۔ اور جب میرے پژمردہ گیتوں کی صدائے بازگشت وادی کی تنہائیوں میں گونجتی ہے۔ تو مجھے گمان ہوتا ہے' اے میرے محبوب! کہ یہ تیری آواز ہے جو روحوں کے ملک سے ابھی تک ان نغمات کا آہستہ آہستہ ہلکی آواز میں جواب دے رہی ہے۔ جو کبھی ہمیں بہت پیارے تھے۔

(ٹامس مور کی زبان سے)

آہ! کیسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا' بہارستان ہند ویران ہوگئی ہے۔ کسی نے اسے سپرد خزاں کردیا!! ورنہ یہ کیوں کہ ہواؤں کا رُخ تبدیل نہ ہوا۔ فضائیں بھی نہیں بدلیں اور بہاریں بھی وہی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ کیف ترنم سے خالی ہیں۔ اور یہ تشنۂ تکمیل ہا! دنیا اب تیری یادگاریں قایم کررہی ہے۔ لیکن آہ! اس یادگار محبت کو کون زندہ رکھے گا جسے نہاں خانۂ دل میں تیرے نقوش محبت نے قائم کردیا ہے۔ آہ! اے حشر! اب میری دنیائے جذبات میں کون ہلچل مچائیگا۔ آ۔ نگارخانوں کی محفلیں سونی پڑی ہیں۔ ان کو آکر آباد کردے!۔ میں چاندنی راتوں میں تیرے خوابہائے رنگیں دیکھا کرتی ہوں۔ آ اور مجھے ان حسین خوابوں کی تعبیر بتادے!! آ' پیارے اور "میری جاگی ہوئی راتوں کو سُلادے آکر!!!"

اے کاش ہم پھر ملیں شالامار کے کسی محبت آفریں کنج میں اور باتیں کریں' بنفشہ کی روشوں سے گذرتے ہوئے!! کہ وہاں کے تازہ پھول' نودمیدہ کلیاں منتظر ہیں کہ کوئی انکو مسل کر میرے قدموں پر بکھیر دے!!

آہ! اب مجھے کون لکھیگا "میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ آؤ' شعر و شباب کی تمام رعنائیوں کو لئے ہوئے' حسن نسائیت بکنار!!"

اب کون اس انتظار کی خلش رسانیوں سے نجات پانے کیلئے میری آرزو کریگا۔ آہ! اب میں کس پر اپنے غرور ناز کا اظہار کرونگی۔ آہ! کہ اب میں تیری ہی نہیں بلکہ تیرے خیال' حیات آفریں خیالوں کی بھی پرستش کررہی ہوں!!!

(طبعزاد)

"ایک پیام!"

آہ! اے نگارخانہ ہند کے نقش جمیل!!

کہ وطن کو تیری ضرورت ہے' قوم اب تیری قدردان ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ مجھے تیرا انتظار! اسکا دل ناتواں تیری یاد میں پژمردہ' جسے تو پیار کرتا تھا اور اُس کی روح نزار رزاں!!!

(نظم)

خصوصیاتِ غلاماں

از:-
میر نور بخش صاحب ماثر سیالکوٹی

ماثر صاحب کی مندرجہ ذیل فکر انگیز اور دماغ پرور نظم بیرک پورہ کی "بزم ادب" کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔ جو حضرت آغا حشر کاشمیری مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ جیساکہ پندرہویں شعر سے معلوم ہوگا۔

آغا صاحب مرحوم صاحب نظم کو ہر ہر شعر پر بے اختیار داد دیتے تھے اور اُن کی داد کے ساتھ حاضرین میں تحسین و آفرین کا طوفان بپا ہو جاتا تھا۔

ماثر صاحب کے بعد آغا صاحب کی باری آئی تو مرحوم نے غزل پڑھنے سے انکار کردیا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ "اس مفید نظم کے بعد میرا اپنی غزل سنانا بیکار ہے۔ میری روح مجھ کو ملامت کر رہی ہے کہ ایسی کام کی نظم کے بعد غزل پڑھ کر شاعروں کی بے معنی اور جھوٹی عاشقی کا ڈھنڈورا پیٹوں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" بارے ماثر صاحب اور دوسرے احباب کے اصرار سے آپ نے اپنا کلام سنایا اور مجلس ایک دلچسپ صحبت کی یاد لئے ہوئے برخاست ہوئی

وطن میں بھی غلاموں کی کبھی توقیر ہوتی ہے — کہ ان کی پنجۂ اغیار میں تقدیر ہوتی ہے

جبینیں کفر کا مسکن۔ عبادت انکی سب بے معنی — بھلا ان کی دعاؤں میں کہیں تاثیر ہوتی ہے

وہ تقلیدِ خیالِ حکمراں پر ناز کرتے ہیں — سمجھتے ہیں نئی تہذیب کی تعمیر ہوتی ہے

یگانوں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے ہیں — زباں ان کافروں کی خنجر و شمشیر ہوتی ہے

وہ خود بینی سے اپنے آپکو محدود رکھتے ہیں نگاہِ بے بصراں کے لئے زنجیر ہوتی ہے
وہ قربانی کو "مرگِ رایگاں" سے یاد کرتے ہیں زباں ان کوفیوں کی شمر کی شمشیر ہوتی ہے

ادیبانِ غلاماں کونسی منزل کے رہبر ہیں کہ ہر شہپارہ ان کا بے تکی تحریر ہوتی ہے
فقیہانِ غلاماں مفسدانِ دین ہوتے ہیں رضا جوئے حکومت انکی ہر تفسیر ہوتی ہے
یہ بے باکی سے ہر آزادہ گو کا خوں کرتے ہیں زباں ان ملحدوں کی نشترِ تکفیر ہوتی ہے
عمل کی منزلوں سے دور رہتا ہے یہ بانونی کہ روحِ بزدلی فطرت میں گوشہ گیر ہوتی ہے
سنا ہے شاعرِ ملت وطن کی آنکھ ہوتا ہے غلامی میں مگر یہ آنکھ بے تنویر ہوتی ہے
کہا جاتا ہے شاعر واقفِ اسرار ہیں لیکن غلامی میں جہالت ان کے دامنگیر ہوتی ہے
غزل کیواسطے احباب کیوں اصرار کرتے ہیں یہ میرے واسطے غالب کی "جوئے شیر" ہوتی ہے
وطن محبوب میرا۔ اور آزادی میری دلبر فغاں میری انہیں کے درد کی تصویر ہوتی ہے
بیانِ حشر گوشِ ہوش ایسا جذب کرتے ہیں کہ میرے سامنے گویا مری تقریر ہوتی ہے

نوائے درد منداں نسخۂ اکسیر ہے۔ ماثر
دلوں کی سلطنت اس تیر سے تسخیر ہوتی ہے

افسانہ

مُردہ عورت

(افسانہ)

از:-
اختر شیرانی

مجھے اُس سے محبت تھی، میں اُس پر دیوانہ وار فدا تھا، نثار تھا...... ہم محبت کیوں کرتے ہیں؟..... یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان تمام کائنات میں صرف ایک ہستی سے لو لگائے اور دماغ میں صرف ایک خیال کو پروان چڑھائے دل میں صرف ایک خواہش ہو۔ اور لب پر صرف ایک نام ——— وہ شیریں نام جو روح کی گہرائیوں سے نکل کر بار بار لب پر اس طرح آئے جیسے ایک تند رو آبشار اپنے منبع سے اُٹھ کر دامن کوہسار میں پھیل جائے۔ اور ہم ایک وظیفے کی طرح تمام دن، زیر لب یاد کرتے رہیں +

میں اپنی محبت کی رام کہانی نہیں سناؤں گا۔ محبت کے پاس کہانی کے سوا کیا دھرا ہے؟ اور محبت کی تمام کہانیاں یکساں ہوتی ہیں۔ میں نے اُسے دیکھا اُس سے ملا۔ اور دل دے بیٹھا ——— ان تین لفظوں سے سب کچھ ظاہر ہوجاتا ہے۔ کامل ایک سال تک میں نے اُس کی محبت کی گود میں زندگی گزاری۔ اس کے طلائی بازوؤں میں، اسکے یاسمین آغوش میں، اس کی پیار بھری نظروں میں۔ اس کے عطر آلود ملبوسات میں، اور اُس کے پُر شوق لفظوں میں میں اس طرح جا بسا رہا کہ یہ تمیز نہ ہوتی تھی دن ہے یا رات! میں مردہ ہوں یا زندہ، اسی پرانی زمین پر ہوں یا دوسری دنیا میں؟

آخر وہ مر گئی!..... کس طرح...؟ میں نہیں جانتا۔ میں اب نہیں جانتا +

برسات کے موسم میں ایک دن شام کو وہ بارش میں بھیگی ہوئی گھر آئی۔ دوسرے دن اُسے کھانسی ہوگئی۔ ہفتے بھر تک کھانسی میں مبتلا رہی۔ اور آخر بستر علالت پر۔ ایسی پڑی کہ پھر نہ اُٹھی +

پھر کیا ہوا؟ میں اب نہیں جانتا۔

ڈاکٹر آئے، نسخے تجویز کئے اور چلے گئے۔ دوائیں آئیں، ایک عورت نے اس کو پلائیں۔ اس کے ہاتھ گرم تھے۔ اس کی پیشانی پسینے پسینے اور گرمی کے مارے دہک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بیمار اور حسرت بھری تھیں۔ میں نے اس سے باتیں کیں۔ اُس نے مجھے ہر ایک بات کا جواب دیا...... ہم نے ایک دوسرے سے کیا کچھ کہا؟ کیا کچھ نہ کہا ہوگا! مگر اب مجھے یاد نہیں اب میں سب کچھ بھول گیا ہے۔ سب کچھ.....

ہاں میں نے سب کچھ بھلا دیا...... وہ مر گئی... مجھے اس کی ہلکی سی آدھی طرح یاد ہے... کسقدر

کمزور آہ تھی۔ جو آخری مرتبہ اُس کے ہونٹوں سے نکلی
...... اتنے میں نرس کے مُنہ سے نکلا "آہ"۔ اور میں
سمجھ گیا!

میں اُس وقت سے لے کر اب تک کچھ نہیں
سمجھ سکا۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ میں نے ایک پادری کو
دیکھا جو "آپ کی محبوبہ" کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ میں نے
محسوس کیا کہ وہ اُس کی ہتک کر رہا ہے۔ اُس کے
مرنے کے بعد کسی کو اُس کے متعلق کچھ جاننے کا حق
نہ تھا۔ میں نے اُسے اپنے گھر سے باہر نکال دیا۔ ایک
اور آیا۔ یہ بہت نیک دل اور شریف انسان تھا۔ جب
اُس نے مرحومہ کے متعلق مجھ سے باتیں کیں۔ تو میں
بے اختیار رو پڑا +

لوگوں نے اُس کے کفن دفن کے متعلق مجھ سے
ہزاروں باتوں کے بارے میں ہدایتیں طلب کیں۔
مجھے اب یاد نہیں کہ وہ کیا کیا تھیں۔ لیکن مجھے اس کا
کفن اچھی طرح یاد ہے۔ اور وہ ہتوڑے کی چوٹوں
کی آوازیں جو اسے تابوت میں رکھنے کے بعد تابوت
بند کرتے ہوئے پیدا ہوئیں۔ الٰہی تیری پناہ!

وہ دفنا دی گئی...... وہ! وہ...... ایک
سوراخ میں... آہ! ایک قبر میں سُلا دی گئی! دبا دی گئی!
چند اشخاص آئے...... میرے احباب! غم کی تاب
نہ لا کر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دیوانہ وار بھاگا
..... گھنٹوں گلی کوچوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ خدا جانے
کب گھر پہنچا۔ اور کب سفر کو روانہ ہوا +

پرسوں پیرس واپس آیا +

جس وقت میں نے اپنی خوابگاہ کو، ہماری خوابگاہ
کو دوبارہ دیکھا۔ ہمارے بستر کو، ہمارے تکیوں کو،
ہمارے آرائشی سامان کو، ہمارے مکان کو جو اب تک
ان تمام ماتمی علامتوں اور حزن انگیز حکایتوں سے
لبریز تھا، جنہیں بے رحم موت اپنے پیچھے چھوڑ جاتی
ہے ـــ میرا صدمہ اس تیزی سے تازہ ہوا کہ میں
نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اور باہر کی طرف بھاگا +

میں زیادہ دیر تک اس مہلک فضا میں، اس
سوگوار فضا میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ ان چار دیواریوں
میں جو ایک دن اُس کی محافظ تھیں۔ اور جو اب بھی
اپنے نامحسوس خلاؤں میں اس کی موجودگی کے،
اس کے جسم کے، اس کے تنفس کے ہزاروں آثار
باقی رکھیں گی ـــ میں نے اپنی ٹوپی اُٹھائی اور
دروازے کی طرف بھاگا۔ میں ہال کے بڑے آئینے
کے پاس سے گذرا۔ وہ آئینہ جو اُس نے یہاں اس
لئے لگایا تھا کہ وہ روزانہ باہر جانے سے پہلے اس
کی سطح پر اپنے حسین مجسمے کا سر سے پاؤں تک معائنہ
کر سکے.... اپنی آرائش کی کامیابی کا اندازہ کر سکے۔
اپنی دلکشی اور دلفریبی کا جائزہ لے سکے۔

میں ساکت وصامت اس آئینے کے سامنے
کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ یہ آئینہ.... جس نے بارہا اس
کا دیدار کیا تھا ـــ اتنی بار.... کہ اس میں یقیناً
اس کا مجسمہ سما گیا ہوگا ثبت ہو چکا ہوگا +

لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ میں وہاں کھڑا رہا
میری آنکھیں آئینے کی صاف شفاف سطح پر جمی رہیں

وہ سطح جس کی گہرائیاں اب خالی تھیں۔ وہ گہرائیاں جو کبھی اس کے سراپائے حسن کی حامل تھیں جو اُس کے تمام و کمال وجود کو اسی طرح اپنے آغوش میں لے لیا کرتی تھیں، جس طرح میں لیا کرتا تھا۔ اسقدر مکمل طور پر جسقدر میری محبت بھری نظریں محیط ہو جانے کی عادی تھیں۔ مجھے اُس آئینے سے محبت ہو گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اُس کو چھوا۔ وہ سرد اور افسردہ تھا۔ آہ! یاد! یاد! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مغموم، پژمردہ، زندہ، ہولناک آئینہ! ہماری تمام تکلیفوں کا باعث! خوش نصیب ہے وہ، جس کا دل، آئینے کی سطح کی طرح، جس پر ہزاروں سائے اور نقشے اُبھرتے اور مٹ جاتے ہیں۔ تمام چیزوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ تمام نقوش کو، جو رنج و غم کے ہوں یا عیش و مسرت کے، عشق و محبت کے ہوں یا سوگ اور ماتم کے! ۔ ۔ ۔ ۔ آہ مجھ پر کیسی بپتا پڑی!

میں باہر نکل آیا۔ اور بغیر ارادے کئے، بغیر یہ جانے کہ میں نے کیا کیا، بغیر جانتے قبرستان میں آپہنچا۔ میں نے جلد ہی اُس کی سادہ قبر تلاش کر لی، جس کی مرمری صلیب پر یہ عبارت کندہ تھی:۔

"وہ محبت کرتی تھی۔ اُس سے محبت کی جاتی تھی۔ اور وہ مرگئی"

وہ یہاں خوابیدہ تھی ـــــ اس حقیر زمین کے اندر خوابیدہ تھی۔ بربادیوں کا مرقع! تباہیوں کا ہجوم! وحشتناک، عبرتناک! ۔ ۔ ۔ ۔ میں رو پڑا، قبر پر پیشانی رکھ کر روتا رہا۔

مجھے اس حالت میں کافی دیر ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ رات کی تاریکی چھا رہی ہے۔ یہ سماں دیکھ کر ایک عجیب وحشیانہ و حسن خواہش: ایک حسرت زدہ اور بدنصیب عاشق کی خواہش، میرے دل میں پیدا ہوئی میں نے اُس کے قریب رات گزارنا چاہا۔ ایک آخری رات ـــ اُس کی قبر پر رونے کے لئے۔ ۔ ۔ ۔ ڈر تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ اور مجھے قبرستان سے نکال دیا جائے گا ـــ میں کیا کر سکتا تھا؟ میں نے سمجھ سے کام لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہمیشہ کے لئے بچھڑنے والوں کی دنیا میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ پھرتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ آوارہ پھرتا رہا۔ ہمارے عظیم الشان اور وسیع و عریض شہر کے قریب یہ کتنا مختصر شہر ہے۔ زندہ انسانوں کے شہر کے قریب۔ درحالیکہ زندہ شہر کے باشندوں سے اس خاموش بستی کے مکینوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

ہمیں زندگی بسر کرنے کے لئے کیسے کیسے طویل مکانات، محلے اور وسعتیں درکار ہیں ـــ ہماری ان گنتی کی چار نسلوں کے لئے جو بیک وقت دن کی روشنی سے لطف اُٹھاتی ہیں۔ چشموں اور فواروں کا پانی اور انگوروں کا عرق پیتی ہیں۔ اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا اناج کھاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں مردوں کی بے شمار نسلوں کے لئے عدم رسیدہ انسانوں کی کثیر النمو آبادیوں کے لئے ابتدا سے لیکر ہمارے عہد تک کسی چیز کی ضرورت نہیں ـــ زمین اُن کا

خیر مقدم کرتی ہے۔ فراموشی ان کو چادر اُڑھاتی ہے اور بس رخصت!

نئے قبرستان کے خاتمے پر پہنچکر میں پرانے قبرستان میں جا نکلا۔ وہ فراموش شدہ بستی، جہاں صدیوں پیشتر کے مردے اپنے خاکی جسم کو خاکی پردہ میں چھپانے کے لئے آئے تھے۔ جہاں بہت سی قبروں کی صلیبیں شکستہ و بوسیدہ حالت میں سر بسجود ہو رہی تھیں۔ اور جہاں کچھ عرصہ کے بعد نئے آنے والے اپنی آرامگاہ بنائیں گے۔ یہ مقام جنگلی گلاب اور شمشاد و صنوبر کے پودوں کی چھاؤں میں آباد ہے۔ ایک مرجھایا ہوا مگر شاندار باغ! جس نے مغرور انسان کے قرمزی خون سے نشو و نما پائی ہے ٭

میں تنہا تھا.... بالکل تنہا۔ میں ایک سبز درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو اس کی گھنیری اور اندھیری شاخوں میں چھپا لیا۔ اور اس کے تنے سے اس طرح لپٹ گیا جیسے کوئی کشتی شکستہ مسافر مستول سے لپٹ جاتا ہے ٭

جب رات کی تاریکی—— بیحد تاریکی.... ہمہ گیر تاریکی.... زیادہ بڑھ گئی، پھیل گئی تو میں اپنی جائے پناہ سے نکلا۔ اور دبے دبے قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ.... چپ چاپ اس شہر خموشاں میں چلا ٭

میں دیر تک آوارہ گردی کرتا رہا—— دیر تک .... بہت دیر تک...... ! میں اُسے دوبارہ نہ پا سکا۔ اشتیاق سے کھلی ہوئی باہوں۔ اور انتظار میں کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، میں مختلف قبروں کی لوحوں اور تعویذوں سے اپنے ہاتھ، پاؤں۔ گھٹنے، سینہ اور سر ٹکراتا ہوا پھرتا رہا۔ مگر وہ نہ ملی ٭

میں نے ایک اندھے کی طرح جو راستے کی تلاش میں سرگرداں ہو، قبرستان کی چیزوں کو چھوا۔ اور محسوس کیا۔ اپنی اُنگلیاں مردوں کے ناموں پر پھیرتے ہوئے، الفاظ کی کھدائی اور گہرائی کے اندازے سے اُن کے نام پڑھے ...... اللہ کیسی ڈراؤنی رات! کتنی اندھیری رات!.... مگر وہ مجھے نہ ملی ٭

چاند غائب ہے! کتنی اندھیری رات ہے! مجھ پر دہشت طاری ہو گئی...... خوفناک دہشت! قبروں کی دو طرفہ قطاروں کے درمیان، تنگ و مختصر راستے..... اور قبریں..... قبریں ہی قبریں .... چاروں طرف قبریں.... میرے بائیں طرف، میرے دائیں طرف، میرے سامنے، میرے چاروں طرف قبریں.... ہر جگہ ہر قدم پر قبریں.... میں ایک قبر پر بیٹھ گیا.... کیونکہ میرے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ اور ان میں چلنے کی طاقت نہیں رہی تھی ٭

میں نے اپنے دل کی دھڑکن سُنی اور ساتھ ہی ایک اور آواز.... ایک مبہم اور بے نام آواز.... اس اندھیری اور گھنیری رات میں یہ آواز میرے دہشت زدہ دماغ ہی میں پیدا ہوئی تھی یا اس پر اسرار زمین سے جہاں لاشیں بوئی جاتی ہیں،

سنائی دی تھی؟ . . . . میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا . . . . میں وہاں کتنی دیر ٹھیرا، مجھے کچھ ہوش نہیں . . . . میں خوف اور دہشت کے مارے لرزہ براندام تھا . . . . ہیبت کے اثر سے مبہوت تھا . . . . قریب تھا کہ میری چیخ نکل جائے! قریب تھا کہ میں مرجاؤں!

معاً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قبر کی مرمری سل کو جس پر میں بیٹھا تھا، جنبش سی ہوئی . . . . . سچ تو یہ ہے کہ وہ سچ مچ ہل رہی تھی، جیسے کوئی اُسے اوپر کی طرف اُٹھا رہا ہو . . . . . میں ایک ہی جست میں اُچھل کر قریب کی قبر پر جا گرا - اور . . . . . اور میں نے دیکھا . . . . . ہاں میں نے دیکھا کہ وہ پتھر جسے میں نے ابھی ابھی چھوڑا تھا - وہ بالکل سیدھا اُٹھتا چلا گیا اور . . . . . اور مردہ نمودار ہوا . . . . . ایک برہنہ پنجر جو پتھر کو اپنی جھکی ہوئی کمر سے دھکیل رہا تھا . . . . . میں نے دیکھا . . . . میں نے صاف طور سے دیکھا، . . . . ہر چند کہ رات بہت زیادہ اندھیری تھی - مگر میں نے صلیب پر لکھا دیکھا :-

"یہاں جیکس اولیونٹ مدفون ہے - جو ۵۱
سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوا -
وہ بہت نیک اور خدا ترس انسان تھا - اپنے
اہل و عیال سے محبت کرتا تھا - اُس نے خدا
کی رحمت کی چھاؤں میں بسیرا لیا"

مردہ خود بھی اپنی قبر کی اس عبارت کو پڑھ رہا تھا . . . . یک بیک اُس نے راستے سے ایک پتھر اُٹھایا - ایک چھوٹا سا نُکیلا پتھر . . . . اور اُس سے ان حرفوں کو کھرچنے لگا - یہاں تک کہ اس نے تمام عبارت کو مٹا دیا - اب اُس نے اپنی آنکھوں کے خالی حلقوں سے، عبارت کی جگہ کو دیکھتے ہوئے، ایک پتلی ہڈی کے آخری سرے سے، جو کبھی اُس کی انگشت شہادت تھی، اُس نے ایسے روشن حروف میں، جیسے پرانی قسم کی دیا سلائی کے مسالے سے رات کو دیواروں پر چمکتے ہیں یہ عبارت لکھی :-

"یہاں جیکس اولیونٹ مدفون ہے -
جو ۵۱ سال کی عمر میں اس دنیا سے
رخصت ہوا - وہ اپنی بدمزاجی اور سختی
کے باعث، اپنے باپ کی قبل از وقت
موت کا سبب بنا کیونکہ وہ ورثہ پانے
کے لئے بے چین تھا - اُس نے اپنی
بیوی کو شدید اذیتیں پہنچائیں - اپنے
بچے کو ایذا اور ہمسایوں کو دغا دی -
امکانی حد تک لوگوں کو لوٹا - اور بالآخر
ذلیل اور کمینہ موت مرا"

مُردے نے تحریر ختم کی - اور کچھ دیر سوچتا رہا . . . . . اب جو مڑ کر دیکھتا ہوں تو تمام قبریں کھلی نظر آئیں - تمام مُردے باہر نکل آئے تھے - اور اپنے اپنے رشتہ داروں کی غلط نویسیوں کو صلیبوں پر سے مٹا رہے تھے - اور اُن کی بجائے سچی باتیں تحریر کر رہے تھے،

میں نے دیکھا کہ یہ شہر خموشاں کے سب مکین، سب کے سب اپنی زندگی میں اپنے رشتہ داروں

کے قاتل رہ چکے تھے ——— ! یہ ہر قسم کے الزامات سے بلند اور پاک افراد ! یہ شریف باپ، یہ نیک مائیں، یہ وفادار میاں بیوی، یہ فرما کار فرزند، یہ معصوم دوشیزائیں، یہ راستباز تاجر، یہ اچھے مرد اور عورتیں ! یہ کیا تھے ؟ ظالم ! بے رحم ! بے وفا ! مکار ! کاذب ! فریبی ! ریاکار ! حاسد اور کینہ توز ! !

ایک انداز اور ایک طریقے سے، تمام کے تمام مردے اپنے ابدی مسکن کے آستانے پر، وہ وحشی، خوفناک، مگر مقدس صداقتیں ثبت کر رہے تھے۔ جن سے اس مدہوش دنیا میں ہر فرد بشر انجان ہے یا انجان رہنے کا دھوکا دیتا ہے ٭

مجھے خیال آیا کہ وہ بھی اپنی قبر پر اسی طرح کچھ نہ کچھ ضرور لکھ رہی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی میں بے خوفی سے کھلی ہوئی قبروں کے درمیان، لاشوں کے درمیان، پنجروں کے درمیان دوڑتا ہوا اس کی طرف چلا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے پا لوں گا۔ میں نے دُور ہی سے اُسے پہچان لیا۔ اگرچہ میں اس کا چہرہ جو کفن میں لپٹا ہوا تھا نہ دیکھ سکا ٭

مرمری صلیب پر، جہاں میں نے ابھی ابھی یہ عبارت لکھی دیکھی تھی کہ:۔

"وہ محبت کرتی تھی۔ اس سے محبت کیجاتی تھی۔ وہ مرگئی"۔

اب اس کی بجائے لکھا تھا:۔

"اپنے عاشق کو دھوکا دیکر کسی دوسرے عاشق سے ملنے باہر گئی تھی کہ بارش میں بھیگنے سے سردی لگ گئی اور وہ مرگئی"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے وہاں سے لوگوں نے صبح آکر اُٹھایا۔ اس حالت میں کہ میں بیہوشی و بیخبری کے عالم میں ایک قبر کے نزدیک پڑا تھا ؎

یاد فا خود نہ بود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد ! (سعدی)

(ماپساں)

بنگالی گیت

از:۔ قاضی نذر الاسلام

میں اس پھلے پھولے باغ میں شاخ سے گرے ہوئے ایک پھول کی مانند ہوں۔

تو اپنے عیش و راحت کے خلد زار کو چھوڑ کر یہاں کیوں آئی ؟

میرے گرد و پیش پژمردہ و افسردہ پتیاں پڑی ہیں۔ اور ان کے درمیان میں شب و روز اشک افشانی کرتا رہتا ہوں ٭

جانِ جہاں ! تو یہاں ناوقت آئی ہے۔ کیونکہ پھول کے کمھلا کر گر جانے کے بعد صرف اُس کے کانٹے ہاتھوں میں چبھتے ہیں ٭

(ترجمہ)

منظومات

سِرِّ لا اِلٰہ

(نظم)

از:-
(جناب اصغر حسین خاں صاحب لفضا نظیر لدھیانوی)

ساقیٔ من بہرِ من چنگیز گشت　　جامِ من از خونِ من لبریز گشت
کوہ ہا افتاد بر بازوئے من　　حشرہا برخاست از پہلوئے من
ابرہا از گوشۂ چشمم چکید　　برقہا در دامنِ من آرمید
کائنات از شورِ من بیتاب گشت　　جانِ من در قالبم سیماب گشت
عاشقی دامِ بلا شد بہرِ من　　زندگی پیکِ قضا شد بہرِ من
سرزمینِ کربلا را دیدہ ام　　من بچشمِ خود فنا را دیدہ ام
ماہ و انجم بر فلک ششدر شدند　　قدسیاں از یاربم مضطر شدند
شش جہت آئینۂ اندوہ و یاس　　گرد و پیشم محشرِ خوف و ہراس
بادہ نوشاں بہرِ من سر در سجود　　دلق پوشاں بر زباں نعت و درود
زاہداں غرقِ یمِ لاتقنطوا　　صوفیاں مستِ مئے سبحانہٗ
لیکن از تسکینِ غم محرم نشد　　یک نفس سیلِ حوادث کم نشد
عقل حیراں از رخِ غمگینِ من　　علم عاجز بر سرِ بالینِ من
فہم و دانائی فہیماں را نماند　　تابِ گویائی حکیماں را نماند
استخوانم شعلہ ہا اندر تنم　　حلقۂ تعویذ ہا در گردنم
طبِ مغرب سربسر مسموم شد　　حکمتِ یونانیاں معلوم شد
از مئے تسکینِ ایام بے نصیب　　از سکونِ قلب و دماغم بے نصیب
ہر قدم مانندِ فترکِ اجل　　ہر طرف روئے غضبناکِ اجل
از عزیزاں چارہ سازی تا بہ کے　　غمگساری دلنوازی تا بہ کے
از الم جانِ پدر کاہیدہ ماند　　سینہا از بہرِ من رنجیدہ ماند

ایں چه می گویم باهِ بے اثر — مادرم از حالِ زارم بے خبر
صبحِ امیدِ دلم شب رنگ گشت — خلدِ زیرِ پاش بر من تنگ گشت
از بہشتش رفتم و آواره ام — در صراطِ زندگی بے چاره ام
لیکن آں انداز فریادم نہ رفت — گفتۂ اقبال از یادم نہ رفت
آنکه فکرش باثریا بوده است — ایں سخن در مثنوی فرموده است

"چوں عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست"

ماحیِ ہر زار و قیصر لَا اِلٰہ — فاتحِ صد بدر و خیبر لَا اِلٰہ
لَا اِلٰہ پروردگارِ قوت است — لَا اِلٰہ سرمایه دارِ ہیبت است
زیں عصا بے باک تر جاں در تنم — بانگِ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوْ زنم
آنکه سرِ زندگی بر ما کشاد — اہلِ عالم را پیامِ عشق داد
رحمت اللعالمیں ہم نامِ اوست — بامِ گردوں پست تر از بامِ اوست
تازه ہر گلشن ز ابرِ رحمتش — لرزه در تن دشمناں از ہیبتش
جانِ ما ایمانِ ما مولائے ما — در جہاں باقی از و غوغائے ما
دل زیادش مست در پہلوئے من — دو جہاں از الفتش ہندوئے من
قیصر و کسریٰ نگوں سر بر درش — ساکنانِ بحر و بر فرماں برش
چوں رموزِ لَا اِلٰہ بر ما کشود — رفت فرعونے کلیمے رخ نمود

بست قمری آشیانِ دیگرے
جلوه گر شد گلستانِ دیگرے

انجاری مضمون

یورپ کی تباہ کاریاں

۱۹۱۴ء میں

روزنامچہ
(۱)

از:- خواجہ سلام الدین صاحب سی۔ ایم۔

جنوری ۹ - جنوبی افریقہ میں زبردست ہڑتال جس کے باعث فوجی قانون نافذ کیا گیا۔
" ۲۶ - لندن کے تیس ہزار معماروں کی ہڑتال۔
فروری ۱۶ - فرانس کے ایک سابق وزیراعظم کی بیوی نے "لی فیگارو" کے ایڈیٹر کو قتل کیا۔
مارچ ۳۰ - مسٹر اسکوئتھ کا برطانوی وزیر جنگ مقرر ہونا۔
اپریل ۲۱ - انگلستان کے بادشاہ اور ملکہ کا سرکاری طور پر پیرس جانا۔
مئی ۲۵ - آسٹریا کے شہنشاہ فرانسس جوزف کے بھتیجے یعنی ولی عہد سلطنت آرچ ڈیوک فرانس فرڈیننڈ کا مع بیوی کے سارا جیوا میں قتل ہونا۔
جون ۲۸ - برطانی جہاز "ایمپرس آف آئرلینڈ" کو جرمن جہاز "سٹارسٹاڈ" نے غرق کر دیا۔ ایک ہزار چودہ انسانوں کی ہلاکت۔
جولائی ۲ - جوزف چیمبرلین کی موت۔
" ۲۸ - ایڈیٹر "لی فیگارو" کی قاتلہ رہا ہو گئی۔
" " - آسٹریا کا سرویہ کے خلاف اعلان جنگ۔
اگست ۱ - جرمنی کا اعلان جنگ روس کے خلاف۔
اگست ۴ - برطانیہ کا اعلان جنگ جرمنی کے خلاف۔
" ۵ - اسی ہزار جرمنوں کا لیج پر حملہ۔
" ۷ - برطانی جہاز "ایمفین" کی غرقابی
" ۹ - جرمن سبمرین ۱۵ - یو کی برطانی کروزر "برمنگم" سے ٹکر اور غرقابی۔
" ۱۲ - برطانیہ کا اعلان جنگ آسٹریا کے خلاف۔
" ۱۶ - پہلی برطانی کمک کا فرانس پہنچنا۔
" ۲۱ - جرمنوں کا برسلز (بلجیم) میں داخل ہونا۔
" ۲۳ - جاپان کا اعلان جنگ جرمنی کے خلاف۔
" ۲۴ - جرمنوں کا نمور پر قبضہ۔
" ۲۵ - لاوین کی جرمنی کے ہاتھوں تباہی۔
" " - اتحادیوں کا کمبرے کی طرف پسپا ہونا۔
" ۲۷ - اوسٹنڈ پر برطانی قبضہ۔ ایک جرمن جہاز کی غرقابی۔
" ۲۹ - سینٹ پیٹرز برگ کا نام پیٹروگراڈ رکھا گیا۔
ستمبر ۱ - ایمی آنگ پر جرمنی قبضہ (یہاں ۱۸۷۰ء میں بھی جرمنی نے فرانس کو شکست دی تھی۔ اور یہیں ۱۸۰۲ء میں برطانیہ کا فرانس سپین

اور بٹاویا کے ساتھ صلحنامہ طے ہوا تھا۔

ستمبر ۲ - لمبرگ پر آسٹریا کو شکست۔ ڈینٹ کو لوٹا گیا۔

" ۳ - حکومت فرانس کی پیرس سے بورڈیو کو ہجرت۔

" ۵ - برطانی شاہی جہاز "پاتھ فائینڈر" کو جرمن سبمرین نے نذر آتش کر دیا۔ ۲۵۹ انسان ہلاک ہوئے۔

" ۵ - ریمز پر جرمنوں کا قبضہ۔

" ۷ - جرمنوں کو جنوبی اور مشرقی پیرس سے ہٹانے کے لئے اتحادیوں کا اقدام۔

" " - برطانی جہاز "اوشنک" کی غرقابی۔

" ۹ - برطانی فوج کا مارن عبور کرنا۔

" ۱۱ - لاوین پر پھر بلجیم کا قبضہ۔

" ۱۲ - جرمنوں کی ۴۲ میل پسپائی۔ جرمن جہاز "ہلا" کی برطانوی تارپیڈو سے غرقابی۔

" ۱۴ - امریکہ کے سمندروں میں جرمن جنگی جہاز کی غرقابی۔

" ۱۴ - ولی عہد جرمنی کی فوج پسپا ہوئی۔

" ۲۲ - برطانی جہاز "ابوکر" "ہیگ" اور "کریسی" کی غرقابی۔

" ۲۲ - جرمن جہاز "ایمڈن" کی مدراس پر گولہ باری۔

" ۲۶ - میلنز پر تیسری بار گولہ باری کی گئی۔ گرجا تباہ کر دیا گیا۔

اکتوبر ۴ - زار روس کا شراب کے متعلق امتناعی حکم۔

" ۷ - جرمنوں کا شیلڈٹ، ارمنڈو، سکونا بورڈ اور

وٹیرن کو عبور کرنا۔

اکتوبر ۶ - آٹھ ہزار برطانی فوج بلجیم کی مدد کے لئے انٹورپ پہنچی۔ حکومت بلجیم کا دارالسلطنت اوسٹنڈ منتقل کیا گیا۔

اکتوبر ۱۰ - جرمنوں نے بلجیم پر دو کروڑ پونڈ تاوان جنگ عائد کیا۔

" ۱۱ - جرمنوں نے روسی جنگی جہاز "پلاڈا" (وزن ۷۵۰۰ ٹن) بالٹک میں سبمرین کے ذریعے آگ لگا کر تباہ کر دیا۔ ۵۶۸ انسان ہلاک ہوئے۔

اکتوبر ۱۳ - جرمنوں کی اوسٹنڈ پر چڑھائی۔

" " - وزارت بلجیم اوسٹنڈ سے ہیور منتقل ہوئی

" ۱۴ - فرانسیسی اور برطانی افواج کا یپرس پر قبضہ۔

" " - برطانی جہاز "یارماؤتھ" نے سماٹرا کے قریب ایمڈن کی دو بار برداری کی کشتیوں کو غرق کیا۔

اکتوبر ۱۵ - اوسٹنڈ میں جرمنوں کا داخلہ۔

" " - بحیرہ شمالی میں برطانی جہاز "ہاک" پر جرمن سبمرین کا حملہ اور "ہاک" کی غرقابی۔

اکتوبر ۱۷ - برطانی "بیخوف" کروزر نے زیر کمان کپتان فوکس چار تباہ کن جہازوں کو زیر آب کر دیا۔

" " - ایک جاپانی جہاز (کروزر) کی غرقابی ۲۶۰ انسانوں کی ہلاکت۔

اکتوبر ۲۲ - جرمن کروزر "کارل سروے" کا بحر اٹلانٹک پر آنا اور ۱۳ برطانوی تجارتی جہازوں کو

تباہ کرنا اور کروزر کا بچ کر نکل جانا۔

اکتوبر ۲۴۔ چارلس فری میٹل نے تباہ کن جہاز "بجبر" سے ایک جرمن سبمرین کو تباہ کیا۔

اکتوبر ۲۶۔ فرانسیسی جہاز "اڈمرل گیر تھم" دو ہزار چھ سو فرانس اور بلجیم کے پناہ گزینوں سمیت جرمن تارپیڈو سے نذر آتش کر دیا گیا۔ سٹیمر "برٹش کوئین" کی مدد سے سوائے چالیس کے باقی بچا لئے گئے۔

اکتوبر ۲۹۔ پرنس لوئیس امیر البحر کا مستعفی ہونا اور لارڈ فشر کا مامور ہونا۔

اکتوبر ۳۰۔ جرمن جہاز "ایمڈن" پے نانگ کے قریب پھر نمودار ہوا۔ اس دفعہ جاپانی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ایک روسی جنگی کروزر اور ایک فرانسیسی تباہ کن جہاز کو غرق کرنے میں کامیاب ہوا۔

اکتوبر ۳۱۔ برطانی "ہرمز" کو ایک جرمن آبدوز نے خلیج ڈاور میں غرق کیا۔ ۴۵ انسانوں کی ہلاکت۔

نومبر ۱۔ چلی کے ساحل پر جرمنی اور برطانیہ میں سخت بحری جنگ۔ ایک طوفان انگیز عالم میں برطانی کروزر "گڈ ہوپ" "مون ماؤتھ" اور "گلاسگو" جرمن جہازوں "شارن ہرسٹ" "نیونسن" "لیپزگ" اور "ڈرسڈن" سے برسر پیکار ہوئے۔ جنگ ایک گھنٹہ جاری رہی۔ برطانیہ کے دو کروزر آگ لگ جانے سے تباہ ہو گئے۔ "گلاسگو" کو کم نقصان پہنچا۔

نومبر ۲۔ جرمنی کا "حملہ آور" جہاز "کارل سروئے" برطانیہ کے تین تجارتی جہازوں کو غرق کر گیا۔

نومبر ۵۔ ٹرکی کے خلاف برطانیہ کا اعلان جنگ۔

" ۱۰۔ برطانی بحری حکام کا اعلان کہ "ایمڈن" کو بحر ہند میں "سڈنی" نے تباہ کر دیا۔

" ...۔ برطانی جہاز "ناگر" کو جرمنوں نے تباہ کر دیا۔ افسر وغیرہ بچا لئے گئے۔

نومبر ۱۴۔ لارڈ رابرٹس کی موت۔

" ۱۵۔ ویسٹ اینڈ میں ایک جرمن آبدوز کی غرقابی اور یسیر کی طرف جرمنوں کی پسپائی۔ برطانی جہاز "ملیوک" اور "ایڈنبرگ" کی مدد سے ہندوستانی فوج کا بحیرۂ احمر کے شمالی ترکی قلعوں پر قبضہ۔

نومبر ۲۶۔ جرمن اور برطانی جنگی جہازوں کی آویزش برطانی جہاز "بلوک" کی آگ لگ جانے سے تباہی۔ آٹھ سو ہلاک ہوئے اور صرف ۱۲ شخص بچے۔

نومبر ۲۹۔ روسی فوج "گلیشیا" کی فتح پندرہ دنوں میں پچیس ہزار آسٹریوں کو اسیر کیا گیا۔

دسمبر ۸۔ چار جرمن حملہ آور جہاز فاک لینڈ (جزیرہ) کے قریب برطانی جہاز "سکویڈرن" نے تباہ کئے۔ یہ جنگ پانچ گھنٹے جاری رہی "ڈرسڈن" بچ کر نکل گیا۔

دسمبر ۱۱۔ اتحادیوں کے مرکزی مقام پیرس کے قریب

جرمنوں کا ناکام حملہ۔

دسمبر ۱۳ - برطانوی آبدوز بی۔ ۱۱ نے دردانیال میں ترکی جنگی جہاز مسعودیہ کو ڈبو دیا۔

دسمبر ۱۴ - سربیا کا بلغراد پر دوبارہ قبضہ۔

" ۱۶ - مصر پر برطانی "حفاظتی قبضہ" کا اعلان۔

" ۱۷ - جرمن جنگی کروزر کی ساحل انگلستان پر گولہ باری۔

دسمبر ۱۷ - وٹبی، سکربرو، ہارٹل پول پر گولے برسائے گئے۔ برطانی سکویڈرن نے تعاقب کیا۔ لیکن ناکامی نصیب ہوئی۔

دسمبر ۲۵ - کاکس ہیون کے ساحل پر دن کے وقت سات برطانوی جہازوں کا جرمن جنگی جہازوں پر حملہ جرمن زپلن اور آبدوز نے مقابلہ کر کے برطانیہ کے چھ جہاز (　　　) لے لئے۔

"نغمہ"

فضائے عالم پر پھیلائے شب کی سیاہ زلفیں پریشان ہیں۔ کل عالم محو خواب ہے۔ . . مکمل خاموشی کا تسلط ہے . . . مگر میرے کانوں میں ایک دلکش نغمہ گونج رہا ہے +

"میں محبت کا نغمہ سن رہا ہوں"

صبح کی سپیدی میں ہر چیز اپنی زندگی کا نیا ورق الٹتی ہے۔ مرغانِ چمن کی نواسنجیاں طیور کی ہنگامہ آرائیاں۔ سورج کی پہلی کرن۔ ہاں سنہری اور لطیف کرن میرے دل کے اندر اتر گئی . . . . . میرے قلب کی دنیا روشن ہو گئی۔ صبا کا ہلکا ہلکا عطر بیز جھونکا میرے کانوں کو دلربا نغمہ سنا گیا۔

"میں محبت کا نغمہ سن رہا ہوں"

امنگوں کا زمانہ ہے . . . . قدرت کا فیضان جوش پر ہے . . . . موسم برشگال کی خوشگوار موسلادھار بارش۔ گھنگھور گھٹائیں۔ خلا میں قوس قزح کی نیرنگیاں۔ بادلوں کے تصادم میں منور اور تیز رو برق کی مضطربانہ کیفیتیں میرے دل کو محو حیرت بنائے ہوئے ہیں . . .

ان تمام حرکتوں میں . . . . "میں محبت کا نغمہ سن رہا ہوں"

اے کاش یہ حالت مستقل و متواتر ہو۔ تاکہ میں اپنی زندگی کے مآل کار سے ہم آغوش رہوں +

عقیل احمد میرٹھ کالج میرٹھ

غزل

آئینۂ حیرت

از:-
جناب عبدالمجید صاحب حیرت دہلوی بی اے۔

تماشا یہ بھی گذرا ہے نظر سے
گھٹا اٹھی مگر بادل نہ برسے

وہاں قائم رہی اک بے نیازی
یہاں مجبور تھے درد جگر سے

دکھا کر زخم دل یہ دیکھنا تھا
کہ اس کی داد ملتی ہے کدھر سے

قیامت ہے کہ دل سے آہ نکلے
مگر محروم رہ جائے اثر سے

تمنا ہے کسی کی اور ہم ہیں
یہ سودا اب کہاں جاتا ہے سر سے

کشاکش زندگی کی ہم سے پوچھو
بمشکل شام کرتے ہیں سحر سے

زمانے کی بدولت ہم بھی حیرت
گزرتے جا رہے ہیں خشک و تر سے

افسانہ

مقدّس معصیّت

(افسانہ)

از:- محترمہ طاہرہ شیرازی

اُسے کسقدر فخر تھا اپنے زہد و اتقا پر۔ کتنا ناز کرتا تھا اپنی تقدیس و طہارت پر۔ سمجھتا تھا۔ کہ دنیا سے منہ موڑ کر جنگل میں آ جانے سے اُس نے نفس پر فتح حاصل کر لی ہے۔ وہ خوش ہوتا کہ دنیا کی معصیت سے بچ نکلا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے سراب زندگی کو بے نقاب کر کے ان حقیقتوں کو معلوم کر لیا ہے۔ جو خوب و زشت میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اب میں نسوانی فطرت کی سحر کاریوں، حسن و جمال کی فتنہ سامانیوں، عشق و محبت کی کرشمہ سازیوں اور ان سب سے زیادہ شباب کے بوجھ سے دبے ہوئے ایک پیکر مخمور کی تقویٰ شکن انگڑائیوں کی دسترس سے کوسوں دور ایک ایسی معصوم فضا میں پہنچ گیا ہوں جہاں صرف الوہیت رقص کرتی ہے تقدس کی لے پر۔ جہاں مخلوق سماوی کے نغمے بیدار ہوتے ہیں۔ تاروں کی جھلملاتی ہوئی آغوش میں۔

وہ راہب تھا۔ ایک تارک الدنیا راہب۔ نمود سحر کے ساتھ وہ چڑیوں کے دلفریب چہچہوں، آب رواں کی رقیق راگنیوں اور باد بہار کے نرم جھونکوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اس برگزیدہ ہستی کی مدح و ثنا میں محو ہو جاتا جس نے... خود اُس کے اعتقاد کے مطابق ___ اُسے صرف اسی مقصد کے لئے تخلیق کیا تھا۔ وہ گھنٹوں سجدہ میں پڑا رہتا۔ مالا جپتے جپتے دھوپ ڈھل جاتی اور رات کی تاریکیاں حسب معمول کائنات کے ذرّوں پر پھیل جاتیں۔ خودرَو درختوں کے بد ذائقہ پھل اور بہتے ہوئے دریا کا کثیف پانی ہی اُس کے کام و دہن کی لذت کے لئے کافی تھا۔

ایک روز حسب معمول وہ ساحل کے قریب بیٹھا عبادت میں مشغول تھا کہ اُسے لہروں کے شگافوں میں ایک زرنگار سفینہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف گھور رہا تھا۔ اسکی نظریں جم گئیں اور جم کر اس مرکز پہ قائم ہو گئیں۔ جو نسوانی رعنائیوں کا حامل تھا۔ دریا کی ہر موج کے ساتھ سفینہ قریب آتا گیا۔ یہاں تک کہ ساحل کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔

اس کے جسم پر لباس تھا ہی نہیں۔ اور اگر تھا تو محض برائے نام۔ اسقدر باریک اور ایسے رنگ کا جو اعضا کی لحمیت سے وصل ہو کر جلد میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اور اُسی کا ایک جزو معلوم ہونے لگتا ہے۔

سفینہ کے ٹھہر جانے پر اُس نے ایک رباب اٹھایا نازک انگلیوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ اور خاموش فضا میں تاروں کی جھنکار سے ایک مترنم و مرتعش تلاطم برپا ہونے لگا پھر لبوں کی شگفتگی نے ان نغموں کو جگا دیا۔ جو اس وقت تک رباب کے تاروں سے بھی بیدار نہ ہو سکے تھے۔ راگ کے زیر و بم کے ساتھ شباب و رعنائی کے حامل سینے میں بھی ایسا نشیب و فراز پیدا ہوتا۔ گویا وہ خود ایک زندہ ساز ہے۔ جو آرزومند ہے صرف ایک مضراب کا۔ گاتے گاتے اُس پر

ایک محویت طاری ہونے لگی۔ اور درحقیقت اس وقت موسیقی کا یہی اعجاز ہونا چاہئے تھا کہ خود مغنیہ وجد میں آجاتی۔

راہب نے سب کچھ سنا اور سنتے سنتے اُسے اپنے جسم میں وہ تھرتھری محسوس ہونے لگی جو خون میں حرکت رفتار پیدا ہو جانے کے بعد نمایاں ہوتی ہے۔ اسے یقین ہو چلا کہ اگر ماحول بدستور رہا تو آج عمر دراز کا تمام زہد و اتقا اس حسینہ کے قدموں میں ڈال دینا پڑیگا۔ اس لئے پوری احتیاط کے ساتھ وہ اس طرح پنبہ بگوش ہوگیا۔ کہ بیرونی صدا تو درکنار اُس کے قلب کی دھڑکن بھی اُس کی سماعت پر اثر انداز نہ ہوسکی لیکن اسکی آنکھیں۔۔ غیر ارادی طور پر وہ اسی مرکز پر جمی رہیں۔

نغمونکو دوبارہ آسودۂ خواب کرکے وہ ساحل پر اس طرح اُتر آئی گویا بجلی کی ایک لہر ہے جسکا اضطراب متشکل ہوگیا ہے۔ وہ رقص کے انداز میں کمر کے اندر بل ڈالکر کھڑی ہوگئی اور ہاتھوں کو شانوں کے متوازی کرکے ساعدسیمیں میں خفیف حرکت شروع کردی۔ اور اسکے ساتھ ہی بائیں ٹانگ میں تھوڑا سا خم ڈالکر۔ پاؤں کی انگلیوں سے کسی ناشنیدہ نغمے کے سروں پر تال دینے لگی۔ اس طرح کہ کائنات کے ذروں سے ہم آہنگ ہوکر بدن کا ہر رونگٹا گنگنانے لگا۔ بکھرے ہوئے بال اور منتشر ہوگئے۔ اُبھرے ہوئے سینۂ شباب کو کچھ مزید سرفرازی نصیب ہوئی۔ آنکھیں تھرکنے لگیں۔ بھویں مٹکنے لگیں۔ اور بحیثیت مجموعی اس کے تمام جسم پر وہ کیفیت طاری ہوگئی۔ جو طوفانی سمندر میں تڑپتی ہوئی موجوں کے ہچکولوں پہ پڑی ہوئی کشتی پر ہوتی ہے۔ پھر وہ رقص طاؤس کے انداز میں نشست کی جانب جھکی اور ایسی جھکی کہ سر زمین سے آلگا۔

راہب کو اندیشہ ہوا کہ مبادا تاب ضبط نہ رہے۔ اس لئے اُس نے منہ موڑ کر آنکھیں بھی بند کرلیں۔ اور منتظر رہا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اب عورت کے پاس وہ کونسا حربہ باقی ہے جس کے ذریعہ اسکی اہرمنی قوتیں بروئے کار آسکتی ہیں۔

کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ حسینہ کشتی کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی۔ راہب نے ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ آنکھیں اس طرح کھولنی شروع کیں گویا نسیم صبح کے لطیف جھونکوں اور قطراتِ شبنم کی صباحت سے دو غنچے بتدریج شگفتہ ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ وہ کشتی میں بیٹھ جانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ شیطانی وسوسوں سے نجات مل گئی۔ لیکن اس وقت جبکہ وہ سکان کا کنارہ پکڑ کر اندر بیٹھ جانے کی آمادگی ظاہر کر رہی تھی۔ اس نے ارادتاً اپنا توازن بگاڑ دیا۔ اور پانی میں جا پڑی۔ اپنے ہاتھوں کی بے قاعدہ جنبشوں اور ہر اُبھار کے ساتھ ہلکی چیخ سے اُس نے راہب کو محسوس کرادیا کہ وہ تیرنا نہیں جانتی۔ راہب نے کچھ دیر اسکو بغور دیکھا لیکن پھر یقین ہوگیا۔ کہ ایک انسانی ہستی خطرہ میں ہے اس لئے فوراً اپنی جگہ سے اُٹھا اور بے تحاشا دریا میں کود پڑا۔

چند لمحے بعد حسینہ بیہوشی کے عالم میں اسکی آغوش میں تھی۔ اور وہ اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ رو بھی رہی ہے اُس کا دل ہل گیا۔ حسین آنکھیں اور اشک۔ آلودہ جوش ہمدردی میں اُس نے حسینہ کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ اور خاکستری لبوں سے اُس کے پپوٹوں پہ گرم بوسے ثبت کرکے آنسوؤں کو خشک کردینا چاہا۔ اُس نے آنکھیں کھولدیں اور اس کامیابی پر مسکرانے لگی۔ اپنی جان کو مصیبت

میں پھنسا کر اور اشکوں کے تقاطر سے فریب دیکر دوسرں کی ہمدردی حاصل کرلینا صنفِ نازک کا وہ آخری حربہ ہے جس کے مقابلے میں تیرو تفنگ کی بھی کچھ حقیقت نہیں

نمودِ سحر سے قبل طلسمِ خواب ٹوٹ چکا تھا۔ مناظرِ قدرت کی کیفیت بدستور تھی لیکن خلافِ معمول راہب کو دیکھا گیا کہ وہ جنگل کے گوشۂ اعتکاف کو چھوڑ کر شہر کے ہنگاموں کی طرف قدم بڑھا رہا ہے کیونکہ یہ حقیقت اُس پر روشن ہو گئی تھی کہ صنفِ نازک سے مُنہ موڑ کر تارک الدنیا ہو جانا ایسا تقدس ہے جو اپنی مذموم نوعیت کے لحاظ سے ایک زبردست معصیت ہے۔

غزل

از:-
اختر شیرانی

بہشتوں پہ ہنستی ہے دنیائے فانی
جوانی کی راتیں ہیں کتنی سہانی

ستم ہے کہ اے دل نہیں جاودانی
حسینوں کا حُسن اور ہماری جوانی

یہ سبزہ، یہ بادل، یہ رُت، یہ جوانی!
کدھر ہے مرا ساغرِ خسروانی؟

بھلا پھر کہاں ہم کہاں نوجوانی!
پلا ساقیا بادۂ ارغوانی!

ترا حسن پروردۂ رنگ و بو ہے
بہاروں میں کھیلی ہے تیری جوانی!

صنم خانۂ ہند خاموش کیوں ہے
نہ وہ دلستاں ہیں، نہ وہ دلستانی!

مری مستیوں کو بُرا کہنے والے!
چھلکتی ہے ساغر میں کس کی جوانی!

یہ حسرت رہی وہ کبھی آکے سُنتے
ہماری کہانی ہماری زبانی!

سرِ بام او محوِ خوابِ بہاریں
ستاروں پہ چھائی ہے تیری جوانی

مرا عشق بدنام ہے کیوں جہاں میں
ہے مشہور اختر جوانی دوانی!

نوکاہی

از:-
علامہ حاجی ابنِ بطوطہ ابن جہانی

پوسٹ مین اُس بُت کا خط لاتا نہیں — اور جو لاتا ہے پڑھا جاتا نہیں

کون سا بُت ہے جو تڑپاتا نہیں — مال پر ہم سے پھرا جاتا نہیں

عاشقی سے کیوں ہم استعفا نہ دیں؟ — ہوٹلوں کا بِل دیا جاتا نہیں!

شیخ جی موٹر پہ حج کو جائیے — عہدِ نو میں اونٹ کام آتا نہیں

بوسہ لیں اُس سروقد کا کس طرح — تاڑ پر ہم سے چڑھا جاتا نہیں

پھیر لیں کیوں دل نہ اُس ظالم سے ہم — عشق ہے رشتہ نہیں، ناتا نہیں:

عاشقوں پر ظلم کرنا چھوڑ دیں — کیوں بے قاصد جا کے سمجھاتا نہیں!

رات دن فرمائشیں زیور کی ہیں — ہم سے اب عاشق رہا جاتا نہیں

بزم میں دشمن ہے کیوں خاموش آج — بھائی مجیبیلا کس لئے گاتا نہیں؟

سلہ مال روڈ لاہور

جل گئی سگرٹ سے ڈاڑھی شیخ کی
یہ مگر فیشن سے باز آتا نہیں!

فربھی کا طنز کیوں عُشاق پر؟
تیری چکّی سے تو پسواتا نہیں!

فیس پہلے جب تلک رکھوانہ لے
ڈاکٹر اپنے بھی گھر جاتا نہیں

بیکری میں نوکری کرنی پڑی
وہ سوائے کیک کچھ کھاتا نہیں

کیوں نہ دعوائے نبوت کیجئے
اندنوں پھانسی کوئی پاتا نہیں!

تیری فرقت میں بہت فاقے کئے
آکہ اب بھوکا رہا جاتا نہیں!

گھس گھدرے لکھنے لگے ہیں ناکیاں
دیسی فلموں میں مزا آتا نہیں

کب سے ہے مہمان تو اے ہجر یار؟
بھائی میرے گھر سے کیوں جاتا نہیں؟

او ستمگر! روکنا موٹر ذرا
میرے خچر سے چلا جاتا نہیں!

لانڈری کھولی تھی اُس کے عشق میں
پر وہ کپڑے ہم سے دُھلواتا نہیں

حضرتِ ابنِ بطوطہ کی غزل

ضد کے مارے وہ صنم گاتا نہیں!

حل طلب انعامی معمّہ

ناظرین "رومان" کے تفنن طبع اور قسمت آزمائی کیلئے ایک معمّہ وقف قرطاس ہے۔ لمحات فرصت گذارنے کیلئے اس سے بہتر اور کیا شغل ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی جلب منفعت بھی ہے۔ گویا ہم خرما و ہم ثواب۔ اگر ناظرین اس سلسلہ کو پسند فرمائیں گے تو آئندہ اس سے بہتر اور زیادہ انعامی مالیت کے معمّے رسالہ "رومان" میں درج کئے جایا کریں گے۔ جن صاحب کا حل صحیح اور صاحب معمّہ کے حل کے مطابق ہوگا ان کی خدمت میں مبلغ ۲۵ روپیہ کی نقد رقم نذر ہوگی، ایک سے زیادہ صحیح حل بھیجنے والے یہ رقم بحصہ رسدی لینے کے حقدار ہونگے اور ایک غلطی والے صاحب کیخدمتمیں مبلغ ۱۰ روپیہ نقد پیش کئے جائینگے اور دو غلطیوں تک ۵ روپے دیئے جائینگے، شرط یہ ہے کہ حل رسالہ ہذا کے کوپن پر ہو اور اس کے ساتھ فی حل ۴ کے ٹکٹ ارسال ہوں۔ آخری تاریخ ارسال حل ۲۸ جولائی ۱۹۳۵ء ہے (حل کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ ناطق اور قطعی ہوگا) تمام حل مدیر شعبہ معمّا۔ رسالہ "رومان" ۱۸ فلیمنگ روڈ لاہور کے نام بھیجے جائیں۔

۹	۸		۷	۶	۵	۴		۳	۲	۱
		۱۳			۱۲		۱۱			۱۰
	۱۶			۱۵						۱۴
	۱۹				۱۸					۱۷
		۲۱							۲۰	
۲۵	۲۴		۲۳			۲۲				
		۳۰	۲۹				۲۸	۲۷		۲۶
	۳۳			۳۲				۳۱		
		۳۷			۳۶				۳۵	۳۴
۴۱		۴۰				۳۹	۳۸			
				۴۴				۴۳		۴۲
	۴۷				۴۶					۴۵

نام ....

پتہ (خوشخط الفاظ میں) ....

متوازی

۱۔ دیکھنے کی چیز — ۲۶۔ چمکدار
۴۔ شیشہ — ۲۹۔ جسم
۸۔ آفرین — ۳۱۔ کرخت
۱۰۔ ایک تاجدار کا نام — ۳۲۔ حیوان ناطق
۱۲۔ گورا — ۳۴۔ بخشش
۱۴۔ چوبدار — ۳۶۔ خون
۱۵۔ نام — ۳۷۔ خوشبودار چھال
۱۷۔ لڑکی کا نام (ہندی) — ۳۸۔ ایک قوم
۱۸۔ پھل — ۴۰۔ دانا منکر
۱۹۔ تنگ — ۴۲۔ مریض
۲۰۔ پانی — ۴۴۔ بت
۲۱۔ بیج — ۴۵۔ خوبصورت
۲۲۔ سین — ۴۶۔ بڑا
۲۴۔ گیلا — ۴۷۔ دانت

عمودی

۱۔ طبیعت — ۱۱۔ پڑوس — ۲۶۔ دور رہی تو میں کو بھاؤ / ہاتھ لگے تو جان جلاوے — ۲۵۔ منوہر
۲۔ پھول — ۱۳۔ عشرہ — ۳۶۔ گنتی
۳۔ علیحدہ — ۱۶۔ ہاتھ — ۲۷۔ دستور — ۳۹۔ نام خدا
۵۔ عرق — ۱۸۔ دوسرا — ۲۸۔ ماننا — ۴۱۔ کوڑی
۶۔ نیلی — ۲۲۔ خوشامد — ۳۰۔ گل سیوتی — ۴۲۔ شہر
۷۔ کمل — ۲۳۔ قیمتی چیز — ۳۲۔ مدد — ۴۳۔ افزونی
۹۔ احمق — ۲۵۔ مست — ۳۳۔ نقلے

(رشید ارشاد علی ارشد دہلوی

مربوط رہلی ٹیکنیکل لاہور وایڈیٹر معما رسالہ رومان (۱۱ تک)

سنگرہنی یا اسہال
قے یا ہیضہ
بدہضمی یا کمی اشتہا
ان کی روک تھام
فوری آرام
بے خطا علاج
کیلئے
"امرت دھارا"
رجسٹرڈ
استعمال کریں قیمت فی شیشی دو روپیہ آٹھ آنہ نصف شیشی عہ نمونہ کی شیشی آٹھ آنہ
ایک بھرے قبیلہ کے لئے صرف ایک شیشی گھر ملو ڈاکٹر کا کام کرتی ہے نزلہ زکام
بخار ہر قسم کی اندرونی بیرونی درد کیلئے نیز پھوڑے پھنسی چوٹ کے لئے اس کا استعمال
مفید ہے!
احتیاط! نقلوں سے بچو کیونکہ سخت و دیرینہ امراض میں دھوکہ دیکر دکھ و تشویش کو بڑھا دیں گی صحت کے معاملہ میں نقلوں پر اعتبار نہ کرو!
خط و کتابت و تار کیلئے پتہ: امرت دھارا لاہور
المشتہر مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

ڈومی سیکس

بڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کرنیوالا معجزہ

مَردوں اور عورتوں کے لئے یکساں قابلِ استعمال اور مفید

ہماری موجودہ زندگی کے طور طریق اور عصر حاضرہ کے افکار و حوادث جسم انسانی علی الخصوص اعصاب پر نہایت تباہ کن اثر ڈالتے ہیں۔ اسی وجہ سے اعصابی امراض جنسی ضعف نیورستھنیا اور دیگر انواع و اقسام کی تکالیف۔ نوع بشر کے تمام طبقوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ان تکالیف سے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو اعضائے رئیسہ پر اثر ڈالتے ہیں جسم میں بالعموم تھکن محسوس ہوتی ہے۔ ایام ماہواری میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات اس کا نتیجہ بانجھ پن اور نسلی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ ایک امر واضح ہے اور اس لئے تشریح طلب نہیں کہ تند و تیز منشیات ان شکایات کو ہرگز رفع نہیں کر سکتی ہیں۔ ان ادویہ کا انسانی غدود پر وہی اثر ہوتا ہے۔ جو "سمندِ ناز" کے لئے تازیانہ حکم رکھتا ہے۔ اگر ایک مستقل علاج اور دوامی صحت درکار ہے، تو ان عارضی علامات کا دور کرنا اور تلخ و تند دواؤں کا استعمال بالکل بے محل ہوگا علم طب اور فن جراحی کے بڑے، بڑے جلیل القدر علما مثلاً پروفیسر "اسٹی ناخ" "وورونا ف" اور" براؤن سیکوارڈ" کا یہ نظریہ ہے کہ جنسی کمزوری کی تہ میں غدود کے عمل کا نقص ہے۔ اعادہ حیات جنسی صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جبکہ وہ ق۔رتی اجزا استعمال میں لائے جائیں جو ان غدود کو صحیح عمل کرنے کی طرف آمادہ اور مائل کر سکیں۔ فن طب ترصہ سے اس سعی و تلاش میں مصروف تھا کہ "ہارمونز" کا کوئی ایسا صحیح اور کارگر مرکب تیار ہو جائے جس کے اثرات دوامی ہوں اور تھوڑی سی مدت میں صحت و کامیابی میسر ہو سکے۔ "ڈومی سیکس" میں یہ تمام شرائط جمع ہیں۔ اس لئے تمام دنیا میں اسکی مانگ زیادہ ہے۔ ڈومی سیکس علی الخصوص اعضائے جنسی پر اثر ڈالتا ہے اور بالعموم مرکزی نظام اعصابی کی تعمیر اس لئے کرتا ہے کہ دماغ میں اعضائے جنسی کے افعال میں گہرا باہمی تعلق ہے۔ اطبا کی یہ رائے ہے کہ ڈومی سیکس مرد اور عورت دونوں کی اعصابی اور جنسی بدنظمیوں کو نہایت با اثر طریق پر رفع کر دیتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے کہ "ڈومی سیکس" ضائع شدہ طاقت کو پھر بحال کر دیتی ہے اور مریض اپنی اصلی صحت کی حالت پر پہنچکر ان تمام لذات دنیوی سے بہرہ اندوز ہوتا ہے جو ایک تندرست و توانا انسان کو مطلوب ہیں۔

"ڈومی سیکس" کی کامیابی کی تہ میں راز یہ ہے کہ اس کی ترکیب میں ذیل کی اشیا استعمال ہوتی ہیں:-

۱- تازہ نسلی غدود۔

۲- وہ تازہ غدود جن کا تعلق صنف نسواں کی جنسی زندگی سے ہے۔

۳- اُن غدود کا ست جو دماغی غدود کہلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈومی سیکس علم طب اور علم کیمیا کے بہترین ماہروں کے زیر ہدایت اور زیر نگرانی تیار ہوتی ہے۔ ان "ہارمونز" کے ترکیبی عمل کو زیادہ مستقل اور مستحکم بنانے کے لئے ہم نے اسمیں ایک اور دوا کا اضافہ کیا ہے۔ جو "لیسی تھنز" کہلاتی ہے۔ یہ درحقیقت فاسفورس کا ایک حیوانی مرکب ہے جو نظام اعصابی میں پایا جاتا ہے۔ اور اعصابی کمزوری کی تمام شکایتوں کے لئے علی الخصوص جب جنسی کمزوری ہو استعمال میں لایا جاتا ہے۔

لٹریچر

بیونوس ایریز کی یونیورسٹی سے پروفیسر "ظابو" فرماتے ہیں:-

بہت سی ایسی حالتوں میں جبکہ بیماری نے نہایت خطرناک صورت اختیار کرلی تھی میں نے "ڈومی سیکس" کو آزمایا میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ یہانتک کہ ایسے مریضوں کی طاقت بھی بحال ہوگئی جو عرصے سے بیمار تھے اور اس سے قبل بہت سی دوائیاں کھا کر اپنی حالت خراب کر چکے تھے۔

رامیوڈی فبیرو سے پروفیسر "روڈیگ" فرماتے ہیں:-

ڈاکٹر ماٹر کا نو تیار شدہ نسخہ "ڈومی سیکس" جدید سائنٹفک تحقیقات کے حقائق پر مبنی ہے اور اسمیں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ادویہ کی ایک جدید کارگاہ مہیا کرسکتی ہے۔ جن مریضوں کے لئے میں نے "ڈومی سیکس" کا استعمال تجویز کیا وہ میرے طبی مشورے کے از حد ممنون ہیں۔ یہ اس سے بہت زیادہ ہے جو کچھ کہ بہتر سے بہتر الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہو۔

استعمال کیلئے ہدایتیں

عارضی کمزوری کے لئے ہر روز دن میں تین مرتبہ کھانے سے پہلے دو یا تین گولیاں پانی کے ساتھ کھانی چاہئیں۔ انکا استعمال چودہ دن تک جاری رہنا چاہئے۔ اس حالت میں کہ مرض شدید ہو ہر سات دن کے وقفہ کے بعد تین یا چار گولیوں کی مقدار ہر روز دن میں تین مرتبہ کے حساب سے بڑھائیں۔ دوران علاج میں شراب اور تمباکو کا استعمال بہت کم کر دینا چاہئے۔

دوا کا اصلی بکس جسمیں پچاس گولیاں ہونگی اور جسے مرد اور عورت دونوں استعمال کرسکتے ہیں، پانچ روپے میں ملیگا۔

تیار کرنیوالے کیمسٹ:- ڈاکٹر ماٹر کیسٹنر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ ہمبرگ سودسی ہوس (جرمنی)

ہندوستان کیلئے سول ایجنٹس:- ماٹر اینڈ کمپنی ۲/۶ لنڈسے سٹریٹ کلکتہ

ڈومی گونو

اندرونی ادویہ برائے سوزاک

ڈاکٹر مائر کیسٹنز

ڈومی گونو ایک اندرونی نظام کے درست کرنیکی دوا ہے جو سوزاک اور سوزاک سے متحدہ دیگر جلدی امراض کے معالجہ میں کامیابی کیساتھ استعمال ہوتی ہے۔ ان اداروں میں جہاں بالعموم جلدی امراض کے متعلق تحقیق اور ریسرچ کی جاتی ہے ڈاکٹروں نے مشاہدہ کے بعد اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچادیا ہے کہ سوزاک اور اس کے دیگر تکلیف دہ اثرات وتوابع سے نجات حاصل کرنے کے لئے اور اس مقصد کے لئے کہ اندرونی شکایات رفع ہوجائیں۔ سکون حاصل ہو اور درد و تکلیف کی حالت میں بدن کے متاثر اعضا بے حس ہوجائیں اس قسم کی دوا نہایت مفید ثابت ہوتی ہے۔

اس دوا کے تیار کرنے میں خاص ترکیب اور احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور وہ تمام شدید نقصانات اور مضرتیں جو بالعموم اس قسم کی ادویہ کے استعمال کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جیسے صندل کی لکڑی کا تیل یا "کاوا کاوا" گولیاں برطرف کئے جاسکتے ہیں۔ تجربہ ثابت کرچکا ہے کہ سنتال لکڑی کا تیل استعمال کرنے والے مریضوں کو کیسی سخت ناخوشگوار بدبو کے ذریعہ سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اور ان کا تنفس کسقدر نفرت خیز ہوتا ہے۔ "ڈومی گونو" کے استعمال میں مزید فوائد یہ بھی ہیں کہ سنتال لکڑی کے تیل کے دیگر لوازمات مثلاً تحریک امعاء و شکم اور ذات الصدر جو اس قسم کے تیلوں کے استعمال سے لاحق ہوجاتے ہیں بالکل ظاہر نہیں ہوتے۔

ڈومی گونو کے فوائد بمقابلہ دیگر ادویہ کے

۱۔ گولیوں کے اوپر ایک دوا کی تہہ ہوتی ہے جو "کراٹین" کہلاتی ہے "کراٹین" ان گولیوں کے معدہ کے ان عرقوں میں حل ہوجانے سے محفوظ کردیتی ہے۔ جو ہاضمہ میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے سانس میں بدبو اور معدہ کی شکایات نہیں پیدا ہوتیں۔

۲۔ جسم کے اندر داخل ہونے پر یہ دوا ایسٹر آف لیکٹک ایسڈ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس لئے بہت کم مقدار میں خوراک بہت بڑے اثرات پیدا کرتی ہے اور زاید خوراک کی حاجت نہیں رہتی۔

۳۔ باوجودیکہ خوراکیں بہت قلیل ہوتی ہیں۔ لیکن جسم کے ان حصوں کو بے حس کرنے میں جہاں شدید درد ہو رہا ہو اور سکون بخشنے میں اور پیشاب کو بسرعت صاف کرنے میں اور دیگر الائشوں کے برطرف کرنے میں بے مثل ہے

سخت اور چھیل ڈالنے والی الایشوں کو بننے سے روک دیتی ہے۔ اور یہ زیادہ خارج ہو کر اعضا کو زخمی نہیں ہونے دیتی ہیں۔ اعضائے رئیسہ میں جلن اور سوزش کو رفع کر دیتی ہے۔

۴۔ پیشاب کی بدبو کم کرنے میں تیر بہدف ہے۔ ڈومی گونو بالکل بے مزہ ہے۔ اور چونکہ چھوٹی چھوٹی گولیوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس لئے بآسانی کھائی جاسکتی ہے۔

۵۔ نہایت کم قیمت ہے۔ (دوسری ادویہ کے مقابلہ میں پچاس فیصدی ارزاں ہے)

خوراک - ہر روز دن میں تین مرتبہ دو دو گولیاں غذا کے بعد پانی کے ساتھ کھائیں۔

نمونہ - ڈاکٹروں اور طبیبوں کے آزمانے کے لئے دوا نمونہ کے طور پر مہیا کی جاتی ہے۔

لٹریچر

شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر اسمتھ فرماتے ہیں:-

ادارے کے اس حصہ میں کام کرنے سے جہاں جلدی امراض کا علاج ہوتا ہے مجھے جو تجربہ ڈومی گونو کے متعلق حاصل ہوا میں بوثوق کہہ سکتا ہوں۔ کہ سوزاک اور سوزاک سے متعلق دیگر شدید تکالیف میں یہ دوا نہایت نافع ثابت ہوئی ہے۔ آنتوں اور معدے پر دوا کے استعمال کے بعد کسی قسم کے ناخوشگوار اثرات مشاہدے میں نہیں آئے۔

بیونوس ایریز کی یونیورسٹی کے پروفیسر "زبالہ" فرماتے ہیں:-

ڈومی گونو خاص طور پر اس وجہ سے قابل قدر قیمتی ہے کہ جلدی سوزشوں میں اس کا اثر نہایت سکون بخش ہوتا ہے۔ علی الخصوص زحمت رساں خیزیوں پر اور اس کی صفات کی خوبیوں کو اس وقت دیکھا جاسکتا ہے جب اس کو پیشاب کے اعضا پر آزمایا جائے۔ اس کے کھانے کے بعد ڈکاریں نہیں آتیں اور نہ قے ہوتی ہے۔ اور گردوں پر بھی کسی قسم کی سوزش ظاہر نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔

تیار کرنے والے کیمسٹس

ڈاکٹر مائر کیسٹنر اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ہمبرگ۔ سووسی ہوس (جرمنی)

ہندوستان کیلئے سول ایجنٹس

مائر اینڈ کمپنی ۶/۲ لنڈسے اسٹریٹ کلکتہ
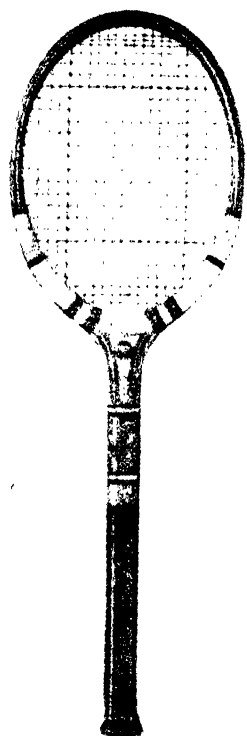
SYKES TENNIS RACKETS

1935 MODEL

Are Unsurpassable in Strength, Durability, Beauty and Elegance
Make up your mind to see them to-day

	Rs.	a.
"Air-Speed"	48	0
Falcon Super	45	0
Prefectus	38	0
Blue Riband	35	0
Raleigh Super	25	0
New Wimbledon	20	0

	Rs.	a.
Aristocrat	40	0
Gold Medal Ruby	38	0
I Challenge	26	0
Royal Blue	25	0
Tournament	16	8

All Strung with Best English Gut

SYKES CRICKET BATS

ARE WORLD'S BEST

	Rs.	a.
Don Bradman Test Selection	34	0
Don Bradman 3 Crown	32	0
,, 2 Crown	28	0
,, Club Brand	20	0
Roy-Kilner Test Selection	35	0
,, 3 Crown	33	0
,, 2 Crown	30	0
,, 1 Crown	25	0

Horbury & London

SOLE AGENTS: Meyer & Co. SPORTS OUTFITTERS

6-3, Lindsay Street, Calcutta - - - - - Phone: Cal. 76

STOCKISTS:

Dodhy & Sons, Sialkot & Bombay
The Sports, Simla & Delhi
Matinee Bros., Sialkot & Secunderabad
Kuckreja Ltd., Sialkot & Branches
Pindi Sports Works, Rawalpindi
Sachdeb & Co., Sialkot

Devanand's Bros. & Sons, Lahore
K. D. Abdulgafur & Son, Sialkot and Branches
Punga Bros., Sialkot & Branches
Sports Ltd., Lahore
Gander & Co., Rawalpindi

رومان
اختر شیرانی
عاشق بٹالوی

کہو زاہد سے کیوں ہے اسقدر فردوس پہ نازاں
ہزاروں جنّتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں (آغا حشر مرحوم)

رُومان

اُردو کے نوجوان اہلِ قلم کا ادبی و فنّی ماہنامہ

نگارندگانِ خصوصی

سیّد امتیاز علی تاج بی اے - سیّد حسن جعفری ایم اے ایل ایل بی

جوش ملیح آبادی

مینجر رسالہ "رومان" ۱۰ فلیمنگ روڈ - لاہور

چندہ سالانہ مع سالنامہ پانچ روپے — طلبہ سے چار روپے — فی پرچہ چھ آنہ

(شیخ محمد نواب پرنٹر پبلشر نے گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع کرا کے ۱۰ فلیمنگ روڈ لاہور سے شایع کیا)

۴۸۶

فہرست

جلد ۱	مضامین بابت ماہ اگست ۱۹۳۵ء	شمارہ ۴

خلوتیانِ رومان

"رئیس المتغزلین" مولانا حسرت موہانی تحریر فرماتے ہیں:-

"رومان" کا جون نمبر پہنچا، پڑھکر جی بہت
خوش ہُوا۔ اس کا پہلا پرچہ بابت ماہ مئی
بھی ضرور بھیجئے تاکہ میرے پاس آپ کے
رسالے کی مکمل جلدیں موجود رہیں.....
فقیر کو اب غزل کہنے کا بہت کم اتفاق ہوتا
ہے۔ کبھی کبھی اگر کچھ کہتا بھی ہے تو اس کی
حیثیت خود فقیر کی نظر میں تقویم پارینہ سے
زیادہ نہیں ہوتی۔ بہرحال ایک جدید و غیر مطبوعہ
غزل کے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔ اگر آپ کے
رسالے کی عام روش کے خلاف نہ ہوں تو
قبول فرمائیے"۔

مولانا کے یہ دلکش اشعار کسی اور جگہ درج کئے جا رہے
ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مولانا آئندہ بھی اس سلسلۂ عواطف
کو جاری رکھیں گے۔ کیونکہ ؎

آپ کے شعر عاشقوں کے لئے فی المثل ہیں شراب ناب سرا!

کوئٹے کے زلزلے نے زمین و زمان کو تہ و بالا کر دیا ع
تو گوئی کہ روز قیامت رسید! بعض ایسے "خلوتیانِ رومان"
ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے جن کا ثانی کبھی نصیب نہیں
ہوتا ع اب دکھائیگا وہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز! انہی میں

باز گو از نجد و از یاران نجد

نواب میر یوسف علی خاں مگسی بلوچ بھی تھے۔ جن کی
دوستانہ شرافت اور نیک دلی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین
نہیں آتا کہ وہ اتنی جلد ہم سے بچھڑ گئے! مرحوم نے
سفر یورپ سے پہلے ایک نظم لکھی تھی کہ ع "بلوچستان"
کو آزادی کی مے پلوا کے چھوڑونگا! کسے معلوم تھا کہ یہ
آزادی "اغیار" کی قید کے بجائے زندگی کی اُلجھنوں سے
آزادی کا نام بن جائے گی ؎

چرخ گردد بر خلاف آرزو در کف کس اختیاری ہست نیست!

بعض ایسے احباب بھی ہیں جن کی زندگی سے "رومان"
قطعی مایوس ہو چکا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی زندگی و
سلامتی کی اطلاعات ملتی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں (نوابزادہ)
میر محمد شہباز خاں نوشیروانی (آف خاران) کی دلگداز تحریر
قابلِ مطالعہ ہے:-

"کوئٹے کی تباہی، عزیزوں کی بربادی اور
مرحوم یوسف کی مفارقت ایسے جانکاہ صدمات
ہیں جنکی تفصیل ممکن نہیں۔ نہیں جانتا کہ ان صبر
آزمائیوں کے بعد آخر مجھ سخت جان کو کیوں زندہ
رہنے دیا گیا۔ بس جی رہا ہوں اور نہ جانے کیوں
ع قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور!
"کوئٹہ" کے ساتھ "رومان" بھی چھوٹا۔ وہ ماہ

سے یہاں (کراچی) خانہ بدوشی کے عالم میں ہوں
اور ع مرے دل کو "رومان" کی آرزو ہے!"

برادرم محمد عظیم خاں احمدزئی بی اے۔ (سابق پرائیوٹ سکرٹری قلات) کی سلامتی کا ہمیں یقین تھا۔ لیکن آثار و اسباب اس کے خلاف تھے۔ خدا خدا کرکے انکا محبت نامہ ملا اور یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ "رومان" کا یہ "خلوتی خاص" زلزلے کی پہلی ہی کروٹ میں کوئٹے سے زیارت (بلوچستان) پہنچ گیا تھا ع جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا۔ زلزلوں کی موجودہ یورشوں کے متعلق ان کا "دلچسپ" بیان ملاحظہ ہو:-

"زلزلہ آیا اور آیا رہتا ہے لیکن وہ دہشت باقی نہیں رہی۔ یا یوں سمجھئے کہ کچھ باقی ہی نہیں رہا جس کی غارتگری کا خوف ہو ع
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو!
تمام دنیا خیموں میں آباد ہے اور ان "سرا پردوں" کے گر پڑنے کا خوف ہی نہیں! ہفتے میں ایک دو مرتبہ اب بھی شدید زلزلے "زور آزمائی" کر جاتے ہیں۔ ہماری کیا بساط پہاڑ تک بجا مے دھنسے جا رہے ہیں۔ شاید قیامت کیلئے ری ہرسل ہو رہی ہے"

بلوچستان کے دور افتادہ علاقے لورالائی سے عزیزی سید صغیر حسن اصغر انبالوی کا غیر متوقع خط شاہد ہے:-
"زلزلے کی نظر عنایت کوئٹہ اور مضافات ہی پر مرکوز رہی۔ لورالائی اس سے محروم رہا۔ گرچہ زلزلے کی محشر آفرینیاں ساکنان لورالائی کے آرام و سکون کو متزلزل کئے بغیر نہ رہیں۔ اور کیوں نہ ہوتا حق ہمسائگی سے کیونکر محروم رہ سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں متعدد بار جھٹکے تو ضرور محسوس ہوئے۔ مگر الحمد للہ وہ جھٹکے کسی جانی و مالی نقصان کا سبب نہیں بنے"!

برسات کا زمانہ ہندوستان کا موسم بہار ہے اور جھولا اور آم اس موسم کی حسین و رنگین پیداوار۔ ایک ماہر اقتصادیات "خلوتی" کی رائے ہے کہ آم مردوں کے لئے اور جھولا خواتین کے لئے مختص ہونا چاہیئے ع ہر کسے را بہر کارے ساختند! ان کا خیال ہے کہ آم کھانے کا سماں بہت بڑی حد تک غیر شاعرانہ ہوتا ہے۔ اور عورت سراپا شعر! اس لئے ظاہر ہے کہ ان دونوں میں کوئی وجہ تعلق نہیں۔ برخلاف اس کے جھولے سے عورت کو وہی حسین نسبت ہے جو نکہت گل کو نسیم سے ہے! ع
بہار جھول رہی ہے ہوا کے جھولوں میں!

"جھولے" کا حال تو "مدتوں" سے نہیں معلوم۔ البتہ ع اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی۔ کہ دو تین سال سے اردو اخبار نویسوں کو آم کھانے کی بری طرح لت پڑ گئی ہے۔ ان "انبہ خور" اڈیٹروں میں ہمارے محترم دوست مولانا نصر اللہ خاں عزیز مدیر "مدینہ" (بجنور) جناب سندباد جہازی مدیر "احسان" (لاہور) اور مولانا سالک بٹالوی مدیر

"انقلاب" (لاہور) پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بلکہ تمام اہلِ تنعم "تہ نشینین" میں "دہ نشینین" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی "انبہ پرستی" کی شہرت اخباری "ابریج کی ملکیت" بن چکی ہے ——— ہمیں ان کی انبہ نوازی پر اعتراض نہیں لیکن "از خود طلبی" اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بالخصوص اس حالت میں کہ "حسن طلب" کی نئی نئی ترکیبیں بھی استعمال میں لائی جاتی ہوں۔ اردو اخبار نویس لاکھ "غریب" ہوں تاہم ان کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ؎

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جسکو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے!

اتنا پڑھ کر شاید کوئی صحافتی "انبہ نواز جنگ" پکار اٹھیں گے کہ ہمارا یہ اعتراض بھی حقیقتاً ایک طرح کا "حسن طلب" ہے تاکہ اسے پڑھ کر ہماری "بے طلبی" پر کسی "آم داتا" کو رحم آ گئے اور وہ چند "آم" ہمارے نام بھی بھجوا دے ———

ہم اپنے ان دوست کو اس تحریری اعتراض کا موقع دینا نہیں چاہتے۔ کیونکہ یہ تمہید حقیقتاً ان "بے طلب" آموں کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے باندھی گئی ہے جو ادیبۂ عزیز محترمہ کنیز فاطمہ خاتون حیا نے لکھنؤ سے ازراہِ عنایت ہمارے نام بھیجے ہیں۔ بلاشبہ ان آموں پر ہمارے ناظرین کا بھی حق تھا۔ کیونکہ ہم اپنے معاصرین کی طرح "تنہا خوری" کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن "یک انار و صد بیمار" کے مصداق ان کی تقسیم کا کوئی طریقہ ہمارے "غیر حسابی" ذہن میں نہیں آیا۔ لہٰذا آموں کو "عام" کر دینے کی بجائے انکا شکریہ "عام" کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے ناظرین اس "قند اکبری" کو دیکھ کر "شکر شکنی" سے دریغ نہ فرمائیں گے ؎

حیا نے لکھنؤ سے آم بھیجے　　ہمیں بھیجے، ہمارے نام بھیجے
نہ کیوں بندے بنیں بے دام انکے　　کہ بھیجے آم اور بے دام بھیجے

ہمارے ایک بچھڑے ہوئے ہموطن اور دوست "حاجی حامد شیر خاں جو غالباً "حاجی" ہونے کی وجہ سے اب تک "خلوتیان رومان" کی محفل میں شریک نہیں ہو سکے، مدت دراز کے بعد ان حسین الفاظ میں جو حاجیانہ "بلغ العلائیت" سے یکسر خالی ہیں۔ اپنی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں:—

"...... ! لوٹ ہی گر تجھے منظور ہے ایمانوں کی!
آ ادھر آ کہ یہ بستی ہے مسلمانوں کی!

میں.... محض تمہاری یاد تازہ کرنے کی غرض سے خریدا کرتا تھا۔ مگر تم نے یہ ذریعہ بھی کھو دیا۔ خیر، اب بہت دن کے بعد "رومان" میں صورت دیکھی اور وہ بھی "ستاروں کی شمعوں" کی چھاؤں میں..... !

اس قدامت کے ساتھ یہ اچھوتا پن تو آگے معلوم.... ہاں پھر کہنا ؎

شب وصل کی بیخودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں!

دیکھیں... ادھر لانا.... ! خدا نہ کرے کہ میرا اختر چھپے۔ یہ شمع روشن رہے اور "بیخودی" روز افزوں ہو.... تمہارا ——— حامد"

اس کے جواب میں صرف اسقدر گذارش ہے کہ ہمارے

حاجی صاحب کو اگر اپنی "تسبیح ہزار دانہ" سے کبھی کبھی فرصت مل جایا کرے تو ان دور افتادہ گناہگاروں کو بھی یاد فرمالیا کریں ؏ کہ مستحق کرامت گناہگارانند!

"غزال صحرائے ادب" عزیزی عمر فاروق ایم اے سابق مدیر "غزال" (حال باشندہ میانوالی) اپنے ایک شوخ مکتوب میں لکھتے ہیں :-

"وہ چودھویں سالگرہ" پر جو نظم آپ نے کہی ہے۔ آپکے شاہکاروں میں سے ہے۔ مجھے کسقدر مسرت ہے کہ "رومان" کے اجراسے آپکی "خوابیدہ" رومانیت اور شعریت ان ابدی موتیوں کی صورت میں بیدار ہونے لگی!..... اور ہاں یہ شگفتہ خانم کا کیا گل کھلایا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کو ان کا نام پتہ معلوم ہے..... کبھی کبھی خط تو لکھ دیا کیجئے ؏ کہ ہم ان ریگزاروں میں بھی اکثر یاد کرتے ہیں!"

نظم کی داد اور اپنی یاد کے سلسلے میں تو ہم کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ البتہ جس حد تک محترمہ شگوفہ خانم کا تعلق ہے عرض ہے کہ ؎

ہم نے کیں کوششیں بہت لیکن
اُن کے "ناتے" کا کچھ پتا نہ ملا!

ممکن ہو تو "میانوالی" کے ریگزاروں میں تلاش کیجئے۔ کیونکہ

؏

ہوا کرتا ہے ناقے کا تعلق ریگزاروں سے!

لوح تربت حشر

از:- شیخ عبداللطیف صاحب تپش ایم اے ایمرسن گورنمنٹ کالج ملتان

ہوئی ختم تمثیل ہستئ فانی　　گرا پردۂ مرگ بے رد و کد اب

تپش کس قیامت کا بدلا ہی منظر　　تماشہ گہ حشر ہی یہ لحد اب

سنہ ۱۳۵۴ھ

نیرنگ جذبات

از:- جناب میر غلام بھیک صاحب نیرنگ انبالوی بی اے ایل ایل بی

اک ہجومِ غم و کلفت ہے خدا خیر کرے
جان پر نت نئی آفت ہے خدا خیر کرے

جائے ماندن ہمیں حاصل ہے نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت سی مصیبت ہے خدا خیر کرے

بُتِ بے پیر کہ ہے دشمن جان و ایماں
مائلِ مہر و محبت ہے خدا خیر کرے

آچلا اس بُتِ عیار کی باتوں کا یقیں
سادگی اپنی قیامت ہے خدا خیر کرے

دل گیا، جانے دو کافر کی ہے ایماں پہ نظر
آنکھ میں اپنی مروت ہے خدا خیر کرے

ابھی تشخیص مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جان ادھر درپئے رخصت ہے، خدا خیر کرے

رہنماؤں کو نہیں خود بھی پتہ رستے کا
راہرو پیکرِ حیرت ہے خدا خیر کرے

حافظ کے مزار پر!

دبیر اعظم بہرامی کا خطاب
ایرانی ادیبوں کی موجودگی میں

مترجمہ:- اختر شیرانی

"تیرا وطن! تیری خاک پاک، مدت ہوئی کہ عربوں اور ترکوں کی قید سے آزادی حاصل کر چکی... اب بنی اُمیہ اور بنی عباس کے اونٹ چرانے والے تیری مملکت کے اطراف میں قدم فرسائی نہیں کرتے۔ اب جنگی پیشہ مغل، تیری نشاط خیز سرزمین کو پامال کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔"

کہتے ہیں کہ یہ تیرا مقبرہ ہے، جس کے سامنے ہم کھڑے ہیں! اور چھ سو سال سے تو یہاں خواب گاہ آرمیدہ ہے ـــــ! میں اسے تسلیم نہیں کرتا، میں اسے نہیں مانتا!

اگر تو اس جگہ خواب ابدی میں محو ہے تو یہ کیسا بانگ جاویدی، جو ایرانیت کے اُفق سے، بشریت کے افتخار کیساتھ، روز بروز روشن تر اور دلپذیر تر انداز میں نغمہ سرائی کر رہی ہے، کہاں سے آئی؟

اُٹھ! کہ چھ سو سال کی راحت و استراحت تیرے لئے کافی ہے!..... ہمیں یقین ہے کہ تو نیند میں نہیں بلکہ جاگ رہا ہے! تو بیدار ابد ہے، تو ہر ایک صاحب نظر کے دل، اور ہر ذی بصیرت کی آنکھوں میں زندہ و پائندہ ہے!

..... ارباب دل اور اصحاب معرفت کی بیداری، تیری ہی بیداری کا نتیجہ ہے ـــــ اگر تو بیدار نہ ہوتا تو عشق و روحانیت کی دنیا، کبھی کی، ابدی خواب میں کھوگئی ہوتی اگر تو گہری نیند سو رہا ہے۔ تو یہ بلبل گویا کون ہے، جو تیرے غیر فانی دیوان کو اپنی حسین منقار میں لئے، عرش کے کنگروں کی بلندیوں سے، عالم خاک کے کانوں تک اپنی صدائے شیریں پہنچا رہی ہے؟ کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ تو نے اس مختصر احاطے کو اپنا دائمی نشیمن بنایا ہے اور یہاں محو خواب ہے! کون ہے جو تیری عظیم الشان منزل گاہ کو اس حقیر خاکدان تک محدود کر سکے، جسے ہم قبر اور مقبرے کے نام سے یاد کرتے ہیں؟ حقیقتاً یہ ہمارے خیال کی کمزوری ہے، غلطی ہے! تو اس سے کہیں بلند ہے کہ روئے زمین پر تیرا مقبرہ ہوتا! تو اس زمین سے زیادہ بسیط ہے!.....

تو عالم خاک سے وجود پذیر ہی کب ہوا تھا کہ ہم تیرے زیر زمین مسکن کے قائل ہو سکیں؟!

تو وہ "شہباز"[1] ہمایوں فال ہے کہ "گلشن قدس"[1] اور "روضۂ رضوان"[1] تیری آرامگاہ ہو! تجھے اس "دیر خراب آباد"[2] میں صرف اس لئے بھیجا گیا تھا۔ کہ انسانوں کو فرشتوں کی صورت میں مجسم کیا جا سکے!

---

[1] خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیت کیطرف اشارہ ہے ؎

طائر گلشن قدسم چہ دہم شرح فراق
کہ دریں دامگہ حادثہ چوں افتادم (ادارہ)

[2] خواجہ علیہ الرحمہ کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے ؎

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود
آدم آورد دریں دیر خراب آبادم (ادارہ)

تو ایک وہم ہے جو حقیقت کو مجسم کرتا ہے! تو ایک حقیقت ہے جو وہم کے تنگنا میں نہیں سماتی! تو ہماری آنکھوں کے حلقے سے بڑا ہے! ہم تجھے اپنے تصورات میں متشکل کرتے ہیں۔ مگر جیسا کہ تو حقیقت میں ہے ویسا نہیں دیکھ سکتے۔

کونسا دل ہے جو تیرے الحان خیریں سے مترنم نہیں؟ اور کونسی زبان ہے جو تجھے سمجھتی ہو اور اپنے حلقۂ دہن میں ساکت و خاموش نہیں ہو جاتی؟ کونسا گھر ہے جو تیرے تذکرے سے گویا نہیں اور دنیا کا کونسا کتب خانہ ہے جو تیرے فرمودات سے مزین نہ ہوا ہو؟ کونسا عشق ہے جو تیرے بیان کی بلندی کے اثر سے رقص نہیں کرتا۔ اور کونسا فلسفہ ہے جو تیری فکری عظمت کی بدولت آسمان و زمین کی روح میں نہیں سما جاتا؟

اٹھ کہ جو لوگ تیری قبر کو اس جگہ خیال کرتے ہیں، غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس لئے کہ وہ تجھے نہیں پہچانتے! اس لئے کہ وہ عالم قدس کی فضا کو نہیں دیکھ سکتے کہ تجھے وہاں پالیں۔

تو لسان الغیب ہے اور لسان غیب، فنا و زوال کے اندیشے سے محفوظ ہے۔

چھ سو سال تک تو زیر خاک آسودہ رہا۔ یہ زمانہ تیرے لئے کافی ہے چھ قرن ——! ۷۲۰۰ مہینے! —— ۲۱۶۰۰ دن! —— ۵۱۸۴۰۰ ساعتیں! ——

اگر تو یہاں دفن ہے اور صرف یہ سنگ لحد تیری پیشانی کو نواز رہا ہے تو یہ ہر روز اور ہر ساعت جو انسانیت کی عمر پر گزر رہی ہے۔ تجھے زندہ تر کیوں دیکھتی ہے؟ اور اپنے دل کی گہرائیوں میں، تیرے تقمص کو زیادہ موجزن کیوں باقی ہے؟

نہیں! بالکل اشتباہ نہیں کیا جا سکتا! تو زندہ جاوید ہے! تو مظہر ابدیت ہے! تو ہی ہے جو ارباب معرفت کی روح میں، ابدیت کو حقیقت کی شکل میں جلوہ گر کرتا ہے! ..... حکمت و معرفت کے دریچے تیری فکر کے روزنوں سے مزین ہیں۔ تیری ہی فکر تھی جس نے فلسفے کی دنیا میں وحدت وجود کو مسجل کر دیا تھا۔

آج بھی جبکہ چھ سو سال کے بعد، بشریت کے دبستانوں میں فلسفۂ اشراق و روحانیت کے صفحات الٹے جا رہے ہیں، تیرے بیانات سے مافوق کوئی نئی بات نظر نہیں آتی۔ تیرے دبستان اور مدرسۂ مقدس اسلام و اسلامیت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھایا جاتا۔

اٹھ کہ ہنوز بشریت کے افکار کی گہرائی بدستور نارسا ہے! اور وہ تجھ سے زیادہ موزوں کلام یا تجھ سے زیادہ دلپذیر نغمہ نہیں سنا سکتی! نہیں پیدا کر سکتی!

متمدن فرانس نے والٹر کے ادبی دور کو "عہد والٹر" کے نام سے موسوم کیا۔ بلاشبہ یہ قدرشناسی درخور تمجید تھی —— لیکن تیرے ہموطن تیرے لئے کسی مخصوص و محدود عہد و عصر کے قائل نہیں ہو سکتے! قرون حکمت و فلسفہ، تیرا قرن ہیں! قرون ادبیات و شاعری تیرا عصر ہیں! اعصار قرون انتہائی زحمت و مشقت سے افراد و رجال کی پرورش کرتے اور ان کو جامع بشریت میں متعارف کرتے ہیں! لیکن تو —— تو وہ ہے جس نے خود قرون و اعصار کی پرورش کی اور ان کو ارباب دل کی زندگی کے لائق قرار دیا! ——

جب تک عشق و روح کی رنگین دنیا آباد ہے! جب تک

کائنات کی بنیاد جذبۂ وجاذبیت پر قایم ہوتی رہے گی! تو مغز عشق وروح جاذبیت میں استوار وبرقرار رہے گا! اگر ایران کی کہن سال تاریخ تجھ سے دو اور فرو/جامع ایرانیت اور جامع بشریت میں روشناس نہ کرچکی ہوتی تو اپنے تین ہزار چھ سو سال کے روشن دور میں تجھ سے زیادہ عظیم الشان شاعر اور تجھ سے زیادہ بدیع ابداع یادگار نہ چھوڑتی ——! افسوس ہے کہ فارسی لغت تیرے افکار کے اظہار کے لئے کافی نہ تھے! ورنہ ممکن تھا کہ تیرے بیانات کا جداگانہ مفہوموں کے ساتھ استقصا کیا جاتا۔

تمام فارسی لغات کے سلسلے تیری نظر میں تھے! اور تو اپنے مقصد کی گلچینی کے سلسلے میں ہر ایک کو اپنے اپنے موقع پر استعمال کیا کرتا تھا۔ یہانتک کہ لغات کے استعمال اور الفاظ وکلمات کو چسپاں کرنے میں تیری مہارت بے مثال ہوگئی! ورحالیکہ تیری فکر وروح اس سے کہیں زیادہ عظیم وبلند تھی کہ لغات وکلمات کے محدود دائرے میں سماتی اور تیرے مقصود کو تیری عظمتِ فکر کے مطابق سمجھاتی سمجھا سکتی!

اُٹھ! اے وہ ہستی کہ فردوسی وسعدی کے بعد، فارسی زبان کا تجھ پر خاتمہ ہوگیا! لطافت بیان کا کمال وہ تھا جسے تو نے غزل کی فضا میں رونما کیا۔ اور پارسی کو "قندِ پارسی" بنادیا۔ تیرے کلام سے مافوق کوئی کلام ایران نے نہیں پیدا کیا اور شاید تیرے بیان سے زیادہ شیریں بیان بھی کبھی پیدا نہ کرسکے گا۔

اعجاز کلام کی حد، اور سحر بیان کی انتہا، اگر کوئی ہوسکتی تھی تو اسے تو نے ختم کردیا اور اُس کے نقوش کو ابدالآباد تک کے لئے ایران کے آسمان پر منعکس کردیا —— ! جب تک تم تینوں افراد باقی وبرقرار ہو اور جبتک تمہاری تینوں مقدس کتابیں جامعۂ بشریت کی دسترس میں ہیں، زمانے کے خوفناک سیلاب، ایران کے نام کو انسانیت وتمدن کی تاریخ سے نہیں مٹا سکتے۔

تمہاری کتابیں وہ باعظمت شعائر ہیں، جنہیں ابدیت کے ہاتھ نے ایران جاوید کے سینے پر نصب کردیا ہے! تم تینوں کی بدولت ایرانیت کا شرف، تمام دنیا کی ادبیت پر مفاخرت کا دعویٰ کررہا ہے ——! دنیا آجتک تم تینوں سے بڑھ کر کوئی عظیم ودلیعت اپنی یادگار نہیں پیش کرسکی۔ آسمان چاہتا تھا کہ معجزات نظمی سے بہرہ ور ہو، پردہ اُٹھایا اور تم تینوں کو نمایاں کردیا!!

شاید مجھے بھی شبہ ہے! کیا واقعی یہ تیرا مقبرہ ہے اور آیا حافظ! یہ تو ہی ہے جس نے اپنے آپ کو قبر کی تنگنا میں مستور کر رکھا ہے اور مطرودین کے تجاوزات سے پنہاں کرلیا ہے؟؟

اُٹھ! اس خلوت خاک سے باہر نکل! کہ تیرا وطن! تیری خاک پاک، مدت ہوئی عربوں اور ترکوں کی قید سے آزادی حاصل کرچکی اور اپنی آزادی کے علم کو شعائر تمدن کی فضا میں لہراچکی!! اب بنی اُمیہ اور بنی عباس کے اونٹ چلانے والے تیری مملکت کے اطراف میں قدم فرسائی نہیں کرتے! اب رہزنی پیشہ مغل، تیری نشاط خیز سرزمین کو پامال کرنے کی جرأت نہیں رکھتے! اُٹھ کہ اب صرف جعفرآباد اور مصلیٰ کی فضا ہی تیرے لئے عبیر خیز وعنبر آمیز نہیں۔ بلکہ تیرے محبوب وطن کے شمال وجنوب اور مشرق ومغرب سب کے

سب عبیر خیز و عنبر آمیز ہیں!! کیونکہ تیرے وطن کی شگفتہ فضا میں صرف ایک علم لہرا رہا ہے! تیرے لئے صرف ایک قومیت متشکل ہو رہی ہے! تشتت و تفرقہ کا دور ختم ہو گیا! اب اہرمن کی بجائے صرف سروش ہے جو تیری مقدس وطن اور محبوب مسکن میں حکم فرمائی و سلطنت میں مشغول ہے! یہ وہی ہاتھ ہے جو تیرہ قرن کے بعد ایرانیت کی آستین سے باہر نکلا ہے۔ اور تیرہ قرن کی شکست و ریخت کو درست کر کے ایران کے مقدس دربار کو ساسان و ہخامنش کے سلسلے سے ملا رہا ہے!! تیرہ قرن کچھ کم زمانہ نہیں ہوتا!

ہاں تیرہ قرن گزرے تھے کہ ایران کی سلطنت ایرانی ہاتھوں سے باہر نکل چکی تھی! تیرہ قرن گزرے تھے کہ ایرانیت کا شرف، بیگانہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے پائمال ہو رہا تھا! آل بویہ کے سوا جنہوں نے بحر خزر کے ساحلوں پر چند روز تک اپنے پرانے دعوے کو تازہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے، ایرانی دربار، ایرانیت کے افتخار کے زوال پر سیاہ پوش ہو چکا تھا! تیرہ قرن گزرنے کے بعد، آج پھر مشرق زمین کی امتِ عظیم، ایرانیت کے فراموش شدہ شعائر کو تاریخ ایران کے صحیفے میں درج کر کے، بیسویں قرن کے تمدن کی آواز کو آلِ ساسان کے کانوں تک پہنچا رہی ہے——!! خدائے لم یزل کی مرضی نہ تھی کہ ایران فنا ہو! کھنڈروں پر کھنڈروں کا اضافہ ہوتا گیا۔ مگر کام نہ چلا! قتل عام ہوا لیکن بات نہ بنی! اس کے باشندوں کے تلویں حلقوم سے خون کے سیلاب بہائے گئے۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا! بالآخر اس کے کھنڈروں کی گہرائیوں اور خون کی نہروں کی پہنائیوں سے ایرانیت کی عظمت انگیز صدا بلند ہوئی اور گوشِ اہلِ ہوش تک جا پہنچی۔

وہ تنہا سرسبز اور بہار پرور خطہ جو تیرہ قرن تک برابر بیگانوں کے ہجوم و یلغار سے محفوظ رہا تھا۔ مازندران کی صورت میں آخری دن کے لئے، انتقام کے دن کے لئے آمادہ تھا! اسی دن کے لئے مقدر تھا کہ ایران کا انتقامی ہاتھ، ایرانیت کی آستین سے باہر نکلے اور نامحرم کی گردن میں پیوست ہو جائے! یہ ہاتھ انتقام کا ہاتھ تھا! نہیں یہ انتقام کا ہاتھ نہیں تھا! بلکہ ایرانی شرف کا ہاتھ تھا! ایرانیت کی عظمت کا ہاتھ تھا! ایرانی تاریخ کے تکبر کا ہاتھ تھا! ایرانی عصبیت و عرق کا ہاتھ تھا! خدائی تحریر اور نوشتۂ تقدیر کا ہاتھ تھا!!——

مگر کیا ممکن ہے کہ اسکندر مقدونی کی صدائے جہاں آشوبی کو، جو آجتک قصر دارا کے شکستہ و ریختہ ستونوں کی بلندیوں پر لہرا رہی ہے، فراموش کر دیا جائے؟ کیا ممکن ہے کہ جمشید کے ویران اور خراب آباد ایوانوں کو، جو ابھی تک عربوں کی شکست و ریخت کے ہاتھوں سے لرز رہے ہیں، دل سے بھلا دیا جائے؟

زمانے کی آنکھیں آجتک تختِ جمشید کی بکھری ہوئی اینٹوں، مٹی ہوئی صورتوں، گری ہوئی دیواروں اور ٹوٹے ہوئے ستونوں پر آنسو گرا رہی ہیں! خون رو رہی ہیں!!

وہ بارگاہ اعظم، جو اپنی عظمت و رفعت سے پایانِ عرشِ خدا کو بوسہ دیتی تھی اور تمدن تاریخ کے گہوارے کو متشکل کرتی تھی!—— کیا ممکن ہے کہ ایرانیت کی خاطر،

خون کے طوفانوں کے درمیان نیشاپور کی جدو جہد اور سر فروشی کو فراموش کر دیا جائے؟ کیا ممکن ہے کہ دارآسائے اعظم کی خوابگاہ پر مغول و افاغنہ کی تاخت و تاراج کے ہنگاموں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے پامال ہونے والوں کی فریادوں کو ایرانیت کی لوح سے دھویا جاسکے؟

قومیت کے شرف، ملیت کے غرور، ایرانیت کی عزت اور انسانیت کی تاریخ کی قدامت نے تیرہ قرنوں کے دوران میں جبل ایران کو آراستہ کیا اور بپایان کار اُس کے باشندے اُس راستے پر گامزن ہوئے جس کی طرف ایران کے خدا، اور شرافت کی تاریخ نے رہنمائی کی —— اور آج یہ اُن تیرہ قرنوں کے کھنڈروں کی بلندی ہے جس پر سے تجھے خطاب کیا جا رہا ہے!!

.... حافظ! اے ملکوتی شاعر! اے پیغام اہل راز! اے طائر گلشن قدس! اے ہمائے اوج سعادت! اُٹھ!! اور اس فرسودہ غمکدے سے باہر نکل!! کہ اب تیرے لئے کوئی خطرہ نہیں! اب ایرانیت، فلسفۂ ایرانیت، اسلامیت اور وحدت وجود کو مورد شماتت نہیں قرار دیا جا سکتا! ؎

این ہمہ عکس مے و نقش مخالف کہ نمود
یک فروغ رخ ساقی است کہ در جام افتاد!
جلوہ کرد کہ ببیند بجہاں صورت خویش
عکسے از پرتو آں بر رخ افہام افتاد!

سنتا ہوں کہ ایک مجہول المغز اور پست فطرت ہستی نے تیرے مقبرے کو منہدم کرنا چاہا تھا۔ مگر اُسے اپنے آلودہ ہاتھ، زمانے کی قضاو قضاوتوں کے حوالے کرنے پڑے! یاد رکھے کہ یہ ہاتھ ایرانی ہاتھ نہ تھا! بیگانہ کا ہاتھ تھا! وہ بدنصیب تجھے زمین کی گہرائی میں تلاش کر رہا تھا۔ درحالیکہ تو اس وقت ستاروں کی پیشانی چوم رہا تھا!..... زمانہ جوہر ایک قوم کا کہن سال شاہد ہے! آفتاب اور ستارے جن کو اولادِ آدم کے وقائع کے سوا کوئی دوسری فرہنگ یاد نہیں! اس حماقت کے داغ کو اپنے صحیفہ ہائے دانش سے ہرگز فراموش نہیں کریں گے —— ! آ! اس ظلمتکدۂ غم سے باہر آ! اور سب کو اپنی صورت دیکھنے دے!...

تیری غزلیات کے جو استعارات ان کی روح میں رچے اور بسے ہوئے ہیں، ان کو خود اپنی زبان سے سننے دے! تو جو اپنے مشتاقوں کے پیکر میں روح کی طرح جاگزیں ہے! آخر بات کیوں نہیں کرتا؟ خاموش کیوں ہے؟

افسوس ہے کہ معلومات و اطلاعات سے بیگانہ مورخین نے تیری زندگی کے حالات سے غفلت برتی! وہ "خلوت گہ اُنس" جو تیری روح کی تجلیات کو گنبدِ عرش تک پرواز بخشتی تھی، ہماری نظروں سے ناپدید رہی! یہانتک کہ تیری باصرہ فروز تصویر کھینچنے سے بھی غفلت کی گئی! تیرے مشتاقوں کو کتنی آرزو تھی کہ تیری بلند پیشانی اور گہری فکر کا اسیطرح اندازہ کریں جس طرح کہ تیرے آب و گل نے ان کو گوندھا تھا! وہ چاہتے تھے کہ اپنے کمال مطلوب کو بشریت کے لباس میں دیکھیں!

اے ملکوتی عفتوں کے حریم میں بسنے والے! آج کون ہے جو نہیں چاہتا کہ تو روح کی طرح اُس کے آغوش میں سما جائے؟ کون ہے جو دل سے نہیں چاہتا کہ تیرے قدموں پر سر رکھدے؟ تیری صدا! ایک نغمۂ جاں نواز اور ایک لحن پر سوز و ساز ہے! جو عشق

شبانگاہی کے بربط پر، ستاروں کی چھاؤں میں گایا جاتا ہے!! تیری تمثال حسین، ایک شعاع روشن و پاک ہے جو ستاروں کے مطلع سے ظاہر ہوتی ہے!! تو صبح کا چاک گریباں ہے! تیری حسین صبح کے طلوع میں افق مغرب کی رنگینیاں! تیرے دن کے غروب میں بدائع ادبیات اور حکمت و فلسفہ کے ذخیرے!!

زمانہ جسقدر پارینہ اور کہن سال ہوتا جاتا ہے، تجھے تازہ تر اور جوان تر پاتا ہے! تیری روح ایک متضاد شعلہ ہے جو ایک طرف تیرے عشق کے دل کو گداز کرتا ہے اور دوسری طرف حکمت کے سینے کو محکم و استوار!! تیرا عشق ایک سمندر ہے جو ایک طرف آسمان کی لطافت سے التہاب حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف آسمان کے چہرے کو التہاب بخشتا ہے......!

تیری رفعتوں میں گم ہوکر میں بھول جاتا ہوں کہ راہ نجات کے سالک اور خط حقیقت کے طالب کی شکل میں میں ہی تیرے آستانے پر کھڑا ہوں۔ یا یہ کوئی اور شخصیت ہے؟...... اے شاعر آسمانی! اے ادب و حکمت کے نابغۂ فنا ناپذیر! اٹھارہ سال ہوئے کہ تیری مقدس کتاب اور تیرے آسمانی الفاظ میری راتوں کے سرہانے سے دور نہیں ہوئے!! اٹھارہ سال سے میری رگیں تیرے جذبات و افکار سے مالا مال ہیں۔

افسوس کہ میں تیرے دربار میں نہایت حقیر نذر لے کر آیا ہوں وہ بھی اس حالت میں کہ مجھے ذاتی طور پر مطلقاً علم نہیں! جو کچھ میرے پاس ہے وہ تیرا اور تیری ہی کتاب کے اٹھارہ سالہ مطالعہ کا اثر ہے ——!

تو نے اپنا اصل مقام "گوشۂ خرابات" کو قرار دیا تھا! تیری اس پیش بینی اور پیش گوئی نے خیال سے گزر کر عمل کی صورت اختیار کر لی۔ گو میرے نزدیک تیری عظمت کے شایان نہیں۔ تاہم تیری قیامگاہ باغ و گلستاں میں تبدیل ہوگئی ہے! تیری آرامگاہ نے اپنی حقیقی بلندی حاصل کر لی اور عنقریب اختتام کی منزل سے دوچار ہونے والی ہے! تیرے شیراز نے اپنی کہنگی کا جامہ اتار پھینکا اور ایک نیا شیراز، جو ہر لحاظ سے تیرا وطن بننے کے قابل ہے، تیرے قدموں میں مسکرا رہا ہے!

اب میں جرأت کے ساتھ ایران کے ادیبوں کی موجودگی میں تیری مقدس بارگاہ کی بلندی و ارتفاع کا اندازہ کرنا چاہتا ہوں! میری درماندہ فکر کے لئے اس ارتفاع کی عظمت کا اندازہ بے حد دشوار ہے۔ لیکن اگر تو خود مشتاق دلوں کی رہنمائی کے لئے قدم بڑھائے تو شاید یہ مشکل آسان ہو جائے!

اب میں اپنے بیان کو تیری ایک غزل پر ختم کرتا ہوں کہ شاید اس کے اثر سے میرے بیان کو بھی دوام نصیب ہو جائے! اور آخر میں خدائے متعال سے مدد کی دعا کرتا ہوں ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست!
سرم بدنیا و عقبیٰ فرو نمی آید!
تبارک اللہ ازیں فتنہ ہا کہ در سر ماست!
دلم ز پردہ برون شد کجائی اے مطرب؟
بنال ہاں کہ ازیں پردہ کار ما بنواست!

درون من خستہ دل ندانم کیست ؟ کہ من خموشم و او در فغان و در غوغاست!
مرا بکار جہاں ہرگز التفات نبود رخ تو در نظر من چنیں خوشش آراست !
ازانکہ صومعہ آلودہ شد بخون دلم گرم بباده بشوئید حق بدست شماست!
نخفتہ ام بخیالے کہ می پزم شبہا خمار صد شبہ دارم شرابخانہ کجاست؟
ازاں بدیر مغانم عزیز می دارند ! کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دل ماست
چہ ساز بود کہ بنواخت مطرب عشاق کہ رفت عمر و دماغم ہنوز پر زصداست

ندائے عشق تو دوشم در اندروں دادند
فضائے سینۂ حافظ ہنوز پر زصداست!

"سرگوشیاں!"

کیا تم بھی اپنی دعاؤں کا فریب دے کر خود کو اپنا قاتل بنانا چاہتے ہو؟ کل شام تم اپنی تمام دلفریبیوں کے ہمراہ شاید یوں شکار کرنے ہی آئے تھے۔ اس میں ناکامی کا خیال کرکے اب ایک نئے حربہ سے میرے محبت آفریں تخیل پر چھاپا مار رہے ہو—— "میں تم سے محبت کرتا ہوں، بلند ترین معنیٰ میں!"

اے کاش! مجھے ایسی راتیں نصیب ہو جائیں کہ کوئی شمع محفل بنکر نا امیدی کی ظلمتوں کو روشن رکھے۔ کوئی تمہیں اور ونکی نظمیں سناتا ہے۔ میں تمہیں اپنے گیت سناؤں، روح کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے نغمے! کوئی پوچھے گیت کی باتیں سنانیکی ہوتیں تو لکھی ہی کیوں جاتیں۔

اسلام کا جواب دیدینا—— رسماً و رواجاً بھی ہاتھ اُٹھا دیتے ہیں۔ پھر کس طرح یہ سمجھ لوں کہ تم محبت کا جواب محبت سے دے رہے ہو۔ ان رسموں کی تنگ دنیا سے باہر آؤ تو یہ باور کر دوں کہ کوئی اظہار التفات کر رہا ہے۔ کوئی نئی رسم نکالو، محبت کی حسین و رنگین رسم—— یا صرف فریبِ التفات

جب کانوں میں آواز آتی تھی کہ تم آج وہاں گئے تھے کل وہاں جاؤ گے تو میں آرزو کرتی تھی کہ کاش وہ یہاں بھی آیا کریں اور اب جب تم گاہے گاہے آجاتے ہو تو میں چاہتی ہوں کہ تم گھنٹوں بیٹھے رہا کرو لیکن یوں خاموش نہیں بلکہ اس طرح کہ تمہارے خیالات رواں ہوں اور ہونٹ لرزاں!

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

تبرّکاتِ خیال

(آل انڈیا مشاعرہ کی غزل کا انتخاب)

از مولانا سید عبدالسّلام خیال ایم اے (علیگ)

کیا منتہائے شوق یہی ہے کہ پھنس رہیں   قید تعینات فراق و وصال میں

ہم چاہتے ہیں جام مئے ذائقہ شکن   تلخی فراق کی ہے شراب وصال میں

سوچو کہ کیوں رکھا ہے یہ قدموں پہ سر مرا   سمجھو کہ ہچکچاتا ہوں کیوں عرض حال میں

اے خانماں خراب کہاں جا کے لی پناہ   بجلی کے ڈر سے تنکے جمائے ہیں جال میں

بندہ کے اختیار میں اتنا بھی تو نہیں   بے اختیار ہو کے رہے ایک حال میں

آخر وہ کیا کریں جسے مرنے بھی تم نہ دو   مایوس ادھر ہوا ادھر آئے خیال میں

وہ شوخ جانتا ہے کہ ہوں سر بسر خیال
آتا ہے دل میں اور نہیں آتا خیال میں

خیال

آغا حشر بحیثیت ڈراما نویس کے

از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج۔ بی اے

(۲)

آغا صاحب کے بنائے ہوئے گانوں کی طرزیں تھیٹر کی دنیا میں کچھ کم شہرت نہیں رکھتیں۔ ایک ایک کھیل کے گانے اپنے زمانے میں اسقدر مقبول ہوئے۔ کہ زباں زد خاص و عام ہو گئے۔ اور اُن کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اُن میں سے بیشتر کے ریکارڈ بھرے جا چکے ہیں۔ وہ گانوں کی طرزیں ڈراما کے مواقع کے اعتبار سے سوچتے اور بناتے تھے۔ اور انہیں حسن و خوبی سے مناسب جگہ پر نہایت بے تکلفی سے داخل کر دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان کی تیز حرکت کے بعض گانے خواہ علم موسیقی کی گہری فہم رکھنے والوں کو پسند نہ آئیں۔ لیکن جو شخص ان کے ڈراما کے اثرات کو سٹیج پر دیکھ رہا ہو۔ وہ انہیں اپنی جگہ پر موزوں کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علاوہ اس کے ان کے گانوں کے بول بہت خوبصورت اور دلاویز ہیں۔ اور طرز میں پورے لطف کیساتھ ادا کئے جا سکتے ہیں۔ سفید خون کا مندرجہ ذیل گانا جو آغا صاحب نے ڈراما نویسی کے بہت ہی ابتدائی زمانہ میں لکھا تھا۔ طرز کی خوبی۔ موضوع کے اثر اور الفاظ کی تاثیر کی وجہ سے بیحد قابل قدر ہے:-

دنیا ایک مسافر خانہ ہے پیارے۔ نہ من اٹکانا۔
سانجھ سمجھ کر آ ٹھیرے ہیں۔ بھور کو ہی جانا۔ دنیا ایک مسافر خانہ۔
چُن چُن اپنی محل بنایا لوگ کہیں گھر میرا
نہ گھر میرا نہ گھر تیرا چڑیاں رین بسیرا
دل نہ لگانا مت للچانا ہر کا گن گانا۔ دنیا ایک مسافر خانہ۔

آغا حشر کے تازہ ترین ڈراموں میں سے تین یعنی سنسار چکر، ترکی حور اور آنکھ کا نشہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے ایک بالکل جدا دور کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے جس قدر ڈرامے لکھے گئے۔ ان کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہندوستانی تماشائیوں کا ایک ماہر نبض شناس زیادہ تر اُن کے ذوق سماعت کا لحاظ رکھ کر ان کی لطف اندوزی کے لئے ایک دلچسپ چیز پیش کر رہا ہے۔ لیکن ان آخری ڈراموں میں مندرجہ بالا خصوصیت کے علاوہ حقائق حیات کی پردہ کشائی کی کوشش بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ افسوس ابھی تک یہ ڈرامے کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے۔ لیکن آغا حشر کی ڈراما نویسی پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے لئے ان کو ایک مرتبہ اسٹیج پر دیکھ لینا بہت کافی ہے۔

سنسار چکر اردو میں پہلا استفہامی کھیل ہے۔ استفہامی کھیل چونکہ اردو میں ایک نئی اصطلاح ہے۔ اس لئے یہاں

اس کا مطلب اگر کسیقدر تفصیل سے بیان کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ان دنوں یورپ میں ٹریجیڈی کا ایک جدید نمونہ استفہامی کھیل یا مجلسی ڈراما کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چونکہ ڈراما کی یہ نوع ٹریجیڈی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے اس کی لازمی خصوصیات کو سمجھنے سے پیشتر اس امر کی ضرورت ہے کہ مختصر طور پر ٹریجیڈی کی حقیقت عرض کر دی جائے۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ کشمکش ڈراموں کا لازمی عنصر ہے۔ ابتک دنیا میں جتنے بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ اُن کا موضوع یہی رہا ہے کہ انسان کے عزائم کے درمیان ایک کشمکش کو پیش کریں۔ ٹریجیڈی میں عزم انسانی ایسی طاقتوں سے دست و گریبان پیش کیا جاتا ہے۔ جو اُس سے زیادہ قوی اور ناقابل تسخیر ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ ناکام رہتا ہے۔ ڈرامے کے ہیرو کی بے بسی دیکھنے والے کے دل میں رحم۔ اور مقابل طاقتوں کی یقینی کامیابی کی اُمید دیکھنے والے کے دل میں خوف پیدا کرتی ہے۔

ٹریجیڈی کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے جتنے ڈرامانویسوں نے قابل قدر ٹریجیڈیاں لکھی ہیں۔ اُن سب کے پیش نظر تین نمونے گویا تین قسم کی کشمکشیں تھیں۔ دوسرے الفاظ میں انسانی تخیل ابتک کشمکش کی صرف تین ایسی قسمیں سوچ سکا ہے جن کا انجام مایوسی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ان تینوں کشمکشوں میں مابہ الامتیاز وہ قوت ہے جس سے ٹکرانے کا انجام انسان کے لئے تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ ٹریجیڈی کی ان تین قسموں میں سے پہلی قسم کو قدیم یونان کے ڈرامانویس ایسکیلیز نے پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور یونان قدیم ہی کے ایک دوسرے ڈرامانویس سوفاکلیز نے اسے معراج کمال پر پہنچا دیا۔ دوسری قسم کو انگلستان کے ڈرامانویس کرسٹوفر مارلو نے پہلی مرتبہ اپنے ڈراموں میں پیش کیا اور آخر شہرۂ آفاق شکسپیئر نے اوج کمال کو پہنچایا۔ تیسری قسم کے آغاز کا سہرا فرانس کے ڈرامانویس وکٹر ہوگیو کے سر ہے اور شباب تک پہنچانے کا فخر ناروے کے ڈرامانویس ابسن کو حاصل ہے۔

ٹریجیڈی کی پہلی قسم جو یونان قدیم کے ڈراموں میں نظر آتی انسان کو تقدیر کے ساتھ اُلجھا ہوا پیش کرتی ہے۔ ان کے نزدیک تقدیر ایک پُر اسرار اور ہمہ گیر قوت تھی۔ دیوتا اس کے کارندے تھے۔ وہ دیوتاؤں کی دیوتا تھی تقدیر کی مداخلت کو استعارتاً یوں بیان کیا جا سکتا ہے گویا غافلوں کو پھنسانے کے لئے وہ اپنا پوشیدہ جال بچھائے تاک میں بیٹھی رہتی ہے۔ ڈراما کا ہیرو جہاں کہیں غرور، نافرمانی یا کوئی دوسری کمزوری ظاہر کرتا ہے۔ تقدیر اشارہ کرتی ہے اور پلک جھپکتے میں جال اُسے گرفتار کر لیتا ہے۔ وہ اس جال سے چھوٹنے کے لئے بیحد جدوجہد کرتا ہے۔ مگر اُس کی ان مساعی کا کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ وہ عظیم ترین قانون کی نافرمانی کر چکا ہے۔ لہذا اسے اپنے قصور کی سزا بھی بھگتنی ہے۔ اور یہ سزا کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی۔

اس فوق الانسان پہلو کی وجہ سے یونانیوں کے ڈراما پر مذہبی ڈراما کا رنگ غالب تھا اور اُسے دیکھ کر تماشائیوں کے دل میں خوف و دہشت کا خاص اثر ہوتا تھا۔

ٹریجیڈی کا دوسرا اعلیٰ نمونہ ملکہ الزبتھ کے زمانے کے قابلِ قدر ڈراموں میں نظر آتا ہے۔ ان ڈراموں میں بھی ہیرو کی تقدیر میں ناکامی اور تباہی لکھی ہے لیکن اس کا باعث تقدیر کی ہمہ گیر قوت نہیں۔ بلکہ ہیرو کی اپنی فطرت ہے۔ قدرت نے خود اُس میں چند ایسی خصوصیات رکھدی ہیں۔ کہ صرف اُن کی موجودگی اس کی بربادی کا باعث بن جاتی ہے۔ گویا یونانی ڈراما کے مفہوم نے یہاں انسانی اور ذہنی صورت اختیار کر لی ہے۔ کرسٹوفر مارلو دنیا کا پہلا ڈراما نویس تھا جس نے مقسوم یعنی خدا اُن کے خدا کے لئے ٹریجیڈی کے ہیرو کی روح میں مندرج بنا دیا۔

مارلو نے اس جدید نمونے کو اپنے ڈراموں میں پیش تو کیا لیکن اُس کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈال کر اُسے زیادہ ترقی نہ دے سکا۔ اُس نے اس کے صرف ایک پہلو کو دیکھا اور اُسی میں کمال پیدا کیا۔ اُس کی ٹریجیڈیوں کے جتنے ہیرو ہیں اُن میں کسی قسم کی فضیلت و برتری حاصل کرنے کی خواہش اتنی عظیم و شدید ہوتی ہے کہ اُس کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اُس نے ایک ڈراما تیمور لنگ لکھا اُس میں تیمور کی بربادی کا صرف یہ باعث ہے کہ اسکا تسخیرِ عالم کا شوق دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ دوسرا ڈراما ڈاکٹر فاؤسٹس ہے۔ ڈاکٹر فاؤسٹس کو علم حاصل کرنے کے شوق نے دنیا و مافیہا سے غافل کر رکھا ہے۔ اور یہی شوق آخر اُسے فنا کر ڈالتا ہے۔ غرض مارلو کی ٹریجیڈیوں کے ہیرو صرف کسی قسم کی فضیلت و برتری حاصل کرنے کے دیوانے تمنائی ہوتے ہیں۔ لیکن شکسپیئر کا تخیل بہت وسیع اور متلون ہے۔ اُس نے ٹریجیڈی کے اسی نمونے کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے ڈراموں میں اس کے کئی دوسرے پہلوؤں کو پیش کیا۔ میں مضمون کے پہلے حصے میں بتا چکا ہوں کہ میکبتھ کی تباہی کا باعث اُس کی بے پناہ ہوسِ زر و جاہ ہے۔ ہملٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیحد متامل رہتا ہے۔ اگر اتھیلو انتہا سے زیادہ غیرتمند نہ ہوتا۔ کوریولینس اپنے آپ کو عوام سے بیحد برتر نہ سمجھتا۔ تو انکا انجام کبھی بربادی نہ ہوتا۔ یہ سب کیرکٹر اپنے ہاتھوں آپ تباہ و برباد ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔

ٹریجیڈی کا یہ دوسرا نمونہ پہلے نمونے کی نسبت بہت کم ارفع اور کم مذہبی تھا لیکن چونکہ انسانی عنصر کو اس میں زیادہ دخل تھا لہذا اثر و تاثیر میں پہلے نمونے سے بہت بڑھ چڑھ کر تھا کسی کو تقدیر کے ہاتھوں برباد ہوتا دیکھیں تو اس سے قادرِ مطلق کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن اگر کسی شخص کو اپنے ہی ہاتھوں برباد ہوتے دیکھا جائے۔ تو اُس کا مشاہدہ انسان کے متعلق زیادہ تخمین سے مسرت بخشتا ہے۔ چنانچہ جہاں یونانیوں کی ٹریجیڈی انسان کے تخیل کو آسمان کی طرف اُڑا لیجاتی ہے وہاں زمانۂ الزبتھ کی ٹریجیڈی کہتی ہے کہ جنت اور جہنم خود ہم میں مضمر ہے۔

ٹریجیڈی کا تیسرا نمونہ آجکل کا مجلسی ڈراما ہے۔ اسمیں ایک فردِ خاص اپنے ماحول سے دست و گریبان پیش کیا جاتا ہے۔ یونانی ٹریجیڈی کا ہیرو فوق الانسانی قوتوں سے مبتلائے کشمکش ہے۔ ملکہ الزبتھ کے زمانے کا ہیرو اپنے آپ سے اُلجھ رہا ہے۔ اور آجکل کی ٹریجیڈی کا ہیرو تمام تمدنی و معاشرتی حالات یا دوسرے الفاظ میں

بیکار ہے۔

موجودہ مجلسی ڈرامے میں ایک فرد خاص اور سوسائٹی کے درمیان جنگ ہوتا ہی یہ امر واضح کردیتا ہے کہ وہ فرد خاص رسم ورواج کا پابند نہیں ہے۔ اگر وہ سوسائٹی کا ہمخیال ہوتا تو دونوں کے درمیان کسی قسم کی کشمکش ہونا دشوار تھی۔ چنانچہ جدید نمونے پر ٹریجیڈی لکھنے والوں کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اپنے ہیرو یا ہیروئن کا انتخاب کرتے وقت ایسے افراد کو منتخب کریں جو سوسائٹی کے نزدیک قابل اعتراض ہوں۔

پھر ڈراما کی کشمکش کو زیادہ موثر بنانے کے لئے ڈراما نویس اس امر پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اپنے کیرکٹروں کو ایسی صورت حالات میں پیش کرے۔ کہ تماشائیوں کی ہمدردی اُس کے شامل حال رہے۔ گویا لوگ تماشا دیکھ کر سمجھیں کہ ان مخصوص حالات میں شاید ڈراما کا ہیرو درستی پر تھا اور سوسائٹی غلطی پر۔ اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے ایسے باغیوں کو ڈراموں میں پیش کیا جائے جن کی رسم ورواج سے آویزش تماشائیوں کے دل میں ہمدردی کو موجزن کرسکے۔ اس نقطۂ نظر سے کسی ڈاکو یا قاتل کو پیش کرکے اُن کی صریح بدچلنی کی حمایت کرنا بہت دشوار تھا۔ بہ نسبتاً آسان تھا کہ کسی عورت اور مرد کے ایسے تعلقات نمایاں کئے جائیں جن کو سوسائٹی قابل اعتراض قرار دے۔ لیکن جو اپنے جواز کے لئے کسی دلیل کے محتاج نہ ہوں۔ اس میدان میں زور قلم دکھانے کی گنجائش بھی بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ موجودہ زمانے کے اکثر ڈراما نویس صرف جنس[1] (عورت اور مرد کے تعلقات) کے مسائل پر ڈراما لکھنے پر مجبور ہوگئے۔

سنسار چکّر ہندی میں پہلا کھیل ہے جس میں ٹریجیڈی کے اس نمونے کی جھلک نظر آتی ہے۔ ٹریجیڈی کی ہیروئن شاردا ہے جس کے دوشیزہ دل کو شباب کے اوّلیں مراحل میں بسنت کمار نے لامحدود تمناؤں سے بھردیا اور اُس وقت جب دونوں کی محبت شعلہ بن کر بھڑک اُٹھی تھی وہ جدا ہونے پر مجبور کئے گئے۔ شاردا کے باپ نے دولت کے لالچ میں اپنی نوجوان بیٹی کو بوڑھے وکیل واسدیو سے بیاہ دیا۔ واقعات کی رَو بسنت کو اُٹھا کر کہیں کا کہیں لے گئی۔ اور دونوں کے لئے اس پہلے پیار کی یادگار صرف آہیں اور آنسو رہ گئے۔

دس برس کے بعد بسنت اور شاردا کی پھر آپس میں ملاقات ہوئی۔ اس حال میں کہ بسنت ایک بیوی کا شوہر اور ایک نوجوان لڑکی کا باپ تھا۔ اور شاردا بسنت کے دوست بوڑھے واسدیو کی بانجھ بیوی تھی۔ شاردا جلوت میں اپنی بیتابیوں کو بمشکل دبائے رہی لیکن خلوت ہوتے ہی جب اُس نے اپنے زمانۂ دوشیزگی کے دیوتا کی آرزو انگیز آنکھوں سے آنکھیں ملائیں تو صبر کا بند ٹوٹ گیا اور پرانی محبت از سرِ نو ایک دریا کی طرح اُمنڈ آئی۔ موجودہ بے رنگ اور پھیکی زندگی کے مقابلہ میں اپنے پہلے پیار کے مخمور دن یاد آئے تو اس کا کمزور دل تاب مقابلہ نہ لاسکا۔ واسدیو اُس کا پتی سہی یہ درست سہی کہ قانون اور مذہب نے اُسے واسدیو کے حوالے کر دیا تھا لیکن اس سے پیشتر وہ خود اپنی روح سے اپنی تمام نسائیت سے بسنت کو اپنا دل نذر کرچکی تھی۔

۱؎ سیکس۔

وہ پھوٹ بہی اور اپنی محروم و مایوس روح کا کرب بسنت
کو سنانے لگی۔ بسنت کے دل میں بھی اس نامراد محبت
کے زخم بھرے نہ تھے۔ لیکن وہ مرد تھا اور ایک نوجوان
لڑکی کا باپ۔ اس میں اتنی جرأت موجود تھی کہ شاردا
کے روبرو اس محبت کو ناجائز کہہ سکے۔

شاردا اور بسنت کی یہ محبت ہے جس کے گرد
پہلا پیار یا سنسار چکر کے ڈرامے کا پلاٹ کھڑا کیا گیا ہے۔
اور اس محبت کی نوعیت ہی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ
اس کا انجام ٹریجیڈی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان میں لڑکیوں کو اپنے شادی بیاہ کے
معاملوں میں دخل دینے کا کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔ دوسری
جائداد کی طرح وہ بھی ایک بے حس چیز سمجھی جاتی ہیں۔
اور ماں باپ محض اپنی سمجھ اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر انہیں
جس شخص کے حوالے کرنا چاہتے ہیں کر دیتے ہیں۔ پھر لڑکیوں
کو ہوش سنبھالتے ہی اس امر کی تعلیم دی جاتی ہے کہ
جس شخص سے ماں باپ اُن کا آنچل باندھ دیں اُس کو
اپنا دیوتا یا مجازی خدا سمجھیں۔ چنانچہ لڑکیاں اپنی پسند اور
رائے کے خلاف اپنی زندگیاں بخوشی اس خیال پر قربان
کر ڈالتی ہیں۔ اگر کوئی لڑکی کسی کی نسبت پسندیدہ خیالات
کا اظہار نہ کرے۔ یا اپنے شوہر کو اس قابل نہ پائے کہ
اُس کے ساتھ بخوشی زندگی بسر کر سکے۔ تو اس پر طرح
طرح کے نام دھرے جاتے ہیں اور وہ سوسائٹی کے
نزدیک قابلِ اعتراض سمجھی جاتی ہے۔

شاردا اسی قسم کی لڑکی ہے وہ شادی کے بعد
اپنے شوہر کو اپنا دیوتا نہیں سمجھتی۔ وہ اُس کی عمر اور صورت
سے بے نیاز ہو کر صرف اس کی عظمت کے تصور کو نہیں سوچ
سکتی۔ شوہر کی ہو جانے سے پیشتر اس کے دل میں بسنت
کی محبت نہایت گہری اُتر چکی تھی۔ وہ ایک جدا شخصیت
کی عام ہندو لڑکی سے بہت الوکھی۔ ایسی عورت ہے
جسے ہندو جاتی شاید اپنی برادری میں سے خارج کر دے۔
وہ سوسائٹی اور اس کے رسم و رواج سے برسرِ پیکار ہے۔

لیکن ڈراما کی کشمکش کو موثر بنانے اور تماشائیوں کو
ہیروئن سے ہمدردی رکھنے کے لئے ڈراما نویس نے اسے
ایسی صورت حالات میں رکھ دیا ہے کہ ہمیں اُس پر رحم آتا
ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بے قصور تھی۔ اسے بچپن سے
جس شخص سے محبت تھی وہ ہمیشہ اُس سے محبت کرتی رہی
اُس کی شادی محض ایک تجارت تھی جس میں اس کی رائے
کا دخل نہ تھا۔ اُس کے زر پرست باپ نے اُسے زبردستی
اُٹھا کر ایک دوسرے شخص کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر بھی
وہ اپنی نامراد زندگی کے مایوس دن صبر سے پورے کر
رہی تھی۔ لیکن جس خیال سے اُس کی روح مصروفِ کشمکش
تھی اگر وہی خیال مہینوں اور برسوں کی مدت میں سے
پھر گوشت پوست اور وہی شکل صورت اختیار کر کے
یک لخت اُس کے سامنے آجائے تو اُس کی بے اختیاری
اور بے بسی پر کس طرح حرف گیری کی جا سکتی ہے؟

موجودہ ٹریجیڈی ڈراموں میں بڑی خوبی یہ ہے۔
کہ وہ خیال انگیز ہوتے ہیں یعنی ہیرو یا ہیروئن کو عام تمدنی
حالات سے مصروفِ کشمکش دکھا کر لوگوں کو ایک خاص موضوع
کے متعلق سوچنے اور غور کرنے کا شوق دلاتے ہیں۔ یہی
خوبی سنسار چکر میں ہے اور اسٹیج پر تمدنی حالات کی اصلاح

کے متعلق یہ ڈراما پہلی معقول کوشش کہی جاسکتی ہے۔

ترکی حور آغا صاحب کے آخری ڈراما سے پہلا ڈراما ہے۔ اور زیادہ تر اعلیٰ اندازِ تحریر اور بلندیٔ خیالات کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ اس کے چست اور پُرمغز فقرے عام فہم فلسفیانہ خیالات اور شاعرانہ بلند پروازیاں تماشائیوں سے داد وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

لیکن اس کے ساتھ جو ایک فلم کا ٹکڑا چپکا دیا گیا ہے۔ میری رائے میں اُس نے ڈراما کی تعمیر کو کئی طرح کا نقصان پہنچایا ہے۔ غالباً اس جدت کا سہرا مالکوں کی طبع تاجرانہ کے سر ہوگا۔ ورنہ آغا صاحب کے مذاق سلیم اور قادر الکلامی سے یہ توقع کسی طرح نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے ڈرامے کی کامیابی کے لئے اپنے قلم کے علاوہ دوسرے بھونڈے ذرائع سے امداد لینا بھی گوارا کر سکتے ہیں۔ عوام نے اس جدت کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے اُٹھائے لیکن تعلیم یافتہ حلقوں کو یہ اَنمل بے جوڑ پیوند ناگوار ہی گزرتا رہا۔ پھر اگر ڈراما کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر کسی ایسے مقام پر فلم کا استعمال کر لیا جاتا۔ جہاں اسٹیج کی وسعت کسی واقعہ کے متعلق عوام کو زیادہ متاثر کرنے سے قاصر نظر آتی تو ایک بات بھی تھی۔ لیکن فلم سے ظاہر ہے کہ یہ کسی یورپین کمپنی کا بنا ہوا ہے محض حسن اتفاق سے ایک ولایتی فلم اور ہندوستانی ڈراما میں کسی قسم کا تعلق نکل آنا قرین قیاس نہیں۔ لہذا ظاہر ہے کہ فلم کو پیش نظر رکھ کر ڈراما لکھوایا گیا۔ یا کسی لکھے ہوئے ڈرامے میں ترمیم کروائی گئی ہے۔

اس ضرورت نے ڈراما کی تعمیر کو کئی جگہ مسخ کر ڈالا ہے۔ گو ڈرامے کا نام ترکی حور رکھا گیا ہے۔ تاہم اس کی مرکزی شخصیت رشیدہ نہیں۔ رشیدہ کا شوہر عارف ہے اور ڈرامے کے بیشتر حصے میں دکھایا گیا ہے کہ شراب کے ہاتھوں عارف اخلاقی پستی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

ادھر فلم میں دکھایا گیا ہے کہ ایک عباپوش سردار ایک لڑکی کو گرفتار کر کے اپنے محل میں لے آتا ہے۔ اور ایک نوجوان فوجی افسر کو جو اس لڑکی کو چھڑانے آیا ہے گرفتار کر لیتا ہے۔ لڑکی پہرہ داروں کو غافل پاکر قلعے سے نکل بھاگتی ہے اور تازہ افواج لاکر نوجوان کو چھڑا لیتی ہے۔ اور اسی سلسلے میں نوجوان اور عباپوش قلعہ دار کی نہایت خوفناک کشتی ہوتی ہے۔

فلم میں عباپوش سردار۔ نوجوان فوجی افسر اور لڑکی کو دیکھ کر آغا صاحب نے اس کے مطابق اپنے ڈراما کے کیرکٹر زیاد۔ انور اور رشیدہ مقرر کر لئے۔ زیادہ بقول ہماری ہندوستانی اسٹیج کی اصطلاح کے بنا بنایا "جراری" پارٹ تھا۔ نوجوان فوجی افسر عارف سے اسقدر مختلف تھا کہ اس کے لئے رشیدہ کے بھائی انور کو رکھنا مناسب سمجھا گیا۔ اور لڑکی کے لئے انور کی محبوبہ کی نسبت رشیدہ اس لئے زیادہ موزوں معلوم ہوئی کہ اوّل الذکر صورت میں ڈراما کا اصل پلاٹ فلم کی ضروریات پر پورے کا پورا قربان ہوا جاتا تھا۔

فلم کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے آغا صاحب نے ان کیرکٹروں کو اپنے ڈرامے کے پلاٹ میں جگہ دینی اور دوسرے کیرکٹروں کے ساتھ مصروفِ عمل دکھانا شروع کیا۔ زیاد کو سب سے پہلے یوں پیش کیا کہ وہ رشیدہ کے شوہر کو شراب

کا شوق دلاتا رہا ہے تاکہ اُس کی بدباطنی بھی لوگوں کے
ذہن نشین ہو جائے اور ڈرامے کی مرکزی شخصیت عارف سے
بھی اُس کا تھوڑا بہت تعلق قایم ہو سکے۔

لیکن فلم میں زیاد، انور اور رشیدہ کے جو تعلقات
دکھائے گئے تھے ان کی کوئی معقول وجہ قائم کرنا ضروری
تھی۔ چنانچہ ایک یتیم پھول بیچنے والی کا کیرکٹر ڈالا گیا۔
انور اُس سے پھول لے کر اُسے اپنا دل دے بیٹھا۔ ایک
ہوٹل میں ہوس پرست زیاد نے اُس پھول والی سے
مذاق شروع کیا اور انور آ کر زیاد سے اُلجھ پڑا۔ یہاں زیاد
کی جو توہین ہوئی اُس کا انتقام لینے کے لئے اُس نے
انور کی بہن رشیدہ کو دھوکے سے اپنے محل میں اُٹھوا
منگوایا اور اُس کی آبروریزی پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن رشیدہ
اُسے پستول سے زخمی کر کے بھاگ گئی۔ فلم میں جو قصہ
تھا اب اُس کے جواز کی یہ صورت نکل آئی تھی۔ کہ زیاد
اپنی اِس ناکامی پر اپنی توہین کا رشیدہ اور انور سے انتقام
لینا چاہتا تھا۔

اوّل تو اب بھی بحیثیت مجموعی تماشے میں یہ نقص
نمایاں نظر آتا تھا۔ کہ فلم میں کسی نوع کے واقعہ کا اعادہ تھا
جو اسٹیج پر دیکھا جا چکا تھا۔ دوسرے پلاٹ کا یہ ڈھانچہ
کسی طرح عارف سی اہم شخصیت کو اپنا حصہ بٹانے میں کامیاب
نہ ہوا تھا۔ ڈرامے میں جتنی توجہ عارف پر کی گئی ہے اُس کے
لحاظ سے وہ قطعی ڈراما کی سب سے اہم شخصیت ہے اور بہت
تھوڑا سا تماشا دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ ہم اس شخص کو شراب
کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھیں گے۔ یہ توقع پوری بھی
ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف زیاد، انور وغیرہ نے جو اپنا
قصہ کھڑا کر رکھا ہے۔ اُس کے نتائج عارف کی شخصیت کو
کسی طرح متاثر نہیں کرتے۔

اسیطرح ڈرامے کا تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ اُس
مقام پر تمام ہو جائے جہاں عارف مال، دولت، عزت،
اور شہرت سب کچھ برباد کر چکنے کے بعد نشہ میں ایک بے بنیاد
خیال سے بھڑک کر اپنی بیوی تک کو زخمی کر ڈالتا ہے اور
حقیقت معلوم ہونے پر انتہائی پچھتاوے کے ساتھ شراب
کی بوتل جیب سے نکال کر پھینک دیتا ہے۔

اس کے بعد جو واقعات دکھائے جاتے ہیں وہ ڈرامے
کی روش۔ توازن اور مناسبت کے اعتبار سے قطعی زائد
معلوم ہوتے ہیں۔ اور اگر انہیں جائز کہا جا سکتا ہے تو
خانم کے جیل سے نکلنے کے بعد جو کچھ ہوا اُس کو نہ دکھانے
کے بھی یہ معنی ہیں کہ ڈراما نامکمل ہے۔

بہت ممکن ہے تماشا دیکھنے کے دوران میں بعض ایسے
اہم فقرے میں پوری طرح سننے نہ پایا ہوں۔ جو ڈراما کی تعمیر
کو متاثر کرتے ہوں۔ تاہم میرا ناچیز مشورہ ہے کہ جب تمکین
کو چھاپنے کی نوبت آئے تو وہ تمام ترمیمات اس میں سے
رفع کر دی جائیں جو محض فلم کو استعمال کرنے کی مجبوری سے
اس میں کی گئی تھیں اور یہ ڈراما بھی سینما سے بے نیاز ہو کر
محض اپنی خوبیوں کی وجہ سے ایک مستقل قابلِ قدر چیز بن جائے۔

بعض حضرات کے نزدیک تمکین کا ناصحانہ انداز بھی
قابلِ تعریف نہیں۔ اور اُن کے نزدیک ڈرامے کا اثر اِس
صورت میں زیادہ ہوتا اگر اِس کی بجائے لوگوں کو صرف
عارف کی زندگی دکھا دی جاتی اور کچھ سوچنے یا نتیجہ نکالنے کا
فرض اُن ہی پر چھوڑ دیا جاتا۔ مغربی ادب کے نقطۂ نظر سے

یہ ناصحانہ انداز ضرور قابلِ اعتراض قرار دیا جائیگا۔ لیکن مشرقی
ادب میں اخلاقی تعلیم کی موجودگی نہایت ضروری سمجھی
جاتی ہے۔ اور مشرق مغرب کے نقطۂ نظر کا یہ اختلاف ایک
جدا بحث کا محتاج ہے۔

ڈراما سے دلچسپی رکھنے والا کون ایسا شخص ہوگا
جس نے پارسی الفنسٹن کی اسٹیج پر آغا صاحب کا تازہ ترین
ڈراما آنکھ کا نشہ نہ دیکھا ہو۔ اور اُس کی کامیابی پر اُسے
ہندوستانی ڈراما کا مستقبل جید روشن نہ نظر آرہا ہو۔
یہ ڈراما موضوع کے زور، تعبیر کے حسن، کیرکٹروں کی پختگی
مکالموں کی لطافت اور مواقع کی خوبی کے اعتبار سے
بلاشبہ اردو ڈراما کی تاریخ میں ایک سنگِ منزل کا
کام کریگا۔

آنکھ کے نشہ کا پلاٹ مختصراً یہ ہے کہ عیاش بینی
کلکتہ کی مشہور طوائف کام لتا سے تعلق رکھتا ہے۔ اور
اُس سے اُس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ بینی
کے اطمینان کے لئے اس لڑکی کی کلائی پر بینی پرشاد
کے نام کے حروف بی۔پی گھود دیئے جاتے ہیں بینی
کے ساتھ اُس کا متمول دوست جنگل کشور جو حسین سروجنی
کا شوہر اور بیوی کا عاشق زار ہے۔ کام لتا کے ہاں آنا
جانا شروع کر دیتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ کام لتا کے دام کاکل
کا اسیر ہو جاتا ہے۔ بینی کی عیاشی سے تنگ آکر اُس کا
بوڑھا باپ اُسے روپیہ پیسہ دینا بند کر دیتا ہے چنانچہ
بینی کام لتا کی فرمائشیں پوری نہیں کر سکتا۔ اور وہ جنگل
سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیتی ہے۔ بینی بگڑ
جاتا ہے اور اپنی بچی کو حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے کام لتا
سے تعلقات توڑ لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر نائکہ کے
بیچ بچاؤ سے یہ معاملہ یوں طے پاتا ہے کہ جب بچی کچھ بڑی
ہو جائے گی تو بینی کو دیدی جائے گی۔

کام لتا جنگل کو رام کرنے کے لئے اپنی گناہ آلود
زندگی سے تائب ہونے کا خیال ظاہر کرتی ہے۔ اور
مختلف عیاریوں سے جنگل پر اثر ڈالا کر اُس کو لوٹنے
کے لئے اُس کے گھر چلی جاتی ہے۔ جنگل اُسے ایک
باغ میں ٹھیراتا ہے۔ جنگل کے چچیرے بھائی مادھو کے
اطلاع دینے پر سروجنی اپنے شوہر کو اس جال سے چھڑانے
کے لئے باغ میں آتی ہے۔ مگر اُس کی فریاد و التجا اور مادھو
کی پند و نصائح کا کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلتا۔

کام لتا دو سال تک جنگل کے ساتھ رہتی ہے۔ اور اس
عرصہ میں اپنی فرمائشوں سے جنگل کو مقروض بنا دیتی ہے۔
یہاں تک کہ ایک ساہوکار اُس کی گرفتاری کا وارنٹ نکلوا
لیتا ہے۔ اور جنگل گرفتار ہو جاتا ہے۔ جنگل کام لتا سے
روپیہ بطور قرض مانگتا ہے۔ مگر وہ انکار کر دیتی ہے اور پولیس
جنگل کو حوالات میں لے جاتی ہے۔ سروجنی کو جب مادھو
کی زبانی یہ اطلاع ملتی ہے۔ تو وہ اپنا تمام زیور دے کر
مادھو سے کہتی ہے کہ انہیں بیچ کر انہیں چھڑا لو۔ مگر انہیں
یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ یہ میری امداد تھی۔ ادھر کام لتا
جنگل سے فارغ ہو کر پھر بینی کو جو اپنے باپ کے مرنے
کے بعد اب تمام جائداد کا مالک بن چکا ہے پھانسنا چاہتی
ہے۔ چنانچہ اُسے جنگل کے مکان پر بلواتی ہے۔ اپنی اداؤں
سے اُس کی خفگی رفع کر کے اُسے آمادہ کرتی ہے کہ گاڑی
لاکر مجھے اپنے ہاں لے جاؤ۔ بینی گاڑی لینے جاتا ہے۔

کہ جنگل پولیس سے چھوٹ کر گھر پہنچتا ہے۔ کام لتا سے تیز تیز باتیں ہوتی ہیں۔ کہ اتنے میں بینی گاڑی لے کر آجاتا ہے اور اب تینوں کی باہمی بحث اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بینی پستول نکال کر چلاتا ہے۔ گولی کام لتا کو لگتی ہے اور وہ ڈھیر ہو جاتی ہے۔ جنگل تو اس ناگہانی موت سے مبہوت ہے کہ بینی خالی پستول وہاں دھر کر پولیس میں یہ اطلاع دینے چلا جاتا ہے۔ کہ جنگل نے کام لتا کا کام تمام کر دیا ہے۔ لیکن پولیس سے پہلے مادھو وہاں آپہنچتا ہے اور اُس کی امداد سے جنگل فرار ہو جاتا ہے۔

دس برس گزر جاتے ہیں اس دوران میں کام لتا کے سازندے بینی کو اطلاع دیتے ہیں کہ اُس کی بیٹی مر چکی۔ جنگل پولیس کے ہاتھوں سے بچکر دیہات میں نہایت غربت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ ذلتوں کی انتہا اُسے اس امر پر آمادہ کر دیتی ہے کہ کلکتہ چل کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے۔ چنانچہ وہ کلکتے چل دیتا ہے۔ اُدھر کلکتے میں ایک نئی طوائف کامنی کے حسن کا شہرہ عام ہے۔ اس طوائف کے سازندے وہی ہیں جو کام لتا کے ساتھ ساز بجاتے تھے۔ ایک روز بینی بابو اُس طوائف کے ہاں آجاتے ہیں شراب وغیرہ لانے کا حکم دے کر وہ کامنی سے محبت کا اظہار شروع کرتے ہیں اور یہ معلوم کر کے بہت متعجب ہوتے ہیں کہ کامنی تعلیم یافتہ ہے۔ اور گناہ کی زندگی سے بیزار ہے۔ مگر چونکہ اُسے سازندوں کا قرض چکانا ہے لہذا مجبوری کی حالت میں بازار کی رونق بنی بیٹھی ہے۔ بینی کامنی کی باتوں سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ اور اُسے اپنی بیوی بنا کر اپنی پناہ میں لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور محبت سے اُسکا ہاتھ چومنا چاہتا ہے۔ کہ کلائی پر اپنے نام کے حروف دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ اب بینی کو معلوم ہوتا ہے کہ بچی کی موت کی اطلاع محض دھوکا تھی۔ اور اُس وقت وہ اپنی ہی بیٹی کی آبرو ریزی کے لئے بالاخانے پر آیا تھا۔ گناہ اور نفرت کے انتہائی احساس کے ساتھ وہ کامنی کو بتاتا ہے کہ وہ اُس کی بیٹی ہے۔ اُسی وقت سازندہ داخل ہوتا ہے۔ بینی سازندے اور کامنی دونوں کو گولی سے مار کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کے لئے پاگلوں کی طرح گھر سے نکل جاتا ہے۔

جنگل ایک مندر کے پاس بھوک اور پیاس سے نڈھال پڑا ہے۔ کہ سروجنی پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر نکلتی ہے اور جنگل بھیک کے لئے اُس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ سروجنی جنگل کو پہچان کر اُس سے لپٹ جاتی ہے۔ اسی وقت ایک شخص کی رپورٹ پر پولیس آکر جنگل کو گرفتار کر لیتی ہے۔ لیکن عین اُسی لمحے بینی داخل ہو کر کامنی اور سازندے کے ساتھ کام لتا کے قتل کا بھی اعتراف کرتا ہے۔ اور آنسو ملی ہوئی گریہ آمیز خوشی پر کھیل تمام ہو جاتا ہے۔

کھیل کے پلاٹ سے ظاہر ہے کہ ڈراما کے عمل میں دو جگہ کئی کئی برس کا وقفہ پڑ گیا۔ پہلے ایکٹ کے بعد دو سال کا اور دوسرے ایکٹ کے بعد دس سال کا۔ بعض نقادوں کے نزدیک اسقدر فصل قابلِ اعتراض چیز ہے۔ اور وہ اسے اصطلاح میں وحدت وقت کا نقص قرار دیتے ہیں مناسب ہوگا اگر یہاں پر مختصر طور پر وحدت ثلاثہ کا

ذکر کیا جائے۔ جن کا تذکرہ ڈراما کی تنقیدوں میں اکثر آتا رہتا ہے۔

ڈراما کے نقادوں نے نہایت غور و خوض کے بعد معلوم کیا کہ اگر کسی طرح ڈراما نویس تین شرطوں کا خیال رکھ کر ڈراما کا پلاٹ بنالے تو اُس کے اسٹیج پر آنے سے ایک سماں سا بندھ جائے۔ اور ڈراما عین بین فطرت کے مطابق نظر آنے لگے۔ ایک شرط تو یہ ہے کہ ڈرامے کے واقعات اتنی ہی مدّت کے ہوں جتنی دیر میں وہ بطور تماشے کے اسٹیج پر دکھائے جاسکیں۔ یا زیادہ سے زیادہ دن بھر کے واقعات ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ واقعات اس خوبی سے مرتب کئے گئے ہوں کہ سب کے سب سہولت سے ایک ہی مقام پر پیش کئے جاسکیں تیسرے یہ کہ ڈرامے میں ایک عمل ہو۔ گویا کہانی کسی ایک کیرکٹر کے ساتھ ساتھ ناک کی سیدھ میں چلی جائے۔ پہلی شرط وحدت زمان دوسری شرط وحدت مکان تیسری شرط وحدت عمل کہلاتی ہے اور ان تینوں کو وحدتہائے ثلاثہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بہت مدّت تک وحدتہائے ثلاثہ کی تحقیق ارسطو سے منسوب رہی لیکن حقیقت میں اُس کا ان سے بہت کم تعلق ہے۔ ارسطو ڈراما کا کوئی ماہر نقاد نہ تھا۔ وہ اپنے زمانے کی ٹریجیڈیاں دیکھنے تھیٹروں میں جاتا تھا اور اپنی حیرت انگیز فہم و فراست سے کام لیکر ڈراما نویسوں کی کامیابی کے راز معلوم کر لیتا تھا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں وحدت عمل اور وحدت زمان کے متعلق اُس کے اشارات ملتے ہیں۔ ٹریجیڈی کے تذکرے کرتے ہوئے اُس نے لکھا ہے کہ ٹریجیڈی میں صرف ایک موضوع ہونا چاہئے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ ٹریجیڈی میں اس امر کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہ اس کے واقعات کی مدّت سورج کی ایک گردش کے اندر اندر محدود رہے۔ یا کچھ بقدر بڑھ جائے۔

لیکن ارسطو نے یہ باتیں تو ڈراما کے قوانین کی صورت میں پیش نہیں کیں۔ انہیں وہ محض یونانی ڈراما نویسوں کے سلسلے میں بیان کرتا رہا۔ ان کی مفصّل تحقیق اطالین نقادوں کی ممنون احسان ہے اور انہیں نہایت مختصر واضح اور قطعی الفاظ فرانسیسی نقاد بوئیلو نے دیئے ہیں کہ ڈراما میں ایک عمل، ایک دن اور ایک مقام کا بیان ہونا چاہیئے۔

جو لوگ لوازم ثلاثہ کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ڈراما عین بین فطرت کے مطابق ہو جائے۔ اس طرح لوگ بھول جائیں گے کہ وہ تماشا دیکھ رہے ہیں اور اس سے بآسانی لطف اندوز ہوسکیں گے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ کوئی بھی آرٹ واقعیت کے بالکل مطابق نہیں ہوتا۔ ہر آرٹ کو ممکن بنانے کے لئے چند اصولوں کو بطور رسم کے قبول کر لینا پڑتا ہے۔ اور ہر آرٹسٹ حقائق حیات کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی غرض سے واقعیت سے الگ ہٹ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ تماشا دیکھتے ہیں وہ یہ سمجھتے بوجھتے ہوئے بھی کہ وہ ایک تماشا دیکھ رہے ہیں اپنے آپ کو تماشا کرنے والوں کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں اور تماشا کرنے والے انہیں جو کہیں فوراً اُس پر یقین کر لیتے ہیں۔ لہذا انہیں قائل کرنے کے لئے اتنے تکلف کی ضرورت نہیں۔

لیکن وحدتہائے ثلاثہ میں سے صرف عمل ڈراما کے لئے بالاتفاق قطعی طور پر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ڈراما نہ کوئی خاص شکل اختیار کر سکتا ہے۔ نہ کسی طرح کا اثر ڈال سکتا ہے۔ وحدت زمان اور وحدت مکان کی عام طور پر پابندی نہیں کی جاتی۔

شکسپیر نے اپنے ڈراموں میں لوازم ثلاثہ کا خیال نہیں کیا اگر اُس نے یہ خیال رکھا ہوتا تو غالباً ہم میکبتھ کا آخری حصہ دیکھتے جب وہ اخلاقی پستی میں گرا ہوا تھا اور اُس کا وہ زمانہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہ آنے پاتا جب وہ ایک بہادر سپاہی تھا اور ہوس زر و جاہ اپنا زہر اُس کے خون میں نہ پھیلا نے پائی تھی۔ اسیطرح ہم اتھیلو کو صرف حسد و رقابت کی آگ میں جلتا ہُوا دیکھ سکتے اور اُسکی فطرت کی دوسری خوبیوں سے بالکل بے بہرہ رہتے۔

لہذا وحدت زمان اور وحدت مکان کوئی خاص اہم چیزیں نہیں اور وحدت عمل کی خوبی آنکھ کے نشے میں نمایاں طور پر ظاہر ہے۔

حسن فروشوں کے طبقے کے متعلق بہت سے ناول اور ڈرامے لکھے جا چکے ہیں۔ مگر اس نقطہ نظر سے کسی نے اُن پر زور قلم نہیں دکھایا۔ کہ "جس گھر میں باپ جاتا ہے وہاں بیٹا بھی جا سکتا ہے۔ اور کامی پُرش جسے دھوکے میں ویشیا کی کنیا سمجھتے ہیں۔ وہ حال کھل جانے پر بہن اور بیٹی بھی پرمانت ہو سکتی ہے۔ یہ خیال ڈرامے کے موضوع کو اسقدر ہیبت ناک اور پُر تاثیر بنا دیتا ہے کہ اسے دیکھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈراما کی تعمیر بھی نہایت متناسب اور دلکش ہے....

تفنن کے لئے کوئی سین زبردستی ڈرامے میں نہیں ڈالا گیا۔ بلکہ تفنن ایسے مناظر کا حصہ ہے کہ اگر انہیں ڈرامے سے نکال دیا جائے تو ڈرامے کے عمل کو نقصان پہنچے اور ڈراما بےمعنی ہو کر رہ جائے۔ پھر تفنن کا حصہ نہایت حسن مذاق سے اور نہایت مناسب مقدار میں شامل کیا گیا ہے۔ اور فقرہ فقرہ تول تول کر اور ضرورت کا لحاظ رکھ کر لکھا گیا ہے۔

کیرکٹروں میں جگل بینی۔ کام لتا نائکہ۔ سدارنگ سروجنی کامنی۔ یہانتک کہ بعض چھوٹے چھوٹے کیرکٹر بھی اس پختگی سے لکھے گئے ہیں۔ کہ جیتے جاگتے نظر آجاتے ہیں۔ اور ان کا باہمی فرق تمام ڈرامے میں عجب رونق پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جگل اور بینی کے کیرکٹر کا فرق دیکھو کام لتا کے ناچ کی داد ہی دینے میں دونوں کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ جگل ناچ دیکھ کر کہتا ہے "کام لتا یہ ناچ نہیں جادو تھا۔ جادو۔ تم ناچ رہی تھیں یا گھنگرو باندھ کر خود راگنی ناچ رہی تھی"۔

بینی کا رنگیلا کیرکٹر اس کی داد سے ظاہر ہے "آہا کیا چلت پھرت اور توڑے تھے۔ مجھے تو یہ معلوم ہُوا کہ پانی کی لہر پر روپیہ والا انار چھوٹتا ہُوا چلا جا رہا ہے"۔

سدارنگ (سازندہ) راج کنور (نائکہ) اور کام لتا کا کیرکٹر اس مختصر مکالمے میں کس لطف کے ساتھ نمایاں ہے۔ بینی اور جگل کی موجودگی میں نائکہ محفل سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

راجکنور۔ سدارنگ جی۔ کندن لال سیٹھ کی آڑھت ... بجے بند ہو جائے گی۔ میں ذرا ہو آؤں۔

بینی ۔ راجکنور جی جلسہ سونا کرکے کہاں چلیں ؟
راجکنور۔ کیا کہوں یہ تو بچے کی طرح ہٹ کر بیٹھتی ہے
آج ایک گلابی ساٹن پر کارچوبی کام کی پشواز بکنے
آئی تھی (کام لتا کو دیکھ کر)۔۔۔۔ وہ دیکھئے آنکھ
مار کر منع کر رہی ہے۔ نہ بابا میں نہ کہونگی۔
کام لتا۔ کہدو۔ کہدو۔ یہ سن کر کیا مجھے پھانسی دیدینگے؟
بینی۔ تمہارے ہی رونے سے تو چلتی موٹر میں پنچر ہو گیا
بائی جی اب تو تمہیں کہنا ہی پڑیگا۔
راجکنور۔ سرکار آج سدارنگ جی کے بہنوئی کسی رنڈی
کی نئی پشواز بیچنے لائے تھے۔ مال تو ہزار سے اوپر
کا نہ تھا مگر چھوٹی بائی نے جھٹ بارہ سو دام لگا
دیئے کہنے لگیں کہ بسنت پنچمی ہے۔ یہی پشواز
پہن کر سرکار لوگوں کے سامنے ناچوں گی۔
بینی۔ سو جی تو اچھی۔ ان کی تال کبھی بے سمجھ نہیں چلتی
راجکنور۔ بس آپ ہی لوگوں نے نخرے اٹھا اٹھا کر
اسکا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ
گھر میں بنک کی طرح ہر وقت روپے نہیں رکھے
رہتے۔ کن۔ ن لال سیٹھ نے چار آنے بیاج پر
بھی روپے نہ دیئے۔ تب بائی جی نئی پشواز پہن
کر سرکار لوگو تمکو کیسے خوش کرینگی۔
سدارنگ۔ بڑی بائی جی۔ یہی دن ان کے اوڑھنے
پہننے کے ہیں۔ گھر کے لوگوں سے کیا شرم ہے۔
باہر نہ لے تو سرکار سے اُدھار لے لو۔
کام لتا۔ اُستاد جی کمل ڈال کے سرکار کو لوٹ نہ لو۔
انہیں باتوں سے تو رنڈیوں اور مراسیوں کا
نام بدنام ہے۔ دیکھو جی تم۔ تم ایک پیسہ بھی دو گے
تو میں بگڑ جاؤنگی۔
جگل۔ پیسہ دونگا تب بگڑو گی نا۔ میں تو روپے دوں گا۔
راجکنور بائی یہ لو۔
راجکنور۔ جیو۔ دولت بڑھتی ہو۔ روپیو نکو بنک میں سمجھنا
میں بیاج کے ساتھ مول لوٹا دونگی۔
جگل۔ مول معاف ہے اور بیاج میں انکی مہربانی چاہئے۔
کام لتا۔ دیکھا (روپے معاف ہیں) یہ سنتے ہی بڑھاپے
پر جوانی آگئی۔ اری نابکاؤ۔ تم بڑی پیسے کی لوبھی
ہوتی ہو۔

اسیطرح جگل کی بیوی سروجنی اور ایک کٹنی
کے درمیان جسے بینی نے سروجنی کے بہکانے کو بھیجا ہوئی
کی گفتگو ان کی شخصیت کی گائڈ ہے۔

دُلاری۔ بہو جی۔ بریلی کا انجن۔ لکھنو کی مسّی۔ دہلی کا
گوٹہ۔ کلکتے کی ریس سب ہی کچھ ہے۔ آج تمہارے
ہی ہاتھ سے بَنی کرونگی۔
سروجنی۔ تم پڑوس میں رہتی ہو اس لئے پیسوں کی
ضرورت ہو تو لے جاؤ۔ لیکن میں ان بناؤ سنگار
کی چیزوں کو پسند نہیں کرتی۔
دُلاری۔ بہو جی یہ ست جگ نہیں کلجگ ہے۔ جبتک
ہونٹوں پر پان کی لالی گالوں پر کاجل کا تل۔
آنکھ میں انجن۔ مانگ میں سیندور۔ ماتھے پر ٹکلی۔
گلے میں پھولوں کی چمپا کلی۔ چوٹی میں بیلے کا ہار
اور تمام بناؤ سنگار نہ ہو۔ تب تک آجکل
کے بنی استر ہو نکو پسند نہیں کرتے۔

سروجنی ۔ یہ تمہاری بھول ہے ۔ مندر میں پھول چڑھاتے سمے دیوتا کی مورتی ہمارے روپ کی طرف نہیں دیکھتی ۔ بھگتی اور شردھا کی طرف دیکھتی ہے ۔ پتی بھی دیوتا کے کان ہیں ۔ یہ بھی آنکھ کے کاجل اور ہونٹ کی لالی سے نہیں استری کے پریم اور سیوا سے پرسن ہوتے ہیں ۔

دلاری ۔ بھوجی پتیوں کی نظر میں پریم اور سیوا کا مان ہوتا تو آج اس بستی میں پتی پتی رٹنے والی مورکھ استریوں کی یہ درگتی نہ ہوتی ۔ ذرا نہا دھو کر اپنے ہی کو دیکھو کتنی سندر کتنی کومل ۔ کتنی اگیا کارنی ہو پھر بھی تمہارے پتی جنگل بابو تم جیسی اپسرا کو چھوڑ کر تیل پھلیل سے مہکتی ہوئی ویشیاؤں کے کوٹھے کیوں جھانکتے پھرتے ہیں ؟

سروجنی ۔ تو کیا وہ کرتویہ بھول گئے ۔ تو میں بھی اپنا دھرم بھول جاؤں ؟ وہ میرے دیوتا ہیں ۔ دیوتا کی مورتی سامنے نہ ہو تو اُس کا دھیان کرنے سے بھی سکھ ملتا ہے ۔

شکسپیر کی اپنے چھوٹے کیرکٹروں سے محبت مشہور ہے ۔ اس کھیل میں آغا صاحب نے بھی بڑے کیرکٹروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کیرکٹروں کو پیش کرنے میں خاص اہتمام سے کام لیا ہے ۔ بازار میں ایک سپاہی کے دو تین فقرے دیکھئے کہ اُن میں موجودہ پولیس کی تمام خصوصیات نہایت خوبی سے جمع کر دی گئی ہیں ۔

بازار میں ایک رنڈی کے نوکر اور پھول والے کی ٹکر ہو جاتی ہے ۔

نوکر ۔ دوں گھما کر منہ سوڈے کی بوتل ۔ آنکھ کا اندھا ہے ۔ تو دیکھ کے نہیں چلتا ؟

پھول والا ۔ اور تیری آنکھیں کیا بائی جی کے پیچھے مجیرا بجا رہی تھیں ۔

نوکر ۔ گدھے کا بچّہ !

پھول والا ۔ گدھی کا ناتی !

سپاہی ۔ ارے سالا لوگ سرکاری سڑک پر کاہے واسطے کول مول مچا رکھا ہے ۔ چلو تھانے ۔

بالاخانہ پر سے طوائف ۔ لکھو کیوں جھگڑا کرتا ہے ۔ گجادھر سنگھ جی ۔ دیا رکھو ۔ ہمارا نوکر ہے ۔

سپاہی ۔ جاؤ ۔ بائی جی کا منہ دیکھ کے چھوڑ دیا نہیں تو ابھی پھاٹک میں بند کر دیتا ۔ (طوائف سے ، ایک سگرٹ تو پھینکو !

انکشاف کیرکٹر کے علاوہ بعض مقامات پر کیرکٹروں سے تعارف بیحد دلآویزی سے کرایا گیا ہے ۔ ابھی تک تماشائیوں کو معلوم نہیں ۔ کہ سامنے سدا رنگ جی بچی کو گود میں لئے بیٹھا ہے ۔ یہ بنی اور کام لتا کی اولاد ہے بنی کام لتا سے لڑ کر غصّے میں بھرا ہؤا آتا ہے ۔ اور نائکہ سے گفتگو کرتا ہے ۔ کام لتا بھی آ پہنچتی ہے اور بنی کی اُس سے تیز تیز باتیں ہوتی ہیں ۔ اُن کی لڑائی پر نائکہ بچی کو مخاطب کر کے کہتی ہے ۔ ارے کیسی لڑکی ہے ۔ ماں باپ لڑ رہے ہیں اور تو ٹک ٹک دیکھ رہی ہے ۔ لو اس برف کے ٹکڑے کو گلے سے لگا دو ابھی غصہ ٹھنڈا ہو جائیگا ۔

اسیطرح مواقع پیدا کرنے میں بیحد دلبری سے

کام لیا گیا ہے۔ کیرکٹر ایسی ایسی کیفیات میں سے گزرتے ہیں کہ تماشائی حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ اور منتظر رہتے ہیں کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ کام لتا اور سروجنی کا آمنے سامنے آنا اور اُن کی موجودگی میں جنگل کا بھی آپہنچنا کام لتا کی تمام کا منظر۔ بینی کا کامنی کو طوائف سمجھ کر اُس کے پاس پہنچنا اور حقیقت سے واقف ہونا وغیرہ وغیرہ ڈرامے کے بعد دُشوار اور پیچیدہ مواقع ہیں۔ اور اُن کو کامیابی اور حسن خوبی سے نبھالینا مستحق مبارکباد ہے۔

یہ سرسری نظر اور میرے ناکمل اور مختصر نوٹس اس قابل نہیں کہ تفصیل سے اس ڈرامے کے محاسن پر بحث کرسکیں کبھی مکمل ڈراما دستیاب ہوُا۔ اور مصروفیات نے مہلت دی۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ اس ڈرامے پر اور آغا صاحب کی دوسری تصانیف پر جُدا جُدا مضمون لکھوں گا۔ آغا صاحب کا کارنامہ نہ صرف مضامین کا بلکہ مستقل تصانیف کا محتاج ہے اور تعلیم یافتہ حضرات کا عموماً اور ڈراما کا ذوق رکھنے والوں کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ وہ ادب اور ڈراما میں آغا صاحب کی اُن بیش بہا خدمات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اور اب ڈراما کو ادب کا ایک بلند پایہ شعبہ مان کر ادبی رسائل و جرائد میں اس سے رونق پیدا کریں۔

آغا صاحب نے انگریزی سے ناواقف ہونے کے باوجود محض اپنی خداداد قابلیت اور حیرت انگیز قادر الکلامی سے ہمارے ڈرامے کو پستی سے اُٹھا کر اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم کہہ سکیں۔ ہماری زبان میں ڈراما موجود ہے۔

اُن کے معجز نگار قلم نے اس میدان میں جو کچھ بہا آفرینیاں کیں وہ ادب اور ڈرامے کی دنیا میں کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں ؎ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام !!

غزل

از: ”خان بہادر“ مولانا شادؔ عظیم آبادی مرحوم

پس از معشوق مرنا عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

تعلق چھوڑ دیں، پائیں کہاں سے تیرا دل زاہد
ہمیں تو زندگی بھر دم اسی کافر کا بھرنا ہے

اکڑ لیں اہل دولت ہم کو اُنکی ریس کیا لازم
اُنہیں مرنا نہ ہو شاید مگر ہم کو تو مرنا ہے

اُمید و نا اُمیدی کی طرف رُخ تک نہیں کرتے
بہرصورت ہمیں تو کام اپنا کر گزرنا ہے

کبھی غافل نہ رہنا نفس سے اے شادؔ سن رکھو
اگر ڈرنا ہے دنیا میں تو اس دشمن سے ڈرنا ہے

"وطن پرست" سے!

"رومان" میں ایک "وطن پرست کا پیام" دیکھکر

از:- م حسن لطیفی لدھیانوی۔ بی اے (عثمانی)

ہنوز بیگانۂ داد سے ہے وطن پرستی کا وہ ترانہ
گماں ہے خوش گوئے "بال جبریل" قدر داں وطن نہیں ہے،
کئے ہیں خوب ایک دوسرے کے مقابل اقبال اور گاندھی
بجا ہے بالکل، نہیں شک اسمیں، زمانہ اُسکا ہی جو بنائے
درست ہے یہ، جو مردِ آگاہ اپنی قسمت کا غیب داں ہے
جنون پائندہ تر ہے اُسکا، جہاد تابندہ تر ہے اُسکا
جو بے خبر ہے ہوا کے رُخ سے، وہ رہگذر کا غبار ہوگا
مگر گلہ اور شکوہ اقبال چاکِ داماں سے بے محل ہے
ترا سخن ہے سخن سے اسکے، مرا سخن ہے سخن سے اسکے
اسی کے خرمن کی خوشہ چینی ضمیر افروز و روح پرور
ترے تصور کی بیش قیمت سمور میں جو لطیف شے ہے
جو آسماں کے طلسم گنبد کو کہہ رہا ہو زجاج کی حد،
حسین اس سے نہیں جو پیدا تو ہے یہ آخر قصور کس کا؟
ذرا گریباں میں ڈالکر منہ خود اپنے دل سے سوال کر تو
ہے کون جس کو "فسادِ مغرب کا ترجمان" تو سمجھ رہا ہے؟
ہے کون جسکو تو کہہ رہا ہے "تو فخرِ ہندوستاں نہیں ہے؟"
ہو خون آشام کیوں نہ شاہیں؟ کبوتر نیروہ کیا نہ جھپٹے؟
ہے کون جسکا ضمیر ہے رازدانِ رمزِ سکونِ مشرق؟
سُنا ہے یہ قدسیوں سے کس نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا؟
کہا یہ دنیا سے کس نے تہذیبِ مغربی خودکشی کریگی،

وہ طعن اور طنز جن کا اقبال کو بنایا گیا نشانہ !
نگہ جو بے لاگ چاہیے تھی ہے دوست پر غیر دوستانہ !
موازنہ کا مزا ہی کیا ہے جو ہوں نہ چوٹیں معاصرانہ !
سخن کو کردارِ عاشقانہ، عمل کو تقدیر جاودانہ !
بصر اُسی کی ہے محرمانہ، نظر اُسی کی ہے عارفانہ !
جو ذرّے ذرّے کی رگ میں بھر دے شرارِ خونِ مجاہدانہ !
ادیب ہو، فیلسوف ہو، اہلِ فن ہو، یا شاعرِ یگانہ ؟
یہ کیا کہا؟ کیوں نہیں بنایا سخن کو کردارِ عاشقانہ ؟
اسی سخن کی حرارتوں سے ہے آج گرمِ عمل زمانہ !
اسی کا ہر تازہ شعر ہر نوجواں کے دل پر ہے تازیانہ !
اسی سخن کا ہے ایک شائستہ نقش موئے مصورانہ !
ہے ظرفِ اندیشۂ بلند اُسکا رشکِ ظرفِ سکندرانہ !
جلے جو نمناک خس نہ شعلے سے نقص کس کا ہے مجرمانہ؟
ہے کون جس کی محبت دل کو کہہ رہا ہے "منافقانہ"؟
ہے رودِ گنگا کی سرزمیں سے سلوک کس کا مخاصمانہ؟
ہے فتنہ کس کے خمیر میں اور ہے کس کی خو فرقہ پرورانہ ؟
خود اُس کو جب مصلحت سے قدرت سکھائے آئینِ طائرانہ؟
اُلوہیت ہے لبوں میں کس کے؟ ہے نطق کسکی پیمبرانہ ؟
اُلٹ دیا جس نے تختِ روما کل کے صحرا سے فاتحانہ؟
نہیں وہ محفوظ شاخِ نازک پہ جو بنائے گا آشیانہ ؟

ہے کون جس نے یقیں دلایا "وہ عالمِ پیر مر رہا ہے — جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے "قمار خانہ"؟

یہ مژدۂ تازہ کون لایا۔ نئی بساط اک بچھائینگے ہم — فلک کے گنبد کو توڑ دینگے نیا بنائینگے آشیانہ؟

پئینگے مشرق کا بادۂ کہنہ بے حجابانہ پینے والے — بنے گا سارا جہان میخانہ، عام ہوگی مئے مغانہ؟

ہے فیضِ نیساں یہ کس کا ہم یوں سخن کے موتی جو رولتے ہیں؟ — یہ کس کے بادل میں کون برسا رہا ہے دُر دانہ دانہ؟

ہے کون "آدم گری" کا آذر؟ ہے کس سے مشاطگیٔ خودی کا — قلم ہے کسکا حریفِ تیشہ؟ ہے خامہ کس کا رقیبِ شانہ؟

وطن پرستی کی پختہ بنیاد کس لئے "آفاقیت" پہ رکھی؟ — بتا مجھے کیا یہ کارنامے ہیں رائیگاں اور عامیانہ؟

حجاز و قسطنطنیہ و اندلس و فلسطین و صقلیہ پر — لہو کے آنسو لٹائے ہیں کس کی چشمِ گریاں نے گوہرانہ؟

زوالِ دہلی پہ کون رویا؟ مزارِ ٹیپو پہ کون تڑپا؟ — غضب ہے اس پر تو کہہ رہا ہے کہ روح اسکی ہے قیصرانہ!

کیا تھا رزمِ طرابلس کے زمانہ میں خون گرم کس نے؟ — رجز پڑھا دورِ جنگِ بلقاں میں کس نے مستانہ، والہانہ؟

مسولینی کی ثنا میں برجستہ کہدیئے چند شعر اس نے — یہ تو نے جانا کہ بس ٹھکانا ہے اسکا روما کا آستانہ!

نہیں اگر ذہن میں یہ ماضیٔ قریب کے واقعات پیہم — سمجھ نہ تو دورِ شاعرِ ایشیا کو اک رائیگاں فسانہ،

شریکِ محفل نہ تھا اگر تو تو سن یہ اقبال کہہ رہا ہے — "مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ!"

نہیں ہے انکار اس سے گاندھی نے اپنی فیضِ جنوں سے توڑا — فریب گستر فرنگیوں کا طلسم افیونِ دلبرانہ،

بجا کہ حق کوش مرد ہے وہ، نہیں کچھ اس میں کلام مجھکو — کہ اس نے شوریدہ سر ہریجنوں کو سکھائے انداز ہمسرانہ،

مگر ابھی تک کوئی بھی اقدام اس نے ایسا نہیں کیا ہے — جسے کہا جائے عاشقی کی زباں میں اقدامِ غازیانہ!

بجا کہ راہیں جدا جدا ہیں، کہیں عصا ہے، کہیں اہنسا — کہیں شکیبِ عدمِ تشدد، کہیں ہے جینے کا شاخسانہ،

مگر بغیر اس کشادِ دل کے، گرہ کشائی محال اپنی — کرشن نے جس سے روحِ ارجن میں روح پھونکی سپاہیانہ!

اگر ہے کچھ امید اس کی فقط جو آپ کی ذات سے ہے — مگر وہ یوسف صفت ابھی تک ہے پابہ زنجیرِ قید خانہ!

تو آدمِ نو سمجھ رہا ہے جسے وہ ہے پیکرِ قدامت — تری نگاہ غلط نگر ہے اسیرِ افسونِ ساحرانہ!

ترا قلندر ہے آدمِ نو، نہ میرا شاعر ہے آدمِ نو — جو ہے تو شاعر کے دل کی تہ میں ہے صورتِ رازِ محرمانہ!

یہ راز اب راز تک ہی محدود اور مقید نہیں رہیگا — مجسم انساں کے آب و گل میں ڈھلیگا مضمونِ شاعرانہ!

حقیقتِ منتظر کی صورت وہ شاہکار آشکار ہوگا، — بصد شئونِ کرشمہ ہائے تراشِ اعجاز آذرانہ!

اسی کی آفاق کو ضرورت اسی کی ہے جستجو وطن کو — قریب تر ہے نمود اس کی، ہے اشتیاق اسکا بیکرانہ!

ہے اس کا احساس قربِ شاعر کو رقتِ حسِ سادہ سے — اسی لئے روشن اس کے رستے کو کر رہا ہے وہ راہبانہ

"ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے — وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ"

رئیس الاطباء مولانا حکیم نذیر احمد خاں صاحب ٹونکی

افسانہ

پہاڑی کھیت میں!

آون ہن کا شاہکار افسانہ

از:- اختر شیرانی

ڈوبتے ہوئے سورج کی زردی مائل سرخی رکتی جھجکتی آسمان کے دامن سے جدا ہوئی، کھیتوں اور جنگلوں کی کھلی فضا پر روشنی بتدریج تاریکی میں گم ہوتی گئی۔ گاؤں میں اندھیرا پھیل گیا۔ ساتھ ہی کسانوں کے گھروں کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے دھندلی دھندلی روشنی کی کرنیں سامنے کی طرف بڑھنے لگیں،

شام خاموش اور پر سکوت تھی۔ مویشی کے گلے جنگلوں سے واپس ہو گئے تھے، کسان اپنا اپنا کام ختم کر کے لوٹ چکے تھے، اور اپنی اپنی جھونپڑیوں کے سامنے پتھروں پر کھانا کھا کر چپ چاپ لیٹ رہے تھے، نہ گیتوں کی آواز آتی تھی، نہ بچوں کی چیخ پکار سنائی دیتی تھی۔

خدائی اور خدائی کی ہر چیز گہری نیند میں تھی، کپتان آئی ونچ بھی اپنے گھر کی کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا نیند کے مزے لے رہا تھا،

اس کا گھر اور کھیت دونوں ایک پہاڑی پر واقع تھے ـــــــ کیکر اور ببکائن کے چھوٹے چھوٹے پودوں کی قطاریں جن کے دامن میں چھوٹی اور دوسری خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں ـــــــ وادی کے سامنے نشیبی زمین کے ساتھ ساتھ۔ نیچے کی طرف جھکی نظر آتی تھیں، کھڑکیوں میں سے نگاہ، شاخوں سے گزر کر دور دور تک کی خبر لا سکتی تھی،

شفق کی چھاؤں میں ڈوبے ہوئے کھیت اور میدان خاموش تھے۔ ہوا میں خشکی اور گرمی کا اثر تھا۔ آسمان پر ستارے متبسم اور پر اسرار انداز سے تھرتھرا رہے تھے، جھاڑیوں کے درمیان کھڑکیوں کے نیچے جھینگر آہستہ آہستہ اپنا صحرائی راگ الاپ رہے تھے، نشیب کی طرف سے کسی بٹیر کی موزوں آواز "ٹیبو ٹیبو" سنائی دے رہی تھی

کپتان آئی ونچ حسب معمول تنہا تھا۔

شاید اس کے نوشتۂ تقدیر ہی میں یہ لکھا تھا کہ وہ اپنی تمام زندگی تنہا گزارے گا، اس کے ماں باپ جو غریب لوگ تھے، اور شہزادہ "نوگیسکی" کے ہاں زندگی کے دن پورے کر رہے تھے، اسے ایک سال کی عمر میں چھوڑ کر مر گئے تھے اس کا بچپن اپنی ایک سودائی اور دوشیزہ پھوپھی کے ہاں اور جوانی کا زمانہ سپاہی زادوں کے مدرسے میں گزرا تھا

عالم شباب میں اس نے اپنے ہاں کے رومانی شاعروں کی طرح ورڈزورتھ کی تقلید میں بہت سی عاشقانہ نظمیں لکھی تھیں۔ جو سب کی سب کسی "سلمیٰ" کے تذکروں سے لبریز تھیں، اس کی "سلمیٰ" آینا نامی ایک لڑکی تھی، جس کا باپ مقامی رجسٹرار کے دفتر میں کام کرتا تھا، افسوس کہ کپتان کی سلمیٰ کو اس سے محبت نہ تھی۔

لوگ کہتے تھے کہ وہ ایک شریف نوجوان ہے، مگر اس کا کیا علاج کہ اس کی وضع قطع ہیں کوئی قابل توجہ بات نہ تھی، وہ دبلا، پتلا اور کسی قدر لانبا تھا، اور اسی لئے اس کے دوست مزاحیہ انداز میں اس کو اکثر و بیشتر "شمشاد قامت" کہا کرتے تھے،

شہزادے کے رسوخ کی وجہ سے، جو بجا طور پر کپتان کے باپ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا تھا، اسے فوج میں کپتان کا عہدہ مل گیا تھا، لیکن پھوپھی کے انتقال پر جب ورثے میں کافی روپیہ ہاتھ آیا، تو اس نے فوجی ملازمت سے استعفا دیدیا، اب وہ اپنے آپ کو کسی ناول کے ہیرو سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے بال روس کے تازہ ترین فیشن یعنی پولینڈ کے انداز کے مطابق ہوتے تھے مگر ——

یہ سب باتیں لاحاصل اور بے سود ثابت ہوئیں۔

کپتان کی "سلمیٰ" اپنے ایک دوست کے ہاں چند روز کے لئے مہمان گئی تھی، خوبئ تقدیر کہ اس نے وہیں شادی کر لی اور بدنصیب کپتان کی رومانی شاعری اس کی بیاض میں دفن ہو کر رہ گئی، جہاں وہ اس کی موت تک مدفون رہی۔ غریب نے کاشتکاری کا کام شروع کر دیا، اور ساتھ ہی مقامی حکومت کے دفتر میں ملازمت کی کوشش کی مگر

قسمت نے یہاں بھی ساتھ نہ دیا —— افسر اعلیٰ نے ایک مرتبہ لوکل جنٹلمین کلب میں ناشتہ کرتے ہوئے کہا تھا "کپتان آئی وینچ ایک شریف انسان ہے مگر خواب و خیال کا پرستار، ایسا شخص جو اپنے زمانے کے بعد تک باقی ہو"۔

کپتان آئی وینچ نے پاس پڑوس کے خورد و فروشوں سے دوستی کی، ڈوجام ڈیل سے غیر معمولی مراسم بڑھنے کی وجہ سے وہ اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ بن گیا۔ دن گزر گئے، مہینے برسوں سے بدل گئے، اور کپتان ہمیشہ کے لئے ایک کسان بن کر رہ گیا۔ وہ ایک دوہری چھاتی کا لمبا سا کرتا پہنا کرتا تھا، جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ اس کی مونچھیں سیاہ اور لانبی تھیں لیکن اب وہ یکسر فراموش کر چکا تھا، کہ اس کی شکل و صورت کیسی معلوم ہوتی ہے۔؟ حقیقتاً اسے بالکل خبر نہ تھی کہ اس کا پتلا اور جھریوں والا چہرہ اپنے شفقت آلود اثر کے ساتھ بہت دلکش نظر آتا تھا۔

آج وہ اداس تھا، صبح سویرے جب اس کی خادمہ بیس اگر یفیا اندر آئی تھی، تو اس نے اثنائے گفتگو میں یہ بھی کہا تھا:-

جناب! آپ آینا گریگوریون کو تو جانتے ہونگے؟

"ہاں" کپتان آئی وینچ نے جواب دیا۔

"بیچاری مر گئی، اس اتوار کو اسے دفنایا گیا تھا"

تمام دن کپتان آئی وینچ کے ہونٹوں پر ایک مبہم اور بے معنی پھیکی پھیکی مسکراہٹ چھائی رہی، شام کے وقت —— اور شام خدا جانے کیوں خاموش اور افسردہ تھی! —— نہ تو اس نے کھانا کھایا اور نہ وقت پر

سو نے گیا۔ جیسا کہ اس کا معمول تھا، بلکہ اس نے سیاہ تنگ
کے سخت تمباکو کا ایک موٹا سا سگریٹ تیار کیا، اور کھڑکی
میں ٹانگیں پھیلا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ کہیں باہر جانا چاہتا تھا اس
شخص کی طرح جو سکون کے ساتھ سوچنے کا عادی ہو۔ اس
نے اپنے دل سے پوچھا "کہاں"؟ .... کیا بٹیروں
کا شکار کرنے؟ .... مگر وقت گزر گیا تھا، اور اسے
کوئی ساتھی نہیں مل سکتا تھا،

وہ باہر جائے یا نہ جائے؟ .... اسے بٹیروں
کے شکار سے مطلقاً رغبت نہ تھی .... اس نے آہ
بھری اور اپنی ٹھوڑی پر جس کے بال دو چار دن سے صاف
نہیں کئے گئے تھے، ہاتھ پھیرا۔

"بیشک" اس نے سوچا "انسانی زندگی مختصر اور مجبور
ہے ...." ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ایک بچہ تھا
...... بچے سے جوان ہوا، پھر وہ فوجی مدرسہ .....
پھر ایک دن آیا کہ اس کی پھوپھی ...... اس کی پھوپھی
...... وہ کیسی عجیب تھی، وہ اسے اچھی طرح یاد
تھی ...... ایک دبلی پتلی بوڑھی دوشیزہ ...... میلے
کچیلے خشک اور سیاہ بالوں، اور خالی خالی آنکھوں والی
...... لوگ کہتے تھے کہ اس کے سودائی ہونے کا سبب
یہ تھا کہ اسے محبت میں ناکامی نصیب ہوئی تھی ...... اسے
یاد تھا کہ کس طرح اس نے بورڈنگ اسکول کی ایک
پرانی رسم کے مطابق فرنچ قصے کہانیاں حفظ کر لی تھیں اور
وہ انہیں احمقانہ رنگ سے چہرہ بنا کر اور آنکھوں کو اوپر کی
طرف گھما گھما کر دہرایا کرتی تھی، ...... پھر اسے وہ
گیت یاد آیا، جس کا عنوان تھا "نغمۂ فراق" اس کی زبانی
یہ گیت کتنا عجیب معلوم ہوتا تھا، بوڑھی کنواری اسے
کیسی از خود رفتگی کے عالم میں سناتی تھی !

"آہ وہ "نغمۂ فراق" ...." وہ کبھی تو اسے پیانو
پر بجایا کرتی تھی ...... آسمان پر ستارے پر اسرار
انداز میں چمک رہے تھے، ٹڈے گنگنا رہے تھے، ان
کی دھیمی آواز شام کی خاموش فضا کو لوری دے کر تھرتھرا
دیتی تھی، کمرے میں ایک پرانا پیانو پڑا
تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں ...... اگر وہ "اس وقت اندر
آ جائے ...... ایک خواب کی طرح ...... اس کی
روح نظروں سے چھپ کر اندر آ جائے اور پیانو کو بجانا
شروع کر دے! اس کے پرانے پردوں کو چھیڑ دے
...... اور پھر وہ دونوں مل کر گھر سے باہر جائیں!
گیہوں کے کھیتوں میں سے جو پگ ڈنڈی گزرتی ہے ...
اس پر سیدھے چلے جائیں ...... دور بہت دور ....
وہاں، جہاں ...... مغربی آسمان میں روشنی جھلکتی نظر
آتی ہے۔

کپتان آئی رینچ نے اپنے جذبات کو منسوب کیا اور
مسکرا دیا،

"تصور نے اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا" اس نے
بلند آواز سے کہا۔ ٹڈے شام کی خاموش ہوا میں گنگنا رہے
تھے، باغ کی طرف سے شبنم سے لدے ہوئے صبح کے پھولوں
کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، یہ خوشبو بھی اس کو ایک شام کی
یاد دلا رہی تھی۔ جب وہ شہر سے دیر میں
گھر لوٹا تھا۔ اس وقت "اس" کے تصور میں کھویا ہوا از خود رفتگی

کی امیدوں کو تازہ کرنا، اسے کس قدر خوش آئند محسوس ہوتا تھا

جب وہ کھیت کی طرف چلا تو گاؤں کی کسی کھڑکی میں سے بھی روشنی کی جھلک نظر نہ آتی تھی، حد نظر تک پھیلے ہوئے تاروں بھرے آسمان کے نیچے ہر ایک شئے خوابیدہ تھی

اپریل کی راتیں اندھیری اور گرم ہوتی ہیں۔ باغ سے شفتالو دانے کی کلیوں کی ہلکی ہلکی، بھینی بھینی مہکار آرہی تھی۔ تالابوں میں مینڈک نیند کی حالت میں ٹرٹر کر رہے تھے،

ایسی دھیمی موسیقی ...... جو اس وقت سنائی دیتی ہے جب بہار کی سحر طلوع کے قریب ہو،

باغ والے مکان میں پیال پر پڑ کر سو رہنے سے پہلے وہ دیر تک پریشان خیالوں میں کھویا رہا۔ گھنٹوں اس نے ان خیالات کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی، جن کا سر رشتہ دور دست خوابوں کے سراب بادلوں میں کھو گیا تھا۔ اتنے میں کسی فراموش شدہ چشمے سے بگلے کی چیخ سنائی دی، یہ کس قدر پراسرار معلوم ہوتی تھی، باغ کی تاریکیاں بھی پراسرار نظر آنے لگیں۔

طلوع سحر سے پہلے باغ کی رسیلی فضا میں سانس لیتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔ اور مکان کے ادھ کھلے دروازے میں سے صبح کے جھلملاتے ہوئے ستاروں نے اس کی طرف دیکھا،

کپتان آئی ورنچ اٹھ کھڑا ہوا، اور مکان کے اندر ٹہلنے لگا، اس کے قدموں کی چاپ کمروں میں پھیل کر اور ان کی جھکی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی چھتوں سے ٹکرا کر صدائے بازگشت پیدا کر رہی تھی،

"یہ چھوٹا سا مکان اسی برس پرانا ہے" کپتان آئی ورنچ کو خیال آیا "اب کے موسم خزاں میں بڑھئی کو بلانا پڑیگا ورنہ سردیوں میں یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا"

ٹہلتے ہوئے اُسے اپنی بدہیئتی اور بدزیبی کا احساس ہوا، لانبا اور دبلا پتلا، قدرے کم خمیدہ، اپنے پرانے بڑے بڑے بوٹ اور کھلے ہوئے بٹنوں کا کوٹ پہنے جس کے اندر سے چھپی ہوئی چھینٹ کی قمیص نظر آرہی تھی، وہ کمرے میں بے ارادہ گھوم رہا تھا، اور ساتھ ساتھ بھویں سکیڑتے ہوئے اور سر ہلاتے ہوئے "نغمۂ فراق" گا رہا تھا، اس نے محسوس کیا کہ اس کی توجہ اپنے قدموں کی طرف ہے، وہ اپنے متعلق سوچنے لگا، اس نے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے اپنے آپ کو ایک اجنبی شخص کے طور پر، خود اپنی تنقیدی نظر کے سامنے پیش کیا، اس نے محسوس کیا کہ اس کے سامنے ایک افسردہ شخصیت ہے، جس کا دل غم زدہ ہے ...

اس نے کارتوس اٹھائے اور گھر سے باہر نکل گیا۔

باہر زیادہ روشنی تھی —— آفتاب کی روشنی جو گاؤں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ اب بھی اس کے مکان کے صحن میں چمک رہی تھی۔

"میکائیل"!!! کپتان آئی ورنچ نے صاف آواز میں بوڑھے چرواہے کو آواز دی، مگر کوئی جواب نہ ملا۔

میکائیل اپنا کرتا بدلنے کے لئے گھر چلا گیا تھا،

"ہائیں، ... ملی ٹریسا کا ریلونا بھی غائب ہو گئی"۔

کپتان نے باورچن کو تلاش کرتے ہوئے کہا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ دونوں کہاں چلے گئے، کپتان صحن کو طے کر کے گایوں کے باڑے کی طرف آیا کہ شاید

ٹمکا' گایوں کے لئے گھاس کاٹنے میں مصروف ہو، وہ اب تک کسی اور چیز کے خیال میں محو تھا! اسی محویت میں قدم اٹھاتے ہوئے باڑے کے پاس آ کھڑا ہوا، "ٹمکا!!!" اس نے آواز دی۔ مگر یہاں بھی صدائے برنہ خاست، فقط کواڑ سے کی آڑ سے گائے کے زور سے سانس لینے اور مرغیوں کے ڈربے سے پرپھٹ پھٹانے کی آوازیں سنائی دیں۔

"مجھے اُن سے کیا کام ہے؟" کپتان آئی ونچ نے سوچا اور آہستہ آہستہ گھی خانے سے اس جگہ پہنچا جہاں ڈھلوان زمین سے گیہوں کے کھیت شروع ہوتے تھے، لڑکھڑاتے اور لٹ پٹاتے قدموں کیساتھ اس نے کچھ گھاس کا ایک اندھیرا تختہ عبور کیا اور پہاڑی پر آ بیٹھا، زرد فام شفق کی روشنی میں نشیب کی طرف جھکا ہوا کھلا میدان دور تک نظر آتا تھا پہاڑی کے اوپر سے چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگلوں کے نظارے جو ہلکے ہلکے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے، اسے اچھی طرح دکھائی دیتے تھے،

"میں اس پہاڑی پر بیٹھا ہوا ایک اُلو کی طرح معلوم ہوتا ہوں" کپتان آئی ونچ نے خیال کیا۔ لوگ کہیں گے اس بڈھے کو کوئی کام نہیں!...... ہاں سچ تو ہے، میں بوڑھا ہوں" اس نے سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا،

"کیا اینا گریگوری ون مر نہیں گئی؟...... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں، آخر یہ سب کچھ کیا ہوا؟ کہاں گیا؟ یہ تمام گزرا ہوا زمانہ! وہ گزرے ہوئے زمانے کے لوگ"!

دیر تک وہ دور کے میدانوں اور کھیتوں کو دیکھتا رہا، دیر تک وہ شام کی خاموشی میں کھویا رہا،" یہ کیوں کر ہو سکتا ہے" اس نے بلند آواز سے کہا" ہر ایک چیز ویسی ہی ہو جائے گی جیسی پہلے تھی، آفتاب طلوع ہو گا، کسان اپنے اپنے ہل لئے ہوئے کھیتوں کی طرف جائیں گے، مگر میں ان کو نہ دیکھوں گا، نہ صرف یہ کہ دیکھوں گا نہیں، بلکہ یہاں سرے سے موجود ہی نہ ہوں گا، چاہے ہزار سال ہی کیوں نہ گزر جائیں، مگر میں دوبارہ اس دنیا میں نہ آؤں گا، نہ اس دنیا میں آؤں گا، اور نہ اس پہاڑی پر بیٹھ سکوں گا"

اسی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کئے اور اپنی کھچڑی کی سی مونچھوں کو بائیں ہات سے مروڑتے ہوئے وہ دیر تک وہاں بیٹھا رہا،

کتنے سال سے اس کی آرزو تھی کہ اسے ایک شاندار اور بلند پایہ مستقبل نصیب ہو۔ پہلے پہل وہ ایک چھوٹا سا، ننھا سا بچہ تھا، پھر وہ جوان ہوا، پھر وہ جوان ہوا، پھر ایک دن وہ آیا کہ ایک دُرشکے میں سوار ہو کر وہ الیکشن کے لئے جا رہا تھا، گرمی کے دن تھے، اور کھلی سڑک...... !

اپنے خیالات کی اس رفتار پر غور کر کے کپتان آئی ونچ مسکرا دیا،

لیکن تسلسل ایام ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی ایک ایسا دن باقی ہے جب بقول لوگوں کے ہر ایک چیز خاتمہ کو پہنچ جاتی ہے...... ستر...... اسی سال...... اس سے آگے کوئی شمار نہیں کر سکتا......

لیکن انسانی زندگی چیز ہی کیا تھی؟ ...... طویل ہو یا مختصر...... !

"میری عمر طویل ہے" کپتان آئی ونچ کو خیال آیا۔ "بہر حال طویل"۔

نیلگوں آسمان پر ایک ستارہ ٹوٹا، ایک لمحے کے لئے شام گوں فضا روشن ہو گئی، کپتان نے اپنی بوڑھی اور اداس آنکھیں اوپر اٹھائیں اور دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ ستاروں کی اس بے کرانی اور نیلمی فضا کی اس لامحدودیت نے اس کے دل کو کسی قدر تسکین پہنچائی۔

بہرکیف اس کی زندگی پرسکون تھی، پرسکون گزری تھی اس کی موت بھی پرسکون ہوگی، بعینہٖ ایسے جیسے سامنے کے پودے کی کسی شاخ پر کوئی پتی خشک ہو جاتی اور زمین پر گر پڑتی ہے،

کھیتوں اور میدانوں کا دائرہ رات کی تاریکی میں، مختصر ہوتے ہوتے نظر سے غائب ہو رہا تھا۔ تاریکی بتدریج گہری ہوتی گئی، ستارے زیادہ درخشاں نظر آنے لگے، ٹھہر ٹھہر کر ایک بٹیر کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ گھاس کی خوشبو تازہ تر ہوتی جا رہی تھی........ اس نے آہستہ سے، آزادی سے گہرا سانس لیا۔

وہ اپنی زندگی پر اس خاموش فطرت کا کس قدر گہرا اثر محسوس کر رہا تھا——!!!

نوائے حسرت

از:- مولانا حسرت موہانی بی۔ اے (علیگ)

محبوب ہیں محبوب کی ہر بات بجا ہے
اب مجھ سے تغافل بھی وہ فرمائیں تو کیا ہے

پھر شکوۂ غم کا مجھے کیوں شوق ہوا ہے؟
پھر ہنس کے وہ کہہ دیں گے یہی تیری سزا ہے

ہم خوش ہیں بہر حال وفا ہو کہ جفا ہو
وہ یوں کہ محبت کی سزا میں بھی مزا ہے

سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں
اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشا ہے

کہنے کو تو ظاہر میں خفا ہم بھی ہیں لیکن
کچھ دل کا عجب حال ہے جب سے وہ خفا ہے

ہم چھین کے لے بھی گئے پان آپکے منہ کا
کہتے ہی رہے آپ نہ دیں گے نہ دیا ہے

شرما کے وہ بولے بھی تو کیا "ہم سے نہ بولو"
کیا خوب تری چھیڑ کا حسرت یہ صلا ہے

شکوہ

(غزل) از:- "کاؤنٹ آف مونٹی کرسٹو"

میری خوابیدہ امیدوں کو جگایا کیوں تھا؟
دل جلانا تھا تو دل تم نے لگایا کیوں تھا؟

مجھ کو اس طرح گرانا تھا اگر نظروں سے!
پھر مرے عشق کو سینے میں بسایا کیوں تھا؟

اک "شکستہ" سا "کھلونا" ہی سہی "دل" میرا
اس کو "تحفے" کی طرح تم نے "منگایا" کیوں تھا؟

غیر کی یاد کو ممنون اگر کرنا تھا!
خلوتِ دل میں مرے غم کو بسایا کیوں تھا؟

عشق تھا تم کو تو دل میں اسے پنہاں رکھتیں!
اپنا یہ رازِ حسیں مجھ کو بتایا کیوں تھا؟

"چاندنی رات" میں "الفت کا سبق" دینے کو
مجھ کو "جمنا" کے کناروں پہ بلایا کیوں تھا؟

عمر بھر پاس نہ آنے کا ارادہ تھا اگر!
پھر مجھے دور سے دیوانہ بنایا کیوں تھا؟

میری راتوں میں سمائے ہیں تمہارے کاکل!
تم نے یہ خواب مجھے آہ دکھایا کیوں تھا؟

یاس کی نیند سلانا ہی اگر تھا منظور!
میری امید کی راتوں کو جگایا کیوں تھا؟

اتنی خوددار اگر تھیں تو مرے دل کے عوض
اپنا سب کچھ مرے قدموں پہ گرایا کیوں تھا؟

تلخ انجامیٔ الفت سے اگر ڈرتی تھیں!
یہ خطرناک "سبق" مجھ کو پڑھایا کیوں تھا؟

روٹھے رہنا ہی اگر حسن کا شیوہ ٹھیرا!
میری روٹھی ہوئی قسمت کو منایا کیوں تھا؟

"آؤ اب صلح کریں، عشق کریں، پیار کریں!" مجھکو یہ زمزمۂ شوق سُنایا کیوں تھا؟

ولولہ اپنی محبّت کا گھٹانا تھا اگر! حوصلہ میری تمنّا کا بڑھایا کیوں تھا؟

اُٹھ نہ سکتا تھا اگر صدمۂ فرقت تم سے! پھر مرے دل کا عبث ناز اُٹھایا کیوں تھا؟

نالۂ درد کی تلخی سے اگر نفرت تھی؟ بربطِ عشق کے تاروں کو جگایا کیوں تھا؟

لب پہ اس طرح لگانی تھی اگر مہرِ سکوت! پھر مجھے نغمۂ اُمید سُنایا کیوں تھا؟

بے نیازی ہی سکھانی تھی اگر جلووں کو! میرے خوابوں کی فضاؤں کو بسایا کیوں تھا؟

"نامۂ شوق" ہمیشہ جو نہ لکھ سکتی تھیں! "بندگی نامہ" عبث ہم سے لکھایا کیوں تھا؟

پاس کرنا تھا اگر اپنی نزاکت کا تمہیں! دل پہ پھر بارِ غمِ عشق اُٹھایا کیوں تھا؟

"وادیوں" میں لئے پھرتا تھا اگر شوق "شکار"! دور سے میری طرف تیر چلایا کیوں تھا؟

بادۂ عشق میں ایسی ہی اگر تلخی تھی! پہلے اس جام کو ہونٹوں سے لگایا کیوں تھا؟

گر نظر آتی تھی دشوار وفا کی منزل! پھر قدم راہِ محبّت میں اُٹھایا کیوں تھا؟

میرے سجدوں کے لئے اور ٹھکانے تھے بہت! آستاں اپنا مجھے تم نے بتایا کیوں تھا؟

الغرض، عشق کا بھولا ہُوا یہ تلخ سبق!

بھولنے والی! مجھے یاد دلایا کیوں تھا؟؟

غالب کا ایک شعر

غالبیات

از:-
مسٹر باری (علیگ)

"یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمّت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا"

مطلب:-

یاس = نا امیدی — عربدہ = لڑائی
عجز = پستی — دل = قوائے عملیہ

پست ہمّت افراد کے قوائے عملیہ کی مثال ایک ایسے طلسم خانہ کی سی ہے جسمیں یاس و امید نبرد آزما ہوں۔ ان کے ہنجر سینوں پر کبھی یاس کا تسلط ہو جاتا ہے اور کبھی اُمید اپنا علم لہراتی ہے۔ گویا پست ہمّت لوگ ہمیشہ امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہوئے کبھی بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ میدان عمل میں اُتریں۔

تشریح:-

اولاد آدم دو جماعتوں میں منقسم ہے۔ قنوطی اور رجائی اوّل الذکر کے نزدیک انسان خارجی اسباب کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔ ابن آدم ماحول کا پروردہ ہے وہ دل کی دنیا کا قائل نہیں۔ وہ ان حسیات قلب کا منکر ہے جو ہر لمحہ تعمیر حیات میں سرگرم ستیز ہیں۔ وہ اس جنون پر ایمان نہیں رکھتا جس کے سامنے فلسفی و متفکر فرد باختہ نظر آتے ہیں۔ جو کوہساروں سے ٹکرا کر انہیں ریگ زار دنیں تبدیل کردے۔ وہ اس نگاہ سے نا آشنا ہے جس سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ قنوطی زندانی تقدیر ہے۔ وہ انسانیت کے ہر ارتقا کو مایوسی کے چشمہ سے دیکھتا ہے۔ اسکا زاویہ نگاہ محدود اور مطمح نظر پست ہوتا ہے۔ وہ اپنے کندھوں پر اپنا جنازہ اُٹھائے پھرتا ہے۔ اس کے نزدیک ارتقائے حیات کسی کینہ پرور اور منتقم قوت کا فعل ہے جو نوع انسان کی تباہی سے خوش ہوتی ہے۔ اس لئے شعور کا یہی تقاضا ہے کہ اس کے دام فریب میں نہ آئے اور شکست آرزو کی معصیت سے کہیں بہتر ہے کہ قلب انسان میں تخلیقِ آرزو ہی نہ ہو۔

آخر الذکر اپنے اندر ایک نئی دنیا پیدا کرنے کے بعد اپنے گفتار و کردار اور فکر و عمل میں تطابق پیدا کرتا ہے۔ اسکا جذبہ شکار اس تیرہ خاکدان سے بلند ہو کر مہ و خور کو اپنے فتراک میں لانا چاہتا ہے۔ وہ پیٹ کے بل رینگنے والوں کو پائے عزم سے ٹھکرا کر فضائے آسمانی میں بلند پرواز عقاب کو

دیکھتا ہے۔ وہ ایام گذشتہ کو گورستانِ ماضی میں سپرد خاک کرنے کے بعد ایوانِ مستقبل کی تعمیر میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اسکا کشورہ آنیوالے حوادث کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسکے نزدیک حیات انسانی کا کوئی مقصد ہے اور وہ خود اس مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔

پہلی جماعت کے تمام افراد کی ناکامی و نامرادی مسلّم ہے دوسری جماعت کے کارکن عروس کامرانی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ لاریب ان کا سفینۂ حیات بارہا بحرِ ناکامی میں نہنگانِ اجل کے سپرد ہوا لیکن انکی شکست فتح مبین کے مترادف رہی۔ اس لئے افراد کی کتاب حیات کا ہر المناک ورق نوجوانوں میں عمل کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ ادیبوں کو ان کے ایثار سے المیہ داستانوں کے لئے کافی مسالہ میسر آتا ہے یہی حوادث المیہ روح ملت کو گرما کر نئے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔

قنوطی اپنے ہاتھ میں اور لق پارینہ لئے پھرتا ہے اس کا دل یاس و اُمید کا میدان کارزار ہے لیکن رجائی کے نزدیک آئندہ حوادث کا مطالعہ ہوتا ہے۔

وہ قدیم کا پرستار ——— یہ جدید کا طلبگار۔

وہ تقلید پرست ——— یہ اجتہاد پرور۔

وہ سکون کا خواہاں ——— یہ انقلاب پسند۔

وہ صید آئین ——— یہ آئین شکن۔

وہ طلسم سامری ——— یہ عصائے موسوی۔

وہ نارِ نمرود ——— یہ گلزار خلیل۔

اقوام عالم اور امم جہان کی عمرانی زندگی میں تغیر و تبدل پیدا کرنے والا یہی عنصر رہا ہے۔ پیمبر۔ مجاہد اور مصلح سب اسی جماعت سے متعلق ہیں۔ آتش نمرود اُن کے سامان زلیست کو نہ جلا سکی۔ خود سر بادشاہوں کی سرکش فوجوں سے وہ کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ کفر و الحاد کے فتنے ان کے ارادوں کو مستحکم کرتے رہے۔ ان کے سینے یاس و امید کی معرکہ آرائیوں کے میدان کارزار نہ بنے' ان کی بلند نگاہی نے ان کے دلوں کو کبھی بھی طلسم خانہ یاس و قنوط نہ بننے دیا۔

حسّیات

از:- اصغر حسین خاں صاحب نظیرؔ لدھیانوی

مکن اندیشہ اے ناداں ز اندوہِ فراوانم　　طلوعِ صبح امید است ہر چاکِ گریبانم

مشو غافل ز جانِ ناتوانِ من مشو غافل　　قیامتہا بآغوشم تلاطمہا بلا مانم

کشائید اے جوانانِ جفاکش سینۂ خود را　　بہ پہنائے محیطِ بیکراں گنجد نہ طوفانم

من از زندانیاں احرار پیدا کردہ ام پیہم　　نوائے حرّیت ارزاں شد از مرغانِ بستانم

مولانا ابوالکلام آزاد سے!

(نظم)

از:- جناب شمس شیدائی سہسرامی بی-اے (آنرز)

اے ادیبِ نکتہ پیرا اے خطیبِ شعلہ بار
بلبلِ شیریں مقال و طوطیٔ شکر شکن

غازیٔ خنجر بدوش و عالمِ قرآں بکف
صوفیٔ صافی سرشت و واقفِ رسمِ کہن

ہند کے آذر کدہ میں ایک شمعِ نور تو
ظلمت آبادِ جہاں میں اک سراپا انجمن

ایک تیرا ہر نفس سرمایہ دارِ حریت
ایک تیری ہر نظر صد محشرِ عالم فگن

ایک ہے گفتار تیری مایۂ لعل و گہر!
ایک تیرا نام صد رونق دہِ بزمِ وطن

ایک ہے ہستی تری سر تا قدم پیغامِ حق
ایک تجھ کو کھیل ہے یہ بازیٔ دار و رسن

تیرے ہونٹوں پر ہیں رقصاں موجہائے سلسبیل
ہے عبارت تیری پیشانی سے صد صبحِ وطن

بر لبِ جاں ہے تکلم سے ترے سرمایہ دار
تیرے رنگِ فیض سے دل ہے چمن اندر چمن

تیری پروازِ تخیل طائرِ سدرہ نشیں
تیرا ... نک گوہر افشاں شہپرِ روح الامیں

دیکھ شامِ آسمانِ شرق کی یہ ظلمتیں
اور صبحِ غرب کی آئینہ سامانی بھی دیکھ

دیکھ سازِ بربطِ سلمیٰ کی یہ افسردگی
اور ربابِ مطربہ کی شعلہ افشانی بھی دیکھ

دیکھ بازارِ جہاں کی رونقِ محشر فروش
محفلِ رنگینِ دوشیں کی یہ ویرانی بھی دیکھ

طائرِ سدرہ نشیں کی دیکھ یہ خاموشیاں
اور "مرغِ بام" کا ذوقِ نواخوانی بھی دیکھ

دیکھ قیسِ خستہ پا کی دشت میں جولانیاں
ناقۂ لیلیٰ کا یہ عذرِ سبکرانی بھی دیکھ

دیکھ سلطانِ جہاں کی کلفت و بیچارگی
اور گدائے راہ کا فرِ جہانبانی بھی دیکھ

تو نے دیکھیں "سوزنِ نو" کی رفو سامانیاں
جامۂ اسلام کی اب چاک دامانی بھی دیکھ

رہزنِ سفّاک کی بیداریاں بھی دیکھ لیں
آہ میرِ "کارواں" کی خفتہ سامانی بھی دیکھ

دیدۂ انجم کی دیکھی چرخ پر وا ماندگی
کرمکِ بے مایہ کی سعئ درخشانی بھی دیکھ

"ساقئ دریا عطا" کی بخششیں بھی دیکھ لیں
"محفلِ رنداں" کی پھر یہ تشنہ سامانی بھی دیکھ

بے خروشی دیکھ اپنے "قلزمِ ذخار" کی
قطرۂ شبنم کی یہ طوفان سامانی بھی دیکھ

خنجرِ قاتل کی تو نے برّشیں بھی دیکھ لیں
پھر شہیدِ خستہ تن کی یہ گراں جانی بھی دیکھ

اُٹھ بپا کر ہند میں پھر ایک طوفانِ خروش
گوشِ باطل کو سنا دے پھر وہی "پیغامِ دوش"

پھر سکوتِ میکدہ کو دے پیامِ ہاؤ ہو
تشنہ لب رندوں کو دے بھر بھر کے پھر جام و سبو

قلزمِ موّاج کو پھر شورشِ طوفان دے
قطرۂ شبنم کو کر دجلہ بدجلہ جو بجو

پھر سکوتِ مرگ ہے طاری فضائے ہند میں
پھونک دے پھر قلبِ ہر ذرّہ میں روحِ آرزو

پھر دلِ مسلم پہ طاری ہو چکیں مایوسیاں
پھر سنا دے سب کو شرحِ آیۂ لا تقنطو

قطرہ قطرہ میں ہو پیدا قعرِ دریا کا خروش
پھر بنے گہوارۂ طوفاں یہ قلبِ آبجو

ذرّہ ذرّہ ہند کا ہونے کو ہے گلشن بجیب
دوڑتا ہے پھر عروقِ خشک میں اپنے لہو

ہاں مدد! اے پنجۂ دستِ جنوں کی "شورِ شو"
پھر بکھر جائے ذرا جیبِ خرد کا تار و پو

پھر بپا کر ہند میں اک بار رزمِ خیر و شر
تا بجا وردِ زباں اللہ ہو، اللہ تو

جادۂ منزل ہے پیدا پھر بجا کوسِ رحیل
"کاروانِ خفتہ پا" کو کر شہیدِ جستجو

نیکرے تازہ بروں آر از دلِ خاکسترے
در سکوتِ مرگ پیدا کن خروشِ محشرے

ہینز انڈرسن کا

شاہکار افسانہ

از:-

مہدی علیخانصاحب مدیر تاج

ریلنڈ کا چھوٹا سا شہر کوج سمندر کے کنارے واقع ہے۔ یہ ایک سنسان اور بنجر علاقہ ہے۔ اردگرد ہموار کھیت پھیلے ہیں۔ سرسبز جنگل یہاں سے بہت دور ہے۔ سمندر ہمیشہ بہت خوبصورت ہوتا ہے لیکن ممکن ہے اور جگھوں کے قریب، سمندر یہاں کے سمندر سے زیادہ خوبصورت ہو۔ کیونکہ جب کوئی کسی جگہ بہت عرصہ رہے اور پھر وہاں سے چلا جائے تو ضرور کبھی نہ کبھی اُسے وہاں کی یاد ستاتی ہے۔ اس کے دل کو وہاں کی کسی نہ کسی چیز کی کشش ضرور کھینچتی ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی حسین ترین خطہ میں کیوں نہ رہتا ہو۔ وطن کی یاد بھی کچھ ایسی ہی دردانگیز ہے۔ اسے بھی دل کبھی بھلا نہیں سکتا۔

اس شہر کے قرب وجوار میں ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے جو اپنی گود میں خوبصورت لہریں لئے سمندر کی طرف بیتابانہ دوڑتی چلی جاتی ہے۔ کچھ گھٹیا سے باغ لگے ہیں۔ گرمیوں میں یہ باغ بہت خوبصورت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ دو چھوٹے بچوں کی رائے بھی یہی تھی کہ یہ جگہ بہت خوبصورت ہے۔ ان کے والدین ایک دوسرے کے ہمسائے تھے۔ بچے انہیں باغوں میں کھیلا کرتے۔ ان باغوں کو درختوں کی باڑ لگا کر ایک دوسرے سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ وہ درختوں کی شاخوں کو ہاتھوں اور بازوؤں سے پرے ہٹاتے کودتے پھاندتے ایک باغ سے دوسرے باغ میں نکل جاتے۔ ان باغوں میں سے ایک میں شاہ بلوط کا ایک درخت اُگا تھا اور دوسرے میں ایک بوڑھا بید مجنوں۔ بچے اسی درخت کے نیچے کھیلنا پسند کیا کرتے تھے۔ انہیں اجازت تھی کہ یہاں آکر کھیلا کریں۔ اگرچہ یہ درخت ندی کے بہت قریب واقع تھا اور بچوں کے ندی میں گر جانے کا بہت خطرہ تھا۔ لیکن خدا کی آنکھ ہر وقت چھوٹے بچوں کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔ نہیں تو وہ کبھی محفوظ نہ ہوں۔ خود وہ بھی پانی کے بہت قریب جانے کی جرأت نہ کرتے۔ ایک لڑکا تو پانی سے بہت ہی زیادہ خوفزدہ رہتا۔ موسم گرما میں جبکہ دوسرے بچے سمندر میں کھیلتے اور پانی کے چھینٹے اُڑاتے پھرتے وہ کنارے ہی پر تنہا کھڑا رہتا اور باوجود اصرار کے ان سب کا شریک نہ ہوتا۔ وہ اس کا مذاق اُڑاتے اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتے۔ وہ یہ سب کچھ صبر سے سُن لیتا۔ ایک دفعہ اس لڑکے کے ہمسائے کی چھوٹی سی لڑکی جوانا نے خواب دیکھا کہ وہ ایک کشتی میں بیٹھی سیر کر رہی تھی کہ کینیوٹ (لڑکے کا نام تھا)

پانی میں لڑکھڑاتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ پانی اُس کی گردن تک آگیا اور پھر سر سے اوپر تک اور ایک ہی لمحے میں وہ پانی میں ڈوب گیا۔ کینیوٹ نے جب یہ خواب سُنا تو وہ دل میں کہنے لگا اب ہنسی مذاق کی حد ہو چکی ہے۔ جوانا کے خواب کے بعد اب وہ کس طرح پانی میں جانے کی جرأت کر سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا کہ "میں پانی میں کبھی نہ آؤنگا!" یہ خواب ہی اس کے لئے کافی تھا۔

ان دو بچوں کے والدین بہت غریب تھے۔ اور اکثر اکھٹے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ اس وقت موقع پاکر کینیوٹ اور جوانا باغ میں کھیلنے چلے جاتے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بید کے درختوں کی ایک قطار لگائی گئی تھی۔ تاکہ یہ خندق سے علیحدہ رہے جو اس کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی۔ یہ درخت کچھ اتنے زیادہ خوبصورت نہیں تھے۔ کیونکہ انکی چوٹیاں کاٹ ڈالی گئی تھیں۔ بہر حال وہ نمائش اور خوبصورتی کے لئے نہیں بلکہ فائدے کے لئے لگائے گئے تھے۔ البتہ بوڑھا بید مجنوں جو باغ میں اُگا ہُوا تھا بہت ہی خوبصورت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بچوں کو اس کے نیچے بیٹھنے کا بہت شوق تھا۔

شہر میں ایک بڑی منڈی تھی جب وہاں میلہ لگتا تو عجیب و غریب چیزیں بکنے آجاتیں، کہیں ریشمی کپڑوں کے ڈھیر لگ جاتے کہیں کھلونوں کی دکانیں لگ جاتیں کہیں طرح طرح کی مٹھائیاں اور کیک بکنے کے لئے سج جاتے غرضیکہ ایک ایک چیز میلے میں بکنے آجاتی اور لوگوں کے جمگھٹے لگ جاتے۔ اکثر اس موقع پر خوب بارش ہو جاتی کسانوں کا اونی لباس بھیگ جاتا۔ البتہ ایک چیز تھی جسے بارش بھی خراب نہ کر سکتی تھی۔ وہ شہد بھرے کیکوں اور سونٹھ ملی میٹھی روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ جن کے صندوق کے صندوق وہاں سجا کر رکھے جاتے تھے۔

بچوں کے لئے سب سے دل خوش کن بات یہ تھی کہ ان میٹھی روٹیوں اور کیکوں کا بیچنے والا جب کبھی میلے میں شرکت کے لئے اس شہر میں آتا کینیوٹ کے والدین کے ہاں ٹھہرتا۔ وہ اکثر بیشتر کینیوٹ کو سونٹھ کی میٹھی روٹی دیا کرتا کینیوٹ ہمیشہ اُس روٹی میں سے جوانا کو بھی حصہ دیتا تھا ایک اور دلچسپ امر یہ تھا کہ روٹیاں بیچنے والا عجیب و غریب باتیں سناتا تھا۔ اور تو اور سونٹھ کی میٹھی روٹیوں کے متعلق اُس کو نہایت دلچسپ کہانیاں یاد تھیں۔ ایک شام اُس نے بچوں کو ایک کہانی سُنائی جس کا بچوں پر اسقدر گہرا اثر ہُوا کہ وہ اسے کبھی نہ بھولے۔ کہانی یہ تھی:۔

کہانی

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میری میز پر دو سونٹھ ملی میٹھی روٹیاں رکھی تھیں ایک کی شکل مرد کی سی تھی جس نے ہیٹ پہن رکھی تھی۔ دوسری ایک دوشیزہ کی ہمشکل تھی جس نے عورتوں کی سی ٹوپی نہیں پہنی تھی۔ ان کے چہرے سب سے اچھی طرف تھے۔ کیونکہ یہ دونوں دوسری طرف سے بالکل مختلف نظر آتے تھے۔ دنیا کے اکثر لوگ دکھاوے کے لئے نہایت اہتمام سے لوگوں کے سامنے اپنی سیرت کا بہترین پہلو پیش کیا کرتے ہیں۔

روٹی کے آدمی کے جسم کی بائیں جانب جہاں دل ہوتا ہے ایک تلخ بادام لگا تھا۔ لیکن نوجوان دوشیزہ صرف

شہد کی بنی تھی۔ انہیں میز پر بطور نمونہ رکھا گیا تھا۔ وہ عرصے تک وہیں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ انہیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئی۔ لیکن ان میں کسی نے بھی اپنی محبت ایک دوسرے پر نہ جتلائی۔ ظاہر ہے کہ اگر انہیں یہ باتیں کرنا منظور ہوتا تو وہ ضرور منہ سے کچھ کہتے۔ میٹھی روٹی کی دوشیزہ دل میں کہنے لگی۔ "وہ مرد ہے پہلے اُسے بولنا چاہئے" لیکن دل ہی دل میں وہ نازاں بھی تھی۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اُس کی محبت کا جواب محبت ہی ہے۔ لیکن اس نوجوان کے خیالات تو کچھ عجیب ہی تھے۔ اُس نے خواب دیکھا کہ میں ایک بازاری لڑکا ہوں۔ میری جیب میں چار پیسے ہیں۔ اور میں نے میٹھی روٹی کی دوشیزہ کو مول لے کر کھا لیا ہے۔

وہ کئی دن بلکہ کئی ہفتوں تک میز پر پڑے رہے یہاں تک کہ وہ سخت اور خشک ہو گئے۔ لیکن دوشیزہ کے خیالات روز بروز لطیف اور عورتوں کے سے ہوتے گئے۔ ایک دن وہ کہنے لگی "آہ میرے لئے یہی کافی ہے کہ ہم اتنی مدت ایک ہی میز پر اکٹھے پڑے رہیں۔" اتنے میں "کٹ" کی آواز پیدا ہوئی اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے نوجوان آدمی کہنے لگا "کاش اگر اُسے میری محبت کا علم ہو جاتا تو وہ اسقدر جلد نہ ٹوٹتی" ...... یہ ہیں وہ دونوں اور یہ ان کی داستان ہے۔ ان کی زندگی اور ناتمام محبت کی داستان کتنی عجیب ہے! لو اب یہ تم لے لو!" یہ کہکر اُس نے جوانا کے ہاتھ میں نوجوان مرد جو ابھی ثابت تھا دیدیا اور کینیوٹ کے ہاتھ میں دوشیزہ جو ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن بچوں پر اس کہانی کا اسقدر گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے گوارا نہ کیا کہ ایک عاشق اور اُس کی محبوبہ کو کھا جائیں۔

دوسرے دن وہ نوجوان اور دوشیزہ کو گرجے میں لے گئے۔ اور گرجے کی دیوار کے نیچے جو تمام سال عشق پیچاں کی بیلوں سے ڈھکی رہتی تھی بیٹھ گئے۔ انہوں نے نوجوان اور دوشیزہ کو سبز پتوں میں رکھ کر تمام بچوں کو انکی خاموشی اور ناتمام محبت کا افسانہ سنایا۔ وہ اسے "محبت" ہی کہتے تھے۔ کیونکہ انہیں یہ افسانہ بہت ہی دلکش معلوم ہوتا تھا دوسرے بچوں کی بھی یہی رائے تھی لیکن جب انہوں نے مڑکر اس عاشق اور معشوقہ پر نظر ڈالی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میٹھی روٹی کی ٹوٹی ہوئی دوشیزہ غائب ہو چکی تھی۔ اسے ایک بڑے سے لڑکے نے شرارت سے ہڑپ کر لیا تھا۔ پہلے پہل تو لڑکوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد غالباً اس خیال سے کہ غریب عاشق اس دنیا میں تنہا نہ رہ جائے انہوں نے اسے بھی کھا لیا۔ البتہ انہوں نے اس افسانے کو کبھی نہ بھلایا۔

یہ دونوں بچے اب بھی شاہ بلوط اور بڑھے بید کے نیچے کھیلا کرتے۔ ننھی دوشیزہ کینیوٹ کو گیت سنایا کرتی۔ اس کی آواز گھنگروؤں کی طرح تیز اور چنچل تھی۔ اس کے برعکس کینیوٹ گا نہیں جانتا تھا۔ البتہ وہ گیتوں کے الفاظ ضرور یاد رکھتا اور یہ بھی غنیمت تھا۔ کوچے کے تمام لوگ یہاں تک کہ کیک بیچنے والے کی امیر بیوی بھی کھڑی ہو کر غور سے جوانا کے گیت سنا کرتی اور کہتی "اُف جوانا کی آواز کسقدر حسین اور پیاری ہے"

یہ زمانہ مسرت و شادمانی کا زمانہ تھا لیکن یہ ہمیشہ نہ رہا۔ دونوں ہمسائے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ لڑکی

کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اُس کے باپ نے دوسری شادی کرنے کی ٹھان لی۔ دارالسلطنت میں اسے پیغام رسانی کی سودمند ملازمت مل گئی۔ یہ ہمسائے جب ایک دوسرے سے جُدا ہوئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بچے تو مارے غم کے خوب روئے۔ لیکن ان کے والدین نے انہیں یہ کہہ کر تسلّی دے لی کہ "چلو مت روؤ سال میں کم ازکم ایک مرتبہ تو ایک دوسرے کو خط لکھا ہی کروگے نا"

اس کے بعد کینیوٹ کو ایک جوتے بنانے والے کا شاگرد بن جانا پڑا۔ اب وہ دن بدن بڑا ہورہا تھا اور اُسے یوں بیکار نہ پھرنے دیا جاسکتا تھا۔ علاوہ ازیں اب اُسے وہاں مستقل ملازمت بھی ملنے والی تھی۔ افسوس میلے کے دن اگر وہ کوپن ہیگن ہوتا تو جوانا سے مل کر سیر کرنے میں اُسے کسقدر لطف آتا۔ لیکن وہ اب بھی کوج ہی میں تھا۔ اُس نے کبھی وہ بڑا شہر نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ یہاں سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ خلیج کے پار جب آسمان صاف ہوتا شہر کوپن ہیگن کے میناروں کی چوٹیاں اُسے صاف صاف نظر آجاتیں اور جس دن وہ اپنی ملازمت پر مستقل ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ شہر کے بڑے گرجے کی صلیب دھوپ میں چمک رہی ہے اُس کے بیتاب خیالات جوانا کے خیالات کے ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ کیا جوانا بھی اُسے یاد کرتی تھی؟ ہاں کرسمس کے موقع پر جوانا کے والدین کا ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے جوانا بھی اچھی طرح ہے۔ اُس کی آواز اب بھی ویسی ہی خوبصورت ہے جیسی پہلے تھی اور امید ہے کہ یہی آواز عنقریب اس کا مستقبل شاندار کردے گی۔ اسے ایک محفلِ رقص وسرود میں ملازمت مل گئی ہے۔ اور اُس نے گا گا کر بہت سا روپیہ کما لیا ہے۔

اس روپے میں سے ایک ڈالر اُس نے اپنے ہمسایوں کو بھی بھیجا تھا۔ تاکہ وہ اسے کرسمس کی شام کو خرچ کرکے خوشی منا سکیں اور اُس کا جامِ صحت پئیں۔ یہ بات خود اُس نے خط میں لکھی تھی۔ اور آخر میں کینیوٹ کو بہت بہت سلام بھی لکھا تھا۔

یہ خبر سنتے ہی نیک دل ہمسایوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حالانکہ یہ خوشخبری کسقدر دلخوش کن تھی۔ لیکن ان کے آنسو خوشی کے آنسو تھے۔ کینیوٹ ہر وقت جوانا کی یاد میں غرق رہتا تھا۔ اور اب اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ خود جوانا بھی اُسے نہیں بھولی۔ جیسے جیسے اُس کی شاگردی کا زمانہ ختم ہونے لگا اُسے جوانا سے زیادہ سے زیادہ محبت ہونے لگی۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ جوانا کو ضرور میری بیوی بننا چاہئے۔ جب اس کے دل میں ایسے خیالات ہوتے تو ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوجاتی۔ ایک دفعہ جب وہ انہیں خیالوں میں غرق تھا اُس نے کام کرتے کرتے دھاگا اس زور سے کھینچا اور اپنے پاؤں کو دھاگے پر اس زور سے دبایا کہ اُس کی انگلی پر نشان پڑگیا۔ لیکن اسے اس کی کیا پروا تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب میں سونٹھ کی میٹھی روٹی کی دوشیزہ اور نوجوان کی طرح خاموش

نہیں رہونگا۔ اس افسانے نے اس کو اچھا سبق پڑھا دیا تھا۔

آخر کار ایک دن اُس نے اپنا بقچہ باندھا اور کپن ہیگن کو روانہ ہونے کے لئے تیار ہوگیا۔ وہاں ایک کاریگر موچی اس کا منتظر تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ جوانا مجھ سے مل کر کتنی خوش ہوگی۔ وہ اب سولہ سال کی ہوچکی تھی۔ اور اُس کی اپنی عمر اس وقت اُنیس سال کی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اُس کے لئے یہاں سے ایک انگوٹھی لیتا جاؤں۔ لیکن معاً اُسے خیال آگیا کہ اس سے کہیں بہت زیادہ خوبصورت چیزیں کپن ہیگن میں مل سکتی ہیں۔ اُس نے اپنے ماں باپ سے اجازت لی اور موسم خزاں کے اخیر میں ایک دن جبکہ بارش ہونے والی تھی اپنے شہر سے روانہ ہوگیا۔ بہت جھکڑ کا موسم تھا۔ اور جب وہ دارالسلطنت میں کاریگر کے ہاں پہنچا۔ تو وہ تمام بھیگ چکا تھا۔ دوسرے دن اُس نے پہلی مرتبہ جوانا کے باپ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ اُس نے نئے کپڑے اور نئی ہیٹ پہنی جو اُس نے کورج سے خریدی تھی اور اُسے بہت زیب دیتی تھی۔ اب تک وہ ایک معمولی سی ٹوپی پہنا کرتا تھا۔

مکان اُسے آسانی ہی سے مل گیا۔ لیکن اُسے اسقدر سیڑھیاں چڑھنی پڑیں کہ اُس کا سر چکرا گیا۔ وہ حیران تھا کہ کس طرح اس خوفناک شہر کے لوگ ایک دوسرے کے سروں پر رہتے ہیں۔

وہ ایک عالیشان محل میں جا داخل ہوا۔ جوانا کے باپ نے اس کا استقبال کیا۔ اُس کی نئی بیوی کینیوٹ کے لئے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتی تھی۔ تاہم اُس نے اس سے مصافحہ کیا اور اس کو کافی پیش کی۔

جوانا کا باپ کہنے لگا "جوانا تم سے ملکر بہت خوش ہوگی۔ تم تو بڑے ہوکر ایک نہایت عمدہ نوجوان بن گئے ہو۔ ابھی جوانا بھی آکر تم سے ملتی ہے۔ وہ ایک نہایت اچھی لڑکی ہے اور خدا نے چاہا تو وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ اب تو یہاں اُس کا ایک اپنا کمرہ بھی ہے۔ اور وہ باقاعدہ اُس کا کرایہ ادا کرتی ہے" اس کے باپ نے نہایت ملائمت سے اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جیسے کوئی اجنبی کھٹکھٹاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں اندر چلے گئے۔ اُف کمرے کی ہر چیز کتنی خوبصورت تھی! تمام کے تمام شہر کوپج میں اس سے زیادہ خوبصورت کمرہ نہیں مل سکتا تھا۔ بلکہ شاید ملکہ کا کمرہ بھی اس سے زیادہ شاندار نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر طرف قالین اور نمدے بچھے تھے۔ کھڑکیوں پر پردے لٹک رہے تھے۔ جا بجا تصویریں اور پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ ایک مخمل کی کرسی بھی پڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ قدآدم آئینہ لگا تھا۔ یہ سب کچھ کینیوٹ نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اُس نے یہاں جوانا کے سوا اور کچھ نہ دیکھا۔ وہ اب بالکل جوان ہوچکی تھی کینیوٹ نے اسکا جو تصور قائم کر رکھا تھا اُس سے وہ بالکل مختلف اور زیادہ حسین ہوگئی تھی۔ تمام کوپج میں اس جیسی حسین کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ کسقدر سلیقہ مند نظر آرہی تھی۔ اگرچہ اُس کی پہلی نگاہ کچھ عجیب سی اور بیگانہ وار تھی۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔

اس کے بعد وہ بیتاب ہو کر اس کی طرف اسطرح بڑھی جیسے ابھی اسے چوم لیگی۔ لیکن اُس نے اُسے چوما نہیں۔ اگرچہ وہ اُسے چوم لینے کے بالکل قریب تھی۔ وہ اپنے بچپن کے دوست سے ایک دفعہ پھر ملکر واقعی بہت خوش ہوئی۔ بلکہ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ اس کے بعد اس نے کینیوٹ کے ماں باپ کے متعلق کئی سوال کئے گاؤں کی ایک ایک چیز کے متعلق کوئی نہ کوئی بات پوچھی یہانتک کہ اُس نے شاہ بلوط کے درخت اور بید مجنوں کو بھی نہ بھلایا۔ جیسے وہ بھی انسان تھے۔ اسے میٹھی روٹی کے آدمی اور دوشیزہ اور اُس کی خاموش محبت کی کہانی بھی ابھی تک یاد تھی۔ کہ کس طرح وہ میز پر پڑے رہے۔ یہانتک کہ اُن کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ کہانی ایک مرتبہ پھر دوہرا کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ لیکن کینیوٹ کے رخساروں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا اور اُس کے دل کی حرکت بلند اور زیادہ تیز ہوگئی۔ نہیں وہ مغرور نہیں تھی۔ کینیوٹ نے دیکھا کہ اُس نے اپنے والدین کی اجازت سے اسے دن بھر وہاں ٹھیرنے کی دعوت دی ہے۔

جوانا نے چائے دانی میں سے ایک پیالی میں چائے اُنڈیل کر اپنے ہاتھوں سے کینیوٹ کو دی۔ اس کے بعد اس نے ایک کتاب اُٹھائی اور بلند آواز سے پڑھ کر سنانی شروع کی کینیوٹ کو محسوس ہوا جیسے یہ تمام کہانی اُسی کے متعلق ہے اور اس میں اُسی کی محبت کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ اس کا ایک ایک حرف اس کی حالت پر صادق آ رہا تھا۔ اس کے بعد اُس نے ایک سادہ سا گیت گایا۔ اور جب وہ گیت گا رہی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ہی دردانگیز خیالات کا اظہار کر رہی ہے۔ آواز کے ساتھ ساتھ اُس کے دل کے خیالات بھی فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ ہاں اسے کینیوٹ سے محبت تھی کینیوٹ کے گالوں پر آنسو ڈھلک آئے۔ وہ انہیں ضبط نہ کر سکا اُس کے پاس ایک بھی لفظ نہ تھا جو وہ کہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گونگا ہے۔

جب وہ رخصت ہونے لگا تو جوانا نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہنے لگی "تم بہت نیک دل ہو اسیطرح رہنا بدل نہ جانا"

آہ یہ کسقدر مسرور شام تھی۔ اس شام کے بعد سونا ناممکن تھا۔ کینیوٹ تمام شب نہ سو سکا۔

رخصت کے وقت جوانا کے باپ نے کینیوٹ سے کہا تھا کہ "دیکھو ہمیں بھول نہ جانا۔ اب یہ نہ کرنا کہ تمام موسم سرما غائب رہو۔ پھر ضرور آنا" چنانچہ وہ اتوار کی شام کو بھی آگیا۔ کام ختم کرنے کے بعد ـــــ ان دنوں وہ موم بتیوں کی روشنی میں کام کیا کرتے تھے ـــــ وہ شہر میں آجاتا اور جوانا کے کمرے کی کھڑکی پر نگاہ ڈالتا ہوا آگے گزر جاتا۔ یہ اکثر روشن رہتی اور ایک شام تو اُس نے اُس کے چہرے کا سایہ بھی کھڑکی کے پردے پر صاف صاف دیکھ لیا۔ اس کے لئے یہ شام نہایت مسرت کی شام تھی۔ اس کے اُستاد کی بیوی کو اس کا ہر شام شہر میں چلے جانا ناگوار گزرتا تھا۔ وہ اپنا سر ہلا ہلا کر اُس سے کہا کرتی "تم خواہ مخواہ جا کر اپنا وقت ضائع کرتے ہو"

لیکن اُس کا اُستاد مسکرا کر جواب دیتا۔ "میری پیاری تم جانتی نہیں کہ وہ نوجوان ہے"۔
کینیوٹ نے دل میں سوچا کہ میں اتوار کے دن اُس سے ملنے جاؤنگا۔ اور اُسے صاف صاف بتا دونگا کہ میں دل و جان سے تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم میری بیوی بننا منظور کرلو۔ میں جانتا ہوں کہ میں فی الحال ایک غریب بوٹ بنانے والا ہوں۔ لیکن میں بہت کام کرونگا۔ اور سر توڑ محنت سے تھوڑے ہی عرصے میں ایک ایک اعلیٰ کاریگر بن جاؤں گا۔ ہاں میں اب اُسے ضرور سب کچھ جتا دونگا۔ خاموش محبت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اُس نوجوان اور دوشیزہ کی کہانی سے مجھے یہی سبق ملا ہے۔
اتوار کی شام آگئی۔ لیکن جب کینیوٹ وہاں پہنچا تو اُنہوں نے اُسے بتایا کہ اس شام تو ہم کسی اور جگہ مدعو ہیں گھر نہیں ٹھیریں گے۔
جوانا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہنے لگی "کیا تم نے کبھی تھیٹر دیکھا ہے؟ ایک دفعہ تو ضرور دیکھو جمعرات کے دن مجھے بھی وہاں گانا ہے۔ میں تمہیں ٹکٹ بھیج دونگی۔ بشرطیکہ تمہارے پاس آنے کے لئے وقت ہو۔ آپا کو معلوم ہے کہ تمہارا اُستاد کہاں رہتا ہے"۔ جوانا اُس سے بہت مہربانی کا سلوک کر رہی تھی۔
جمعرات کے دن دوپہر کے قریب کینیوٹ کو ایک سربمہر لفافہ ملا جس پر کوئی پتہ نہیں لکھا تھا۔ البتہ ٹکٹ اُس کے اندر تھا۔ شام کو اپنی عمر میں پہلی مرتبہ کینیوٹ تھیٹر دیکھنے گیا۔ اُس نے کیا دیکھا؟ ——
جوانا ایک حسین ساحرہ بن کر کھڑی تھی۔ اور ایک اجنبی سے اُس کی شادی ہوگئی تھی۔ یہ سب کچھ ایک کھیل تھا سراسر دھوکا۔ کینیوٹ کو یہ اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ اصلی بات ہوتی تو جوانا کا دل کبھی گوارا نہ کرتا۔ کہ وہ مجھے اس موقع پر مدعو کرے۔ وہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح کھیل دیکھتا چلا گیا۔ اور جب تمام لوگ تالیاں بجا بجا کر جوانا کو داد دیتے تو وہ بھی "شاباش شاباش" پکار اُٹھتا۔ اُس نے دیکھا کہ بادشاہ بھی جوانا کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اور اس کے گانے سے بے حد محظوظ ہوا ہے۔ کینیوٹ کو اس وقت بہت نفرت محسوس ہو رہی تھی لیکن اُسے تو جوانا سے محبت ہو چکی تھی۔ اُسے میٹھی روٹی کی دوشیزہ کا افسانہ یاد آرہا تھا" اظہار محبت مرد کی طرف سے ہونا چاہئے"۔ آہ اس کے لئے یہ بچوں کی سی کہانی کسقدر اہم ہو رہی تھی۔ جوں ہی اتوار آیا وہ پھر جوانا کے گھر گیا۔ اُس وقت اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی مقدس زمین پر قدم رکھ رہا ہے۔
وہاں صرف جوانا ہی اس کے استقبال کے لئے موجود تھی۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی وہ کہنے لگی "تمہارے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ آپا کو تمہارے گھر بھیجوں لیکن مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آج شام تم ضرور آؤ گے۔ بات یہ ہے کہ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں فرانس جا رہی ہوں۔

جمعہ کے دن روانہ ہوجاؤں گی۔ میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ نہیں تو میں ایک اعلیٰ درجہ کی مغنیہ نہیں بن سکونگی۔"

آہ غریب کینیوٹ! یہ سنتے ہی اُسے محسوس ہُوا گویا تمام کمرہ اُس کے گرد گھوم رہا ہے۔ اُس کی طاقت اُسے جواب دے گئی۔ اُس کا سینہ فرطِ غم سے پھٹنے لگا۔ اُس نے آنسوؤں کو ضبط کئے رکھا لیکن اُس کے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اُسے اس بات کا کسقدر رنج و غم ہے۔

"وہ اُس سے کہنے لگی "تم ایک نیک اور باوفا روح ہو!" ان الفاظ سے کینیوٹ کی رُکی ہوئی زبان کھل گئی اُس نے جوانا کو بتایا کہ وہ کسقدر سچے دل سے اس سے محبت کرتا رہا ہے اور اُس کی دلی آرزو ہے کہ وہ اُس کی بیوی بننا منظور کرلے۔ جونہی جوانا نے یہ الفاظ سنے اُس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوکر زرد پڑگیا۔ اُس نے کینیوٹ کا ہاتھ نیچے گرادیا اور نہایت غمناک الفاظ سے کہنے لگی "کینیوٹ مجھے اور اپنے آپ کو غمگین نہ کرو میں ہمیشہ تمہاری بہن بنی رہونگی۔ ایک ایسی بہن جس پر ہمیشہ تم اعتبار کرسکو۔ لیکن اس سے زیادہ میں تمہاری کچھ نہیں ہوسکتی"۔ اس کے بعد اُس نے اپنا مرمریں ہاتھ پیار سے اُس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھدیا۔ اور کہنے لگی "اگر ہم مصائب جھیلنے کا عزم کرلیں تو خدا بھی اس میں ہماری مدد کرتا ہے"!

عین اُس وقت اُس کی سوتیلی ماں بھی اُس کے کمرے میں آداخل ہوئی۔ جوانا جلدی سے کہنے لگی "میرے جانے کا کینیوٹ کو بہت رنج ہُوا ہے۔ اُس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گویا وہ سفر ہی کی باتیں کر رہے ہیں۔ "آؤ مرد بنو" کہہ کر جوانا نے اپنا ہاتھ اُس کے شانے پر رکھدیا۔ "تم اب بھی پہلے کی طرح بچے ہی ہو۔ تمہیں اب سمجھدار اور معقول بننا چاہئے۔ جیسے کہ تم اُس وقت تھے۔ جب ہم بچے تھے اور بید کے درخت کے نیچے کھیلا کرتے تھے"۔

کینیوٹ یہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن اب اُسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ دنیا اپنے راستے سے پرے ہٹ گئی ہے۔ اُس کے خیالات ایک ایسے دھاگے کی طرح تھے جو ہوا میں اِدھر اُدھر اُڑ رہا ہو۔ وہ وہیں ٹھیرا رہا۔ اگرچہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ جوانا نے اُسے اور زیادہ دیر وہاں ٹھیرنے کے لئے کہا ہے یا نہیں۔ کیونکہ وہ اس پر بہت مہربان تھی اور اس سے بہت اچھا سلوک کیا کرتی تھی۔ اس نے پیالی میں چائے ڈالکر اُسے دی اور اُسے ایک گیت گاکر سنایا۔ لیکن اب اس گیت میں وہ پہلی سی آواز اور لگن نہیں تھی۔ اگرچہ یہ گیت بھی نہایت دلکش تھا اور جوانا کی آواز بھی۔ لیکن اتنا ضرور ہُوا کہ کینیوٹ کو یہ گیت سن کر محسوس ہونے لگا کہ اُس کا دل ٹوٹنے والا ہے۔ اس کے بعد وہ جانے کو اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کرنے کے لئے جوانا کی طرف بڑھایا۔ جوانا نے خود اُٹھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس کے رخساروں پر آنسوؤں کا ایک سیلاب بہ آیا اور آنسوؤں ہی میں مسکرا کر وہ کہنے لگی۔ کیا تم اپنی بہن سے ہاتھ نہ ملاؤ گے؟ اس کے بعد اُس نے ایک مرتبہ پھر "بھائی" کا لفظ دُہرایا۔ یقیناً اس سے کینیوٹ کو کچھ تسلی

ہوئی اور اس طرح وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

وہ جہاز میں بیٹھ کر فرانس کو روانہ ہوگئی اور کینیوٹ کپن ہیگن کے کیچڑ والے بازاروں میں پھرا کرتا۔ ایک دن ورکشاپ کے دوسرے کاریگروں نے اُس سے پوچھا کہ "تم اتنے اُداس اُداس کیوں رہتے ہو۔ تم نوجوان ہو ہمارے ساتھ مل کر ذرا سیر و تفریح کیا کرو۔" سو وہ بھی ان کے ہمراہ ایک رقص گاہ میں چلا گیا۔ وہاں اُس نے بہت سی خوبصورت لڑکیاں دیکھیں لیکن ان میں سے ایک بھی جوانا کی طرح نہ تھی۔ وہاں اس نے جوانا کو بھولنے کی کوشش کی لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو کر اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔ اُس نے اس سے کہا تھا کہ "اگر ہم مصائب جھیلنے کا عزم کرلیں تو خدا بھی اس میں ہماری مدد کرتا ہے۔" یہ سوچ کر اس میں کچھ ہمت آگئی۔ لیکن جب سازندوں کے محزوں نغمے فضا میں گونجنے لگے اور لڑکیوں کا رقص شروع ہوا۔ تو وہ یکایک چونک اُٹھا اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک ایسی جگہ آگیا ہے جہاں اُسے جوانا کو نہ لانا چاہئے تھا۔ وہ اس وقت بھی اسکے ساتھ تھی ـــــ اُس کے دل میں۔ وہ وہاں سے فوراً اُٹھ کر باہر چلا آیا اور گلیوں میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اس مکان کے سامنے سے گزرا۔ جہاں جوانا رہا کرتی تھی۔ تمام مکان خالی پڑا تھا۔ اسمیں اب اندھیرا چھا رہا تھا۔ دنیا اپنے راستے پر گامزن تھی۔ کینیوٹ کو تنہا چھوڑ کر۔

سرما آگیا۔ پانی جم گیا۔ اور ہر طرف قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ لیکن جب بہار واپس آئی اور پہلا جہاز سفر کو روانہ ہونے کے لئے تیار ہوا تو کینیوٹ کے دل میں دنیا کی سیر کرنے کی لاانتہا خواہش پیدا ہونے لگی۔ اُس نے اپنا بقچہ باندھا اور سفر کو روانہ ہوگیا۔ سب سے پہلے جرمنی پہنچا اور شہر بشہر پھرتا رہا۔ لیکن اُسے کہیں بھی آرام اور سکونِ دل میسّر نہ ہوا۔ جب وہ ایک عالی شان اور قدیم شہر نورمبرگ میں پہنچا تو اُسے اپنے دل پر کچھ قابو حاصل ہوگیا۔ وہاں اُس کے تکان سے چور قدموں کو کچھ آرام ملا۔ وہ وہیں رہ پڑا۔

نورمبرگ ایک عجیب و غریب اور پرانا شہر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے تصویروں کی پُرانی کتاب سے کاٹ کر زمین پر رکھ دیا گیا ہے۔ گلیوں اور بازاروں نے اپنی خواہش کے مطابق اپنا اپنا راستہ لے لیا ہے۔ اور مکان قطاروں میں کھڑے رہنا نہیں چاہتے۔ مٹیوں والے مکان منقش ستون اور مجسمے شہر کے دروازے ہی سے نظر آجاتے ہیں۔ اور ایک ہی قسم کی چھتوں پر اژدہاؤں یا کتوں کی شکل کے پرنالے لگے ہیں جو گلیوں کے وسط تک جا پہنچے ہیں۔ کینیوٹ کا بقچہ اُس کی پیٹھ پر تھا۔ وہ یہیں منڈی میں پرانے فواروں میں سے ایک کے قریب کھڑا تھا جس پر تاریخی اشکال یا روحانی سبق دینے والی حسین تصویریں کندہ تھیں۔ ایک البیلی اور چنچل خادمہ وہاں سے پانی کا ایک جگ بھرنے آئی۔ اُس نے کینیوٹ کو تازہ اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اُس کے ہاتھ میں چند گلاب کے پھول تھے۔ ایک پھول اُس نے کینیوٹ کی نذر کردیا۔ کینیوٹ نے اُسے مستقبل کیلئے

ایک نیک شگون سمجھا۔ قریب کے ایک گرجے سے موسیقی کی صدا آنے لگی۔ موسیقی کی طرز وہی تھی جو وہ کوچ کے گرجے میں سن چکا تھا۔ وہ اس بڑے کیتھیڈرل کے اندر چلا گیا۔ رنگین کھڑکیوں کے شیشوں سے سورج کی روشنی ندی کی طرح بہہ رہی تھی۔ اس کا دل دعاؤں سے لبریز ہوگیا۔ اُس نے دعا مانگی۔ اور اُسکی روح کو طمینان و سکون میسر ہونے لگا۔ اس کے بعد اُس نے کسی قابل اُستاد کی تلاش شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد اسے حسب دلخواہ ایک اُستاد مل گیا۔ وہ اُس کے ساتھ رہنے لگا اور اُس سے اُس نے جرمن زبان سیکھ لی۔

شہر کے گرد جو پُرانی کھائی ہے۔ اسے اب چھوٹے چھوٹے باغوں میں تبدیل کردیا گیا ہے لیکن اونچی اونچی دیواریں اور بھاری بھاری برجیاں اب بھی کھڑی ہیں۔ ان دیواروں کے اندر کی طرف رسیاں بٹنے والوں نے اپنی رسیاں تان رکھی ہیں۔ دیوار کے شگافوں اور دراڑوں میں بڑی بڑی جھاڑیاں اُگ آئی ہیں ان کی سرسبز شاخیں چھوٹے چھوٹے مکانوں کی چھتوں پر چھا رہی ہیں جو ان کے نیچے بنے ہیں۔ انہیں مکانوں میں سے ایک میں کینیوٹ کا اُستاد رہتا تھا۔ جس کے ہاں وہ ملازم تھا۔ مکان کی بالائی منزل پر کینیوٹ کا کمرہ تھا جس کی کھڑکی کے سامنے شاہ بلوط کا درخت اپنی شاخیں ہلاتا رہتا تھا۔ اُس نے موسم گرما اور سرما یہیں بسر کیا لیکن بہار آتے ہی اُس کے دل سے صبر و قرار پھر رخصت ہوگیا۔ شاہ بلوط کا درخت بہار پر تھا اور اس کے ـــــ پتوں میں سے اسی خوشبو کی لپٹیں نکلنے لگیں جو کوچ کے شاہ بلوط کے پتوں میں سے نکلا کرتی تھیں۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے وطن کے باغوں میں آگیا ہے۔

کینیوٹ سے یہ کیونکر برداشت ہوسکتا تھا۔ اُس نے اپنے اُستاد کو الوداع کہی اور شہر میں کام تلاش کرلیا جہاں شاہ بلوط کا کوئی درخت نہ تھا۔ اس کا ورکشاپ پتھروں کے پرانے پلوں میں سے ایک کے قریب تھا۔ ساتھ ہی ایک پن چکی تھی۔ جس کے اردگرد ہر وقت ایک تیز رَو ندی چیختی چلاتی چھینٹے اُڑاتی منہ میں کف بھرتی گذرتی تھی۔ ندی کے قریب کے مکانوں سے آکر ٹکراتی تھی۔ جن کے پُرانے اور سالخوردہ برآمدے ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے فضا میں لٹک رہے ہیں۔ اور ابھی پانی میں گرجائیں گے۔ یہاں شاہ بلوط کا کوئی درخت نہ تھا۔ بلکہ یہاں تو پھولوں کا کوئی گملا تک نہیں تھا جسمیں کوئی ننھا سا پودا بہار دکھا رہا ہو۔ البتہ ورکشاپ کے بالکل سامنے ایک بہت بڑا بید کا درخت اُگا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے گھبرا کر مکانوں کو زور سے پکڑ رکھا ہے مبادا وہ پانی میں گرجائے اُس نے اپنی شاخیں ندی پر پھیلا رکھی تھیں بالکل اسی انداز سے جیسے کوچ کے بید نے دریا پر پھیلا رکھی تھیں۔ اس درخت میں کوئی ایسی بات تھی کہ اسے دیکھتے ہی کینیوٹ کے شکستہ دل پر چوٹ سی لگتی۔ خصوصاً چاندنی راتوں میں تو وہ دیوانہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ اس شہر میں بھی نہ رہ سکا۔ کیوں؟ آہ بید سے پوچھو! شاہ بلوط سے پوچھو! اُس نے نورمبرگ کو بھی خیرباد کہی اور سفر پر چل پڑا۔ اُس نے کبھی کسی سے جماتا کا ذکر نہ کیا۔ غم کو اپنے دل میں چھپائے رکھا۔ بچپن کی دو

میٹھی روٹیوں والی کہانی میں اس کے سلئے گہرے مطالب پنہاں تھے۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ میٹھی روٹی کے آدمی کے پہلو میں دل کی جگہ تلخ بادام کیوں لگا تھا۔ اس کے دل میں تلخی ہی تلخی موجود تھی اور جوانا جو اسقدر حلیم اور ملتفت تھی اُسے شہد ملے کیک سے کیوں تشبیہ دی گئی تھی۔ جب وہ ان سب باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اُس کا کلیجہ اُس کے سینے پر آپڑا۔ اور بوجھ کی وجہ سے اُسے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اُس نے اس کی گرفت ذرا ڈھیلی کردی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہُوا۔ اسے اپنے سامنے نصف دنیا نظر آرہی تھی۔ نصف اس کے خیالات میں چھپ گئی تھی۔ اس حالت میں اُس نے نورمبرگ کو الوداع کہا۔

جب تک اُسے بلند برفانی پہاڑ نظر نہ آنے لگے۔ اس کے دل پر سے بار نہ اُترا۔ اب اس کے خیالات بیرونی چیزوں کی طرف منعطف ہونے لگے اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایلپس کے برفانی پہاڑ اُسے اُڑنے والی دنیا کے دو سفید پر معلوم ہو رہے تھے جو اس وقت بند تھے۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جونہی دنیا انہیں اُڑنے کے لئے پھیلائے گی۔ تاریک جنگلوں کے خوشنما نظارے کف در وہاں شفاف ندیاں فضا کے بستر پر لوٹتے ہوئے بادل جا چاند پیدا کرتے، برف کے ڈھیر جو اس وقت تک چھپے ہوئے ہیں ہویدا ہو جائیں گے۔ کینیوٹ نے دل میں سوچا کہ قیامت کے دن دنیا اپنے سفید پر پھیلا کر آسمانوں کی طرف اُڑ جائے گی اور وہاں خدا کی نور آفریں نگاہ کی تاب نہ لا کر صابون کے بلبلے کی طرح پھٹ جائے گی۔ اُس نے ایک آہ بھری اور کہنے لگا:- "کاش قیامت آجائے!"

وہ پہاڑی کی سرزمین میں چپ چاپ گزرتا گیا جو اسے پھلوں کا ایک باغ معلوم ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے برآمدوں ہی سے فیتے بُننے والی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ایک دوسری کو سر کے اشارے کرنے لگیں۔ شام کا وقت تھا اور پہاڑوں کی زرفشاں چوٹیاں خون میں نہاتے ہوئے سورج کی مدہم روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔ اور گھنے درختوں کے نیچے سبز جھیلوں میں ان سرخیوں کا عکس لرز رہا تھا۔ اس وقت اسے خلیج کوج کا ساحل یاد آگیا اور اس کا دل نئی آرزوؤں سے آباد ہو گیا لیکن اس وقت اس کے دل میں درد و الم موجود نہیں تھا۔ جہاں دریائے رائن پیچ و خم کھاتا ہوا ایک بوڑھے بید کی طرح آگے جا کر نرم نرم بن گیا تھا۔ جہاں چلتے بادل ہر آن شکلیں بدل رہے تھے۔ جیسے یہی ان کی حیات پیدائش ہے۔ اور جہاں قوس قزح ایک رنگ برنگ تتلی کی طرح ہلتے جلتے بادلوں میں پر پھیچھڑا رہی تھی۔ وہاں کینیوٹ کے دل کو کوج کی پن چکی اور چھینٹے اُڑاتے مُنہ میں سے جھاگ اُگلتے پانیوں کی یاد آگئی۔ وہ اس خاموش فضا میں بخوشی رہ سکتا تھا۔ لیکن آخر میں اس بات کا کیا علاج تھا کہ یہاں بھی بید اور شاہ بلوط کے درخت سے زیادہ درخت تھے۔

پس اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ اور پہاڑوں کے ایک بلند اور عالی شان سلسلے پر چڑھ گیا۔ اب اس کے

قدم اونچے نیچے ٹیلوں اور ان ٹیڑھے میڑھے راستوں پر پڑ رہے تھے جو دور سے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیا بیلوں
کے لٹکتے ہوئے گھونسلے معلوم ہو رہے تھے۔ نیچے گہرائیوں میں پانی جھاگ پیدا کرتا چلا جا رہا تھا۔ بادل آوارہ پھر رہے
تھے۔ وہ چلتا گیا چلتا گیا۔ گلاب کے پھولوں۔ بھٹ کٹیوں اور برف کے گالوں کو پیروں سے مسلتے ہوئے۔ موسم
گرما کا سورج اس پر چمک رہا تھا۔ بالآخر اس نے خطہ شمال کو بھی آخری سلام کیا اور شاہ بلوط کے سرسبز و شاداب
درختوں کے سایوں، انگور کے باغوں اور مکئی کے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آگے ہی آگے نکلتا گیا۔ اسے محسوس
ہونے لگا کہ پہاڑ اس کے اور اس کے خیالات کے درمیان حائل ہو رہے ہیں۔ اس وقت خود اس کی بھی یہی آرزو تھی

اس کے سامنے ایک بڑا اور عالیشان شہر آ گیا۔ جس کا نام میلان تھا۔ یہاں اسے ایک جرمن استاد ملا۔
جس نے اسے ملازم رکھ لیا۔ استاد اور اس کی بیوی جن کے کارخانے میں وہ ملازم تھا دو معمر اور پارسا ہستیاں
تھیں۔ وہ دونوں اس خاموش مسافر کے بہت گرویدہ ہو گئے۔ جو بولتا تو کم تھا لیکن کام زیادہ کرتا تھا۔ اور نہایت
نیکی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ خود اسے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ خدا نے اس کے دل سے ایک بھاری بوجھ اتار دیا
ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اس عالیشان گرجے کی چھت پر دوبارہ اور سہ بارہ چڑھے۔ جو
سفید مرمر کا بنا تھا۔ اس کے نکیلے مینار۔ شاندار ستون، آراستہ اور ہوادار حجرے، پیش طاق، محراب اور سفید
مجسمے جو ہر کونے سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور یہاں تک کہ خود گرجا بھی اسے ایسا معلوم
ہو رہا تھا جیسے اس کے وطن کی برف کا بنا ہے۔ اس کے اوپر نیلا آسمان تھا اور نیچے شہر اور لمبارڈی کے وسیع
میدان شمال کی طرف بلند پہاڑ بھی۔ پگھلنے والی برف سے ڈھنپے ہوئے تھے۔ کومو کا گرجا یاد آ گیا۔ جس کی
سرخ دیواریں عشق پیچاں کی بیلوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ لیکن اب اسے وطن جانے کی آرزو نہ تھی۔ اسکی خواہش
تھی کہ یہیں پہاڑوں کے اس پار وہ مر جائے اور یہیں کوئی اسے دفن کر دے۔

اس کو وطن چھوڑے تین سال گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں ایک سال وہ میلان میں رہا۔

استاد اپنے خاموش اجنبی پر بہت مہربان تھا۔ ایک دن وہ اسے لاسکالا کے شاندار تھیٹر میں لے گیا۔ یہ
ایک شاندار عمارت تھی جسے باہر سے ہی دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ گدیلوں والی کرسیوں کی قطاریں زمین سے بتدریج
بلند ہوتی ہوئی چھت تک چلی گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر پر اطالیہ کی حسین عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان کے برق پاش
حسن سے کمرہ منور ہو رہا تھا اور انہوں نے جو ہیرے اور جواہرات پہن رکھے تھے۔ وہ اسقدر چمک رہے تھے
گویا انہیں آگ لگ گئی ہو۔ ان کے گورے گورے نازک ہاتھوں میں خوبصورت اور بیش بہا پھول تھے مردوں
نے شام کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ اور بعضوں کے لباس میں سونے اور چاندی کے بٹن لگے تھے۔ اسقدر تیز روشنی
کی گئی تھی کہ رات دن بن گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد عمارت کی فضا موسیقی کے کیف افشاں نغموں سے مسحور ہو کر وجد

میں آنے لگی۔ یہاں کپن ہیگن کے تھیٹر سے ہر چیز زیادہ خوبصورت اور شاندار نظر آرہی تھی۔ لیکن وہاں تو جوانا تھی اور کیا یہ ہوسکتا تھا کہ ؟ ـــــ ہاں ـــــ ایک معجزے کی طرح جب پردہ اُٹھا سامنے جوانا ریشم کا مطلا زرق برق لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کے سر پر ایک سنہری تاج تھا۔ اس نے گانا شروع کیا۔ لیکن آسمان کی حور کی سی شیریں اور سحر آفریں آواز کے ساتھ۔ وہاں کا ذرہ ذرہ موسیقی کے نشے سے مست نظر آنے لگا اور فضا پر گویا پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ اس کے بعد وہ چند قدم آگے بڑھی اور اس ادائے دلنشیں سے ایک بار مسکرائی جس سے صرف جوانا ہی مسکرا سکتی تھی۔ اس کی نگاہیں کینیوٹ سے چار ہوئیں۔ آہ غریب کینیوٹ!
اُس نے اپنے اُستاد کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور زور سے پکار اُٹھا۔ "جوانا! ؟" لیکن اُستاد کے سوا اور کسی نے اس کی آواز نہ سُنی۔ کیونکہ چنگ ورباب کی صداؤں نے اس وقت ایک شیریں طوفان برپا کر رکھا تھا اُستاد کہنے لگا "ہاں ہاں یہ جوانا ہی تو ہے" اس کے بعد اس نے ایک چھپا ہُوا اشتہار نکالا اور جوانا کے نام کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا۔ وہاں اس کا پورا نام لکھا تھا یہ سب کچھ ایک خواب نہیں تھا۔ تمام حاضرین نے تالیاں بجا بجا کر اُسے داد دی اور اُس پر ہاروں اور پھولوں کی بارش کر دی۔ اور ایک بار جب وہ چلی جاتی وہ دیوانہ وار چلا چلا کر اُسے پھر سٹیج پر واپس بُلا لیتے۔ اسیطرح وہ سٹیج پر آتی رہی اور جاتی رہی۔ آتی رہی اور جاتی رہی بازار میں لوگ اس کی گاڑی کے گرد جمع ہو گئے اور اُسے بغیر گھوڑوں کے خود دور تک کھینچ کر لے گئے۔ کینیوٹ سب سے پہلی قطار میں تھا اور دوسرے لوگوں کی طرح خوشی سے چلّا رہا تھا۔ گاڑی ایک جگمگ جگمگ کرتے ہوئے مکان کے نیچے ٹھہر گئی۔ کینیوٹ بڑی کشمکش کے بعد گاڑی کے دروازے کے قریب آکر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آئی۔ روشنی نے آگے بڑھ کر اُس کے پیارے پیارے چہرے کو چوم لیا۔
کینیوٹ دیکھ رہا تھا کہ وہ لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مُسکرا رہی ہے اور تحسین و آفریں کے نعروں کے آگے مغلوب ہو چکی ہے۔ کینیوٹ نے آگے ہو کر اس کی آنکھوں سے اپنی تشنہ آنکھیں ملائیں۔ لیکن افسوس اُس نے اُسے نہ پہچانا۔ ایک آدمی کے سینے پر ایک ستارہ جگمگا رہا تھا۔ اُس نے اپنا بازو اُس کی طرف بڑھا دیا اور وہ بازوؤں میں بازو ڈالکر اندر چل دیئے۔ لوگ کہہ رہے تھے ان دونوں کی منگنی ہو چکی ہے اور عنقریب شادی ہونے والی ہے۔
کینیوٹ گھر کی طرف چل دیا۔ وہاں آتے ہی اُس نے اپنا سامان باندھ لیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے اب فوراً اپنے وطن کی طرف چل دینا چاہئے ـــــ شاہ بوط اور بید کے پاس آ۔ بید کے درخت کے نیچے ایک ہی لمحہ گذار کر کوئی اپنی عمر بھر کی خوشی حاصل کرسکتا ہے۔

بوڑھے میاں بیوی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی بہتیری منت سماجت کی۔ لیکن وہ نہ مانا۔ الفاظ اُسے روک نہ سکے۔ انہوں نے اُسے سمجھایا کہ موسم سرما آرہا ہے پہاڑوں پہ برف پڑ چکی ہے۔ ابھی نہ جاؤ۔ لیکن اُس نے اُن کی ایک نہ سنی۔ وہ کہنے لگا "میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گاڑیوں کے راستے آسانی سے معلوم کرونگا"۔

وہ پہاڑوں پر چڑھ گیا کبھی ایسی کسی ڈھلوان جگہ پر اوپر کی سمت چڑھنا پڑتا۔ کبھی نیچے اُترنا پڑتا۔ آخر اُسے طاقت جواب دینے لگی۔ اُس نے تھکی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شاید کوئی گاؤں یا جھونپڑی نظر آجائے لیکن اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس کے اوپر آسمان پر ستارے چمک رہے تھے اور نیچے وادی میں انکا عکس کانپ رہا تھا۔ نیچے بھی ایک آسمان بنا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ قدم ڈگمگانے لگے۔ اور وہ بیمار ہوگیا۔ وادی کی روشنیاں زیادہ سے زیادہ چمکیلی ہوتی گئیں۔ ان کی تعداد بھی بڑھتی ہی گئی۔ اب وہ ہل جل رہی تھیں۔ اُسے یقین ہوگیا کہ تھوڑے فاصلے پر ضرور کوئی گاؤں ہے۔ اُس نے اپنی لمحہ بہ لمحہ سلب ہوتی ہوئی طاقت وہاں تک پہنچنے کے لئے صرف کرنی شروع کردی۔ آخر اُسے ایک حقیر سی جگہ پناہ لینے کے لئے مل گئی۔ وہ اس رات وہیں ٹھہر گیا۔ اور دن بھر وہیں رہا۔ اس کا تھکا ہوا جسم آرام کی بے حد ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ وادی میں بارش ہورہی تھی۔ اور برف پگھل رہی تھی۔ تیسرے دن صبح سویرے ایک آوارہ مغنی بربط اُٹھائے وہاں آن پہنچا اور اُس نے اس کے تاروں پر وہی راگ چھیڑ دیا جو وہ اپنے وطن میں سن چکا تھا کینیوٹ وہاں نہ رہ سکا۔ وہ پھر شمال کی سمت اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ کئی دن تک نہایت تیز تیز قدم اُٹھائے چلتا رہا جیسے اُسے شک ہو کہ وطن پہنچنے سے پہلے پہلے وہ سب چیزیں جنہیں اُسے دیکھنے کی اسقدر تمنا تھی فنا نہ ہوجائیں۔ لیکن اُس نے اپنی خواہش کا اظہار کسی پر بھی نہ کیا۔ کون اس کے الفاظ پر یقین کرسکتا تھا۔ کس کو اس کے دلی رنج کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک ایسا عذابناک درد چھپا تھا۔ جسے شاید ہی کوئی انسان برداشت کرسکتا ہو۔ ایسا درد دنیا کے لئے نہیں ہوتا۔ دنیا اسے کیا سمجھے۔ دوست کیا جانیں اور غریب کینیوٹ کے وہاں دوست بھی کب تھے۔ وہ تو ایک مسافر تھا جو غیر مانوس زمینوں پر سفر کرتا سمت شمال اپنے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

شام ہوچکی تھی وہ ایک کھلی سڑک پر چل رہا تھا۔ اردگرد کی فضا بہت دلکش تھی کھیت اور چراگاہیں ہر طرف پھیلی تھیں۔ گرد آلود ہوا مارے سردی کے چیخ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے ایک بید مجنوں کا درخت اُگا تھا۔ اُسے وطن کی ایک ایک چیز یاد آگئی۔ اس کا بدن تکان سے چور چور ہو رہا تھا۔ وہ بید کے نیچے سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اور وہ سوگیا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اب بھی اسے احساس ہے کہ بید کے درخت نے اس پر اپنی شاخیں پھیلا رکھی ہیں۔ خواب ہی خواب میں اُسے محسوس ہوا گویا گرانڈیل بید ایک بوڑھا باپ ہے جس نے اپنے تھکے ہوئے بیٹے کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا ہے۔ تاکہ اُسے

واپس گھر چھوڑ آئے ــــ بچپن کے زمانے کے باغوں میں ــــ کوچ کے ویران کناروں پر۔

اس کے بعد اسے خواب آیا کہ دراصل یہ کوچ ہی کا بوڑھا بید ہے۔ جس نے اس کی تلاش میں تمام دنیا چھان ماری ہے اور اب اُسے تلاش کرلیا ہے اور چھوٹے باغ میں ندی کے کناروں پر لے آیا ہے۔ وہاں جوانا اپنے حسن اور تمام شان و عظمت کے ساتھ اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہے۔ اب بھی اُس نے اپنا سنہری تاج پہن رکھا ہے۔

اس کے بعد اُس کے سامنے دو عجیب و غریب شکلیں آگئیں۔ جو بچپن کے زمانے کی بہ نسبت اب زیادہ انسانی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ اب بدل چکی تھیں۔ لیکن اُسے یاد آگیا کہ یہ وہی میٹھی روٹی کا آدمی اور دوشیزہ ہیں جنہوں نے اپنی صورت کا بہترین پہلو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور جو اسقدر بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

وہ دونوں کینیوٹ سے کہنے لگے "ہم تمہارے شکرگزار ہیں جو تم ہماری زبانوں کو حرکت دینے کا موجب ہوئے۔ ہم نے تم سے سیکھ لیا ہے کہ خیالات کا اظہار آزادانہ طور پر کردینا چاہئے نہیں تو ان سے کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوگا۔ اور اب ہمارے خیالات کے نتائج برآمد ہوگئے ہیں۔ ہماری منگنی ہوگئی ہے۔ عنقریب ہماری شادی ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈالکر کوچ کے بازاروں میں سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے "اپنی صورت کے بہترین پہلو" سے وہ نہایت محترم معلوم ہو رہے تھے۔ انہیں حق حاصل تھا کہ وہ دنیا کو اپنا یہی پہلو دکھائیں۔ اُنہوں نے اپنے قدم گرجے کی سمت بڑھائے۔ کینیوٹ اور جوانا بھی بازوؤں میں بازو ڈال کر پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ اس گرجے کی طرف جس کی سرخ دیواروں پر عشق پیچاں کی بیلیں بڑھی تھیں بڑے گرجے کا دروازہ کھل گیا۔ جب وہ ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے جوڑے راستے کی طرف پہنچے تو موسیقی کے نغموں نے ان کا استقبال کیا۔ میٹھی روٹی کے بنے ہوئے مرد اور عورت پکار اُٹھے "پہلے ماسٹر" اور اُنہوں نے کینیوٹ اور جوانا کے لئے جگہ خالی کردی۔

کینیوٹ اور جوانا قربان گاہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے۔ یکایک جوانا کینیوٹ پر جھک گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے سرد برف کی مانند آنسو کینیوٹ کے چہرے پر آگرے۔ وہ درحقیقت برف کے آنسو تھے۔ کیونکہ عاشق کی گرمجوش محبت نے محبوبہ کا برف آلود سرد مہر دل پگھلا دیا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس پر مائل ہو رہی تھی۔ جونہی محبوبہ کے سرد آنسو عاشق کے تپتے ہوئے رخساروں پر گرے وہ چونک کر بیدار ہو گیا۔ وہ اب بھی بید کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا ــــ موسم سرما کی شام کے وقت ایک اجنبی فضا میں بادل اوپر سے اولے اور برف نیچے گرا رہے تھے۔ جو آ آ کر کینیوٹ کے چہرے پر پڑتے تھے۔

وہ پکار اُٹھا۔ "یہ میری زندگی کا مسرور ترین لمحہ تھا! اگرچہ یہ سب کچھ خواب تھا۔ آہ میں ایک مرتبہ پھر یہی خواب دیکھوں گا!"

اس کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سوگیا۔ اور خواب دیکھنے لگا۔

صبح کے وقت برف نہایت خاموشی سے گر رہی تھی۔ ہوا اپنی گود میں برف کے نرم نرم گالے لا لاکر کینیوٹ پر گرا رہی تھی۔ لیکن اب وہ سو رہا تھا۔ گاؤں والے گرجے میں جانے کے لئے اُس طرف آنکلے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ سڑک کے ایک طرف بید مجنوں کے نیچے ایک نوجوان لڑکا بیٹھا ہے۔ اُس کا جسم منجمد ہوچکا ہے اور روح پرواز کرچکی ہے۔

(ہینز اینڈرسن)　　مہدی علی خاں

غزل

از:- محترمہ کنیز فاطمہ خاتون حیاؔ (لکھنو)

پھول کھلے چلی نسیم دل نہیں اختیار میں　　پھر مری داستانِ غم تازہ ہوئی بہار میں

کوئی نہ نکلی آرزو ہے مگر اب بھی جستجو　　آنکھیں بچھی ہیں کوبکو دوست کے انتظار میں

ہم تو ہیں دل کے دھیان میں دل ہے کسیکی یاد میں　　کس کو ہو دوسری کی فکر کون ہے اختیار میں

آنکھ مری اور اشک گرم ہونٹ مرے اور آہ سرد　　ہونا نہ تھا سو ہوگیا حالتِ اضطرار میں

اُنکی نگاہِ لطف سے دل کے بڑھے ہیں حوصلے　　تازہ ہوئی چہل پہل اُجڑے ہوئے دیار میں

ایک طرف ہیں شوخیاں شرم ہے اکطرف حیاؔ
ناک نبھیگی دوستی قطرہ میں اور شرار میں

مدینہ و صبحِ مدینہ

از: سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے (علیگ)

مدنی صبح کا عجب ہے ظہور
قابلِ دید ہے یہ بارشِ نور

نظر آتا ہے پیش روئے حضور
اہلِ بینش کو نور جلوۂ طور

آپ کا غم ہے عاشقوں کیلئے
فی المثل اک شرابِ نابِ سرور

وائے بر حال عاشقِ محروم
پاس ہو کر بھی ہے جو آپ سے دور

طعنِ اغیار پر ہے ناز مجھے
کہ میں حسرت ہوں مستفیضِ قبور

معصومیّت

"اللہ میاں - ابّا کی بیوی کو اچھا کر دے اور اگر اُس کی صُورت ڈراؤنی نہیں تو آج ہمیں اُس سے ملا دے اور میاں سے بھی۔ اللہ میاں ہماری دُعا سُن"

(نذیر مرزا برلاس سرحدی منشی فاضل)

مکان دو منزلہ تھا۔ نیچے کی منزل بند پڑی تھی۔ سکونت بالائی منزل میں تھی۔ نوزی صبح و شام ڈرتے ڈرتے ایک ایک کمرہ میں کسی کی تلاش کیا کرتی۔ گھر میں ابا، اماں، بھائی بہنیں اور ملازم رہتے تھے، لیکن ان کے علاوہ کوئی اور دو شخصیتیں تھیں جن کی اُسے تلاش تھی، سوتے سوتے آنکھ کھل جاتی، ڈر سے پہروں آنکھ جھپکتی، ہمیں کہیں پردوں کی اوٹ میں دونوں ہستیاں چھپے ہی ہونگی کہیں آنہ دبوچیں، دن کو دبے پاؤں سانس روک روک کر اوپر نیچے ایک ایک کمرہ میں انہیں تلاش کرتی اور ان سے اچانک مڈبھیڑ کے خیال سے سہم سہم جاتی، یہ شخصیتیں کہاں چھپی ہیں بغیر کھائے پئے کیونکر زندہ ہیں، آخر ہیں کیا؟

ان میں سے ایک کا ذکر ابا کرتے، غیر لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے بارہا انہیں کہتے سنا "میری بیوی" دوسری شخصیت کا تذکرہ اماں کرتیں "میرے میاں"

اسے حیرت تھی یہ "میری بیوی" اور "میرے میاں" رہتے کہاں ہیں!

معصوم نوزی کے لئے دونوں شخصیتیں ایک راز تھیں جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ بار بار کی تلاش اور ان کے نہ ملنے نے اس راز کو اور زیادہ اہم کر دیا تھا۔ ان کے متعلق اس کی معلومات میں نت نیا اضافہ ہوتا گیا۔ ابا کہتے ہیں "میری بیوی سردی نہیں برداشت کر سکتی" اماں کسی سے کہتی ہیں "میرے میاں کو یہ چیز بہت پسند ہے" ایسی معلومات سے اس کا اشتیاق اور بڑھتا تھا۔ ایک دن ابا کسی سے کہہ رہے تھے "میری بیوی اوپر کمرہ میں ہے" دوڑی دوڑی اوپر کے کمرہ میں گئی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

ایک دن اماں نے کہہ دیا "میرے میاں باغیچہ میں ہیں" - باغیچہ کا چپہ چپہ چھان مارا "میرے میاں" نظر نہ آئے۔

آخر ایک دن آیا۔

ابا گھر سے نماز پڑھنے کو نکلے۔ یہ ساتھ ہولی۔ رستہ میں انہوں نے ایک دوست سے کہا "میری بیوی آج بیمار ہے"۔ اس کے سننے سے دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ ان سے اسے اک گونہ ہمدردی ہو گئی تھی۔ پھر دل سوچا کرتی

یہ بھوک کیونکر برداشت کرتے ہوں گے، سردی میں آگ تاپنے کو کہاں سے میسر آتی ہوگی؟

مسجد پہنچ کر ابّا نماز پڑھنے لگے تو اس نے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہوئے دُعا کی "اللہ میاں۔ ابّا کی بیوی کو اچھا کر دے۔ اور اگر اس کی صورت ڈراؤنی نہیں تو آج ہمیں اس سے ملا دے اور میاں سے بھی اللہ میاں ہماری دعا سن"

دن بھر اُسے بیوی کی بیماری کا فکر رہا۔ شام کو سب کھانا کھانے بیٹھے تو معاً اس نے پوچھا "ابّا جان آپ کی بیوی کی طبیعت کیسی ہے"۔

چھ سال کی عمر میں یہ پہلا سوال تھا جو نوزی نے براہ راست ابّا سے پوچھا اور یہی معصومانہ سوال زندگی بھر کیلئے اس کی چھیڑ کا باعث ہوگیا۔

کمرے پر ایک سکوت سا چھا گیا، ہاتھ جہاں تھے رُک گئے، مُنہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے، ابّا جان نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور سب کے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نوکر ہنستے ہنستے کمرہ کے باہر چلا گیا اور دیر تک باورچی خانہ سے قہقہے سنائی دیتے رہے۔ آخر ابّا نے کہا "بیٹی یہ جاکر امّی جان سے پوچھو"۔

ماں علیل تھی اور کھانے میں شریک نہ ہوسکی تھی۔ نوزی نے حیرت سے ایک ایک کا مُنہ دیکھا، اُٹھی اور آہستہ آہستہ ان قہقہوں سے دُور ہوتی گئی۔

چارپائی کے قریب بیٹھ کر ماں سے تمام حالات کہے۔ ان شخصیتوں کی تلاش۔ ان سے ملنے کا اشتیاق۔ اللہ میاں سے دعا۔ کوئی بات اُٹھا نہ رکھی اور آخر ماں سے پوچھا "امّی! ابّا جان کی بیوی اب کیسی ہیں"۔

ماں مسکرائی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے، بوسہ دیتے وقت دو موٹے موٹے قطرے نوزی کی پیشانی پر ٹپک پڑے۔

آہ نوزی ......

ع میرے بس میں ہو تو میں تجھ کو جواں ہونے نہ دوں

راجکمار

خلیل احسان۔ بی۔ اے۔

"راجہ کا مقصد تھا کہ راجکمار پھولوں سے لدے پھندے پودوں میں سیر کرے لیکن انکی نکہت نہ سونگھ سکے، اس وادی کے مرغزار حسن میں پھرے، لیکن حسن کی قیمت معلوم نہ کرسکے، دقیق پتیوں پر مینہ کی بوندیں پڑتے دیکھے، لیکن آواز نہ سن پائے، اپنے جسم کو اِدھر اُدھر متحرک دیکھے لیکن اپنی روح کی آواز کی طرف سے کان بند کرلے ــــــ"

ہمالہ کی خوشنما وادیوں میں ایک وادی ــــ

جہاں فطرت کی رعنائیاں صرف چند مخصوص انسانوں کے لیئے وقف تھیں، ایک لامتناہی عرصہ سے پتھر پھولنے لدی ہوئی تھی۔ آبشار اتنی مرتبہ فضا میں گونج پیدا کر چکے تھے کہ اب وہ شور موسیقی میں تبدیل ہوچکا تھا۔ خدا جانے چاند کتنی مرتبہ اس حسن خیز وادی پر چمکا اور ڈوبا اور ڈوب کر پھر ہلال بنا اور سورج کتنی دفعہ پہاڑیوں کی برف آلود چوٹیوں سے پیشانی گھس کر وہاں تابش پہنچانیکی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔

وہاں تھی ایک مختصر سی راجدھانی جسے چلیتیہ کہتے تھے۔ چلیتیہ کے لوگ نہایت خوش حال اور راجہ نیک سیرت اور رعایا پرور تھا۔ راجہ کو رعایا کے ہر ایک فرد سے ہمدردی تھی وہ ہر ایک شخص کو پہچانتا تھا اور اُس کے باپ کا نام تک بھی بتا سکتا تھا۔ اسکا خیال تھا کہ اُس کی روح تب ہی مکتی پا سکتی ہے جب پرجا سکھی ہو۔

اُس کا بڑا بیٹا سمپورن جو حسن و جمال کا مجسمہ تھا اور جس کی آنکھوں میں وہ جاذبیت تھی کہ جب وہ اس روح افزا وادی میں پھرا کرتا تھا تو فطرت کی ہر ایک شے حسین بن جاتی تھی۔ اس مختصر سی آبادی میں حسن کا دیوتا اس راجکمار پر پھول برساتا تھا۔

اس نے اٹھارہ برس کی عمر میں گیان اور ودیا سب کچھ حاصل کرلیا۔ راجہ نے پنڈتوں سے کہہ رکھا تھا کہ راجکمار کو دنیا کے تمام علوم سے آگاہ کردو۔ ہر ایک مصیبت اور آفت کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کردو۔ لیکن دنیا میں سب سے بڑی تباہ کن اور خلش انگیز چیز محبت سے آشنا نہ ہونے دو۔ راجہ نے اپنے کتب خانے سے وہ تمام کتابیں جن میں حسن و عشق کے نقوش موجود تھے نذر آتش کردیں حسین داسیوں کے بدلے بدصورت اور بھونڈی شکل کی معمر عورتیں راجکمار کی خدمت گزاری کے لئے متعین ہوئیں۔ راجہ کا مقصد تھا کہ راجکمار پھولوں سے لدے پھندے پودوں میں سیر کرے۔ لیکن اُن کی نکہت کو نہ سونگھ سکے۔ اس وادی کے مرغزار حسن میں پھرے۔ لیکن حسن کی قیمت نہ معلوم کرسکے۔ نازک اور دقیق پتیوں پر مینہ کی بوندیں پڑتی دیکھے۔ لیکن آواز نہ سن پائے۔ اپنے جسم کو ادھر ادھر متحرک دیکھے۔ لیکن اپنی روح کی آواز کی طرف سے کان بند کرلے ــــــ

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ راجکمار اٹھارہ برس کا ہوگیا مذہب اور دیگر علوم وفنون اُس کے دماغ میں ٹھونس

دیئے گئے ـــــ علم کی ہر شق پر وہ مکمل بحث کر سکتا تھا۔ اُسے یہ جتا دیا گیا تھا کہ تم حسین ہو لیکن یہ راز اُس پر افشا نہ ہونے دیا کہ تم کیوں حسین ہو؟ حُسن کی کیا قیمت ہے؟ ـــــ وہ اُس شخص کی طرح تھا جو دریا میں رہ کر بھی پیاسا ہو۔ آنکھیں دیکھتی تھیں لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ کیا دیکھ رہی ہیں۔ پیالہ میں شراب سے بھرا ہُوا ایک مینا تھا لیکن سربمہر۔ اسیطرح دن مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ راجکمار کی اُنیسویں سالگرہ تھی۔ مراسم ادا کرنے کے بعد راجہ نے حکم دیا کہ اب راجکمار تین سال تک روزانہ مندر میں پوجا کے لئے جایا کرے۔ مندر شہر سے تھوڑی دور ایک پہاڑی کی اوٹ میں واقع تھا۔ راجکمار دو پنڈتوں کی معیت میں ہر صبح مندر میں جانے لگا۔

(۲)

اسی راستہ پر پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی کہ وادی کے تمام پھول اسے خراج دیا کرتے تھے۔ فطرت کی رعنائیاں اُس کے قدموں کے نیچے لوٹتی تھیں صبح کے وقت ہوا دُور دُور سے مرغزاروں کی نکہت چرا کر لاتی تھی اور اُس حُسن کے بلوری مجسمے پر نچھاور کر دیتی تھی۔ رات کو تارے الوہیت کی روشنی مستعار لیکر اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ڈالتے تھے جب وہ مخمور آنکھوں سے رات کے وقت اِدھر اُدھر نگاہیں ڈالتی تھی۔ قدرت کے تمام ساز خاموش ہو جاتے تھے۔ تارے آنکھیں جھپکنا بھول جاتے تھے۔ آبشاروں کی آوازیں مدہم پڑ جاتی تھیں ـــــ دملا کی ماں بچپنے میں ہی مر چکی تھی۔ بوڑھے ماہی گیر نے اس موتی کو بڑی حفاظت سے پرورش کیا بوڑھے کی اس عمر میں صرف ایک آرزو باقی رہ گئی تھی وہ دِملا تھی۔ اس کے فرسودہ جسم میں گوشت کا صرف ایک ٹکڑہ درست تھا۔ اور وہ دِملا کا بدن تھا۔ اس کے تمام بدن پر جھریاں اور بال برف کی طرح سپید ہو چکے تھے لیکن دل میں ایک شرار موجود تھا جو اس کے خون کو سرگرم رکھتا تھا۔ وہ دِملا کی صورت تھی ـــــ دِملا کو پھولوں سے بہت محبت تھی۔ اس لئے بوڑھے نے اپنی جھونپڑی کے گرد و پیش قسم قسم کے پھولوں سے تمام پہاڑی کو گلزار بنا دیا تھا۔ دِملا دن رات پھولوں میں کھیلتی۔ ہار بناتی۔ اپنے سر میں گوندھتی اور گلدستے بنا بنا کر جگہ جگہ اپنی جھونپڑی اور درختوں پر لٹکا دیتی۔ پرندے چہچہاتے ہوئے آتے اور کلیوں پر نچھاور ہوتے تو وہ مسرت سے پھولی نہ سماتی اور جب وہ ہنستی تو ہزاروں کلیاں کھل جاتیں۔ جب وہ اپنے گلابی ہونٹوں پر پھول رکھتی تو اُس کی پتیوں کی سرخی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ یہ حسن کی جیتی جاگتی تصویر نہایت دلچسپ زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ حسن رواں اور فطرت اُس کا آئینہ۔ وہ اپنے آپ کو اُس میں پاتی تھی اور مسرت سے بیقرار ہو جاتی تھی ـــــ اسقدر مسرور کہ نادان لڑکی نے کبھی غور نہ کیا کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔

انہیں نشیلی کیفیات میں وہ اپنے اندر ایک یاسمین شباب کی روح بیدار پانے لگی۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ وہ خراماں موسیقی اب جدھر نکل جاتی تھی نظر کا راز بیدکی طرح گھنٹوں تھرتھراتا رہتا تھا۔ اسکی سحر آگیں نظروں سے پہاڑ کی پیشانی سے فرشتیات ٹپک پڑتا تھا۔ وہ جوان تھی۔ جوانی بھی سرشار۔ اور سرشار بھی حسن کی نعمت سے،

اس نعمت سے جس کے سامنے فرشتے بھی مودب کھڑے
رہتے ہیں۔ جب وہ پہاڑی کے پتھروں کو ٹکراتی ہوئی ادھر
ادھر اُدھر چلتی تو ان پتھروں سے ایک غیر فانی نغمہ نکلتا جو
آنِ واحد میں فضا پر چھا جاتا اور ہر ایک شے پر وجد طاری
ہو جاتا۔

بوڑھے ماہی گیر کو احساس ہو چکا تھا کہ یہ حسن کا چشمہ
اب اُبلنے اور قیامت خیز طوفان کی صورت اختیار کرنیوالا
ہے۔ بوڑھا سمجھتا تھا کہ اگر وملا محبت سے آشنا ہو گئی تو
اسکا بڑھتا ہوا نوخیز حسن اپنے لئے ہلاکت اور یاس کا
سامان پیدا کریگا۔ بوڑھا اب دن رات وملا کو حسن و عشق
کے قصے سناتا جسمیں محبت کو نہایت تاریک پہلو میں پیش کرتا
لیکن بوڑھے کی جد وجہد اس وقت بے سود تھی۔ شراب کے
اُبھرے ہوئے مینا سے اس کے نشیلے اثرات نہیں کھینچے
جا سکتے۔ اب اس کی کوشش ایسی ہی تھی جیسے مصور کے
قلم سے حسین ترین عورت کا برہنہ جسم ایک نادر شاہکار کی
صورت میں کھنچ جائے۔ اور بعدازاں وہ مصور اس پر نقاب
ڈالکر ڈھانپنے کی کوشش کرے۔

(۳)

ایک دن کا ذکر ہے کہ وملا اپنے حسن کی شان بےخبری
میں پھولوں اور قدرتی مناظر سے کھیلتی ہوئی دور نکل آئی
اور اسی سڑک پر جا بیٹھی جہاں سے راجکمار کا گزر ہوا کرتا
تھا۔ وہ ایک پتھر پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ پانی
اوپر سے سرکشی اور شور کرتا ہوا آتا تھا۔ لیکن وملا کے
نزدیک پہنچکر اُس کے پاؤں کو چومتا ہوا آگے نکل جاتا تھا۔
اُس نے اپنی نقرئی آواز سے ایک پہاڑی گیت گانا شروع
کیا۔ فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔ حسن اور نغمہ کا امتحان ہوا۔ خدائی
تخلیق کے دو نادر شاہکار جمع ہو گئے۔ وہاں پر کوہن کی سب
طاقتیں بیکار تھیں۔ اُس کے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے اور ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے چاند کے ساتھ دو کالی بدلیاں باندھ دی
ہوں اور چاند ہوا میں اُڑا جا رہا ہو۔ اُس کی رگ وپے سے
انتہائی مسرت پھوٹ رہی تھی۔ اور ترنم کی صدا پہاڑیوں
پر ٹکرا ٹکرا کر ان کو مسحور کر رہی تھی کبھی آواز اتنی دھیمی پڑ جاتی کہ
پانی کی موجوں کے ساتھ مل کر ان میں ملاحت پیدا کر دیتی۔۔۔۔

ابھی اسکا گیت ختم نہیں ہوا تھا۔ کہ اس نے دور پہاڑی
سے تین آدمیوں کو اُترتے ہوئے دیکھا جن میں راجکمار بھی
تھا۔ وملا نے گانا بند کر دیا۔ وہ حیرت سے آنے والونکی
طرف دیکھنے لگی۔ دُور سے اُسے راجکمار کا شاہانہ لباس
نظر پڑا۔ اب اس میں یہی امر اس کی کشش کا باعث ہوا۔ اسے معلوم
ہوا کہ وہ اُسی راستے پر آ رہے ہیں۔ وہ اُٹھ کر بھاگنا چاہتی
تھی۔ لیکن اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے پاؤں کی طاقت
سلب ہو گئی۔ اُس نے بھاگنے کے لئے قدم اُٹھایا۔ نگاہ
اُٹھا کر پہاڑی کی پگڈنڈی کی طرف دیکھا۔ لیکن اُسے احساس
ہوا کہ کوئی اُس کا دامن پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ راجکمار اسوقت
نزدیک آ چکا تھا۔ اُس کے حسن کی شعاعیں وملا کی آنکھوں
میں پڑنے لگیں۔ ان شعاعوں کی کمندوں سے اب کون
بھاگ سکتا تھا۔ وملا کی روح آنکھوں میں اُتر آئی۔ سارا
بدن بےحس تھا۔ رگوں پر جمود طاری تھا .... وہ
نہایت سرعت سے سانس لینے لگی۔ اُس کی نظریں راجکمار
پر جمی ہوئی تھیں۔ راجکمار نے ذرا رک کر وملا کی طرف دیکھا
وملا کی روح کھنچ گئی۔ وہ ٹھٹکا اور رُک کر پھر چل دیا۔ اسی

قلیل ترین عرصہ میں محبت کی ایک غیر فانی داستان کی ابتدا ہوئی۔ کیوپڈ اپنا کام کر چکا تھا۔ پنڈت نے گرج کر کہا۔

"چھوکری کیا دیکھ رہی ہو؟ راجکمار کو پرنام کرو!"

ولّا کے ایک ہاتھ میں بڑا سا پھول تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس کی نگاہیں پانی کی لہروں پہ تیرنے لگیں۔ اور اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر جوڑنے کی ناکام کوشش کی اور لبوں کو خفیف سی جنبش ہوئی۔

راجکمار دُور نکل گیا ——— ولّا کی نگاہیں ابھی تک اُدھر لگی ہوئی تھیں۔ اُس نے پھول کو مسل کر زمین پر پھینک دیا۔

"اے پھول! اب تیری بو مجھے کبھی نہ لبھائیگی"

راستہ میں راجکمار نے پنڈت سے پوچھا:۔

"گیانی جی! کیا وہ چھوکری حسین تھی؟"

"ہاں راجکمار! وہ حسین تھی"

راجکمار چلتا ہوا سامنے عمیق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ایک وقفہ کے بعد پھر پوچھا۔

"گیانی جی! اگر وہ حسین ہے تو ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں؟"

"ہاں راجکمار! ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں"

پہاڑی کے دوسرے چکّر کے قریب پہنچ کر راجکمار نے پھر پوچھا۔

"گیانی جی! یہ حُسن کیا چیز ہے؟"

گیانی کا ماتھا ٹھنکا۔

"راجکمار! حسن وہی چیز ہے جو دل کو بھلی معلوم ہو۔ یہ فطرت کے مناظر۔ یہ پانی۔ یہ پہاڑوں کی روشیں کس قدر حسین ہیں۔ اور خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے یہ چیزیں حسین ترین ہیں"

تھوڑی دیر سوچ کر راجکمار نے لطیف آواز میں کہا۔

"جو چیز دل کو بھلی معلوم ہو گیانی جی! یہی کہا تھا نا"

"یہی راجکمار"

اس کے بعد راجکمار خاموش ہو گیا۔ اسکی آنکھوں کی چمک میں خفیف سا تغیر واقع ہو چکا تھا۔ ایک بے کیف حسن کا محبت کی تمازت سے امتزاج ہونے لگا تھا۔ آج کی پوجا میں اُسے خاص لطف حاصل ہُوا۔

(۴)

"بیٹی ولّا! آج اُداس کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں پتا جی! سر میں خفیف سا درد ہے"

"بیٹی! مجھے پہلے ہی بتایا ہوتا"

یہ کہہ کر بوڑھا دوڑا ہُوا گیا اور ساتھ والی پہاڑی سے ایک بوٹی کے کچھ پتّے لے آیا۔

"ولّو! لو ان پتوں کو سونگھ لو۔ سر کے درد کے لئے بہترین علاج ہے"

ولّا نے طوعاً و کرہاً پتّوں کو سونگھ لیا۔ لیکن دیوانے بوڑھے کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں جو درد ہے وہ لادوا ہے۔ دل پر لگے ہوئے چرکوں کو کس نے مندمل ہوتے دیکھا ہے۔

اُس کی حالت میں دن بدن تغیر ہو رہا تھا۔ اس نے پھولوں سے کھیلنا ترک کر دیا۔ حسن جب سوگوار ہوتا ہے تو کائنات کی تمام لطافتیں چھن جاتی ہیں۔ کلیوں نے مسکرانا چھوڑ دیا۔

"بیٹی! مجھ سے بھی تو کہو۔ آخر کیا بات ہے۔ تمھاری

آواز میں مسرت نہیں اور حرکت میں وہ شوخی نہیں۔ دیکھو تم خاموش ہو تو پرندوں نے بھی چہچہانا چھوڑ دیا ہے۔"

"پتا جی! میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"بیٹی وِملا! اس سنسار میں سکھ اور سنتوش تو کسی شخص کو حاصل نہیں اور آج تک کبھی کسی کی تمناؤں کا دھارا شانت نہیں بہا ہے۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ تمہارے من میں روح کی پوتر روشنی عکس ڈال رہی ہے۔ اور تمہاری مدھ بھری آواز ان پہاڑیوں میں کوئل کی طرح ہمیشہ گونج پیدا کرتی رہے گی۔ صدمہ اور رنج تو اب میں بھی نہ دیکھوں گی۔ بلکہ تمہاری موجودگی میں اس فضا کی تمام کلفتیں دور ہو جائیں گی۔ بیٹی! میں خوب سمجھتا ہوں کہ جب کلی کھلتی ہے تو اس پر ضرور بھونرا بیٹھتا ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو اپنے ساتھ پھولوں کی بو لے اڑتی ہے ...... لیکن کیا میں معلوم کر سکتا ہوں، کہ وہ کون شخص ہے؟ ——"

"پتا جی! میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ میرا دل ایک پتھر کے نیچے دبا ہوا ہے۔"

وِملا نے آج ارادہ کیا کہ وہ راجکمار کو چھپ کر دیکھے گی۔ روح کو تسکین دینا ایک غیر معمولی اور اہم مرحلہ ہے۔ لیکن آنکھوں کے راستہ سے روح کا اتر جانا سہل ترین کام ہے۔ اس نے اپنے گرد و نواح سے بہترین پھولوں کا انتخاب کیا۔ توڑتے وقت گنگنا رہی تھی۔

"پھولو! آج میں تمہیں حسن کے دیوتا کے پاؤں پر بھینٹ چڑھاؤں گی۔ پرماتما سے بنتی کرو کہ تمہاری بھینٹ سویکار ہو جائے۔"

اس کے ہاتھوں میں اس وقت محبت کے تمام جذبات کا اجتماع ہو چکا تھا۔

اس کی رگ و پے سے شعریت ٹپک رہی تھی۔

اسے آج تنہا اور سنسان دنیا کا احساس ہوا۔

وہ اپنے آرزوؤں کے پلندہ کو اٹھائے ہوئے سڑک کی طرف چل دی۔ وہ آج دیکھنا چاہتی تھی کہ محبت کے دیوتا میں کتنی شگفتگی باقی ہے! آنکھوں کا سحر کہاں تک اثر پذیر ہو سکتا ہے! دل کی دنیا کیسے بدل سکتی ہے!

بوڑھا ماہی گیر بھی کہیں چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ وِملا کے پیچھے ہو لیا۔ آج وِملا کو دیکھ کر پھولوں نے سرگوشیاں کیں۔ وہ آج معمول سے زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک نامعلوم لذت سے بہرہ اندوز ہونے جا رہی تھی۔ بوڑھا بھی اس کے پیچھے تھا لیکن وہ اس کی گرد کو نہ پا سکتا تھا۔ وہ اس ہرنی کی طرح بڑے بڑے پتھروں کو پھاندتی ہوئی جا رہی تھی جس کے بچے کو شکاری اٹھا کر لے گئے ہوں۔ اور وہ دیوانہ وار اس کی تلاش کر رہی ہو۔ روح کے تلاطم اور جذبات کے ہیجان سے وہ تیتری سے بھی زیادہ ہلکی ہو گئی تھی۔ —— اسے احساس تھا کہ وہ اپنی زندگی کا اولیں اور اہم ترین فرض ادا کرنے جا رہی ہے۔

وہ سڑک پر پھولوں کو ہاتھ میں لئے منتظر کھڑی تھی بوڑھا ایک وقفہ کے بعد وہاں پہنچا اور سڑک کے اوپر ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ رہا۔

راجکمار اور دونوں پنڈت دور سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وِملا چاند کے عکس کی طرح جو پانی میں ہر کانپ رہی تھی۔ نور پاش نگاہیں آنے والوں پر جمی ہوئی تھیں ——

اس کی آنکھوں سے جرأت ٹپک پڑی۔ اس نے اپنے

کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"راجکمار! تمہیں پرنام کرنے آئی ہوں۔ غریب لڑکی کا یہ تحفہ قبول کرو۔"

راجکمار کے خنک چہرہ پر ایک کندنی شعلہ ظاہر ہوا۔ اس نے بےتکلفی سے وِملا کی طرف دیکھا اور بے اعتنائی سے آگے چلدیا۔

"راجکمار!......"

پنڈت نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

"خاموش رہو چھوکری!"

وِملا کو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مُنہ پر تھپڑ مار دیا اُس کی خاموش نگاہیں راجکمار کے تعاقب میں تھیں۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں ———

(۵)

"بیٹی! تمہارے دُکھ کا کارن مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ وِملا! اگر تمہارے لئے مجھے آسمان سے تارے چُرا کر بھی لانا پڑتے تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی پس و پیش نہ کرتا۔ اگر دیوتاؤں کے جڑاؤ سنگھاسن میں سے تمہیں کوئی موتی درکار ہوتا۔ تو میں وہاں سے بھی نوچ کر لے آتا ——— لیکن تم نے کبھی اس بات کا بھی وِچار کیا ہے کہ چکور خواہ کتنا ہی بلند اُڑ جائے لیکن چاند تک نہیں پہنچ سکتا؟ تمہارا نشچے صرف پرماتما ہی دور کر سکتا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ اس جگ میں چارکھونٹ پاپ کا اندھیرا چھا رہا ہے۔ لوگوں نے من کی آواز سننا تیاگ دیا ہے۔ ایک راجہ ہے تو دوسرا بھکاری! بھکاری کی یہ اچھیا زندگی بھر میں پوری نہیں ہو سکتی کہ وہ راجہ سے ہمکلام بھی ہو سکے۔ یہ انسان کی بنائی ہوئی دنیا ہے جہاں لوبھ ترشنا اور اہنکار کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ایشور کی مرضی یہیں ہے ——— تم نے جھونپڑی میں بیٹھ کر محلوں کا سپنا دیکھا ہے۔ اب اس کشٹ کو جھیلو۔ جیسے بھی ہو سکے جھیلو۔ اب صرف بھگوان پر ہی نظر رکھو کہ تمہارے جیون کو سکھ ملتا ہے یا دُکھ ——— لیکن قیاس یہی ہے کہ تمہاری نربل آتما کو اب وہ شانتی کبھی نصیب نہ ہو گی ...... تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ راجکمار کی شکل موہنی ہے۔ لیکن اس کے سینے میں پگھلنے والا ہردے نہیں۔ راجہ کے حکم سے اس کو ایسی شکشا دی گئی ہے کہ پریم کا وشواش اُس کے دل میں ذرہ بھر بھی نہیں ہو سکتا۔

وہ راجکمار تم ایک غریب و بیکس بوڑھے ماہی گیر کی بیٹی......"

"پتا جی! میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" اُس کی حسین آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمڈ آیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دائمی کشٹ جھیلنے کو تیار ہے۔ روح فرسا اور جانسوز زندگی بھی اُس کو اپنے ارادہ سے باز نہ رکھ سکیگی۔

بوڑھا سر ہلاتا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکل گیا۔ وِملا کا دُکھ وہ کیسے دور کر سکتا تھا؟ ——— "راجکمار کو قتل کر دوں سارا قصہ پاک ہو جائے گا ——— لیکن اس سے وِملا کی زندگی تادمِ مرگ وبالِ جان رہے گی۔ درد کی دوا پانے کے باوجود درد لا دوا رہے گا۔ اور ہمیشہ گھل گھل کر غم کے اندھیرے میں اپنے جی کو ہلاک کرتی رہے گی ———"

بوڑھے کے پاؤں کی سکت سلب ہو چکی تھی۔ وِملا کا غم اُس کا غم تھا۔ لیکن دونوں کے نبھاؤ کا فرق تھا۔ اس نے

لاٹھی زمین پر پھینک دی اور خود ایک پتھر پر گر پڑا۔
وملا نے جب بوڑھے کے ہذیان پر غور کیا تو وہ ہنس پڑی "انجام پر غور کروں؟ روح کو آزار نہ پہنچاؤں"
اس خیال سے اُس کے خشک چہرہ پر ملال انگیز تبسم پیدا ہوا۔

(۶)

جب مایوسی آنکھوں سے آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلے تو ابھی وہ یاس کی انتہا متصور نہ ہوگی۔ یاس کی انتہا اُس وقت ہوگی جبکہ چہرہ سے اُس کے آثار نظر نہ آئیں —— یاس خود وہ یہ سمجھ لے کہ اب اس میں کوئی شبابی کیفیت باقی نہیں رہی اور روح بے آرزو ہو چکی ہے جب سینے سے آرزوؤں کے طوفان اُمڈ اُمڈ کر آئیں روح کی غم انگیز مستیاں آنکھوں سے شراروں کی طرح چمک رہی ہوں۔ روح اور جذبات بلندیوں کی طرف پرواز کرنا چاہتے ہوں تو سمجھ لیجئے کہ ابھی یاس انتہا کو نہیں پہنچی۔
وملا سمجھ چکی تھی کہ راجکمار پتھر ہے۔ اور اسے پتھر میں جان ڈالنا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر محبت کا جذبہ خدا کی دنیا میں اب تک موجود ہے اور جیسا کہ قیاس کیا جاتا ہے کہ خدا کی تخلیق کا یہ انتہائی شاہکار اور عظیم ترین شائبہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ راجکمار اس سے متاثر نہ ہو۔ پیمانہ میں جب تک شراب نہ ڈالی جائے وہ ایک بے وقعت سا شیشے کا ایک ڈھانچہ ہے۔ لیکن جونہی اسمیں ارغوانی رنگ لہریں لیتا ہے تو وہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے راجکمار پتھر نہیں ہے۔ بلکہ پتھر بنا یا گیا ہے۔ اب وملا کا اور صرف وملا کا فرض تھا کہ وہ اپنے احساس کی بلندی اور رُوح کی افسوں گری سے اس کو اصلی روپ میں لائے۔
اب وملا کو اس خوشنما جھونپڑی میں سکوت وطمانیت کا ملنا غیر ممکن تھا۔ کیونکہ سکونِ قلب کا صحیح مقصد وہ پا چکی تھی وہ اس دم تک وہاں مطمئن تھی جبتک کہ وہ تسکین کے معنوں سے ناآشنا تھی۔ اب اُس کے خون کو گرما دینے والا جذبہ ہر وقت اُس کے سینے میں تلاطم انگیز تھا۔ وہ اطمینان ڈھونڈتی تھی لیکن اس کی تلاش میں زیادہ بیقرار ہوئی جاتی تھی۔
پہاڑوں کی سنگین پیشانی پر وہ اپنے ماتھے کا لکھا پڑھنا چاہتی تھی۔ وہ دشوار گزار پہاڑی پگڈنڈیوں سے گرتی سنبھلتی ہوئی نشیب میں ایک جھیل پر پہنچ گئی۔ اردگرد پہاڑیوں کی بلند دیواروں پر دھیمی دھیمی ہوا سرسرا رہی تھی۔ جھیل کا پانی تاروں کی وادی کی طرح خاموش تھا۔ چارسو سکون طاری تھا۔ اسقدر سکون کہ ہوا کی سرسراہٹ بھی اس سکون میں اضافہ کر رہی تھی۔ سپید بگلوں کی ایک ڈار دور اُفق میں گم ہو رہی تھی —— اس روح پرور سکون سے اس کا اضطرار دور نہ ہو سکا۔ پھول کی ایک جھکی ہوئی ڈالی کو اُس نے ہاتھ میں لیا۔ اور آہستہ آہستہ بلندیوں کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ اُس نے ڈالی کو مروڑ کر چھوڑ دیا اور وہ مایوسی کے گڑھے سے بلندیوں کی طرف جانے لگی۔ بلندی کیطرف جاتے ہوئے اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ غم کی ایک کڑی منزل طے کر رہی ہے —— ایک بلندی پر پہنچ کر اس نے نظر اُٹھائی تو برفانی چوٹی سامنے تھی —— وہ وہاں تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اُمنگیں اُمڈ آئیں۔ شباب خیز کیفیتیں رگ رگ اور نخ نخ میں سرایت کر گئیں۔ پرغور آنکھیں کسی غیر فانی نقطۂ کشش پر جم گئیں —— وہ اُڑنے لگی اور اُڑتی ہوئی

یزدانی چوٹی کی طرف جارہی تھی ——— ارادے کہیں
صدا ادراک سے دور مربوط ہو رہے تھے۔ چوٹی کے نچلے رستے
پر پہنچ کر وہ ہانپتی ہوئی گر پڑی۔ اس کی چھاتی کے اُتار چڑھاؤ
سے فطرت ہنڈولے لے رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ اٹھی اپنے
بکھرے ہوئے بالوں کو آراستہ کیا۔ اور آسمان کی طرف
نگاہ ڈالی جہاں شفق کا ہلکا سا رنگ نیلگوں چھت میں جذب
ہو رہا تھا۔ اور کہیں کہیں "تارے" ایک دیگر سے بہت دور چمکنا
شروع ہو گئے تھے۔ وِملا کی آنکھیں بفور جوش سے آہستہ
آہستہ بند ہوئیں اور دو بڑے بڑے آنسو اس کے گلابی
رخساروں سے ڈھلک کر پھول کی پتی پر آ گرے۔ اس نے
ایک دفعہ پھر آسمان کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہاں کسی
کھوئی ہوئی چیز کی جستجو کر رہی ہے۔

"پرماتما! میں جانتی ہوں کہ تو ہر جگہ موجود ہے میرے
باپ کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں بھی تو موجود ہے۔ لیکن جسے
تسکین اور طمانیت نہ ملے اُسے کس طرح یقین آئے کہ تو
ہر جگہ موجود ہے۔ روح ہمیشہ بلندیوں کی طرف جاتی ہے
اس لئے کشاں کشاں میں اس چوٹی پر پہنچ کر سمجھتی ہوں
کہ تیرے چرنوں کے نزدیک آ گئی ہوں۔ اے بھگوان!
میری آواز سن! ایک غریب لڑکی کی آواز جو درد اور
کرب سے لبریز ہے سُن!! دنیا کی تمام اُمنگوں اور تمناؤں
سے بے نیاز ہو کر تیرے پاؤں کو چھونے آئی ہوں۔

اے شکتی دان! اگر تجھ میں اتنی شکتی ہے کہ اپنے
منش کے دل کو زیر و زبر کر دے تو میں تجھ سے پرارتھنا کرتی
ہوں کہ راجکمار کے دل کو زیر و زبر نہ کر بلکہ مجھ میں، میری آنکھوں
میں، میرے آنسوؤں میں، میری شخصیت میں اتنا اثر دے
کہ میں اس بے حس دل میں انقلاب برپا کر سکوں۔ اے
ایشور! اثر مانگتی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میرے کشٹ کا
خاتمہ ہو جائے۔ بلکہ اس لئے کہ تیری تخلیق میں سے ایک
بہترین رُوح محبت جیسے آسمانی تحفہ سے نا آشنا نہ رہے۔
اے بھگوان! تمہیں معلوم ہے میں کب سے کشٹ جھیل
رہی ہوں۔ آج تک تم سے میں نے امداد کے لئے دعا
نہیں کی۔ اگر وہ میرا نہیں ہو سکتا تو نہ ہو۔ لیکن مجھ میں اتنا
اثر دے کہ میں اُس کے دل میں پریم کے سوتی ہوئی پریوں
کو جگا سکوں۔

اے دُوتیوں کے کھویّا! جیون کا سکھ اس لئے
نہیں مانگتی کہ باقیماندہ زندگی عیش و عشرت سے بسر کروں۔
میں چاہتی ہوں کہ بے چینیاں اور بے قراریاں اس سے
بھی دُگنی ہو جائیں لیکن ہوں کسی اور رنگ میں ———
اتنا تو ہو کہ وہ میرے آنسوؤں کی چمک معلوم کر لے"۔
اتنا کہہ کر اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا "تار" بندھ گیا

"اے بندھنوں کے توڑنے والے! بندھنوں میں
رہ کر تجھ سے نجات کی خواہشمند ہوں۔ . . . . . .
میری روح کو آزاد کر . . . . "

اس کے بعد وہ ہچکیاں لیتی ہوئی ایک پتھر پر گر پڑی
آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔ ایک عرصہ
تک وہ وہاں پڑی رہی۔ پتھر کا سنگین کلیجہ بھی اُن مقدس
آنسوؤں سے ڈھل گیا . . . . فطرت نے ماتمی
لباس پہن لیا۔

(۷)

وِملا کو احساس تھا کہ اس کی دعا بارگاہ عالی میں قبول

ہوچکی ہے ۔ دل کو طمانیت اور روح کو مسرت سی محسوس
ہونے لگی ——

اُس نے آج پھر شگفتہ اور دلآویز پھولوں کا
انتخاب کیا ۔ روح کو جب اطمینان ہوتا ہے تو فطرت کی
ہر ایک شے سکون پرور ہوجاتی ہے ۔ وہ خاموش لہر
کی طرح پھولوں کے پودوں میں متحرک تھی ۔ آنکھوں کی
آلمانہ چمک فضا کو پُرنور کررہی تھی ۔ رگِ صہبا میں
نشہ مچل رہا تھا ۔ اور بے اختیار ہوکر اُنڈ پڑنا چاہتا
تھا ۔ پھولوں سے جھولی بھر کر وہ ابرِ رواں کی طرح
دل میں ایک کیف لئے ہوئے پہاڑیوں پر سے
گذر رہی تھی ۔ وہ خاموش تھی اور مقدس سکون چار سو
پھیلا ہوا تھا ——

سڑک پر پہنچکر وہ ٹھٹک گئی ۔ اُسے خیال پیدا
ہُوا کہ اگر بارگاہِ عشق میں اُس کی دعا قبول ہوچکی ہے تو
اُس کے امتحان کا یہی وقت ہے ۔ میری روح اور شخصیت
میں کتنا اثر ہے ؟ اپنے اُبلتے ہوئے آنسوؤں کا تحفہ
پیش کرکے میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی تھی وہ کہاں
تک عرشِ اعظم میں تھرتھری پیدا کرنے میں کامیاب
ہوئی ؟ اس کا جواب آج ہی مانگتی ہوں ۔ بادل کے سینے
میں برقِ خیرہ ستم ہر وقت موجود رہتی ہے ۔ لیکن اس کے
چمکنے کے لئے خاص اوقات ہوتے ہیں ۔ آج وہی وقت
آگیا ہے ۔

یہ خیال کرکے اُس نے پھولوں کو راستہ میں
بکھیر دیا ۔ اور خود پہاڑی کی اوٹ میں ایک پودے
کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی ۔

اُس کے کانوں میں باتیں کرنے کی دھیمی سی آواز
آئی ۔ راجکمار پھولوں کے نزدیک پہنچ چکا تھا ۔ یہ ٹھیک
وہی جگہ تھی جہاں پہلے وہ دو مرتبہ پہلے وملا کو دیکھ چکا
تھا ۔ اور اُس دن کے بعد ہر روز وہ وملا کو دیکھنا چاہتا
تھا ۔ اور اس جگہ پہنچکر ایک غائبانہ کشش اُسکو مجبور
کرتی تھی کہ وہ اِدھر اُدھر دیکھے ۔ آج سڑک پر پھول بکھر
ہوئے دیکھ کر اُس نے سوچنا چاہا ۔ لیکن دوسرے لمحہ وہ
پھولوں کو پاؤں سے روندتا ہُوا آگے نکل گیا ۔

وملا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی ۔ کل کائنات اسکی آنکھوں
کے سامنے اُڑنے لگی ۔ روح مایوسی کی انتہائی گہرائیوں
میں ڈوب گئی ۔ اُس نے آسمان کی طرف طنز آمیز نظروں
سے دیکھا اور مُسکرا پڑی ۔

"پرارتھنا ..... اور .... قبولیت ...
..... اونہہ"

اُس نے ہر طریقے سے اپنی قسمت آزمائی ۔ اب امید و
بیم کی کشمکش میں رہنا فضول تھا ۔ مشیتِ ایزدی صاف
معلوم ہوچکی تھی ۔ اس قمار باز کی طرح جو قمار خانہ سے صرف
اپنی جان لیکر باہر نکلے اور باقی سب کچھ وہاں کھو بیٹھے وہ
پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر باہر آئی ۔ اب وہ مایوس ہوچکی
تھی ۔ ہونٹوں پر ارتعاش تھا لیکن کچھ کہہ نہ سکتی تھی ۔ اب
کہنے کے لئے اُس کے پاس الفاظ نہ تھے ۔

اُس نے روندے ہوئے پھولوں کو ٹوٹے ہوئے
دل کے ٹکڑوں کی طرح جمع کرلیا اور نہایت اطمینان سے
گھر کو لوٹی ۔

جب وہ راندۂ قسمت یاس انگیز اطمینان دل میں

لئے ہوئے گھر کو جا رہی تھی۔ تو راجکمار کہہ رہا تھا۔

"گیانی جی! راستہ میں بکھرے ہوئے پھول آپکو نظر پڑے تھے؟"

"ہاں راجکمار"

"اس کا مطلب؟"

"راجکمار! میرے خیال میں کوئی شخص پھولوں کی جھولی بھر کر ادھر سے گزرا ہوگا اور کچھ پھول راستے میں گر گئے ہونگے"

"گیانی جی! لیکن وہ پھول میرے دل کو بہت بھلے معلوم ہوئے تھے جس شخص نے ان پھولوں کا انتخاب کیا ہوگا وہ کس قدر رانش مند ہوگا"

"راجکمار! اگر آپ کہیں تو وہ پھول بھاگ کر اٹھا لاؤں"

"نہیں! میں ان کو روند چکا ہوں اور اسی خاطر میں نے ان کو روندا تھا کہ فطرت کی حسین چیزوں کو روندنے سے مجھے قلق ہوگا یا نہیں۔ چند لمحوں کے بعد ہی میں نے دیکھ لیا کہ کوئی شخص میرا کلیجہ مسوس رہا ہے۔ اور اسی باعث میں نے آپ سے ان پھولوں کے متعلق سوال کیا تھا"

"راجکمار! ویدوں میں لکھا ہے کہ اس قسم کے وشواش دھرم کا نشٹ کر دیتے ہیں"

"ٹھیک ہے۔ لیکن میں اسے وشواش نہیں سمجھتا گیانی جی! ہمیں جہاں دو دفعہ وہ لڑکی ملی تھی پھول اسی جگہ پڑے ہوئے تھے نا ——؟"

(ایک وقفہ کے بعد) "راجکمار! شاید وہی جگہ تھی"

اس کے بعد راجکمار خاموش ہوگیا اور آج کی پوجا مطلق بے کیف تھی۔

(۸)

ومِلا جب گھر پہنچی تو یاس و حرماں کی گھٹا آسمانی زمینوں کو چھپا چکی تھی۔ اس کی حالت اس شہزادی کی طرح تھی جو اپنے محلوں سے باہر سکھیوں کے ساتھ کھیلنے گئی ہو اور کھیلتے کھیلتے بچھڑ گئی ہو اور تمام دن کی کوفت اور تکان کے بعد اسے اپنے محل کا راستہ ملا ہو۔ شام کے دھندلکے میں وہ خستہ و خراب حالت میں محل کے دروازے پر آئے اور دربان اسے نہ پہچانے اور دھتکار کر پرے ہٹا دے وہ کہتی رہے "میں شہزادی ہوں —— شہزادی میں ہی ہوں" لیکن دربان ایک نہ سنے کیونکہ وہ اسے اس خستگی میں پہچاننے سے قاصر ہے۔ شہزادی ناچار لڑکھڑاتی ہوئی واپس ہو اور سامنے مہیب اور دہشتناک اندھیرا ہو ——

ومِلا کے سامنے اس وقت روح کی تاریکی تھی۔ وہ اپنے گھر میں اس طرح داخل ہوئی گویا وہ اپنے گھر سے نکل کر صحرا کی طرف بھٹکتی ہوئی جا رہی ہے۔ آنکھوں میں آنسو نہ رہے۔ دل کا آتشکدہ ٹھنڈا ہوا اور روح بلندیوں کی طرف جانا بھول گئی —— روندے ہوئے پھول نہایت احتیاط سے اس نے محفوظ کر لئے۔

لمحے گھڑیوں میں، گھڑیاں دنوں میں تبدیل ہوتی گئیں حسن ابھی تک سوگوار تھا۔ آسمان ابھی تک خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ چنگاری جب راکھ میں دب جائے تو اس کا وجود عدم کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن اگر کپڑوں کی لاتعداد تہوں میں آگ کا ایک شرار بھی موجود ہو تو وہ ضرور ظاہر ہوگا۔ ومِلا بلندیوں سے گری تھی اور گر کر خاک

میں مل چکی تھی۔ اب سوائے جاں گسل سکون کے اور کوئی
چارہ کار نہ تھا۔ اسیطرح کئی مہینے گذر گئے۔

ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی دفعہ اُس نے آسمان کی
طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا، پھر مسکرا پڑی۔ "پہاڑ کی وہ چوٹی
اور وہ دعا اور یہ قبولیت" ـــــــ اس نے دل
میں خیال کیا۔

"یہ سب ڈھونگ ہے۔ ایک من گھڑت ہوّا بنا
رکھا ہے۔ اگر پرماتما ہو تو اس جگ میں غریب کی آواز
کیوں صدا بصحرا ثابت ہو۔ بیکس کے آنسو عرش اعلیٰ
میں کپکپی پیدا کرنے کو کافی ہیں بشرطیکہ ان کو کوئی دیکھنے
والا ہو۔ روح بلندیوں پر جاکر پاش پاش ہو جاتی ہے
اور فضا میں بکھر جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی پرماتما کی شکتی
کا اظہار نہیں ہوتا۔ خون برسانے والی آنکھ پر آسمان سے
رحم اور شفقت کا ایک قطرہ نہیں گرتا ـــــ اب کوئی
کیا کہے کہ ہماری زبان سمجھنے والا آسمان میں موجود ہو
ـــــ اُس سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنا خیال کرکے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے
لیکن کسی مصلحت سے آنکھوں کی پتلیوں میں ہی جذب
ہو گئے۔ خوابہائے رنگیں نے دماغی کیفیات پر تسلط
کیا۔ کیا روح کو ماضی سے کچھ تعلق نہیں؟ کیا یہ فراموشی
کی گہرائیوں میں اک افسانہ تھا ــــ؟ وہ اپنی
جگہ سے اُٹھی۔ اپنے کمرہ میں گئی۔ لکڑی کا ٹوٹا ہوا صندوق
کھولا۔ ایک اُجلے سے کپڑے کی تین چار تہیں کھولتے
وقت وملا کے چہرے کے جذبات کا اُتار چڑھاؤ صاف
طور پر عیاں تھا۔

ان روندے ہوئے پھولوں کی پژمردہ اور
بے جان پتیاں لاتعداد ٹکڑوں میں تبدیل ہو چکی تھیں
وملا نے تقدس آب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔
پھر دامن میں ڈال کر باہر نکل آئی۔

اب معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ لیکن
وہ آہستہ آہستہ جیسے پانی پر پچھلے پہر کی ہوا چل رہی
ہو سڑک کی طرف چل دی۔ اس کے بلور سے شفاف
بازو کاندھوں تک عریاں تھے۔ ہوا سے بال اُڑ اُڑ کر
چہرے پر پڑ رہے تھے۔ اُس کی نگاہیں کسی غیر معمولی دنیا
میں مرکوز تھیں۔ وہ آج بے مدعا گھر سے نکلی تھی۔ اسے
معلوم نہیں تھا کہ اسکا نازک اور سیمیں بدن کدھر اور کیوں
جا رہا ہے۔ جب وہ سڑک کے نزدیک پہنچی تو وہ ٹھٹک
گئی ـــــ "میں راجکمار کا انتظار کیوں کروں!"

لیکن جلدی ہی وہ سنبھل گئی۔ "مقدر آزما چکی ہوں۔
امید و بیم کی کشمکش مٹ چکی ہے۔ سمجھتی ہوں کہ وہ میرا نہیں
ہو سکتا۔ تاہم سڑک پر سے گزر جانا گناہ نہیں سمجھتی۔ اس کا
انتظار نہیں کروں گی۔ اتفاق سے اگر وہ راستہ میں مل
گیا تو اتنا کہہ دوں گی "راجکمار! مجھے تم سے محبت ہے"
اس کے پاس اگر دل نہیں کان تو ہیں۔ اگر وہ محبت کو نہ سمجھے
تو نہ سہی سُن تو لیگا۔ یہ راز میرے سینے میں پہاڑ سے بھی
زیادہ سنگین ہے اسے کیوں چھپائے رکھوں۔ آسمان پر
جب تارے ٹوٹتے ہیں تو کائنات کے کئی حصے منور ہو
جاتے ہیں۔ یہ گراں بہا راز جس میں میری آہیں آنکھوں سے
بہ کر نکلتی رہی ہیں۔ اور سینے سے دھوئیں اُٹھ کر دماغ پر
چھا جاتا رہا ہے۔ بالکل لاطائل تھا ـــــ اگر وہ راستے میں

مل گیا تو یہ راز اپنے سینے سے نوچ کر باہر پھینک دوں گی۔ وہ سمجھے یا نہ سمجھے اس سے کچھ مطلب نہیں ——"

اس طرح وہ ضمیر کو پھسلاتی ہوئی سڑک پر آگئی دماغ میں وہی رنگینیاں وہی کیف عود کر آیا۔ وہ محوِ انتظار ہو گئی لیکن راجکمار کو دور سے دیکھ کر اس پر وہ لرزہ طاری نہ ہوا۔ راجکمار نزدیک آیا تو ودّلا کی لمبی اور گھنی پلکیں لجائیں اور لجا کر جھپکنا بھول گئیں۔

راجکمار رُک گیا۔

ودّلا نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔

لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟

"ودّلا"

"ودّلا! تم بہت دنوں سے یہاں نہیں آئیں"

ودّلا کو ایسا معلوم ہوا کہ راجکمار کہہ رہا ہے

"ودّلا! مجھے تم سے محبت ہے" اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے ٹھہر گیا۔ کیف کی نورسامانیاں اس کی روح پر چھا گئیں۔

"راجکمار! اتنے دنوں کے بعد آپ کے لئے یہ تحفہ لائی ہوں"

یہ کہہ کر اس نے دامن کی تہ کو کھولا۔ راجکمار نے ماتھے پر شکن ڈال کر کہا۔

"لڑکی! ہمارے لئے یہ تحفہ....

پھولوں کی پژمردہ اور سڑی ہوئی پتیاں!"

"ہاں راجکمار! آپ کے لئے اس سے بہتر اور کوئی تحفہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہ پھولوں کی سڑی ہوئی پتیاں نہیں بلکہ کسی غریب لڑکی کے ٹوٹے ہوئے دل کے بارے ہیں۔ انہیں دیکھ اور آنکھیں کھول کر دیکھ ——!

میں اتنا سمجھتی ہوں کہ تیری آنکھیں ہیں۔ دل نہیں ہے۔ تم میں روح ہے لیکن اس کی گہرائیاں جو جذبات کی فراوانی سے دلآویز بن جاتی ہیں تیرے سینے میں نہیں آئیں۔ اے نور کے مجسمے آ! میں تجھے زندگی کا عظیم ترین راز بتاؤں۔ تیرے اندر ایک کاشانۂ نور ہے لیکن پھر بھی تو ابھی تک تاریکی میں ہے۔"

یہ باتیں سن کر پنڈت برانگیختہ ہو گیا۔ اور لڑکی کو ڈانٹنا چاہا۔ لیکن راجکمار نے کہا۔

"گیانی جی! میں اس لڑکی کی باتیں سننا چاہتا ہوں"

اس نے پھر ودّلا کی طرف تلطف آمیز نگاہیں ڈالیں۔

"اے میرے چاند! رات میں نے سپنا دیکھا کہ دیوتاؤں کی محفل رچی ہوئی ہے۔ باری باری ہر ایک دیوتا اپنے اپنے سنگھاسن پر بیٹھا ہوا روحانی نغموں سے فضا کو پُرکیف بنا رہا ہے۔ معاً محبت کا دیوتا ہاتھ میں چند مسلے ہوئے پھول لے کر داخل ہوتا ہے آنکھوں سے شرارے برس رہے ہیں اور دوسرے دیوتاؤں سے مخاطب ہوتا ہے۔

"اے دنیا کے نگہبانو! میں تمہیں آج ایک ایسے گناہ کی تفصیل سناتا ہوں جس سے تمہارے کان آشنا نہیں۔ ان پھولوں کی طرف دیکھو جن میں اس گناہ کا راز پنہاں ہے۔ آج میں تمہاری روحانیت کی بلندیوں کو ناپنا چاہتا ہوں بتاؤ تمہاری طرف سے اس شخص کے لئے کونسی سزا مقرر ہو گی جس نے تمہارے دربار سے ایک غیر فانی حسن پایا ہے لیکن تربیت کے ہاتھوں محبت

سے بالکل بے بہرہ ہے۔ ایک حسین ترین لیکن غریب لڑکی
اپنا دل اس پر نچھاور کر دیتی ہے۔ لیکن اس بیکس لڑکی کی
وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس کے دل میں محبت کا
مقدس دریا بہہ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی پگھلی ہوئی آگ اس
کے حلق سے نیچے اُتاری جاتی ہے۔ فطرت کا ہر ایک راز
اس لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ اس غربت میں بھی امیر
تھی۔ لیکن اس شخص سے محبت کر کے وہ خاک ہو گئی۔ اُسے
یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ پتھر سے ٹکرا رہی ہے۔ آبشار کی
ترنم ریز دھیمی سی آوازیں، پتھروں میں چھپا تے ہوئے
پرندوں میں سمندروں کی تاریکیوں میں بسنے والی مچھلیوں
میں خزاں دیدہ ہوا میں، اُڑتی ہوئی پتیوں میں ----
فطرت کے ہر ایک حسن میں، محبت کا جذبہ موجود ہے۔
لیکن اس شخص کو کس بنا پر محبت سے نا آشنا رکھا گیا
ہے! ---- ان پھولوں پر اس لڑکی نے اپنی
روح چھڑک کر اس حرک سنگ گراں بار کے سامنے
پیش کیا۔ یہ پھول نہیں بلکہ آنکھیں ہیں۔ لیکن وہ شخص ان
پھولوں کو روندتا ہوا گزر گیا۔ جس دن یہ پھول روندے
گئے۔ اُس دن میں نے سمجھا کہ دنیا پر میری حکمرانی کا
خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اس دن کیا تمہارے دلوں پر لرزہ
طاری نہ ہوا تھا۔ کیا تمہاری قدسیت بھری آوازیں فضا
میں گونج نہ اٹھیں؟

اے آرام سے زندگی بسر کرنے والے دیوتا! اس
مجبور محبت لڑکی کے درد و کرب کی قیمت کا اندازہ لگاؤ۔
جس نے یہ پھول اپنی آنکھوں سے روندتے ہوئے دیکھے
کہاں ہے تمہارا انصاف! کہاں ہے تمہارا قہر!!

راجکمار! اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے
تھے۔ اُس کا بدن غصّے سے بید کی طرح کانپ رہا تھا۔
میں خوفزدہ ہو کر بیدار ہو گئی۔"

راجکمار کی نگاہیں نیما پر جمی ہوئی تھیں خوف کے
احساس نے اس میں ایک روح پرور کیف کی لہر دوڑا
دی۔ اس کا رنگ سُرخ اور آنکھیں مخمور سی ہو چکی تھیں۔

"راجکمار! مغنی جب اپنے لحن سرور انگیز میں ڈوب
جاتا ہے اور تانیں عین بلندی پر ہوتی ہیں تو وہ آگے راستہ
نہیں پاتا اور اپنا کمال اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ نچلی سروں
کی طرف پھر لوٹے۔ لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔ جب میری
اُلفت کا نغمہ حسن کی رفعتوں میں اڑ رہا تھا۔ میں نے لوٹنے
کی بجائے ساز کو توڑ دینا مناسب سمجھا۔ اس دن جب
تم میرے پھولوں کو روندتے ہوئے گزر گئے میں نے
اپنا ساز توڑ دیا اور مایوس ہو گئی ---- اور میری مایوسی
کی یہ نشانی ہے ---- یہ کمہلائی ہوئی پھولوں کی پتیاں!

راجکمار! میں تم سے یہ نہیں کہتی کہ مجھ سے محبت کرو
بلکہ میں صرف اتنا جتا دینا چاہتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت
ہے۔ اُس دن سے محبت ہے جب میں نے پہلی بار تمہیں
دیکھا۔ اس دن سے آج تک مجھ پر کیا گذری۔ اس کا جواب
آسمان پر بیٹھے ہوئے دیوتا دیں گے۔ راجکمار! اگر تم محبت
کو نہیں سمجھ سکتے تو روح کو سمجھتے ہو گے؟ تم میری روح کے
مالک ہو جس طرح شریانوں میں صاف خون دوڑ رہا ہے
اسی طرح تمہارا تصور، تمہاری محبت میری روح پر چھا
چکی ہے۔

راجکمار! میں ایک بوڑھے ماہی گیر کی لڑکی ہوں

تو ایک راجکمار ہے۔ پھر بھی تم سے محبت کرتی ہوں، ایک بے حقیقت سا چکور چاند پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے بلندیوں کی طرف اڑتا ہے، نحیف و نزار پروانہ بلا خوف و خطر آگ میں کود پڑنے کو تیار ہوتا ہے۔ اگر میں ایسا کرتی ہوں تو میرا کوئی دوش نہیں۔

راجکمار! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ کتنی دفعہ میں نے تمہارے نقشِ پاکی خاک اپنے ماتھے پر ملی ہے۔ اپنے آنسوؤں کے ہار بنا کر کتنی دفعہ تمہاری بلوری گردن میں پروئے ہیں۔ میں جب سوگوار ہو جاتی تھی تو قدرت کے تمام نمائندے ماتم کرتے تھے ——— تیرا حسن، میری محبت ——— دونوں ملکوتی سانس تھے۔۔۔۔۔۔

بالآخر میں مایوس ہو گئی۔ میری رفتارِ شادابی منقطع ہو گئی لیکن تم کو نہ بھول سکی۔

"اے میری روح کے نغمے! میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اگر تو مجھ سے محبت نہیں کر سکتا تو نہ کر لیکن مجھے اتنا بتا دے کہ تو اس جذبے سے آگاہ ہو چکا ہے یا نہیں؟"

راجکمار مبہوت سا کھڑا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے اس کو گہرائیوں میں سے باہر کی طرف کھینچا ہے اور وہ روشنی میں آیا ہے۔

ومَلا کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو کائنات کا عکس لئے ہوئے باہر نکلے پھر تار بندھ گیا۔ ومَلا پر راز کہہ کر آگے چلدی۔ وہ تھوڑی دور گئی ہو گی کہ راجکمار نے پنڈتوں کی طرف دیکھا اور پھر اُڑ کر ومَلا کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے ومَلا کے ہاتھ کو زور سے کھینچا اور کہا۔

"ومَلا! میں ابھی تک تاریکی میں تھا۔ آج مجھے اپنی زندگی کا احساس ہوا ہے۔" پھر اُس نے مُڑ کر پنڈت کی طرف دیکھا۔

"گیانی جی! آپ واپس محلوں میں چلے جائیے میں مندر میں نہیں جاؤں گا۔"

راجکمار اور ومَلا دونوں پہاڑی پر چڑھ گئے۔ ومَلا کے چہرہ پر وہی رنگینی اور تازگی عود کر آئی۔ آسمان سے نور پاشیاں ہونے لگیں۔ پتھروں سے مسرتیں پھوٹ کر بہنے لگیں۔ رمز و اشارات کے نغمے فضا میں تحلیل ہو گئے۔ خاک کا ہر ایک ذرہ جوان ہو گیا۔ امنگیں جاگ اُٹھیں۔ ساری وادی وادیٔ ایمن بن گئی۔

دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے کیفِ صہبا کی طرح سرشار ہو رہے تھے۔ وقت اپنی رفتار بھول گیا۔ کون و مکاں کو اپنی جگہ کا احساس نہ رہا۔ راستے میں ومَلا نے پژمردہ پتیوں کو تیز رفتار ندی میں بہا دیا۔ راجکمار نے ومَلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں اور گلے سے چمٹ کر [illegible] لے۔

"ومَلا! مجھے زندگی کا آج احساس ہوا ہے!"

(۹)

بوڑھا ماہی گیر، راجکمار اور ومَلا کو پھولوں سے کھیلتے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی باچھیں دونوں طرف کھلی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں مسرت ناچ رہی تھی۔

"راجکمار! ان پہاڑیوں کے ہر ایک پتھر میں تمہاری تصویر موجود ہے!"

"ومَلا! وہ کیسے؟"

ومَلا نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہارے تصور میں پتھروں

سے لپٹ لپٹ کر بوسے دیا کرتی تھی۔"

آج پھولوں میں وہی تازگی تھی۔ کلیاں ویسے ہی سرشار تھیں۔ جھونپڑی کے ٹوٹے ہوئے تنکوں سے روح پرور نغمے نکل رہے تھے۔ راجکمار نے وملا کی طرف دیکھا پھر جھونپڑی کے روزنوں میں نگاہیں ڈالیں جو آسمان پر جا کر رک گئیں۔

"وملا! میں جس مندر میں جایا کرتا تھا وہاں میری روح کو کبھی تسکین نہ ہوئی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میرے سینے میں ایک مندر ہے جس میں تمہاری جیسی پجارن رہتی ہے۔ تم نے الوہیت کے گیت گا کر مجھے ہمیشہ کے لئے سرشار کر دیا ہے۔ میری رگ و پے میں طمانیت سرایت کر گئی ہے۔ وملا! اس جھونپڑی میں تاج شاہی کی ضرورت تو نہ ہوگی! ———— میں پرماتما کے نزدیک پہنچ چکا ہوں۔"

درسِ محبّت

از جناب صادق نیازی کاشمیری

شہیدِ ہو کے بقائے دوام پیدا کر
مگر نہ نخلِ تمنا غلام پیدا کر!

بہت بلند سہی کنگرِ وصالِ جمال
نگاہِ شوق میں تابِ خرام پیدا کر

نشانِ مردہ پسندی اُٹھا دے دنیا سے
تو اپنی زیست میں ہی اپنا نام پیدا کر

یہ کیا، کہ پرتوِ رنگیں سے ہی بہک اُٹھنا
برائے بادۂ گلگوں مشام پیدا کر

گھٹا نہ حوصلہ پیشِ لوائے دستِ یزید
رگوں میں جوششِ خونِ امام پیدا کر

فسردگیٔ گلِ آرزو کا غم نہ اُٹھا
"نہ کشتِ دل سے تمنائے خام پیدا کر"

جہاں کو دیکھ جہاں کی نگاہ سے ہر دم
تسلیٔ دلِ ہر خاص و عام پیدا کر

جنوں کی آگ تحمل سے سرد ہوتی ہے
نہ دل میں آرزوئے انتقام پیدا کر

جہاں کو نہ ہو سخن کی ہو آرزو صادق
کلام میں تو وہ حسنِ کلام پیدا کر

گلکدہ

مختلف اشعار

از مولانا حسرت کاشمیری ایڈیٹر روزنامہ "احسان" لاہور

اُن سے پہلی سی ملاقات گئی وہ جو اک بات تھی وہ بات گئی

رات کی بات کا مذکور ہی کیا چھوڑیئے رات گئی بات گئی

اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

راہ میں اُنسے ملاقات ہوئی جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

بات کیا تھی جو میں کہتا غمِ دل تم نے خود جان لیا بات ہوئی

عمر بھر ہم نے فکاہات لکھے زندگی نذرِ فکاہات ہوئی

آپ کا ذکر بیٹھتے اُٹھتے آپ کی یاد جاگتے سوتے

عشق نے حُسن کو بنایا حُسن ہم نہ ہوتے تو آپ کیا ہوتے

غیر اگر بارِ غم اُٹھا سکتا میرے مرنے پہ آپ کیوں روتے

ایک خط سلمیٰ کے نام

از:- مسعود حسن صاحب داناپوری

پیاری سلمیٰ!

آج دس سال کا عرصہ ہوتا ہے، مجھے خوب یاد ہے برسات کے موسم میں جبکہ پانی برس کر کھل گیا تھا، اور آسمان پر جا بجا ابر کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے۔ میں نے تمہارے نام آخری خط لکھا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہلکے آسمانی رنگ کے لیٹر پیپر پر دھوپ کبھی تیز ہو جاتی تھی اور کبھی ہلکی، میں فطرت کی اس انوکھی ظرافت سے جھنجھلا سا جاتا تھا مگر فوراً ہی ہونٹوں پر ایک تبسم خفیف لئے ہوئے پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

اس طویل مدت میں میں تمہیں یاد نہ کر سکا۔ تمہیں اس کی شکایت ضرور ہوگی۔ اور ہونی بھی چاہئے، مگر آہ تم کیا جانو! بس سمجھ لو خط و کتابت کا خیال، سلام و پیام کی فکر، مزاج پرسی اور جذبات کی ترجمانی کا شوق۔ یہ سب عقل و ہوش اور کامرانی و شادمانی کی باتیں ہیں، اور میں عقل و ہوش سے بیگانہ اور شادمانی و کامرانی سے کب کا محروم ہو چکا ہوں۔

دس برس قبل میں نے جو آخری تحریر تمہارے نام بھیجی تھی وہ تمہیں بہت پسند آئی تھی۔ تم نے اسکی رنگین انشا کی تعریف میں رائٹنگ پیڈ کے دو صفحہ رنگ ڈالے تھے۔ تمہاری توصیف و تعریف کے دو فقرے اب تک دماغ میں محفوظ رہ گئے ہیں ایک "دامانِ باغباں" اور دوسرا "کف گلفروش"! لیکن اب تو ؏

دنیا بدل گئی مرے خواب و خیال کی

کسی زمانہ میں مالی کے دامن اور ہاتھوں سے پھول خریدنے کی عزت حاصل کر چکی ہو۔ اب آج ذرا دل کے ٹکڑے خریدنے کی بھی زحمت گوارا کرو کہ اب میں مالی کا کام چھوڑ کر دل کی پھیری کیا کرتا ہوں۔

من قماش فروشِ دل صد پارۂ خویشم

دس برس قبل کا زمانہ وہ تھا جب میں مسرور تھا۔ یا یوں کہو کہ زندہ تھا۔ اب جبکہ رنج و الم کا مدفن اور مردہ سے بدتر ہوں، چاہتا ہوں کہ اس عہد کی بھی کوئی یادگار چھوڑ جاؤں۔ پیاری سلمیٰ! وہ تحریر زندگی کی تھی اور یہ موت کی، ان دونوں کو ایک جگہ جمع کر دینا کیا عجب ہے "پھولوں کی ڈلی" اور "سیپارۂ دل" کے اجتماع میں کسی عندلیب زار کے

لئے کچھ سبق موجود ہو۔

شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں اب تمہارا وہ زندہ دل مسعود نہیں رہا۔ یہ صحیح ہے کہ کالج کے دوران قیام میں میرے قہقہے ہوسٹل کی رونق تھے۔ اور میری زندہ دلی زبان زد ہر خاص و عام۔ اور کالج سے نکلنے پر بھی کچھ دنوں میری مرنجان مرنج زندگی رشک کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی لیکن اب ایک مدت سے سوسائٹی کے لئے مستقل اذیت بن گیا ہوں۔ جدھر جاتا ہوں افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را کہہ کر نکال دیا جاتا ہوں۔ فلک بوس قہقہوں نے آتشیں نالوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جو شوخ و شریر لڑکا ریکٹ گھماتا ہوا تین بجے کے قبل ہی ٹنیس کے میدان میں پہنچ جاتا تھا۔ اب اکثر کسی ویرانے میں بیٹھا ہوا گھانس سے کھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جو آنکھیں روزانہ سینما کے لطف سے محظوظ ہوتی تھیں اب اُن سے آنسوؤں کی گنگا جمنا جاری ہے۔ جو شخص ہر روز دو دو بار تبدیل لباس کا عادی تھا اب اُس کے نازک بدن پر کپڑے تار تار ہیں۔ جس کی زندگی کا ہر لمحہ بزم مسرت اور مجلس نشاط میں گذرا اب آدھی رات گئے تک اُس کے کمرے سے نالہائے حزیں کی جگر خراش صدائیں آتی ہیں۔ جس خوش نصیب کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی۔ اب اُس کے غم خانہ مصیبت کی چاندنی بھی سیاہ ہوتی ہے۔

تم سے جدا ہونے کے بعد دو چار سال اور مسرت و سکون سے گزرے اور اس میں شک نہیں کہ اس عرصہ میں مجھ پر ہنسی خوشی کی دولت ساون کی موسلادھار بارش کی طرح برستی رہی۔ لیکن تم جانتی ہو کہ خصوصاً اس معاملہ میں فطرت فیاض نہیں واقع ہوئی ہے۔ گلاب کے پھول کو دیکھو صرف ایک تبسم کے بعد غریب کی ساری زندگی پریشانی ہی پریشانی میں گزرتی ہے۔ قوس قزح کی رنگینیاں کتنی ناپائدار ہوتی ہیں۔ چاندنی راتیں کے دن رہتی ہیں؟ لیکن تاریک راتیں اپنا دامن پھیلائے جاتی ہیں ——— پھیلائے جاتی ہیں۔ بالکل یہی حال ہماری مسرتوں کا ہوا۔ تم خود شاعرہ ہو ادیبہ ہو ایسی ادیب و شاعر کہ کم از کم صنف نازک میں قدرت مشکل سے ایسے افراد پیدا کرتی ہے۔ اس لئے تمہارے سامنے اس حقیقت کو اس سے زیادہ بے نقاب کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا ہوں۔

تم سے ملنے کی آرزو ہے۔ اس لئے نہیں کہ حال دل سنا کر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کروں گا یا اپنی مصیبت پر تمہیں دل دکھانے کی تکلیف دوں گا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ ذرا تم میرے اُترے ہوئے چہرے کو، ڈھلتے ہوئے آنسوؤں کو، میری دھنسی ہوئی آنکھوں کو اور ان کے گرد سیاہ حلقوں کو، میرے خشک افسردہ لبوں کو، اور میرے اُلجھے اُلجھے بالوں کو ایک نظر دیکھ لیتیں۔ پھر اگر تم دیکھ سکتیں تو اپنا زخمی سینہ چیر کر اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی دکھاتا جن میں چھوٹی بڑی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں۔

تم بھول گئی ہو گی تاہم مجھے خوب [illegible] آنکھیں بند کر لوں تو وہ نظارہ سامنے آ جاتا ہے۔ میں تھا، سلیم تھا اور تم تھیں، گرمی کی ایک فرحت بخش شام کو میں

اپنے پائیں باغ میں بیٹھا ہوا بلند آواز سے "شہاب کی سرگذشت" پڑھ رہا تھا۔ دور، ہم لوگوں سے بہت دور درختوں کے کسی کنج میں فاختہ بھی کوکو کا نغمہ الاپ رہی تھی۔ پڑھتے پڑھتے جب میں اس عبارت تک پہنچا تھا کہ "سچ پوچھئے تو جوانی اس شخص کی ہے جسے دیکھ کر دس آدمی تو سو میں ایسے کہنے والے موجود ہوں کہ اس نے بھی جوانی کس بُری طرح ضایع کی ہے، دنیا میں اگر کوئی چیز صرف ضایع کرنے کی ہے تو وہ جوانی ہے"۔ تو میں نے کتاب کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ مگر سلمیٰ پیاری! اب اردو لٹریچر کے گرانبار ذخیرے میں سے صرف یہی تحریر مجھے یاد ہے اسے زبان سے ادا کرتا ہوں تو قلب کو بڑی راحت ملتی ہے۔

سلمیٰ! تمہارے نام یہ میری آخری تحریر ہے، تمہارے نام نہیں بلکہ دنیا کے نام! ہاں تو یہ میری آخری تحریر ہے۔ اس خط کے جواب کی تکلیف گوارا نہ کرنا اور نہ یہ اُمید رکھنا کہ میں آئندہ سلام و پیام کی زحمت برداشت کرونگا۔ دیکھو میں اپنے اس ارادہ پر اسقدر پابندی سے عمل کرونگا کہ اگر تمہارا خط مجھے کبھی ملا تو اس کے پُرزے ہوا میں اُڑتے ہوئے نظر آئینگے اس حال میں کہ میری آنکھوں نے اس میں سے ایک لفظ بھی پڑھا نہ ہوگا۔

الوداع! اے رفیق دلی الوداع!

تمہارا

مسعود

غزل

از:- محمد بشیر صاحب برق سیالکوٹی

آجا نظر میں مستیٔ صہبا لئے ہوئے
دل ہے کشاکشِ غمِ دنیا لئے ہوئے

ہم کو ہوا نصیب نہ رنگِ بہارِ عیش
جاتے ہیں دل میں داغِ تمنّا لئے ہوئے

اللہ رے چشمِ مست کی کیف آفرینیاں
بیٹھا ہوا ہوں ساغر و مینا لئے ہوئے

گھبرا گیا ہے عرصۂ دنیا سے اپنا دل
کب تک رہینگے ہم غمِ دُنیا لئے ہوئے

کب دل پہ ہونگی نورِ محبت کی بارشیں
کب آئینگے وہ عارضِ زیبا لئے ہوئے

پھر شعلہ ہائے غم مرے دل میں بھڑک اُٹھے
آئی بہار پھر ترا جلوا لئے ہوئے

یا رب جہاں سے دردِ محبت کا مٹ گیا
اک دل مرا ہے درد کی دُنیا لئے ہوئے

دل کو کسی کی یاد ستاتی رہے گی برقؔ
جائیں گے تا بہ گور تمنّا لئے ہوئے

روحِ ادب

از:- حضرت جوشؔ ملیح آبادی

شکرِ ایزد کہ شبِ تار کا ارماں نکلا — غرفۂ ابرِ سیہ سے مہِ تاباں نکلا

تیرہ روزن سے اُدھر ابر کے جھانکا مہتاب — تنگ غرفے سے اِدھر چہرۂ جاناں نکلا

اُس طرف تیز ہُوا ولولۂ بادِ صبا — اِس طرف حوصلۂ زلفِ پریشاں نکلا

اُس طرف تیرگیٔ شام کی بر آئی مراد — اِس طرف رندِ سیہ مست کا ارماں نکلا

یاں سرِ بزم چلا ساغرِ گلرنگ کا دور — واں سرِ چرخ جلوسِ مہِ تاباں نکلا

موجِ ظلمت سے اُدھر عارضِ رقصاں اُبھرا — کنجِ عزلت سے اِدھر سروِ خراماں نکلا

سرخ بوتل سے اِدھر آتشِ نمناک ابلی — تیرہ بادل سے اُدھر شعلۂ عریاں نکلا

اُس طرف غلغلۂ عشوۂ مہتاب اُٹھا — اِس طرف تذکرۂ عارضِ تاباں نکلا

جوشؔ اُدھر نور ہُوا عہدہ برا ظلمت سے

یار پردے سے اِدھر مست و غزل خواں نکلا

اخباری مضمون

یورپ کی تباہ کاریاں

روزنامچہ (۲)

۱۹۱۵ء میں

از خواجہ سلام الدین صاحب سی ایم

جنوری ۱ - جرمن آبدوز نے انگریزی جنگی جہاز "فارمیڈیبل" کو غرق کر دیا۔

" ۵ - ترکی فوج کو کاکیشیا میں شکست ہوئی۔

" ۷ - الساس میں فرانس کی پیشقدمی۔

" ۱۴ - فیبنو (اٹلی) میں المناک زلزلہ۔ ہزارہا انسان ہلاک ہوئے۔

" ۱۴ - ایو یئر نیو کی تباہی۔ سوئنز میں جرمنوں کی فتح۔ قیصر کی موجودگی۔

" ۲۴ - برطانی سکواڈرن نے تین جرمن جنگی جہازوں کا تعاقب کیا۔ برطانی جنگی جہاز "لائین" نائب امیر البحر سر ڈیوڈ بیٹی کے زیر کمان بحری جنگ کے لئے تیار ہوتا ہے "لائین" "ٹائیگر" "پرنس رائل" "نیوزیلینڈ" "ان ڈامی ٹیبل" (ناقابل مغلوب) برطانی جہاز ایک طرف اور "ڈرفلنگر" "سیڈلٹز" "مولٹکے" "بلوشر" جرمن جہاز دوسری طرف معرکہ آرا ہوئے۔ دونوں جانب سے غضبناک حملہ آوری۔ رات کے ایک بجے "بلوشر" زیر آب ہوگیا کوئی برطانی جہاز تباہ نہ ہوا۔ البتہ ۱۴ آدمی ہلاک اور ۲۹ زخمی ہوئے۔ "بلوشر" کے ۸۰۵ انسانوں میں ۱۲۳ بچے۔

فروری ۲ - ترکوں نے طوسوم پر اسمٰعیلیہ کے قریب نہر سوئز کو عبور کرنے کا عزم کیا۔ برطانی فوج سے مقابلہ۔ ترک پسپا ہوئے۔

" ۱۱ - جرمن بحری حکام کا اعلان کہ غیر جانبدار جہازوں کو بشرطیکہ وہ ممنوع سامان حرب نہ لے جاتے ہوں کچھ ضرر نہیں پہنچایا جائے گا۔ لیکن ہر برطانی جہاز خواہ وہ جنگی ہو یا تجارتی زیر آب کر دیا جائیگا۔

فروری ۱۳ - مشرقی پروشیا میں جرمن پیشقدمی جاری رہی

" ۱۵ - مشرقی پروشیا کو روسیوں نے خالی کر دیا۔

" ۱۶ - ساحل بلجیئم کے قریب جرمنوں پر برطانیہ نے چالیس ہوائی جہازوں سے ۲۴۰ بم گرائے بعد ازاں آٹھ فرانسیسی ہوائی جہاز آکر برطانیہ کی گولہ باری میں شریک ہوگئے۔

" ۱۸ - جرمن بحری حکام کا اعلان کہ جزائر انگلستان کا محاصرہ کیا جائے۔

فروری ۱۹:- ۳۲ برطانی اور فرانسیسی جہازوں کا بیڑا دردانیال
کے قلعوں پر حملہ آور ہوا۔
مارچ ۱ - برطانیہ نے جرمنی کے محاصرہ کا اعلان کر دیا۔ دردانیال
میں معرکہ آرائیاں۔ برطانی جہازوں نے مختلف
قلعوں پر گولہ باری کی۔
" ۴ - جرمن آبدوز ۸-لا کو برطانی جہاز نے ڈاور میں غرق
کر دیا۔
" ۱۰ - جرمن آبدوز ۱۲-لا کو برطانی جہاز "ایریل" نے
غرق کر دیا۔
" ۱۴ - جرمن کروزر "ڈرسڈن" کو تین برطانی جہازوں
"گلاسگو" "کینٹ" اور "اراما" نے جان فرڈیننڈ
میں گھیر لیا۔ ڈرسڈن نے سفید جھنڈا لہرا دیا۔ لیکن
اُسے آگ لگا دی گئی اور تباہ کیا گیا۔
" ۱۸ - دردانیال میں ہولناک جنگ دہدل۔ اتحادیوں
کے تین جہازوں کی غرقابی۔
" ۲۲ - سقوط زمسل۔
" ۲۵ - جرمن آبدوز ۲۹-لا کی غرقابی۔
اپریل ۱۵ - آرس اور لابسل پر اتحادیوں کی کامیابی۔
" ۲۷ - فرانسیسی کروزر "لین گمبٹا" کو آسٹرین آبدوز نے
غرق کر دیا۔ سات سو انسان لقمۂ اجل ہوئے۔
مئی ۷ - برطانی جہاز "لوسی ٹینیا" کو جرمن آبدوز نے
تارپیڈو سے غرق کر دیا۔ ایک ہزار پانچ سو آدمی
ہلاک ہوئے۔
" ۱۳ - دردانیال میں برطانی جہاز "گولیتھ" کی تباہی ۵۰۰
انسانوں کی ہلاکت۔

مئی ۲۲ - گریٹنا کے قریب ریلوے حادثہ - ۱۵۰ ہلاک
اور ۲۰۰ زخمی ہوئے۔
" ۲۲ - آسٹریا کے خلاف اٹلی کا اعلان جنگ۔
" ۲۳ - برطانیہ میں مخلوط وزارت قائم ہوئی۔
" ۲۶ - برطانی جہاز "ٹرائمف" (ظفر) گیلی پولی میں
تارپیڈو سے تباہ کر دیا گیا۔
جون ۲ - اٹلی کی فوج کا ڈروز عبور کرنا۔
" ۳ - زمسل پر جرمنی اور آسٹریا کا دوبارہ قبضہ۔
" ۷ - برطانی زپلین کو گینٹ اور برسلز کے درمیان
بمقام وارن فورڈ چھ ہزار فٹ کی بلندی سے
جرمنوں نے غارت کر دیا۔
" ۲۰ - لمبرگ پر جرمن قبضہ۔
جولائی ۱ - برطانی جنگی جہاز "آرمینیا" جرمن آبدوز نے
ساحل کورنش پر غرق کیا۔ ۲۹ جانیں ضایع ہوئیں
جن میں ۱۲ امریکن تھے۔
" ۹ - جرمن افریقہ کی تسخیر۔
" ۱۵ - ویلز کے دو لاکھ کان کنوں کی ہڑتال۔
" ۲۰ - ہڑتال کا خاتمہ۔
" ۳۰ - برطانی جہاز "آئی بیرین" جرمن آبدوز نے غرق
کر دیا۔
اگست ۴ - تسخیر وارسا۔
" ۹ - ترکی جنگی جہاز "ہیردن بار بروس" کو برطانی
آبدوز نے زیر آب کر دیا۔
" ۱۴ - برٹش ٹرانسپورٹ "رائل ایڈورڈ" کو ایجین میں
" ۱۰ - جرمن تباہ کن جہاز "موٹکے" کو برطانی آبدوز نے

فروری ۹: - ۳۲ برطانی اور فرانسیسی جہازوں کا بیڑا دردانیال کے قلعوں پر حملہ آور ہوا۔

مارچ ۱ - برطانیہ نے جرمنی کے محاصرہ کا اعلان کر دیا۔ دردانیال میں معرکہ آرائیاں۔ برطانی جہازوں نے مختلف قلعوں پر گولہ باری کی۔

" ۴ - جرمن آبدوز ۸-لا کو برطانی جہاز نے ڈاور میں غرق کر دیا۔

" ۱۰ - جرمن آبدوز ۱۲-لا کو برطانی جہاز "ایریل" نے غرق کر دیا۔

" ۱۴ - جرمن کروزر "ڈرسڈن" کو تین برطانی جہازوں "گلاسگو"، "کینٹ" اور "اراما" نے جان فرڈیننڈ میں گھیر لیا۔ ڈرسڈن نے سفید جھنڈا لہرا دیا۔ لیکن اُسے آگ لگا دی گئی اور تباہ کیا گیا۔

" ۱۸ - دردانیال میں ہولناک جنگ و جدل۔ اتحادیوں کے تین جہازوں کی غرقابی۔

" ۲۲ - سقوط زمسل۔

" ۲۵ - جرمن آبدوز ۲۹-لا کی غرقابی۔

اپریل ۱۵ - آرس اور لابسل پر اتحادیوں کی کامیابی۔

" ۲۷ - فرانسیسی کروزر "لین گمبتا" کو آسٹرین آبدوز نے غرق کر دیا۔ سات سو انسان لقمۂ اجل ہوئے۔

مئی ۷ - برطانی جہاز "لوسی ٹینیا" کو جرمن آبدوز نے تارپیڈو سے غرق کر دیا۔ ایک ہزار پانچ سو آدمی ہلاک ہوئے۔

" ۱۳ - دردانیال میں برطانی جہاز "گولیتھ" کی تباہی۔ ۵۰۰ انسانوں کی ہلاکت۔

مئی ۲۲ - گریٹنا کے قریب ریلوے حادثہ - ۱۵۰ ہلاک اور ۲۰۰ زخمی ہوئے۔

" ۲۳ - آسٹریا کے خلاف اٹلی کا اعلان جنگ۔

" ۲۳ - برطانیہ میں مخلوط وزارت قائم ہوئی۔

" ۲۶ - برطانی جہاز "ٹرائمف" کو خلیج گیلی پولی میں تارپیڈو سے تباہ کر دیا گیا۔

جون ۲ - اٹلی کی فوج کا دریائے آئسونزو عبور کرنا۔

" ۳ - زمسل پر جرمنی اور آسٹریا کا دوبارہ قبضہ۔

" ۷ - برطانی زیلن کو گمینٹ اور برسلز کے درمیان مبعام وارن فورڈ چھ ہزار فٹ کی بلندی سے جرمنوں نے غارت کر دیا۔

" ۲۰ - لمبرگ پر جرمن قبضہ۔

جولائی ۱ - برطانی جنگی جہاز "آرمینیا" جرمن آبدوز نے ساحل کورنش پر غرق کیا۔ ۲۹ جانیں ضایع ہوئیں جن میں ۱۲ امریکن تھے۔

" ۹ - جرمن افریقہ کی تسخیر۔

" ۱۵ - ویلز کے دو لاکھ کان کنوں کی ہڑتال۔

" ۲۰ - ہڑتال کا خاتمہ۔

" ۳۰ - برطانی جہاز "آئی بیرین" جرمن آبدوز نے غرق کر دیا۔

اگست ۴ - تسخیر وارسا۔

" ۹ - ترکی جنگی جہاز "ہیرڈن باربروسا" کو برطانی آبدوز نے زیر آب کر دیا۔

" ۱۴ - برٹش ٹرانسپورٹ "رائل ایڈورڈ" کو ایجین میں

" ۱۰ - جرمن تباہ کن جہاز "سوشکے" کو برطانی آبدوز نے

فروری ۹:- ۲۲ برطانی اور فرانسیسی جہازوں کا بیڑا دردانیال کے قلعوں پر حملہ آور ہوا۔

مارچ ۱- برطانیہ نے جرمنی کے محاصرہ کا اعلان کر دیا۔ دردانیال میں معرکہ آرائیاں۔ برطانی جہازوں نے مختلف قلعوں پر گولہ باری کی۔

" ۴- جرمن آبدوز ۸-لا کو برطانی جہاز نے ڈاور میں غرق کر دیا۔

" ۱۰- جرمن آبدوز ۱۲-لا کو برطانی جہاز "ایریل" نے غرق کر دیا۔

" ۱۴- جرمن کروزر "ڈرسڈن" کو تین برطانی جہازوں "گلاسگو" "کینٹ" اور "اراما" نے جان فرنینڈ میں گھیر لیا۔ ڈرسڈن نے سفید جھنڈا لہرایا۔ لیکن اُسے آگ لگا دی گئی اور تباہ کیا گیا۔

" ۱۸- دردانیال میں ہولناک جنگ دہدل۔ اتحادیوں کے تین جہازوں کی غرقابی۔

" ۲۲- سقوط زمسل۔

" ۲۵- جرمن آبدوز ۲۹-لا کی غرقابی۔

اپریل ۱۵- آرس اور لابسل پر اتحادیوں کی کامیابی۔

" ۲۶- فرانسیسی کروزر "لین گمبیٹا" کو آسٹرین آبدوز نے غرق کر دیا۔ سات سو انسان لقمۂ اجل ہوئے۔

مئی ۷- برطانی جہاز "لوسی ٹینیا" کو جرمن آبدوز نے تارپیڈو سے غرق کر دیا۔ ایک ہزار پانچ سو آدمی ہلاک ہوئے۔

" ۱۳- دردانیال میں برطانی جہاز "گولیتھ" کی تباہی ۵۰۰ انسانوں کی ہلاکت۔

مئی ۲۲- گریٹنا کے قریب ریلوے حادثہ ۱۵۰ ہلاک اور ۲۰۰ زخمی ہوئے۔

" ۲۲- آسٹریا کے خلاف اٹلی کا اعلان جنگ۔

" ۲۳- برطانیہ میں مخلوط وزارت قائم ہوئی۔

" ۲۶- برطانی جہاز "ٹرائمف" ظفر ا گیلی پولی میں تارپیڈو سے تباہ کر دیا گیا۔

جون ۲- اٹلی کی فوج کا ڈرو زہ عبور کرنا۔

" ۳- زمسل پر جرمنی اور آسٹریا کا دوبارہ قبضہ۔

" ۲۷- برطانی زیلن کو گمینٹ اور برسلز کے درمیان مقام وادن فورڈ چھ ہزار فٹ کی بلندی سے جرمنوں نے غارت کر دیا۔

" ۲۰- لمبیز پر جرمن قبضہ۔

جولائی ۱- برطانی جنگی جہاز "آرمینیا" جرمن آبدوز نے ساحل کورنش پر غرق کیا۔ ۲۹ جانیں ضائع ہوئیں جن میں ۱۲ امریکن تھے۔

" ۹- جرمن افریقہ کی تسخیر۔

" ۱۵- ویلز کے دو لاکھ کان کنوں کی ہڑتال۔

" ۲۰- ہڑتال کا خاتمہ۔

" ۳۰- برطانی جہاز "آئی بیرین" جرمن آبدوز نے غرق کر دیا۔

اگست ۴- تسخیر وارسا۔

" ۹- ترکی جنگی جہاز "ہیردن بار بروس" کو برطانی آبدوز نے زیر آب کر دیا۔

" ۱۴- برٹش ٹرانسپورٹ "رائل ایڈورڈ" کو ایجین میں

" ۱۰- جرمن تباہ کن جہاز "موسکے" کو برطانی آبدوز نے

فروری ۹: - ۳۲ برطانی اور فرانسیسی جہازوں کا بیڑا دردانیال کے قلعوں پر حملہ آور ہوا۔

مارچ ۱ - برطانیہ نے جرمنی کے محاصرہ کا اعلان کر دیا۔ دردانیال میں معرکہ آرائیاں۔ برطانی جہازوں نے مختلف قلعوں پر گولہ باری کی۔

" ۴ - جرمن آبدوز ۸-لا کو برطانی جہاز نے ڈاور میں غرق کر دیا۔

" ۱۰ - جرمن آبدوز ۱۲-لا کو برطانی جہاز "ایریل" نے غرق کر دیا۔

" ۱۴ - جرمن کروزر "ڈرسڈن" کو تین برطانی جہازوں "گلاسگو"، "کینٹ" اور "اراما" نے جان فرڈیننڈ میں گھیر لیا۔ ڈرسڈن نے سفید جھنڈا لہرایا۔ لیکن اُسے آگ لگا دی گئی اور تباہ کیا گیا۔

" ۱۸ - دردانیال میں ہولناک جنگ و جدل۔ اتحادیوں کے تین جہازوں کی غرقابی۔

" ۲۲ - سقوط زمسل۔

" ۲۵ - جرمن آبدوز ۲۹-لا کی غرقابی۔

اپریل ۱۵ - آرس اور لابسل پر اتحادیوں کی کامیابی۔

" ۲۷ - فرانسیسی کروزر "لین گمبٹا" کو آسٹرین آبدوز نے غرق کر دیا۔ سات سو انسان لقمۂ اجل ہوئے۔

مئی ۷ - برطانی جہاز "لوسی ٹینیا" کو جرمن آبدوز نے تارپیڈو سے غرق کر دیا۔ ایک ہزار پانچ سو آدمی ہلاک ہوئے۔

" ۱۳ - دردانیال میں برطانی جہاز "گولیتھ" کی تباہی۔ ۵۰۰ انسانوں کی ہلاکت۔

مئی ۲۲ - گریٹنا کے قریب ریلوے حادثہ - ۱۵۰ ہلاک اور ۲۰۰ زخمی ہوئے۔

" ۲۲ - آسٹریا کے خلاف اٹلی کا اعلان جنگ۔

" ۲۳ - برطانیہ میں مخلوط وزارت قائم ہوئی۔

" ۲۶ - برطانی جہاز "ٹرائمف" ! غلفر! گیلی پولی میں تارپیڈو سے تباہ کر دیا گیا۔

جون ۲ - اٹلی کی فوج کا ڈروز پر عبور کرنا۔

" ۳ - زمسل پر جرمنی اور آسٹریا کا دوبارہ قبضہ۔

" ۲۷ - برطانی زپلن کو گینٹ اور برسلز کے درمیان مقام والدن نورڈ چھ ہزار فٹ کی بلندی سے جرمنوں نے غارت کر دیا۔

" ۲۰ - لمبیز پر جرمن قبضہ۔

جولائی ۱ - برطانی جنگی جہاز "آرمینیا" جرمن آبدوز نے ساحلِ کورنش پر غرق کیا۔ ۲۹ جانیں ضائع ہوئیں جن میں ۲۱ امریکن تھے۔

" ۹ - جرمن افریقہ کی تسخیر۔

" ۱۵ - ویلز کے دو لاکھ کان کنوں کی ہڑتال۔

" ۲۰ - ہڑتال کا خاتمہ۔

" ۳۰ - برطانی جہاز "آئی بیرین" جرمن آبدوز نے غرق کر دیا۔

اگست ۴ - تسخیر وارسا۔

" ۹ - ترکی جنگی جہاز "ہیرِدن بار بروس" کو برطانی آبدوز نے زیرِ آب کر دیا۔

" ۱۴ - برٹش ٹرانسپورٹ "رائل ایڈورڈ" کو ایجین میں

" ۱۰ - جرمن تباہ کن جہاز "موٹکے" کو برطانی آبدوز نے

فروری ۱۹: - ۳۲ برطانی اور فرانسیسی جہازوں کا بیڑا دردانیال کے قلعوں پر حملہ آور ہوا۔

مارچ ۱ - برطانیہ نے جرمنی کے محاصرہ کا اعلان کر دیا۔ دردانیال میں معرکہ آرائیاں۔ برطانی جہازوں نے مختلف قلعوں پر گولہ باری کی۔

" ۴ - جرمن آبدوز ۸-لا کو برطانی جہاز نے ڈاور میں غرق کر دیا۔

" ۱۰ - جرمن آبدوز ۱۲-لا کو برطانی جہاز "ایریل" نے غرق کر دیا۔

" ۱۴ - جرمن کروزر "ڈرسڈن" کو تین برطانی جہازوں "گلاسگو" "کینٹ" اور "اراما" نے جان فرڈیننڈ میں گھیر لیا۔ ڈرسڈن نے سفید جھنڈا لہرا دیا۔ لیکن اُسے آگ لگا دی گئی اور تباہ کیا گیا۔

" ۱۸ - دردانیال میں ہولناک جنگ دہدل - اتحادیوں کے تین جہازوں کی غرقابی۔

" ۲۲ - سقوط زمسل۔

" ۲۵ - جرمن آبدوز ۲۹-لا کی غرقابی۔

اپریل ۱۵ - آرس اور لابسل پر اتحادیوں کی کامیابی۔

" ۲۰ - فرانسیسی کروزر "لین گمبٹا" کو آسٹرین آبدوز نے غرق کر دیا۔ سات سو انسان لقمۂ اجل ہوئے۔

مئی ۷ - برطانی جہاز "لوسی ٹینیا" کو جرمن آبدوز نے تارپیڈو سے غرق کر دیا۔ ایک ہزار پانچ سو آدمی ہلاک ہوئے۔

" ۱۳ - دردانیال میں برطانی جہاز "گولیتھ" کی تباہی ۵۰۰ انسانوں کی ہلاکت۔

مئی ۲۲ - گرینٹنا کے قریب ریلوے حادثہ - ۱۵۰ ہلاک اور ۲۰۰ زخمی ہوئے۔

" ۲۲ - آسٹریا کے خلاف اٹلی کا اعلان جنگ۔

" ۲۳ - برطانیہ میں مخلوط وزارت قائم ہوئی۔

" ۲۶ - برطانی جہاز "ٹرائمف" (ظفر) گیلی پولی میں تارپیڈو سے تباہ کر دیا گیا۔

جون ۲ - اٹلی کی فوج کا ڈرو زنجبور کرنا۔

" ۳ - زمسل پر جرمنی اور آسٹریا کا دوبارہ قبضہ۔

" ۲۰ - برطانی زپلین کو گینٹ اور برسلز کے درمیان مقام وادن فور ڈچھ ہزار فٹ کی بلندی سے جرمنوں نے غارت کر دیا۔

" ۲۰ - لمبیز پر جرمن قبضہ۔

جولائی ۱ - برطانی جنگی جہاز "آرمینیا" جرمن آبدوز نے ساحل کورنش پر غرق کیا۔ ۲۹ جانیں ضائع ہوئیں جن میں ۱۲ امریکن تھے۔

" ۹ - جرمن افریقہ کی تسخیر۔

" ۱۵ - ویلز کے دو لاکھ کان کنوں کی ہڑتال۔

" ۲۰ - ہڑتال کا خاتمہ۔

" ۳۰ - برطانی جہاز "آئی بیرین" جرمن آبدوز نے غرق کر دیا۔

اگست ۴ - تسخیر وارسا۔

" ۹ - ترکی جنگی جہاز "ہیردن بار بروس" کو برطانی آبدوز نے زیر آب کر دیا۔

" ۱۴ - برٹش ٹرانسپورٹ "رائل ایڈورڈ" کو ایجین میں

" ۱۰ - جرمن تباہ کن جہاز "موسکے" کو برطانی آبدوز نے